جدید ایڈیشن

تحقیق وتخریج اور علمی اضافوں سے مزین

بلوغ المرام

من أدلة الأحكام

تالیف
ابوالفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ
شرح
فضیلۃ الشیخ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ

جلد اوّل





www.KitaboSunnat.com

جلد اوّل

مترجم

بلوغ المرام

من أدلة الأحكام

تحقیق و تخریج اور متعدد علمی و تحقیقی اضافوں سے مزین جدید ایڈیشن

كتاب الطهارة — كتاب الحج ❖ أحاديث: 1 — 647

تالیف

ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ

۷۷۳ - ۸۵۲ھ

شرح

فضیلۃ الشیخ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ

۱۳۹۱ - ۱۴۲۷ھ

ترجمہ

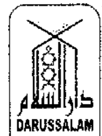
مولانا عبد الوکیل علوی حفظہ اللہ

تحقیق و تخریج

حافظ ابو طاہر زبیر علی زئی حفظہ اللہ

نظر ثانی، تصحیح و تنقیح اور اضافات

حافظ آصف اقبال حفظہ اللہ — قاری ذکا اللہ سلیم حفظہ اللہ





سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

* الریاض۔العُلیا۔ فون: 4614483 01 فیکس: 4644945 * الملز فون: 4735220 01 * سویلم فون: 2860422 01
* مندوب الریاض: موبائل: 0503459695 * قصیم (بریدہ): فون/فیکس: 3696124 06 موبائل: 0503417156
* مکہ مکرمہ: موبائل: 0502839948 * مدینہ منورہ فون: 8234446 04 فیکس: 8151121 موبائل: 0504296740
* جدّہ فون: 6879254 02 فیکس: 6336270 * الخبر فون: 8692900 03 فیکس: 8691551
* ینبع البحر فون/فیکس: 3908027 04 * خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 07

شارجہ فون: 5632623 6 00971 امریکہ ہوسٹن: 7220419 713 001 نیویارک: 6255925 718 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون: 4040 9758 2 0061

پاکستان (ہیڈ آفس ومرکزی شوروم)

لاہور **36-لوئرمال، سیکرٹریٹ شاپ**
فون: 37232400-37240024-37324034 42 0092 فیکس: 37354072 موبائل: 0322-8484569
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com
* غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 37120054 فیکس: 37320703 موبائل: 0321-4439150
* مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن فون: 37846714 موبائل: 0321-4156390
* Y-260 بلاک کمرشل ایریا فیز III ڈیفنس لاہور فون: 35692610 موبائل: 0321-4212174

اسلام آباد F-8 مرکز، فون/فیکس: 2281513 موبائل: 0321-5370378
کراچی مین طارق روڈ (D.C.HS / 110,111-Z) ڈاممین مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی
فون: 34393936 فیکس: 34393937 موبائل: 0321-2441843

اجمالی فہرست

أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ

أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ

”اچھی طرح سن لو! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ
اس کی مثل (سنت) بھی۔ خبردار! مجھے قرآن دیا گیا ہے
اور اس کے ساتھ اس کی مثل (سنت) بھی۔“ (مسند احمد: ...)

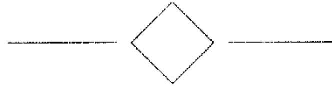
نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً

سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے
کوئی حدیث سنی، پھر اُسے یاد کر کے لوگوں تک پہنچا دیا۔"

(سُنن أبي داود، العلم، حديث:٣٦٦٠)

فہرست مضامین (جلد اول)



عرض ناشر

دارالسلام اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ الحمدللہ' اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ' زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری اور طباعت و کتابت کے حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔ اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری اشاعتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی علمی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص' اس کی مہربانی اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ اور صلہ ہے جس پر ہم بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز اور دارالسلام کے رفقاء اور محققین کے شکر گزار ہیں۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ ' وَوَفَّقَنَا اللّٰهُ وَ إِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَ يَرْضٰى.

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب "بُلُوغُ الْمَرَامِ مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ" بھی ہے۔ ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیبی سائز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا ہے۔ اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا اعزاز بھی دارالسلام نے حاصل کیا۔ یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری ﷫ کی تحریر کردہ ہے۔

''بلوغ المرام'' پاک و ہند کے اکثر دینی مدارس میں داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متداول ہے' اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے' چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں بھی مولانا مبارکپوری ﷫ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ اردو دان حضرات بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی ﷾ کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا جس پر ادارے کے فاضل رفقاء نے نظر ثانی فرمائی اور یہ زیور طبع سے آراستہ ہوگئی۔ لیکن یہ کام بڑی عجلت میں کیا گیا تھا اور اس میں بہت سی طباعتی اغلاط کے علاوہ متعدد علمی فروگزاشتیں بھی رہ گئی تھیں۔ اس پر ادارے نے از سر نو نظر ثانی کرانے کا فیصلہ کیا' چنانچہ اس کے مطابق دوبارہ پوری کتاب کو تنقیح و تصحیح اور اصلاح و ترمیم کے مرحلے سے گزارا گیا۔ علاوہ ازیں احادیث کی صحت و ضعف کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس

کی وجہ سے بعض جگہوں پر فوائد و مسائل میں بھی ردّ و بدل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یوں الحمد للہ اب یہ کتاب گزشتہ غلطیوں اور فروگزاشتوں سے بہت حد تک پاک ہوگئی ہے۔

اس جدید ایڈیشن کی تحقیق وتخریج عظیم محقق حافظ زبیر علی زئی ﷾ نے کی ہے اور اس کی نظر ثانی، تصحیح وتنقیح اور تحقیقی اور علمی اضافے حافظ آصف اقبال اور قاری ذکا اللہ سلیم حفظہما اللہ نے کیے ہیں جبکہ ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ وغیرہ کی ذمہ داری مولانا عبدالجبار، مولانا ابونعمان بشیر احمد، مولانا عثمان منیب، حافظ محمود، پروفیسر ابوانس محمد سرور گوہر، مختار احمد ضیاء اور مولانا غلام مرتضی حفظہم اللہ نے بڑی محنت سے نبھائی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کی تیاری کے فنی مراحل، کمپوزنگ اور ڈیزائننگ میں محمد عامر رضوان، اخلاص الحق ساجد، شیخ محمد یعقوب اور عبدالجبار غازی نے اسے خوب سے خوب تر بنانے میں بھرپور محنت کی ہے۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم ﷾ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انھوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

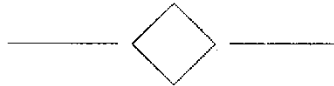
اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اب بھی اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں، ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کردی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظر ثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے، اس لیے ادارہ اسے قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں ہرگز تأمل نہیں کرے گا۔

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر: دارالسلام الریاض، لاہور

نومبر 2009ء



مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں تخلیق فرمایا ہے' نیز اس دنیا میں اسے یہ ثابت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ ابدی زندگی کی اعلیٰ ترین نعمتوں کا اہل ہے۔ اس کی تخلیق کی خوبی ہے کہ وہ اس دنیا میں رہنے کے لیے سب سے مناسب مخلوق ہے۔ اسے اپنی زندگی اور جدوجہد کے لیے جو کچھ چاہیے وہ سب یہاں موجود ہے لیکن وہ اس دنیوی زندگی کے آخری حصے تک جس طرح کی لازوال خوشی اور خوش حالی کا متلاشی رہتا ہے اور اس کے حصول کے لیے دیوانہ وار جدوجہد کرتا ہے وہ اسے اس دنیا میں مل ہی نہیں سکتی۔ اسے اگر اپنی طلب سے بہت کم کبھی میسر آتا بھی ہے تو موت کا ہاتھ اسے اس کی ساری جمع پونجی سے محروم کر کے قبر کے حوالے کر دیتا ہے۔

انسان کی تخلیق میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں فطری طور پر اچھائی اور برائی میں امتیاز اور اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت ودیعت کر دی ہے۔ ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا ۝﴾ (الشمس ۹۱:۸) بڑے سے بڑا سرکش بھی' اگر اپنی غرض موجود نہ ہو تو مظلوم کے لیے دل میں ہمدردی اور ظالم کے خلاف نفرت ہی محسوس کرتا ہے۔ انصاف اور بھلائی کے راستے پر چلنا انسان کے لیے اسی طرح ہے جس طرح محفوظ اور پختہ راستے پر چلنا' اس راستے پر چلتے ہوئے وہ خود سے جنگ نہیں کرتا' جبکہ ظلم وعدوان کے راستے پر چلتے ہوئے وہ اپنے آپ سے برسرپیکار ہوتا ہے۔ اسی بات کو قرآن مجید کی آیت: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (التین ۹۵:۴) "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین انداز میں پیدا کیا ہے" میں بیان کیا گیا ہے۔ زندگی کے اہم ترین معاملات کے حوالے سے جو راستہ فطرت کے عین مطابق ہے' قرآن نے اسی کو شریعت (پختہ راستہ جس پر چلنا آسان ہو) قرار دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر تمام انبیائے کرام علیہم السلام جنھوں نے کامیابی کی راہ پر چلنے کی خواہش رکھنے والوں کی قیادت کی' اسی پختہ راہ پر چلے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ إِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝﴾ (الشوریٰ ۴۲:۱۳)

"اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف

وحی کیا ہے اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔ یہی بات تو مشرکین پر گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ انھیں بلاتے ہیں' اللہ جسے چاہے اپنے لیے چن لیتا ہے' اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔''

رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے اس راہ کو انتہائی پختہ اور واضح کر دیا گیا۔ آپ پر نعمت تمام ہوئی اور انسانیت کو کامل ترین صورت میں دین فطرت عطا ہوا۔ ارشاد ہوا:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الجاثیة ۴۵:۱۸)

''پھر ہم نے (اے نبی!) آپ کو دین کے (واضح) راستے پر لگا دیا' لہٰذا آپ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔''

کامیابی کی اس یقینی اور پختہ راہ پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر فیصلے کے وقت اور ہر راستے کے انتخاب کے موقع پر' جس کے ذریعے سے منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا' انسان کو یہ معلوم ہو کہ کون سا کام لازمی اور ضروری ہے جس کے بغیر منزل نہیں ملے گی' یا کون سا کام مفید اور پسندیدہ ہے۔ اس کے بالمقابل کون سا کام ہے جو ہر صورت ترک کر دینا چاہیے۔ کون سا کام ہے جس کا ترک لازم تو نہیں' البتہ بہت مفید ہے اور یہ بھی کہ کون سے کام ہیں جن میں آزادی ہے' ان کے کرنے یا چھوڑنے سے فرق نہیں پڑتا۔

یہی بات اگر فقہ کی زبان میں کی جائے تو یوں ہوگی کہ کیا واجب ہے اور کیا مندوب یا مستحب ہے؟ اسی طرح کیا حرام ہے اور کیا مکروہ اور کون سے امور مباح ہیں؟ ہر کام کے بارے میں ان پانچ صورتوں کے تعین کو حکم شرعی کہا جاتا ہے' اور بنیادی طور پر ان کا تعین اللہ کے فرمان کے ذریعے سے ہو سکتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے جو اللہ ہی کے حکم کی تفہیم ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے فرامین کو حکم شرعی کی ادلہ کہا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں قرآن اور فرمان رسول کی صورت میں واضح نص موجود نہ ہو تو قیاس اور اجماع سے کام لیا جاتا ہے۔

کتاب و سنت کے بنیادی دلائل کی روشنی میں ہر چیز کے بارے میں حکم شرعی اور اس کے لوازم' یعنی اسباب' شروط' موانع' صحت اور عدم صحت (ان ہی کو احکام وضعیہ کہا جاتا ہے) کو معلوم کرنا ہی تفقہ فی الدین ہے جسے عام اصطلاح میں فقہ کہا جاتا ہے۔ فقہ کے معنی سمجھنا ہیں۔ اللہ کے احکام کو صحیح اور مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ نے سمجھا اور تمام امت کو سمجھایا۔ آپ کے سمجھانے ہی سے ہر چیز کے بارے میں احکام شرعیہ اور احکام وضعیہ کا علم ہوا' اس لیے اصل فقہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین ہی ہیں۔ آپ نے خود پوری صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ فقہ بنیادی طور پر آپ ہی کے فرامین کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً ا سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتَّى يُبَلِّغَهُ ' فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ' وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ] (سنن أبي داود' العلم' باب فضل نشر العلم' حديث:٣٦٦٠)

''اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی' پھر اسے حفظ کیا تاکہ اسے (آگے) پہنچائے۔ بہت سے فقہ کے حامل اپنے سے بڑھ کر فقیہ لوگوں تک فقہ کو (خود) پہنچاتے ہیں اور بہت سے علم وفقہ کے حامل ایسے ہوتے ہیں جو فقیہ نہیں ہوتے۔''

اللہ کے رسول ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کا تفقہ واجب الاتباع ہے' پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں۔ باقی سب نے تفقہ فی الدین کی راہ میں جو بھی جدوجہد کی وہ سب قابل قدر ہے لیکن قابل قبول وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے فرامین کے مطابق ہو۔ اس اعتبار سے فقہ کا سب سے بڑا ذخیرہ محدثین کے پاس ہے۔ راویانِ حدیث میں سے بعض راوی محض حامل فقہ ہیں' لیکن فقہائے محدثین وہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ احکام کو اکٹھا کیا' آپ کے سکھائے ہوئے طریقۂ تفقہ کی پیروی کی اور آپ ہی کی اتباع میں احکام شرعیہ اور وضعیہ کے فہم اور تفہیم کو اپنی جہد اور اجتہاد کا محور بنایا۔ وہ حدیث وسنت کے معاملے میں تنگ داماں بھی نہ تھے کہ ان کے لیے اکثر معاملات میں اپنی رائے پر انحصار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ ان کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے دین کے تمام احکام اپنے الفاظ کی بجائے براہ راست رسول اللہ ﷺ کے فرامین یا آپ کی سنت کو بیان کرنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں پیش کیے۔

کم نصوص کی بنا پر اپنی رائے سے فتویٰ دینے اور محدثین کے طریق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب کوئی شخص دین کے احکام کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے تو وہ حقیقت میں ان احکام کے بارے میں اپنے فہم کو بیان کر رہا ہوتا ہے' وہ انتہائی دیانت داری سے صحت کا اہتمام کرتے ہوئے بھی جو الفاظ استعمال کرے گا' وہ اپنے بہترین فہم کے مطابق احکام کی ترجمانی کر رہا ہوگا۔ اس کے فہم میں جو بھی قصور رہ جائے گا پڑھنے اور سننے والے کے خیال میں وہ بھی حکم ہی سے منسلک ہوگا۔ اس کے برعکس محدثین کے طریق کار میں ان کا اپنا فہم باب کے عنوان تک محدود رہتا ہے' وہ حکم کے بارے میں الفاظ براہ راست شارع علیہ السلام سے یا ان صحابہ سے لیتے ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آپ کی تربیت کے ذریعے سے اچھی طرح سمجھ کر بیان کیا۔ آج اگر ایک آدمی ان الفاظ کے تمام مدلولات تک نہیں پہنچ پایا تو کل دوسرا ان معانی کو پالے گا جو پہلوں کی نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔ انسانی معلومات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں' احوال میں تبدیلی آتی رہتی ہے' نئے سے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ شارع علیہ السلام کے الفاظ ہر زمانے کی ہر صورتِ حال میں ہر قسم کے مسئلے میں مکمل رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ کل تک جو مفہوم کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکا تھا' آج کی صورتِ

حال میں اورنئی معلومات کی روشنی میں واضح اور نمایاں ہو سکتا ہے۔

احکام کے حوالے سے سب سے پہلی تالیف جو ہم تک پہنچی وہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس کی ''الموطا'' ہے۔لغوی طور پر موطا سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چلنے والوں کے قدم کثرت سے پڑے ہوں۔لفظ شریعت کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے۔ امام مالک سے پہلے بھی موطا کے نام سے بعض حضرات نے کتابیں تالیف کیں۔جن مسائل پر اہل مدینہ کا اتفاق تھا ان پر مشتمل کتاب سب سے پہلے عبدالعزیز بن الماجشون نے موطا ہی کے نام سے مرتب کی۔یہ کتاب جب امام مالک کے سامنے لائی گئی تو فرمایا: اچھی کتاب ہے لیکن اگر میں نے مرتب کی ہوتی تو احادیث اور آثار سے شروع کرتا۔[1]

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے جب موطا تالیف فرمائی تو انھوں نے اسے فقہی ابواب کے مطابق مرتب فرمایا۔ پہلے احادیث اور آثار صحابہ، پھر ان کی تشریح و توضیح کے لیے اہل مدینہ کا اجماع، پھر تابعین وغیرہم کے فتاویٰ اور ان کی روشنی میں اپنا اجتہاد درج فرمایا۔یہ فقہی منہج اتنا عمدہ تھا کہ یہ کتاب عالم اسلام کے کونے کونے میں مقبول ہوگئی۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد خاص امام محمد رحمہ اللہ نے بھی اپنی مسند فتویٰ چھوڑ کر تین سال امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں گزارے اور حصولِ علم کے ساتھ ساتھ امام مالک سے ان کی موطا روایت کی۔آپ سے علم حاصل کرنے والوں میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دوسرے بہت سے اصحاب کے علاوہ آپ کے فرزند حماد بن ابی حنیفہ بھی تھے۔[2] خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی حضرت امام مالک سے کم از کم دو حدیثیں روایت کی ہیں۔(المناقب للسیوطي، ص:۵۹)

فقہ میں امام مالک رحمہ اللہ کے منہج، آپ کی عظیم الشان علمی قدر و منزلت اور اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ لاتعداد دیگر ائمہ وفضلاء کے علاوہ امام شافعی رحمہ اللہ، ان کے توسط سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور محدثین کرام اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بعد فقہ حنفی کے بہت بڑے ستون امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ نے بھی آپ سے فیض اٹھایا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عہد صحابہ اور تابعین کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فرمان: [اَلْفِقْهُ يَمَانٍ] (صحیح البخاري، المغازي، باب قدوم الأشعریین وأهل الیمن...... حدیث:۴۳۹۰) ''دین کی سمجھ یمنیوں کو حاصل ہے۔'' کا صحیح مصداق امام مالک ہی تھے۔[3]

---

① امام مالک، ابوزہرہ، عنوان الموطا۔

② مدارک بحوالہ امام مالک، محمد ابوزہرہ، اردو ترجمہ عبیداللہ قدسی، ص:۶۹

③ امام مالک رحمہ اللہ یمنی الاصل ہیں۔ان کے دادا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ آئے، یہاں ان کی شادی بنوتمیم میں ہوئی۔ان کے دادا نے، جن کے نام پر آپ کا نام رکھا گیا، حضرت طلحہ، عائشہ صدیقہ، ابوہریرہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت کی۔یہ ان چار لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے حضرت عثمان کی تکفین اور تدفین کی۔(امام مالک، ابوزہرہ، ص:۳۶) ان کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ان کے چچا نافع بن مالک، ابن شہاب الزہری کے استاد تھے۔ (امام مالک، ابوزہرہ، ص:۲۵۷)

عراق کے اہل الرائے کو چھوڑ کر امت کے تمام فقہائے محدثین اور ائمۂ مجتہدین نے تفقہ فی الدین کی اسی روایت کو آگے بڑھایا جو امام مالک رحمہ اللہ نے اپنائی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم سمیت فقہائے محدثین نے اس روایت کو نبھاتے ہوئے مزید احتیاط کا راستہ اختیار کیا اور جس طرح پہلے بیان ہوا' دین کے ہر مسئلے کو براہ راست رسول اللہ ﷺ کے فرامین' سنن اور آثار خلفائے راشدین وصحابہ کے ذریعے سے واضح کیا اور تفہیم کے لیے احادیث کی تبویب اور ترتیب وغیرہ ایسے عمومی اور مؤثر انداز میں کی کہ ان کی کتب سے عبادات اور معاملات سے متعلق ہر مسئلہ علماء وفضلاء سے لے کر سمجھنے کے خواہش مند ایک عام انسان تک کے سامنے خود رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میں واضح ہو جائے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ سے بڑھ کر دین کی وضاحت کرنے اور سمجھانے پر کوئی دوسرا انسان قادر نہیں ہوسکتا۔

فقہائے محدثین کے سلسلے کا ایک بہت بڑا اور معتبر نام نویں صدی ہجری کے امیر المومنین فی الحدیث' شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن محمد المعروف بہ ابن حجر رحمہ اللہ کا ہے' جنھیں معاصرین نے حافظ المشرق والمغرب کا لقب بھی دیا۔ وہ بہت بڑے مفسر' محدث' فقیہ' مؤرخ اور ماہر لغت تھے۔ [1]

علم حدیث میں ان کی عظیم الشان تصنیفات: ۞ فتح الباري. ۞ هدي الساري. ۞ النكت على ابن الصلاح. ۞ تغليق التعليق. ۞ التلخيص الحبير. ۞ الدراية في تخريج أحاديث الهداية. ۞ نخبة الفكر اور نزهة النظر ہیں۔ ○ تاریخ رجال میں: ۞ الإصابة. ۞ تهذيب التهذيب. ۞ تقريب تهذيب التهذيب. ۞ لسان الميزان. ۞ ذيل الميزان. ۞ الدرر الكامنة في أعيان المأة الثامنة. ۞ ذيل الدرر الكامنة اور المجمع المؤسس بالمعجم المفهرس جیسی کتب ہیں۔

شرعی احکام کے حدیثی دلائل پر مبنی فقہ میں ان کی مایۂ ناز کتاب ''بلوغ المرام من أدلة الأحكام'' ہے [2] جو صدیوں سے دنیا بھر کے اسلامی حلقوں میں معروف اور بے شمار تعلیمی اداروں میں داخل نصاب چلی آ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے یہ کتاب انھوں نے حافظ ابن دقیق العید کی تالیف ''الإلمام'' سے متاثر ہو کر تالیف کی۔ اس میں الالمام کی تلخیص بھی ہے اور بڑی مقدار میں عظیم الفوائد اضافے بھی۔ [3] یہ فقہ کے تمام اہم ابواب کا احاطہ کرتی ہے۔ مختصر لیکن انتہائی جامع ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس میں فقہائے محدثین کے اسلوب کا تتبع انتہائی مہارت اور خوبصورتی سے کیا ہے۔ انھوں نے ہر مسئلے کو احادیث نبویہ کے ذریعے سے واضح کیا ہے۔ کتاب کے موضوع' مقاصد اور اسلوب کے حوالے سے مقدمے

---

① علم تفسیر میں ان کی 5 معلوم تصنیفات ہیں جبکہ حدیث میں 93، فقہ میں 18، تاریخ میں 28 اور لسانیات میں 5 کتابیں ہیں۔ ان تمام حقائق کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (تغليق التعليق على صحيح البخاري' مقدمة دراسة و تحقيق لسعيد عبدالرحمٰن موسى القزقي) ② ایضاً' ص:199۔ ③ ایضاً۔

کا یہ فقرہ ''یہ ایک مختصر (کتاب) ہے جو شرعی احکام کے ان بنیادی دلائل پر مشتمل ہے جو حدیث نبوی سے (لیے گئے) ہیں'' کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ دلیل ہی اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ کسی کام کے بارے میں اللہ کا حکم کیا ہے اور دلیل ہی اس حکم پر عمل کا طریقہ واضح کرتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی اس مختصر مگر جامع کتاب میں احکام شریعت کو سمجھنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ احادیث کے ذریعے سے مہیا کر دی ہیں۔ انھوں نے احکام شریعت کی وضاحت کے لیے صحیح ترین احادیث کا انتخاب کیا۔ ہر حدیث کی تخریج کی اور تمام اہم کتب کا جن میں وہ حدیث موجود ہے حوالہ دیا' انھوں نے کتب ستہ کے علاوہ دوسری کتب کا بھی حوالہ دیا۔ صحت کے اعتبار سے ان کا مرتبہ واضح کیا' اگر کسی محدث یا فقیہ نے کسی وجہ سے کسی حدیث پر اعتراض کیا ہے تو اس کی حقیقت بیان کی۔ مسئلے کے ہر پہلو کو واضح کرنے کے لیے بالعموم صحیح ترین احادیث کا انتخاب کیا' جن احادیث پر محدثین نے کلام کیا ہے ان کو چھوڑ دیا۔ طویل احادیث کا اس طرح اختصار کیا کہ مفہوم میں کوئی خلل نہ پڑے اور اس مسئلے کے حوالے سے الفاظ حدیث کی دلالت کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

وہ بخاری کے شارح اور امام بخاری رحمہ اللہ کے نکتوں کے سب سے بڑے راز دان ہیں۔ ان کا تتبع کرتے ہوئے وہ ضرورت کے مطابق ایک حدیث کو ایک سے زیادہ ابواب میں لائے ہیں کیونکہ وہ ان سب مسائل کو واضح کرتی ہے جو ان ابواب کا موضوع ہیں۔

جرح و تعدیل کے لیے وہ کم از کم الفاظ استعمال کرتے ہوئے حکم کی مکمل وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ان کی بلاغت کا کمال ہے کہ انھوں نے بلوغ المرام کی ایک ہزار پانچ سو چھیانوے احادیث میں ''کتب سنت'' کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔(مقدمة دراسة و تحقيق تغليق التعليق' ص: ۲۰۰)

اکثر احادیث میں متن حدیث کے بعد مختلف اسناد سے روایت ہونے والے اضافوں اور احادیث کے ایسے ٹکڑوں کے اضافے کیے ہیں جن سے احکام وضعی بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں حکم مطلق ہے' کہاں مفصل ہے اور کہاں اجمال ہے۔ اگر کہیں تعارض نظر آتا ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔ دلائل کے اختلاف کی صورت میں تطبیق کیسے ممکن ہے۔ کہیں اغلاق ہے تو اس کی توضیح کیا ہے اور کہیں دلائل میں اختلاف ہے تو کس بات کو کس پر محمول کرنے سے یہ اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ سب کام اس خوبصورت اور عام فہم طریقے سے کیا ہے کہ علماء حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ جس طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خود فرمایا: ''یہ کتاب مبتدی کے لیے معاون ہے لیکن منتہی بھی اس سے مستغنی نہیں رہ سکتا۔'' علماء کہتے ہیں کہ ایک عام مسلمان اگر چاہے کہ وہ احکام شریعت پر عمل کرنے کے لیے کوئی ایسی کتاب منتخب کرے جو مختصر ہو'

آسان ہو' فقہی ابواب کے مطابق مرتب ہو' تمام مسائل کے بارے میں مکمل رہنمائی پیش کرے اور اس پر کسی تردد یا ذہنی تحفظ کے بغیر بلا کھٹکے عمل کیا جا سکتا ہو تو اس کے لیے بلوغ المرام سب سے عمدہ انتخاب ہو گا۔[1]

اس کتاب میں تمام ضروری فقہی مسائل کے لیے انتہائی بلیغ انداز میں جو دلائل مہیا کیے گئے ہیں' بڑے سے بڑا عالم بھی ان کی ضرورت سے مستغنی نہیں۔ احکام شرعی ہوں یا وضعی اس کتاب میں جو نکات سمیٹ دیے گئے ہیں ان کے بغیر بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ کے لیے بھی مسائل کا حقیقی فہم آسان نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کو اس شرف سے نوازا ہے کہ پہلے عربی میں اور بعد ازاں اردو میں بلوغ المرام کو ایک عمدہ شرح کے ساتھ انتہائی خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ حالیہ ایڈیشن مولانا زبیر علی زئی کی تحقیق اور تفصیلی تخریج سے مزین ہے۔ حافظ محمد آصف اقبال اور قاری ذکاء اللہ سلیم ﷾ نے نظر ثانی، تصحیح و تنقیح اور اضافات کی ذمہ داری کما حقہ نبھائی ہے' فوائد و مسائل میں مذکور کمزور روایتوں کو حذف کیا ہے اور صحیح روایات کی روشنی میں فوائد و مسائل میں عمدہ اضافے کیے ہیں جن سے فوائد و مسائل کی افادیت دوچند ہو گئی ہے' نیز متن کی لغوی تشریح کو مزید سہل بنا دیا گیا ہے اور زبان و بیان کی سلاست اور عمدگی کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مزید تصحیح و تنقیح اور پروف ریڈنگ کرتے ہوئے آخری نظر مولانا ابوعبداللہ محمد عبدالجبار' مولانا ابونعمان بشیر احمد' حافظ محمود' مولانا عثمان منیب' مختار احمد ضیاء اور مولانا غلام مرتضیٰ ﷾ نے ڈالی ہے۔ اللہ تعالیٰ ادارہ دارالسلام اور کتاب کی تیاری اور اشاعت کے مختلف مرحلوں میں شریک ہونے والے تمام افراد کی کوشش کو قبولیت سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین.

والحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين
محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.

پروفیسر محمد یحییٰ
(سینئر ریسرچ سکالر' دارالسلام' لاہور)

---

[1] مقدمة التبيان في تخريج و تبويب أحاديث بلوغ المرام.

پیش لفظ

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب بُلُوغُ الْمَرَامِ مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ اپنے موضوع میں متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ مؤلف نے اس میں احکام سے متعلق ایسی احادیث جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں، جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ انھوں نے طویل احادیث کا شاندار انداز میں اختصار کیا ہے اور حدیث کو ائمۂ حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے، نیز صحت وحسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے اور بہت سی علل کی طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔ واضح رہے کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد الفاظ اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں، جو مطلق کو مقید، مجمل کو مفصل، مغلق اور مبہم کو واضح، تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث وتحقیق سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنا دیا ہے، چنانچہ یہ مشرق ومغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کی زینت بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کر لیا، نیز اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح وتوضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

اس قدر اہتمام واعتنا کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی جس میں قدیم وجدید انداز کی معروف ومشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقے سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہو، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا وآخرت میں میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا، اس عمل عظیم کو شروع کیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

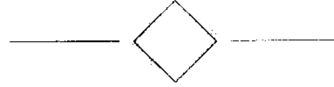
یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہوگی جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہوگی، تاہم یہ اس وقت ہوگا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدے کے اثبات کا ارادہ کروں جو عام کتابوں میں

ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اور درست بات اکثر یا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے پوشیدہ اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسا کیا ہو' حالانکہ وہ طبیعی' تاریخی' جغرافیائی اور دیگر تجزیوں کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں' چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت کرنے پر مجبور ہوا تا کہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔ وہی مجھے کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ.

صفی الرحمٰن مبارکپوری

شعبان ۱۳۹۴ھ



مؤلف کتاب کے مختصر حالات

اس کتاب کے مؤلف ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی ہیں جو ابن حجر عسقلانی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے' قاضی القضاۃ اور حفاظ ورواۃ میں منفرد شخصیت ہیں۔ ۱۰ شعبان ۷۷۳ ہجری کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی' نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحاوی' مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب حفظ کر لیں' بعد ازاں اپنے ایک وصی کے ہمراہ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا' پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز' شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے' چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی' ابن ملقن اور دیگر اہل علم سے فقہ حاصل کی۔ آپ کو اتنی کثیر تعداد میں جلیل القدر ائمہ وشیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا جو کسی دوسرے کو میسر نہ ہو سکا۔ متقدم الذکر ائمہ وشیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عنایت کیا۔ آپ نے دونوں اصول' یعنی کتاب وسنت اور دیگر علوم ''عز بن جماعہ'' سے' لغت ''مجد فیروز آبادی'' سے' عربی زبان ''عماری'' سے' ادب وعروض ''بدر مشتکی'' سے اور کتابت ایک جماعت سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر محنت اور سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے' نیز آپ نے قراءت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ ''تنوخی'' سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشر واشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ' قراءت' تدریس وتصنیف اور افتا کی صورت میں اس پر جمے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر' حدیث اور فقہ کی تدریس کی' وعظ ونصیحت میں مشغول رہے اور ازہر' جامع مسجد عمرو'' اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے' نیز اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املا کروانے کا سلسلہ جاری کیا' چنانچہ بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے متجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں۔ اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ بادشاہ

اور اُمراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے۔ اگر ''فتح الباری'' شرح صحیح بخاری کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی فتح الباری آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب' سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ ہجری میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ ہجری میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۴۲ ہجری میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا جس میں تمام عام وخاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی خدمت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

پہلے پہل آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے' پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شامی علاقے بھی آپ کی قضا میں شامل کر دیے گئے جو اکیس سال سے زائد عرصے تک آپ کے زیر قضا رہے' شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے حتی کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا' پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے' بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انھیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا' یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے' آپ کی یہ تقرری بروز ہفتہ ۱۲ محرم ۸۲۷ ہجری میں ہوئی' پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات دفعہ ہی اس سے الگ ہوئے' پھر جمادی الثانیہ ۸۵۲ ہجری کو آخری مرتبہ اس عہدے سے دستبردار ہوئے اور اسی سال آپ اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔

اس کے علاوہ آپ تواضع' بردباری' صبر وتحمل' خوش طبعی' وسعت ظرافت' قیام وصیام' احتیاط وورع' جود وسخا' حوصلہ وبرداشت' دقیق ولطیف کلام اور عمدہ ونفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور ومعروف تھے جس طرح کہ آپ ائمۂ متقدمین ومتاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب واحترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ ہفتے کی رات ۸ ذی الحجہ ۸۵۲ ہجری کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انھیں انتہائی عمدہ ثواب اور بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تلخیص از: التبر المسبوك وغیرہ

حدیث کی اقسام

قَوْلِي حديث - فِعْلِي حديث - تَقْرِيرِي حديث - شَمائِل نَبوِي

حدیث کی اقسام نسبت کے اعتبار سے

حديث قُدْسِي - مَرْفُوع - مَوْقُوف - مقطُوع

حدیث کی اقسام راویوں کی تعداد کے اعتبار سے

مُتَواتِر - خَبَرِ وَاحِد

مَشْهُور - مُسْتَفِيض - عَزِيز - غَرِيب

غريب مُطلق - غريب نسبي

مقبول حدیث کی اقسام

صَحِيح لِذَاتِه - صَحِيح لِغَيْرِه - حَسَن لِذَاتِه - حسن لِغَيْرِه

مقبول حدیث کے مراتب

مُتفق عليه - أفرادبخاری - أفرادمسلم - صحيح على شرطهما - صحيح على شرط البخاري - صحيح على شرط مُسْلم - صحيح على شرط غيرهما

❶ مردود حدیث کی اقسام انقطاع سند کے اعتبار سے

مُعَلَّق - مُرْسَل - مُعْضَل - مُنْقَطِع - مُدَلَّس - مُرْسَل خَفِي - مَعْلُول يا مُعَلَّل

❷ مردود حدیث کی اقسام راوی کے عادل نہ ہونے کی وجہ سے

مَتْرُوك - مَوْضُوع - رِوايَةُ الْفاسِق - رِوايَةُ الْمُبْتَدِع

❸ مردود حدیث کی اقسام راوی کے ضابط نہ ہونے کی وجہ سے

مُصَحَّف - مَقْلُوب - مُدْرَج - اَلْمَزِيد فِي مُتَّصِلِ الأَسَانِيد - شاذ - مُنْكَر - رِوَايَةُ سَيِّئِ الْحفظ - رِوايَةُ كَثِيرِالْغَفْلَة - رِوايَة فَاحِش الْغَلَط - رِوايَة الْمُخْتَلِط - مُضْطَرِب - مُعَلَّل

❹ مردود حدیث کی اقسام راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے

مُبْهَم - رِوَايَةُ مَجْهُولِ الْعَيْن - رِوايةُ مجهُولِ الْحَال

اصطلاحاتِ محدثین

○ **حدیث کی تعریف:** رسول اللہ ﷺ سے متعلق راویوں کے ذریعے سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، وہ ''حدیث'' کہلاتا ہے۔ حدیث کو بعض دفعہ سنت، خبر اور اثر بھی کہا جاتا ہے۔

○ **بنیادی اقسام:**

● قَوْلِي حَدِیث : وہ حدیث جس میں آپ کا فرمان مذکور ہو۔

● فِعْلِي حَدِیث : وہ حدیث جس میں آپ کا فعل مذکور ہو۔

● تَقْرِيري حَدِیث : وہ حدیث جس میں آپ کا کسی بات پر خاموش رہنا مذکور ہو۔

● شَمَائِل نَبوِی : وہ احادیث جن میں آپ کے عادات و اخلاق یا بدنی اوصاف مذکور ہوں۔

نوٹ : کسی حدیث کی اصل عبارت ''مَتْن'' کہلاتی ہے۔ متن سے پہلے راویوں کے سلسلے کو ''سند'' کہتے ہیں۔ سند کا کوئی راوی حذف نہ ہو تو وہ ''مُتَّصِل'' ورنہ ''مُنقَطِع ہوتی ہے۔''

○ **نسبت کے اعتبار سے حدیث کی اقسام:**

● حَدِیث قُدْسِي: اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان جسے نبیٔ اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہو، راویوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہو اور قرآن مجید میں موجود نہ ہو۔

● مَرْفُوع : وہ حدیث جس میں کسی قول، فعل یا تقریر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

● مَوْقُوف: وہ حدیث جس میں کسی قول، فعل یا تقریر کو صحابی کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

● مَقْطُوع: وہ حدیث جس میں کسی قول یا فعل کو تابعی یا تبع تابعی کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

○ **راویوں کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی اقسام:**

● مُتَوَاتِر: وہ حدیث جس میں تَوَاتُر کی چار شرطیں پائی جائیں:

(ا) اسے راویوں کی بڑی تعداد روایت کرے۔

(ب) انسانی عقل و عادت ان کے جھوٹا ہونے کو محال سمجھے۔

(ج) یہ کثرت عہد نبوت سے لے کر صاحب کتاب محدث کے زمانے تک سند کے ہر طبقے میں پائی جائے۔

(د) حدیث کا تعلق انسانی مشاہدے یا سماعت سے ہو۔

نوٹ: راویوں کی جماعت جس نے ایک استاد یا زیادہ اساتذہ سے حدیث کا سماع کیا ہو ''طبقہ'' کہلاتی ہے۔

- خَبَرِ واحد: وہ حدیث جس میں متواتر حدیث کی شرطیں جمع نہ ہوں۔ اس کی چار قسمیں ہیں:
- مَشْهُور: وہ حدیث جس کے راویوں کی تعداد ہر طبقے میں دو سے زیادہ ہو مگر یکساں نہ ہو' مثلاً: کسی طبقے میں تین' کسی میں چار اور کسی میں پانچ راوی اسے بیان کرتے ہوں۔
- مُسْتَفِيض: وہ حدیث جس کے راوی ہر طبقے میں دو سے زیادہ اور یکساں تعداد میں ہوں یا سند کے اول و آخر میں ان کی تعداد یکساں ہو۔
- عَزِيز: وہ حدیث جس کے راوی کسی طبقے میں صرف دو ہوں۔
- غَرِيب: وہ حدیث جسے بیان کرنے والا کسی زمانے میں صرف ایک راوی ہو۔ اگر وہ صحابی یا تابعی ہے تو اسے غَرِيبِ مُطْلَق کہیں گے اور اگر کوئی اور راوی ہے تو اسے غَرِيبِ نِسْبِي کہیں گے۔

نوٹ: مذکورہ بالا اقسام میں سے متواتر حدیث علم الیقین کی حد تک سچی ہوتی ہے۔ باقی اقسام مقبول یا مردود ہو سکتی ہیں۔

○ قُبول و رَدّ کے اعتبار سے حدیث کی اقسام:

- مَقْبُول: وہ حدیث جو واجب العمل ہو۔
- مَرْدُود: وہ حدیث جو مقبول نہ ہو۔

○ مقبول حدیث کی اقسام و درجات (شرائطِ قبولیت کے اعتبار سے):

① صَحِيح لِذَاتِهٖ ② صَحِيح لِغَيْرِهٖ ③ حَسَن لِذَاتِهٖ ④ حَسَن لِغَيْرِهٖ

- صَحِيح لِذَاتِهٖ: وہ حدیث جس میں صحت کی پانچ شرطیں پائی جائیں:

(ا) اس کی سند متصل ہو' یعنی ہر راوی نے اسے اپنے استاد سے اخذ کیا ہو۔

(ب) اس کا ہر راوی عادل ہو' یعنی کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو' صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو' شائستہ طبیعت کا مالک اور بااخلاق ہو۔

(ج) وہ كَامِلُ الضَّبط ہو' یعنی حدیث کو تحریر یا حافظے کے ذریعے سے کما حقہ محفوظ کرے اور آگے پہنچائے۔

(د) وہ حدیث شاذ نہ ہو

(ھ) معلول نہ ہو۔ (شاذ اور معلول کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔)

- حَسَن لِذَاتِہٖ: وہ حدیث جس کے بعض راوی صحیح حدیث کے راویوں کی نسبت خَفِیفُ الضَّبُط (ہلکے ضبط والے) ہوں' باقی شرطیں وہی ہوں۔

نوٹ: حَسَن لِذَاتِہٖ کا درجہ صَحِیح لِغَیرِہٖ کے بعد ہے مگر تعریفات کو آسان تر کرنے کیلئے ترتیب بدلی گئی ہے۔

- صَحِیح لِغَیرِہٖ: جب حسن حدیث کی ایک سے زائد سندیں ہوں تو وہ حسن کے درجے سے ترقی کر کے صحیح کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسے صحیح لغیرہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے غیر (دوسری سندوں) کی وجہ سے درجۂ صحت کو پہنچی۔
- حَسَن لِغَیرِہٖ: وہ حدیث جس کی متعدد سندیں ہوں' ہر سند میں معمولی ضعف ہو مگر متعدد سندوں سے اس ضعف کی تلافی ہو جائے تو وہ حسن لغیرہ کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔

○ صحیح حدیث کی اقسام و درجات (کتب حدیث میں پائے جانے کے اعتبار سے:)

- مُتَّفَقٌ عَلَیہ: وہ حدیث جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں پائی جائے متفق علیہ کہلاتی ہے اور صحت کے سب سے اعلیٰ درجے پر ہوتی ہے۔
- أَفْرَادِ بُخَارِي: ہر وہ حدیث جو صحیح بخاری میں پائی جائے' صحیح مسلم میں نہ پائی جائے۔
- أَفْرَادِ مُسْلِم: ہر وہ حدیث جو صحیح مسلم میں پائی جائے' صحیح بخاری میں نہ پائی جائے۔
- صَحِیحٌ عَلٰی شَرْطِهِمَا: وہ حدیث جو صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں میں نہ پائی جائے لیکن دونوں ائمہ کی شرائط کے مطابق صحیح ہو۔
- صَحِیحٌ عَلٰی شَرْطِ الْبُخَارِي: وہ حدیث جو امام بخاری کی شرائط کے مطابق صحیح ہو مگر صحیح بخاری میں موجود نہ ہو۔
- صَحِیحٌ عَلٰی شَرْطِ مُسْلِم: وہ حدیث جو امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہو مگر صحیح مسلم میں موجود نہ ہو۔
- صَحِیحٌ عَلٰی شَرْطِ غَیرِهِمَا: وہ حدیث جو امام بخاری و امام مسلم کے علاوہ دیگر محدثین کی شرائط کے مطابق صحیح ہو۔

○ مردود حدیث کی اقسام انقطاع سند کی وجہ سے:

- مُعَلَّق: وہ حدیث جس کی سند کا ابتدائی حصہ یا ساری سند ہی (عمداً) حذف کر دی گئی ہو۔
- مُرْسَل: وہ حدیث جسے تابعی بلا واسطہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرے۔
- مُعْضَل: وہ حدیث جس کی سند کے درمیان سے دو یا دو سے زیادہ راوی اکٹھے حذف ہوں۔
- مُنْقَطِع: وہ حدیث جس کی سند کے درمیان سے ایک یا ایک سے زائد راوی مختلف مقامات سے حذف ہوں۔

- مُدَلَّس: وہ حدیث جس کا راوی کسی وجہ سے اپنے استاد یا استاد کے استاد کا نام (یا تعارف) چھپائے لیکن سننے والوں کو یہ تأثر دے کہ میں نے ایسا نہیں کیا' سند متصل ہی ہے' حالانکہ اس سند میں راویوں کی ملاقات اور سماع تو ثابت ہوتا ہے مگر متعلقہ روایت کا سماع نہیں ہوتا۔
- مُرسَل خَفِي: وہ حدیث جس کا راوی اپنے ایسے ہم عصر سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو۔
- مَعلُول یا مُعَلَّل: وہ حدیث جو بظاہر مقبول معلوم ہوتی ہو لیکن اس میں ایسی پوشیدہ علت یا عیب پایا جائے جو اسے غیر مقبول بنا دے۔ ان عیوب وعلل کا پتہ چلانا ماہرینِ فن ہی کا کام ہے ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

۞ مردود حدیث کی اقسام راوی کے عادل نہ ہونے کی وجہ سے:

- رِوَايَةُ الْمُبْتَدِع: وہ حدیث جس کا راوی بِدْعَتِ مُكَفِّرَه کا قائل و فاعل ہو۔ لیکن اگر راوی کی بدعت' مکفرہ نہ ہو اور وہ عادل و ضابط بھی ہو تو پھر اس کی روایت معتبر ہوگی۔ یاد رہے بدعت مکفرہ (کافر بنانے والی بدعت) سے ارتداد لازم آتا ہے۔
- رِوَايَةُ الْفَاسِق: وہ حدیث جس کا راوی کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو لیکن حد کفر کو نہ پہنچے۔
- مَتْرُوك: وہ حدیث جس کا راوی عام بول چال میں جھوٹ بولتا ہو اور محدثین نے اس کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔
- مَوْضُوع: وہ حدیث جس کے راوی نے کسی موقع پر حدیث کے معاملے میں جھوٹ بولا ہو' ایسے راوی کی ہر روایت کو موضوع (من گھڑت) کہتے ہیں۔

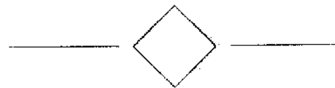
۞ مردود حدیث کی اقسام راوی کے ضابط نہ ہونے کی وجہ سے:

- مُصَحَّف: وہ حدیث جس کے کسی لفظ کی ظاہری شکل تو درست ہو مگر نقطوں' حرکات یا سکون وغیرہ کے بدلنے سے اس کا تلفظ بدل گیا ہو۔
- مَقْلُوب: وہ حدیث جس کے الفاظ میں راوی کی بھول سے تقدیم و تاخیر واقع ہوگئی ہو یا سند میں ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی رکھا گیا ہو۔
- مُدْرَج: وہ حدیث جس میں کسی جگہ راوی کا اپنا کلام عمداً یا سہواً درج ہو جائے اور اس پر الفاظِ حدیث ہونے کا شبہ ہوتا ہو۔
- اَلْمَزِيد فِي مُتَّصِلِ الْأَسَانِيد: جب دو راوی ایک ہی سند بیان کریں' ان میں ایک ثقہ اور دوسرا زیادہ ثقہ ہو۔ اگر ثقہ راوی اس سند میں ایک راوی کا اضافہ بیان کرے تو اس کی روایت کو "مزید فی متصل الاسانید" کہتے ہیں۔

- شَاذ: وہ حدیث جس کا راوی ثقہ ہو اور بیان حدیث میں اپنے سے زیادہ ثقہ یا اپنے جیسے بہت سے ثقہ راویوں کی مخالفت کرے۔ (شاذ کے بالمقابل حدیث کو محفوظ کہتے ہیں۔)
- مُنکَر: وہ حدیث جس کا راوی ضعیف ہو اور بیان حدیث میں ایک یا زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرے۔ (منکر کے بالمقابل حدیث کو معروف کہتے ہیں۔)
- رِوَایَةُ سَيِّئِ الْحِفْظ: وہ حدیث جس کا راوی سیئ الحفظ، یعنی پیدائشی طور پر کمزور حافظے والا ہو۔
- رِوَایَةُ کَثِیرِ الْغَفْلَه: وہ حدیث جس کا راوی شدید غفلت یا کثیر غلطیوں کا مرتکب ہو۔
- رِوَایَةُ فَاحِشِ الْغَلَط: وہ حدیث جس کے راوی سے فاش قسم کی غلطیاں سرزد ہوں۔
- رِوَایَةُ الْمُخْتَلِط: وہ حدیث جس کا راوی بڑھاپے یا کسی حادثے کی وجہ سے یادداشت کھو بیٹھے یا اس کی تحریر کردہ احادیث ضائع ہو جائیں۔
- مُضْطَرِب: وہ حدیث جس کی سند یا متن میں راویوں کا ایسا اختلاف واقع ہو جو حل نہ ہو سکے۔

مردود حدیث کی اقسام راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے:

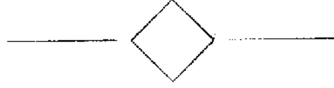
- رِوَایَةُ مَجْهُولِ الْعَیْن: وہ حدیث جس کا راوی مجہول العین ہو یعنی اس کے متعلق ائمۂ فن کا کوئی ایسا تبصرہ نہ ملتا ہو جس سے اس کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا پتہ چل سکے اور اس سے روایت کرنے والا بھی صرف ایک ہی شاگرد ہو جس کے باعث اس کی شخصیت مجہول ٹھہرتی ہو۔
- رِوَایَةُ مَجْهُولِ الْحَال: وہ حدیث جس کا راوی مجہول الحال ہو یعنی اس کے متعلق ائمۂ فن کا کوئی تبصرہ نہ ملتا ہو اور اس سے روایت کرنے والے کل دو آدمی ہوں جس کے باعث اس کی شخصیت معلوم اور حالت مجہول ٹھہرتی ہو۔ ایسے راوی کو مستور بھی کہتے ہیں۔
- مُبْهَم: وہ حدیث جس کی سند میں کسی راوی کے نام کی صراحت نہ ہو۔



کتب احادیث کی اقسام

- کُتُبِ صِحَاح: ہر وہ کتاب جس کے مؤلف نے اپنی کتاب میں صحیح روایات لانے کا التزام کیا ہو اور ''صحیح'' کے لفظ کو کتاب کے نام کا حصہ بنایا ہو۔ ایسی کتاب کی روایات کم از کم اس کے مؤلف کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ خود ہی کسی حدیث کی علت بیان کر دے تو اس سے اس کتاب کے صحیح ہونے پر حرف نہیں آتا۔
- صِحَاح سِتَّہ: حدیث کی چھ کتب: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداود، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔ انھیں "أُصولِ سِتَّہ" یا "کُتُبِ سِتَّہ" بھی کہا جاتا ہے۔ پہلی دو کتابیں ''صحیحین'' کہلاتی ہیں اور یہ صرف اپنے مؤلفین کے نزدیک ہی صحیح نہیں ہیں بلکہ پوری امت کے نزدیک صحت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ ان پر اعتراض برائے اعتراض کرنے والا شخص، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بقول، اجماعِ امت کا مخالف اور بدعتی ہے، جبکہ آخری چار کتابوں کو سنن اربعہ کہتے ہیں۔ گو ان میں ضعیف احادیث موجود ہیں، تاہم صحیح حدیثوں کی کثرت کی وجہ سے اکثر علماء انھیں ''صحاح ستہ'' میں شمار کرتے ہیں۔
- جَامِع: جس کتاب میں اسلام سے متعلق تمام موضوعات، مثلاً: عقائد، احکام، تفسیر، جنت، دوزخ وغیرہ سے تعلق رکھنے والی احادیث روایت کی گئی ہوں، مثلاً: صحیح بخاری اور جامع ترمذی وغیرہ۔
- سُنَن: جس کتاب میں صرف عملی احکام سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہوں، مثلاً: سنن ابی داود۔
- مُسْنَد: جس کتاب میں ایک صحابی یا متعدد صحابہ کی روایات کو الگ الگ جمع کیا گیا ہو، مثلاً: مسند احمد، مسند حمیدی۔
- مُسْتَخْرَج: جس کتاب میں مصنف کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اپنی سندوں سے روایت کرے، مثلاً: مستخرج إسماعيلي على صحيح البخاري.
- مُسْتَدْرَك: جس کتاب میں مصنف ایسی روایات جمع کرے جو کسی دوسرے مصنف کی شرائط کے مطابق ہوں لیکن اس کی کتاب میں نہ ہوں، مثلاً: مستدرک حاکم۔
- مُعْجَم: جس کتاب میں مصنف ایک خاص ترتیب کے ساتھ اپنے ہر استاد کی روایات کو الگ الگ جمع کرے، مثلاً: معجم طبرانی۔

- أَرْبَعِین: جس کتاب میں کسی ایک یا مختلف موضوعات پر چالیس احادیث جمع کی گئی ہوں' مثلاً: اربعین نووی' اربعین ثنائی وغیرہ۔
- جُزْء: وہ کتاب جس میں صرف ایک راوی یا ایک موضوع کی روایات جمع کی گئی ہوں' جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کی "جُزْءُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ" اور "جُزْءُ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ" یا امام بیہقی رحمہ اللہ کی "كِتَابُ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ" وغیرہ۔



کتب احادیث کے مختلف طبقات یا درجات

① پہلا طبقہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک پر مشتمل ہے۔ موطا امام مالک زمانۂ تالیف کے لحاظ سے صحیحین سے متقدم لیکن مرتبہ و مقام کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے۔ امام مالک ؒ اور ان کے ہم خیال علماء کی رائے کے مطابق اس کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ دوسرے محدثین کے نزدیک اس کی منقطع یا مرسل روایات (مختلف کتابوں میں) دیگر سندوں سے اگرچہ متصل ہیں (لیکن صرف اتصالِ سند بسا اوقات صحت حدیث کے لیے کافی نہیں ہوتا۔)

② دوسرا طبقہ سنن اربعہ پر مشتمل ہے۔ بعض کے نزدیک مسند احمد اور سنن دارمی بھی غالباً اسی طبقے میں شامل ہیں۔ ان کے مؤلفین علم حدیث میں متبحر تھے، ثقاہت و عدالت اور ضبط حدیث میں معروف تھے۔ انھوں نے جن مقاصد اور شرائط کو مدنظر رکھا، ان کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ان کی کتابوں کو ہر دور کے محدثین اور دیگر اہل علم میں بے پناہ پذیرائی ملی۔

③ وہ مسانید، جوامع اور مصنفات جو صحاح ستہ سے پہلے یا ان کے زمانے میں یا ان کے بعد لکھی گئیں۔ ان کے مؤلفین کی غرض محض احادیث کو جمع کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہر قسم کی احادیث پائی جاتی ہیں۔ محدثین میں گو یہ کتابیں اجنبی نہیں، تاہم زیادہ معروف و مقبول بھی نہیں، چنانچہ جو احادیث پہلے دو طبقوں کی کتابوں میں موجود نہیں بلکہ صرف اسی طبقے کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، فقہاء نے ان کا زیادہ استعمال نہیں کیا اور محدثین نے بھی ان کی صحت و سقم، قبول ورد اور تشریح و توضیح کا زیادہ اہتمام نہیں کیا، مثلاً: مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی اور طبرانی وغیرہ۔

④ وہ کتابیں جن کے مؤلفین نے زمانۂ دراز کے بعد ان احادیث کو جمع کیا جو پہلے دو طبقوں کی کتابوں میں نہیں تھیں بلکہ ایسے مجموعوں میں پائی جاتی تھیں جن کی (علمی دنیا میں) کوئی وقعت نہ تھی۔ یہ احادیث عموماً واعظین کے استدلالات، حکماء کے اقوال زرّیں اور اسرائیلی روایات پر مشتمل ہیں جنھیں ضعیف راویوں نے سہواً یا عمداً احادیث نبویہ سے خلط ملط کر دیا یا کتاب و سنت کے بعض احتمالات ہیں جنھیں بعض جاہل صوفیاء نے بالمعنی روایت کر دیا اور انھیں مرفوع احادیث سمجھ لیا گیا یا چند احادیث سے جملے منتخب کر کے ایک نئی حدیث بنا دی گئی وغیرہ، مثلاً: ابن حبان کی "کِتَابُ الضُّعَفَاءِ"،

ابن عدی کی اَلْکَامِل اور خَطِیب بَغْدَادِي' أَبُو نُعَیم أَصْبَهَانِي' اِبْنِ عَسَاکِر' جَوْزَقَانِي' اِبْنِ نَجَّار اور دَیْلَمِي کی کتب۔ اسی طرح مُسْنَد خَوَارَزْمِي' اِبْنِ جَوزِي اور ملا علی قاری کی "اَلْمَوضُوعَات" وغیرہ بھی اسی طبقے میں شامل ہیں۔

⑤ اس طبقے کی کتابوں میں وہ احادیث شامل ہیں جو فقہاء' صوفیاء' مؤرخین اور مختلف فنون کے ماہرین کی زبانوں پر مشہور تھیں' نیز وہ احادیث بھی شامل ہیں جو بے دین زبان دانوں نے کلام بلیغ سے وضع کیں اور ان کے لیے سندیں بھی گھڑ لیں۔ ایسی باتوں کو لغوی طور پر "احادیث یا حدیث" کا نام دیا گیا ہے۔

- پہلے اور دوسرے طبقے کی کتابوں پر محدثین کا کامل اعتماد ہے۔ انھیں ہمیشہ ان کتابوں سے وابستگی رہی ہے۔
- تیسرے طبقے کی احادیث سے استدلال کرنا ان ماہرین حدیث کا کام ہے جو راویوں کے حالات اور حدیث کی مخفی علتوں کے جاننے والے ہوں۔ عموماً ایسی احادیث خود دلیل نہیں بن سکتیں' البتہ کسی مقبول حدیث کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔
- پہلے دو طبقوں کی احادیث کی تقویت میں چوتھے طبقے کی احادیث کو جمع کرنا اور ان سے استدلال کرنا علمائے متأخرین کا محض تکلف ہے۔ اہل بدعت اسی قسم کی احادیث سے اپنے اپنے مذاہب کی تائید میں شواہد مہیا کرتے ہیں لیکن محدثین کے نزدیک اس طبقے کی احادیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ (مُلَخَّص از حُجَّةُ اللهِ الْبَالِغَه)

✪ مصادر اور مراجع کا مفہوم:

- مَصَادِر: وہ کتب جن میں مصنفین نے احادیث کو اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہو۔ مذکورہ بالا طبقات میں جو درجہ بندی کی گئی ہے ان میں عموماً مصادر ہی مراد ہیں۔
- مَرَاجِع: وہ کتب جن میں احادیث کو مختلف مصادر سے منتخب کر کے جمع کیا گیا ہو۔ ان کی تین اقسام ہیں:

(ا) وہ مراجع جن میں صرف صحیح احادیث کو جمع کیا گیا ہے' مثلاً: "اَللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ فِيمَا اتَّفَقَ عَلَيْهِ الشَّيْخَان" اور "عُمْدَةُ الْأَحْكَام" وغیرہ۔

(ب) وہ مراجع جن میں عموماً مستند مصادر سے احادیث منتخب کی گئی ہیں لیکن ان میں ضعیف احادیث بھی موجود ہیں' جیسے مِشْكَاةُ الْمَصَابِيح' رِيَاضُ الصَّالِحِين' اَلتَّرْغِيبُ وَالتَّرْهِيب' بُلُوغُ الْمَرَام" وغیرہ۔

(ج) وہ مراجع جن میں کسی معیار اور تحقیق کے بغیر بہت سے مستند اور غیر مستند مصادر سے احادیث لے کر جمع کر دی گئی ہوں' مثلاً: "كَنْزُ الْعُمَّال" وغیرہ۔

نوٹ: دوسری اور تیسری قسم کے مراجع میں مذکور کسی حدیث سے تحقیق کے بغیر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

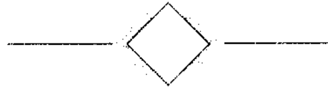
○ دو مقبول احادیث کے ظاہری تعارض کو دور کرنے کی مختلف صورتیں:

① سب سے پہلے ان کا کوئی ایسا مشترک مفہوم مراد لیا جائے گا جس سے ہر حدیث پر عمل کرنا ممکن ہو جائے اور اس سلسلے میں اس مفہوم کو ترجیح دی جائے گی جو کسی تیسری حدیث میں بیان ہوا ہو یا فقہائے محدثین نے اسے بیان کیا ہو۔

② اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر یہ تحقیق کی جائے گی کہ آیا ان میں سے کوئی حدیث منسوخ تو نہیں ہے۔ اس صورت میں منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل کیا جائے گا۔

③ اگر نسخ کا ثبوت نہ ملے تو پھر ایک حدیث کو کسی مسلک کا لحاظ کیے بغیر محض وجوہِ ترجیح (فنی خوبیوں) کی بنا پر ترجیح دی جائے گی اور دوسری حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا' مثلاً: کوئی حدیث صحت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو یا اعلیٰ طبقے کی کسی کتاب میں مروی ہو تو کمتر درجے یا طبقے کی حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا...... وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ: اگر مقبول اور مردود حدیثوں کا تعارض آئے گا تو وہاں مردود حدیث کو رد کر کے صرف مقبول حدیث پر عمل کیا جائے گا۔



مُقَدِّمَةُ الْمُؤَلِّفِ

کلمۂ مؤلف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ وَالْبَاطِنَةِ قَدِيمًا وَّحَدِيثًا، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ الَّذِينَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ دِينِهِ سَيْرًا حَثِيثًا، وَعَلٰى أَتْبَاعِهِمُ الَّذِينَ وَرِثُوا الْعِلْمَ، وَالْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، أَكْرِمْ بِهِمْ وَارِثًا وَّمَوْرُوثًا.

آغاز اللہ رحمٰن (اور) رحیم کے نام سے

ظاہری و باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ اور درود و سلام نازل ہوں اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر، جنھوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تندہی اور برق رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ اور تابعین کرام رحمہم اللہ پر، جو علم نبوت کے وارث ہوئے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ علماء ہی انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ ہے یہ ورثہ!

أَمَّا بَعْدُ: فَهٰذَا مُخْتَصَرٌ يَشْتَمِلُ عَلٰى أُصُولِ الْأَدِلَّةِ الْحَدِيثِيَّةِ لِلْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَّرْتُهُ تَحْرِيرًا بَالِغًا، لِيَصِيرَ مَنْ يَّحْفَظُهُ مِنْ بَيْنِ أَقْرَانِهِ نَابِغًا، وَيَسْتَعِينَ بِهِ الطَّالِبُ الْمُبْتَدِي،

حمد و صلاۃ کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر کتاب ہے جو احکام شرعیہ کی احادیث اور دلائل کے اصولوں پر مشتمل ہے، یعنی احادیث میں جو احکام شرعیہ وارد ہوئے ہیں ان کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب

وَلَايَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّاغِبُ الْمُنْتَهِي.

میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بڑی شان والا بن جائے' مبتدی طالب علم اس کے ذریعے سے مدد حاصل کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت وضرورت سے مستغنی نہ رہے۔ (یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)

وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقِبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ أَخْرَجَهُ مِنَ الْأَئِمَّةِ، لِإِرَادَةِ نُصْحِ الْأُمَّةِ، فَالْمُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ وَالْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه، وَبِالسِّتَّةِ: مَنْ عَدَا أَحْمَدَ، وَبِالْخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا الْبُخَارِيَّ وَمُسْلِمًا، وَقَدْ أَقُولُ: اَلْأَرْبَعَةُ وَأَحْمَدُ. وَبِالْأَرْبَعَةِ: مَنْ عَدَا الثَّلَاثَةَ الْأُوَلَ، وَبِالثَّلَاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ وَالْأَخِيرَ، وَبِالْمُتَّفَقِ: اَلْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لَاأَذْكُرُ مَعَهُمَا غَيْرَهُمَا، وَمَا عَدَا ذٰلِكَ فَهُوَ مُبَيَّنٌ، وَسَمَّيْتُهُ بُلُوغَ الْمَرَامِ مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ.

میں نے امت کی خیر خواہی کے لیے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہے' چنانچہ جہاں میں نے [أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ] تحریر کیا ہے اس سے میری مراد احمد' بخاری' مسلم' ابوداود' نسائی' ترمذی اور ابن ماجہ ؒ ہیں۔ اور [أَخْرَجَهُ السِّتَّةُ] سے امام احمد ؒ کے سوا باقی ائمہ مراد ہیں۔ اور [أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ] سے بخاری و مسلم ؒ کے سوا باقی پانچ ائمہ مراد ہیں۔ اور کبھی میں [أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ] کی بجائے [اَلْأَرْبَعَةُ وَأَحْمَدُ] کہتا ہوں۔ اور [أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ] سے پہلے تین (احمد' بخاری اور مسلم ؒ) کے سوا باقی ائمہ مراد ہوتے ہیں۔ اور [أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ] سے پہلے تین اور آخری کے سوا بقیہ تین امام مراد ہیں (ابوداود' نسائی' ترمذی ؒ۔) اور [مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ] سے مراد بخاری اور مسلم ؒ ہیں۔ اور بسا اوقات میں بخاری و مسلم کے ساتھ دیگر ائمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ مذکورہ بالا ائمہ کے علاوہ باقی تمام ائمہ کا ذکر نمایاں طور پر کر دیا گیا ہے۔ اور میں نے اس مختصر کتاب کا نام [بُلُوغُ الْمَرَامِ مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ] تجویز کیا ہے۔

وَاللّٰهَ أَسْأَلُ أَنْ لَّايَجْعَلَ مَاعَلِمْنَاهُ عَلَيْنَا وَبَالًا، وَأَنْ يَّرْزُقَنَا الْعَمَلَ بِمَا يُرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى.

آخر میں رب کائنات ہی کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

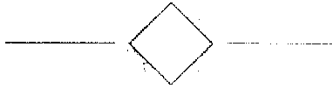
لغوی تشریح: [بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ] مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز [بِسْمِ اللّٰهِ] اور [اَلْحَمْدُلِلّٰهِ] سے کیا تا کہ قرآن پاک کے طریقے کی پیروی اور نبی ﷺ کے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتدا کرنے کی تعمیل ہو جائے۔ [اَلْحَمْدُ] سے مراد ہے: بہترین تعریف جو کسی کی ذاتی اور اختیاری خوبی پر کی جائے۔ [اَلنِّعَم] ''نون'' مکسور اور ''عین'' مفتوح ہے اور ''نون'' پر فتحہ بھی جائز ہے۔ یہ نِعْمَةٌ کی جمع ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ [اَلظَّاهِرَة] سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ [اَلْبَاطِنَة] ایسے انعامات جن کا انسان ادراک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو زمین و آسمان ہی میں نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں جن کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ اور بہت سی ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ ظاہری و باطنی نعمتوں کی کچھ دوسری تفاسیر بھی ہیں جنھیں ہم طوالت کے خوف سے چھوڑ رہے ہیں۔ [اَلصَّلَاةُ] کے معنی دعا، رحمت، بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں۔ [اَلسَّلَامُ] آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ [آل] آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ اور یہ لفظ بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے متبعین اور پیروکاروں کے علاوہ کسی پر نہیں بولا جاتا، مثلاً: آل ابراہیم، آل داود، آل فرعون وغیرہ۔

[صَحْبِه] ''صاد'' مفتوح اور ''حا'' ساکن ہے۔ صَاحِبٌ کی جمع ہے۔ اور صحابی سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبیٔ اکرم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ [اَلْحَثِيثُ] تیز رفتاری۔ [أَتْبَاع] ''ہمزہ'' کے فتحہ اور ''تا'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ تَابِعٌ کی جمع ہے۔ [أَكْرِمْ بِهِمْ] فعل تعجب ہے۔ [وَارِثًا] أَكْرِمْ بِهِمْ میں ضمیر مجرور کی تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب لایا گیا ہے۔ [أَمَّا بَعْدُ] أَمَّا حرف شرط ہے اور بَعْدُ مبنی برضمہ ہے کیونکہ یہ ظرف واقع ہو رہا ہے اور مضاف الیہ بظاہر موجود نہیں لیکن نیت میں موجود ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: بَعْدَ الْحَمْدِ وَالصَّلَاةِ. [أُصُول] أَصْلٌ کی جمع ہے۔ جس پر کسی چیز کی بنیاد ہو۔ [اَلْأَدِلَّة] ''ہمزہ'' کے فتحہ ''دال'' کے کسرہ اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ ہے، اور دَلِيلٌ کی جمع ہے۔ [اَلْأَحْكَام] حُكْمٌ کی جمع ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ [حَرَّرْتُهُ] تحریر سے ماخوذ ہے جس کے معنی تنقیح اور تہذیب کے ہیں۔ [نَابِغًا] عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ [اَلْمُبْتَدِي] فن حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ [اَلْمُنْتَهِي] جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچ چکا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلبہ سے لے کر کامل ماہرین تک سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

[عَقِب] ''عین'' پر فتحہ اور ''قاف'' پر کسرہ ہے۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ [مَنْ أَخْرَجَهُ] اس میں مَنْ موصولہ ہے اور اپنے صلے أَخْرَجَهُ کے ساتھ مل کر بَيَّنْتُ کا مفعول ہے۔ إِخْرَاجٌ اور اسی طرح تَخْرِيجٌ اور روایت کے معنی ہیں: محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ اپنی کتاب میں بیان کرنا۔ مصنف نے مُخَرِّجِين کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے یا حسن یا پھر ضعیف ہے۔ [اَلنُّصْح]

بھلائی اور خیر خواہی کرنا۔ [فَالْمُرَاد] کا مطلب ہے: اس کتاب میں میری مراد۔ [بِالسَّبْعَةِ] یعنی اس کتاب میں جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد [أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ] کہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین (احمد، بخاری، مسلم، ابوداود، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ ﷭) نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ [عَدَا] غیر اور سوی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو استثنا کے لیے ہیں۔ اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے۔ [وَقَدْ أَقُولُ: الْأَرْبَعَةُ وَأَحْمَدُ] یعنی کبھی میں [الْخَمْسَةُ] کی بجائے یہ الفاظ کہتا ہوں۔ [الْأَرْبَعَةُ وَأَحْمَدُ] اور [الْخَمْسَةُ] ان دونوں میں بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔

[الثَّلَاثَةُ الْأُوَلُ] الأول ''ہمزہ'' کے ضمہ اور ''واو'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ أَوَّلٌ کی جمع ہے۔ [وَبِالثَّلَاثَةِ] یعنی ثلاثہ سے میری مراد۔ [مَنْ عَدَاهُمْ] (بخاری، مسلم اور احمد) کے علاوہ۔ [الْأَخِيرَ] یعنی آخری کے علاوہ۔ پہلے تین اور آخری کا استثنا کر لینے کے بعد ابوداود، نسائی اور ترمذی کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا، اس لیے ثلاثہ سے یہی تینوں مراد ہیں۔ [مَعَهُمَا] یعنی بخاری و مسلم کے ساتھ۔ [غَيْرَهُمَا] یعنی میں بعض اوقات حدیث کو بخاری و مسلم کی جانب منسوب کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، حالانکہ ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہوتا ہے۔ [مَا عَدَا ذٰلِكَ] ان سات محدثین کے علاوہ دیگر محدثین کی روایت مراد ہے۔ [فَهُوَ مُبَيَّنٌ] یہ تبیین سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، یعنی ان کے اسمائے گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ [الْمَرَام] کے معنی طلب کے ہیں اور مراد مطلوب ہے۔ [وَاللّٰهَ] یہ أَسْأَلُ کا مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے۔ مفعول کو مقدم کرنے سے مقصود، کلام میں حصر پیدا کرنا ہے، یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ کے آگے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ اس کے سوا کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ [مَا عَلِمْنَاهُ] موصول اپنے صلے کے ساتھ مل کر [جَعَلَ] فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول [وَبَالًا] ہے۔ وبال کی ''واو'' پر فتحہ ہے، اس کے معنی بوجھ اور برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصتاً اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے۔ [أَنْ يَرْزُقَنَا] یعنی اللہ ہمیں توفیق دے۔



١ - كِتَابُ الطَّهَارَةِ

طہارت سے متعلق احکام ومسائل

١ - بَابُ الْمِيَاهِ

باب:1- پانی کے احکام ومسائل
(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)

(١) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الْبَحْرِ: «**هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ**». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ.

[1] ـ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے (پانی کے) متعلق (ایک شخص کے استفسار کے جواب میں) فرمایا: ''اس کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔'' (اس حدیث کو چاروں نے اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ (متن حدیث کے) الفاظ ابن ابی شیبہ کے ہیں۔ ابن خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کو مالک' شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔)

١ـ **[إسناده صحيح]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الوضوء بماء البحر، حديث: ٨٣، والترمذي، الطهارة، حديث: ٦٩، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٨٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ٣٣٣، ومالك في الموطأ: ١/ ٢٢، والشافعي في الأم: ١/ ٧، وأحمد: ٢/ ٢٣٧، وابن أبي شيبة: ١/ ١٢١، حديث: ١٣٧٨، وابن خزيمة في صحيحه: ١/ ٥٩، حديث: ١١١، وابن حبان، (الموارد)، حديث: ١١٩.

لغوی تشریح: [كِتَابُ الطَّهَارَةِ] کتاب، کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب ان مسائل کے مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع، یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں۔ اور طہارت، پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

[بَابُ الْمِيَاهِ] ایک ہی مسئلہ یا ایک ہی نوع سے متعلق مستقل حیثیت کے حامل مسائل کو باب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور مِیاہ: ماء کی جمع ہے۔ اس کی تصغیر مُوَيْه آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر مُوَيْه کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں کنوئیں، دریا، سمندر، چشمے اور بارانِ رحمت کے پانی کا ذکر کریں گے۔)

[عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ] یہ جار مجرور محذوف کے متعلق ہیں جو رُوِيَ یا مَرْوِيٌّ وغیرہ ہو سکتا ہے اور [فِي الْبَحْرِ] کا مطلب ہے: دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ [اَلطَّهُورُ] "طا" پر فتحہ ہے اور اس سے وہ چیز مراد ہے جس کے ساتھ طہارت حاصل کی جاتی ہے اور یہ مُطَهِّر (پاک کرنے والا) کے معنی میں ہوگا۔ دریا اور سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ [اَلْحِلُّ] "حا" کے کسرہ اور "لام" کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اس کے معنی ہیں: حلال۔ [مَيْتَتُهُ] سے وہ جانور مراد ہیں جو پانی ہی میں زندہ رہ سکیں۔ یہ مطلق نہیں ہے اور اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتے ہوں۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث دراصل ایک سائل کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں، ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے، اگر ہم اس سے وضو کریں تو پیاسے رہ جاتے ہیں، تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: "وہ پانی پاک ہے۔" (الموطأ، (يحيى): ۱/ ۲۲، وسنن أبي داود، الطهارة، باب الوضوء بماء البحر، حديث: ۸۳) ② یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سمندری پانی مطلقاً پاک ہے، اس میں کسی قسم کی تفصیل اور تقسیم نہیں ہے، نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں، خواہ وہ کسی بھی شکل کے ہوں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی ﷺ نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ ساتھ بغیر سائل کے دریافت کیے اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتا دی، اس لیے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے تو وہ اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ شک وشبہ میں پڑ سکتا ہے، خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے اور اس کی تفصیل بیان نہیں کی گئی اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو سکتا ہے، لہٰذا نبی ﷺ کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ ③ یہ سائل کون تھا؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے اس کا نام عبداللہ مدلجی رضی اللہ عنہ کہا ہے اور بعض نے عبدالعرکی رضی اللہ عنہ کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبیدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور عَرَكِي ("عین" اور "را" دونوں پر فتحہ ہے۔) [صَيَّادُ السَّمَكِ] مچھلیاں پکڑنے والے کو کہتے ہیں، یعنی مچھیرا، پھر مچھلیاں پکڑنے کی مناسبت سے اس لفظ کا اطلاق ملاحوں، یعنی کشتی بانوں پر بھی کر دیا جاتا ہے اگرچہ ان کا اصل نام عَرَكٌ نہیں ہے۔ ④ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ

سمندری پانی پاک ہے۔اس سے وضو کرنا اور اسے (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے۔ ⑤ اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں، چاہے سمندر میں مر جائیں یا نکالنے کے بعد مر جائیں۔ ⑥ نیز سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ] آپ وہ جلیل القدر صحابیٔ رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبویہ ہم تک پہنچی ہیں۔صاحب "الاستیعاب" کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن تھا۔قبیلۂ دوس سے تھے۔ خیبر والے سال ۶ ہجری میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے۔۷۸ سال کی عمر پائی اور ۵۹ ہجری میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع الغرقد (جنت البقیع) نامی قبرستان میں دفن کیے گئے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے اور مروان کی جانب سے مدینے کے گورنر بھی رہے۔ان سے کم وبیش (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں اور ان سے احادیث بیان کرنے والوں کی تعداد (۸۰۰) سے زائد ہے۔واللہ أعلم.

(۲) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ.

[2] حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔'' (اس حدیث کو تینوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْخُدْرِيّ] ''خا'' کے ضمہ اور ''دال'' کے سکون کے ساتھ ہے۔خُدْرَۃ کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔[طَھُورٌ] ''طا'' کے فتحہ کے ساتھ ہے، یعنی پاک اور پاک کرنے والا۔[لَا یُنَجِّسُهُ] یہ تَنْجِیس سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس، یعنی ناپاک نہیں کرتی۔مطلب یہ ہے کہ پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا، بشرطیکہ وہ پانی دو مشکوں کے برابر یا اس سے زیادہ ہو جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

فوائد ومسائل: ① حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے ناپاک نہیں ہوتا، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔امام مالک رحمہ اللہ، اہل ظاہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف تبدیل نہ ہو پانی ناپاک نہیں ہوتا جیسا کہ آگے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ ② حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بئر بُضاعہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ بئر بُضاعہ ایک پرانا کنواں تھا جس میں حیض والے کپڑے، کتوں کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار

۲۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب ما جاء في بئر بضاعة، حديث: ٦٦، والترمذي، الطهارة، حديث: ٦٦، وقال: "هذا حديث حسن"، والنسائي، الطهارة، حديث: ٣٢٧، وأحمد: ٣/ ٣١، وصححه أحمد وابن معين وغيرهم، انظر التلخيص الحبير: ١/ ١٢ - ١٤.

چیزیں گر جاتی تھیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''پانی پاک ہے۔'' (سنن أبي داود' الطهارة' باب ماجاء في بئر بضاعة' حديث:٦٦)

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ [الماء] میں جو الف لام ہے یہ عہد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ سائل کے ذہن میں جس پانی کے متعلق سوال تھا اس کے بارے میں آپ نے یہ جواب دیا اور وہ بئر بضاعہ کا پانی تھا۔ اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ اس میں پانی جب زیادہ ہوتا تو ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا جیسا کہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ② یہ حدیث صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا' یعنی یہ حدیث صرف کثیر پانی کے متعلق ہے' قلیل کے بارے میں نہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ] ابوسعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہے۔ انصار کے قبیلۂ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھیاسی (۸۶) برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ ہجری کے آغاز میں وفات پائی...... رضی اللہ عنہ...... ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔ اور انھوں نے کچھ عرصے تک مفتی کے فرائض بھی سرانجام دیے۔

(٣) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلٰى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنِهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَبُوحَاتِمٍ وَلِلْبَيْهَقِيِّ: اَلْمَاءُ طَهُورٌ إِلَّا أَنْ تَغَيَّرَ رِيحُهُ أَوْ طَعْمُهُ أَوْ لَوْنُهُ بِنَجَاسَةٍ تَحْدُثُ فِيهِ.

[3] حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی الا یہ کہ پانی پر اس (ناپاک و پلید چیز) کی بو' ذائقہ اور رنگت غالب آجائے۔'' (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔) بیہقی میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں: ''پانی پاک ہے (اور پاک کرنے والا بھی ہے) مگر یہ کہ کسی نجاست کی وجہ سے' جو اس میں گر جائے' اس کی بو یا اس کا ذائقہ یا اس کا رنگ بدل جائے۔''

لغوی تشریح: [لَا يُنَجِّسُهُ] تنجیس سے ماخوذ ہے۔ [شَيْءٌ] اس سے مراد نجاست ہے' یعنی محض کچھ نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جب پانی کی مقدار کثیر ہو' یعنی دو بڑے مٹکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ [إِلَّا مَا] ''ما'' موصوفہ یا موصولہ ہے' یعنی مگر ایسی نجاست۔ [غَلَبَ عَلٰى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنِهِ] جو ان تین اوصاف میں سے کسی کو تبدیل کر دے تو پانی اس کی وجہ سے ناپاک ہو جائے گا۔ اوصاف ثلاثہ بدلنے سے پانی لازماً

٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، الطهارة، باب الحياض، حديث: ٥٢١ وسنده ضعيف من أجل رشدين، والبيهقي: ١/ ٢٦٠، وسنده ضعيف من أجل عنعنة بقية - علل الحديث لابن أبي حاتم: ١/ ٤٤، حديث: ٩٧، والحديث يغني عنه الإجماع، انظر الإجماع لابن المنذر ص: ٣٣، نص: ١١، ١٢.

پلید ہو جائے گا' خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر۔ اور "و" یہاں "أَو" کے معنی میں ہے۔ [تَحْدُثُ فِيهِ] کے معنی ہیں: نجاست پانی میں گر جائے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی اگر زیادہ مقدار مثلاً: دو قلّے' یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز اسے پلید نہیں کرتی۔ ہاں' اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ' بو یا ذائقہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ] ابو امامہ کنیت ہے۔ ''امامہ'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ باہلہ قبیلے سے ہونے کی وجہ سے باہلی کہلائے' جو کہ ایک مشہور ومعروف قبیلہ ہے۔ ان کا نام صُدَيّ (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی، پھر حمص کی جانب منتقل ہو گئے۔ وہیں ان کی وفات ۸۱ یا ۸۶ ہجری میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی یہی ہیں...... رضی اللہ عنہ......

(٤) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ». وَفِي لَفْظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[4] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب پانی کی مقدار دو بڑے مٹکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔'' ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: ''پانی نجس (ناپاک) نہیں ہوتا۔'' (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قُلَّتَيْنِ] قلة، ''قاف'' کے پیش اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ مٹی کے پکے ہوئے بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اگرچہ اختلاف رائے واقع ہوا ہے لیکن چونکہ عرب میں ''ہجر'' (ایک بستی کا نام) کے مٹکے مشہور ومعروف تھے' نیز ان کے اشعار اور امثال میں بھی بکثرت اس کا استعمال ہوا ہے' اس وجہ سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حدیث میں بیان شدہ مٹکے سے مراد یہی ہجر بستی کا مٹکا ہے' کوئی اور مٹکا نہیں۔ اور ان کے مٹکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سمانے کی گنجائش تھی' لہٰذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانے کے پیمانے کے مطابق دو سو ستائیس کلوگرام' یعنی پانچ من ستائیس کلوگرام ہے۔ [لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ] اَلْخَبَث میں ''خا'' اور ''با'' دونوں پر زبر ہے۔ اس کے معنی نجاست اور گندگی کے ہیں' یعنی پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا بلکہ قبول کرنے سے انکاری ہے' اس لیے صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ [لَمْ يَنْجُسْ] میں ایک قراءت کے مطابق تو ''جیم'' پر فتحہ ہے اور دوسری قراءت کے مطابق ضمہ ہے' دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

٤ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب ما ينجس الماء، حديث: ٦٣، والترمذي، الطهارة، حديث: ٦٧، والنسائي، الطهارة، حديث: ٥٢، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٥١٧، وابن خزيمة: ١/ ٤٩، حديث: ٩٢، والحاكم: ١/ ١٣٢، ١٣٣، وابن حبان (موارد الظمآن)، حديث: ١١٨.

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (مٹکوں) سے کم ہوگی تو وہ محض نجاست کے گرنے ہی سے ناپاک ہو جائے گا' خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کسی وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ' اور اگر اس کی مقدار قُلَّتَین (دو مٹکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی تو محض وقوع نجاست سے وہ ناپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو بھی پاک کرے گا' البتہ جب اس نجاست کی وجہ سے ان اوصاف ثلاثہ (بو' ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف تبدیل ہو جائے گا تو پھر وہ پانی ناپاک شمار ہوگا جیسا کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ جہاں تک بئر بضاعہ والی حدیث کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ اس میں پانی دو قلے یا اس سے بھی زیادہ تھا۔ ② اس حدیث کو حفاظ ائمۂ حدیث کے ایک جم غفیر: امام شافعی' ابوعبید' احمد' اسحاق' یحییٰ بن معین' ابن خزیمہ' طحاوی' ابن حبان' دارقطنی' ابن مندہ' حاکم' خطابی' بیہقی' ابن حزم اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے "قوت المغتذي" میں نقل کیا ہے۔ ③ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی' کثیر کے زمرے میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احناف کا دہ در دہ کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلے میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما] آپ زاہد اور پختہ علم والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے شمار ہوتے ہیں۔ صِغر سِنی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ ۷۳ ہجری میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَايَغْتَسِلْ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. وَلِلْبُخَارِيِّ: «لَايَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَايَجْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». وَلِمُسْلِمٍ «مِنْهُ» وَلِأَبِي دَاوُدَ «وَلَا يَغْتَسِلْ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ».

[5] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور بخاری کے الفاظ ہیں: ''تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں' جو جاری نہ ہو' پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔ صحیح مسلم کے الفاظ ((فِيهِ)) کی بجائے ((مِنْهُ)) ہیں' یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل نہ کرے۔ اور ابوداود رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: ''اس میں غسل جنابت نہ کرے۔''

٥ـ أخرجه مسلم، الطهارة، باب النهي عن الاغتسال في الماء الراكد، حديث: ٢٨٣، واللفظ له، وانظر، حديث: ٢٨٢، والبخاري، الوضوء، باب البول في الماء الدائم، حديث: ٢٣٩، وأبوداود، الطهارة، حديث: ٧٠، واللفظ له في الرواية الأخيرة، وسنده حسن.

لغوی تشریح: [اَلدَّائِم] ایسا ساکن جو بہتا نہ ہو۔ [جُنُبٌ] ''جیم'' اور ''نون'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے۔ جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ [ثُمَّ یَغْتَسِلُ فِیهِ] اس میں ثُمَّ استبعاد یعنی دوری ظاہر کرنے کے لیے ہے، یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور یَغْتَسِلُ کے آخر میں پیش (رفع) بھی جائز ہے، مبتدا محذوف هُوَ کی خبر ہونے کے اعتبار سے۔ اور سکون (جزم) بھی جائز ہے، اس صورت میں اس کا عطف [لَا یَبُولَنَّ] میں نہی کے محل پر ہوگا اور أَنْ مقدر ماننے کی صورت میں اس پر نصب (زبر) بھی جائز ہے۔

فوائد ومسائل: ① مسلم کی روایت میں فِیهِ کی جگہ مِنْهُ ہے۔ اگر فِیهِ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے۔ اور مِنْهُ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس میں سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہی ہے۔ بہر حال صحیح مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور صحیح بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے، دونوں کے جمع کرنے کی ممانعت ہے جبکہ ابوداود کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر بھی ممانعت ہے، یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ یہ تمام عمل ہی ممنوع ہیں۔ ② یہ اس بنا پر ہے کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر وتبدل کا موجب ہوگا، چنانچہ نہی تحریم کے لیے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تنزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار والا پانی رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک ونجس نہیں ہوتا۔

(٦) وَعَنْ رَجُلٍ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، أَوِ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيعًا. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ.

[6] ایک ایسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ عورت، مرد کے (غسل سے) بچے ہوئے پانی سے غسل کرے یا مرد، عورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے۔ ہاں، دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔) (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: [عَنْ رَجُلٍ صَحِبَ] صَحِبَ باب سَمِعَ یَسْمَعُ سے فعل ماضی ہے اور ترکیب کے لحاظ سے رَجُلٍ کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں، کیونکہ تمام اہل سنت کا اتفاق ہے کہ [اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُولٌ] ''تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں۔'' [بِفَضْلِ الرَّجُلِ] آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ [وَلْيَغْتَرِفَا] میں ''لام'' امر کا ہے اور اِغْتِرَاف کے معنی ہیں: دونوں ہاتھوں کو ملا کر چلو سے پانی لینا۔

٦۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب النهي عن ذلك، حديث: ٨١، والنسائي، الطهارة، حديث: ٢٣٩.

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں ''نہی'' سے مراد نہی تنزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے' تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ آدمی عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ ② چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے لیکن اس طریقے سے غسل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا' اس لیے اس کی اجازت دے دی گئی۔

(٧) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. وَلِأَصْحَابِ السُّنَنِ: اِغْتَسَلَ بَعْضُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ لِيَغْتَسِلَ مِنْهَا، فَقَالَتْ لَهُ: إِنِّي كُنْتُ جُنُبًا، فَقَالَ: «إِنَّ الْمَاءَ لَا يَجْنُبُ». وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

[7] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے (غسل کے) پانی سے نہا لیا کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے ٹب میں غسل کیا' پھر نبی ﷺ تشریف لائے تاکہ اس میں بچے ہوئے پانی سے غسل فرما لیں تو اس نے آپ سے عرض کیا: میں تو جنبی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''یقیناً پانی ناپاک نہیں ہوتا۔'' (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لِأَصْحَابِ السُّنَنِ] سے ابوداود' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور اسی طرح دارمی' دارقطنی' ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ [جَفْنَة] ''جیم'' کے فتحہ اور ''فا'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ بڑا پیالہ۔ عام لوگ اسے إِجَّانَة (چمڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ [لِيَغْتَسِلَ مِنْهَا] تاکہ اس کے پانی سے غسل کریں۔ [فَقَالَتْ لَهُ: إِنِّي كُنْتُ جُنُبًا] اس کا مطلب ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ [لَا يَجْنُبُ] جنب' باب سَمِعَ اور کَرُمَ دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب افعال سے ہو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جنبی کسی برتن سے پانی لے کر غسل کرے تو اس کی وجہ سے باقی پانی ناپاک نہیں ہو جاتا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے عورت کے بچے ہوئے پانی سے مرد کے غسل کرنے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔ اور اس پر قیاس کیا جائے گا کہ مرد کے بچے ہوئے پانی سے عورت بھی غسل کر سکتی ہے' لیکن اس حدیث سے کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ پہلی حدیث کے مخالف ہے۔ درحقیقت نبی اکرم ﷺ نے امت کی سہولت اور آسانی کے لیے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا۔ دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ② پہلی حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے' تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر اور پہلی حدیث ترک کے اولیٰ ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ بچنا بہتر ہے۔

٧ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة . . .، حديث: ٣٢٣ * وأبوداود، الطهارة، باب الماء لا يجنب، حديث: ٦٨، والترمذي، الطهارة، حديث: ٦٥، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٧٠، والنسائي، الطهارة، حديث: ٣٢٦، وابن خزيمة: ١/ ٥٨، حديث: ١٠٩ وسنده ضعيف، حديث سماك عن عكرمة ضعيف، انظر سير أعلام النبلاء: ٥/ ٢٦٨.

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما] ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تھا۔ یہ وہی صحابی ہیں جنھیں اس امت کے پیشوا اور بحرالعلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بہت ذہین تھے۔ اپنی امامت علمی کی وجہ سے تعارف سے مستغنی ہیں، اس لیے کہ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم و حکمت اور فقہ و تاویل میں برکت کی دعا دی تھی۔ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۷ ہجری میں طائف کے مقام پر وفات پائی۔

[سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا] میمونہ بنت حارث ہلالیہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء کے موقع پر ان سے نکاح کیا۔ ۶۱ یا ۵۱ یا ۶۶ ہجری میں فوت ہوئیں۔

(٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**طُهُورُ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ إِذَا وَلَغَ فِيهِ الْكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ، أُولَاهُنَّ بِالتُّرَابِ**». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. وَفِي لَفْظٍ لَهُ «**فَلْيُرِقْهُ**». وَلِلتِّرْمِذِيِّ: «**أُخْرَاهُنَّ أَوْ أُولَاهُنَّ بِالتُّرَابِ**».

[8] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کسی کے برتن میں جب کتا منہ ڈال جائے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھوئے۔ پہلی مرتبہ اسے مٹی سے صاف کیا جائے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور مسلم کی ایک روایت میں لفظ ((فَلْيُرِقْهُ)) ہے' یعنی اس برتن میں جو کچھ ہے اسے انڈیل دے۔ اور ترمذی میں یہ الفاظ ہیں: ''پہلی یا آخری مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کیا جائے۔''

لغوی تشریح: [طُهُورُ] ''طا'' کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ مصدر ہے اور ترکیب میں مبتدا واقع ہو رہا ہے اور لفظ إِنَاء (برتن) کی طرف مضاف ہے۔ [وَلَغَ] وُلُوغُ الْكَلْبِ کے معنی ہیں: کتے کا زبان کے کنارے کے ساتھ پینا (چاٹنا۔) وَلَغَ باب فَتَحَ يَفْتَحُ' حَسِبَ يَحْسِبُ اور سَمِعَ يَسْمَعُ سے آتا ہے۔ [أَنْ يَغْسِلَهُ] یہ خبر واقع ہو رہی ہے جو جزائے شرط پر دلالت کرتی ہے۔ [أُولَاهُنَّ] کا مطلب یہ ہے کہ سات مرتبہ دھونے کی صورت میں سب سے پہلی مرتبہ۔ [فَلْيُرِقْهُ] یہ إِرَاقَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: برتن میں خور و نوش کی جو چیز ہو اسے انڈیل کر برتن کو خالی کر دینا۔ اس میں مفعول کی ضمیر کا مرجع مفہوم سے معلوم ہو رہا ہے، یعنی [مَا وَلَغَ فِيهِ الْكَلْبُ]

فوائد و مسائل: ① ترمذی کے لفظ [أُخْرَاهُنَّ أَوْ أُولَاهُنَّ] کے متعلق غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے' أَوْ تخییر کے لیے نہیں کہ دھونے والے کو اختیار ہو۔ اور أُولَاهُنَّ کا لفظ بکثرت روایات میں آنے کی وجہ سے اور خاص طور پر بخاری و مسلم کے روایت کرنے کی وجہ سے راجح ہے' یعنی اس بات کو ترجیح ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنا چاہیے۔ ② یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کتے کا منہ' اس کا لعاب دہن اور اس کا جوٹھا نجس و ناپاک ہے۔ اور یہی اس کے سارے بدن کے نجس و ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور برتن کے سات مرتبہ دھونے کو واجب ٹھہراتی ہے۔ اور مٹی کے ساتھ صاف کرنا بھی واجب ہے۔ محققین کی رائے یہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی

٨۔ أخرجه مسلم، الطهارة، باب حكم ولوغ الكلب، حديث: ٢٧٩، والترمذي، الطهارة، حديث: ٩١.

سے صاف کرنا مستحب ہے' واجب نہیں۔ اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی۔ اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست' خواہ وہ کسی قسم کی ہو' اس کے ازالے کے لیے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی کوئی اور حکمت ہو۔ ③ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جرثومے پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلے سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے اردگرد بالوں میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا جسم صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کا منہ چومتا ہے (جیسا کہ غیر مسلم اور ان کی نقالی کرنے والے ایسا کرتے ہیں) تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورونوش کے وقت آسانی سے انسان کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر معدے کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل' دماغ اور پھیپھڑوں کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز چونکہ بڑا مشکل کام ہے' اس کے لیے کافی وقت درکار ہے اور ایسے آلات کے ذریعے سے انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں' اس لیے شریعت نے عوام کو ان بکھیڑوں میں ڈالنے کی بجائے اس کو ناپاک قرار دے کر برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا ہے تاکہ برتنوں کی صفائی اور نظافت ہو سکے اور مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے۔ یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔ (حاشية إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام لابن دقيق العيد: ۱/۲۷) ④ خورونوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہیں لانا چاہیے بلکہ اسے گرا دینا چاہیے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہیے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ (صحيح مسلم' الطهارة' باب حكم ولوغ الكلب' حديث: ۲۸۰) یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ ⑤ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دارقطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہیے' حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا یہ فتویٰ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ (سنن الدارقطني' الطهارة' باب ولوغ الكلب في الإناء' حديث: ۱۸۰) لہٰذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے' وہی راجح ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتوی سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباري: ۱/۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں' معاذ اللہ! مگر یہاں حدیث مرفوع اور صحیح فتویٰ کے مقابلے میں ان کے مرجوح فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے اس سلسلے میں علامہ عینی اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کے اعتراضات باردہ کا کافی وشافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعاية: ۱/۴۴۹-۴۵۴)

(٩) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي الْهِرَّةِ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

[9] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا: ''وہ نجس نہیں ہے کیونکہ وہ تمھارے گھروں میں ہر وقت آمد و رفت رکھنے والا جانور ہے۔'' (اسے چاروں نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي الْهِرَّةِ] یعنی بلی کے حکم کے بارے میں بتایا کہ اس کا حکم شرعی کیا ہے؟ ہِرّۃ کے علاوہ اسے قِطّ اور سِنَّوْر بھی کہتے ہیں۔ [اَلطَّوَّافِينَ] ''واؤ'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ واحد اس کا طوّاف ہے اور طواف اس کو کہتے ہیں جس کی آمد و رفت بکثرت ہو۔ اور وہ گھر کا خادم ہوتا ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلے میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کے لیے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور دقت کو دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے سے ثابت ہوا کہ اس کا جوٹھا پاک ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا کہ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی۔ تو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تاکہ بلی آسانی سے سیر ہو کر پی لے۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب ﷺ کو فرماتے سنا ہے: ''بلی نجس نہیں ہے۔'' (سنن أبي داود' الطهارة' باب سؤر الهرة، حديث:٧٥) ② اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ] ابوقتادہ ان کی کنیت ہے اور اصل نام حارث بن ربعی ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی ہیں۔ رضی اللہ عنہ۔ فارس (شہسوار) رسول اللہ ﷺ کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوۂ احد اور بعد والی جنگوں میں شریک رہے۔ جائے وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ مدینے میں اور بعض نے کہا کہ کوفے میں ۵۴ ہجری کو فوت ہوئے۔

(١٠) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي طَائِفَةِ

[10] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک بدوی آیا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔

٩ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب سؤر الهرة، حديث:٧٥، والترمذي، الطهارة، حديث:٩٢، وابن ماجه، الطهارة، حديث:٣٦٧، والنسائي، الطهارة، حديث:٦٨، وابن خزيمة:١/ ٥٥، حديث:١٠٤، وابن حبان (الموارد)، حديث:١٢١، والحاكم:١/ ١٦٠، ووافقه الذهبي.

١٠ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب صب الماء على البول في المسجد، حديث:٢٢١(ب) واللفظ له، ومسلم، الطهارة، باب وجوب غسل البول وغيره من النجاسات....، حديث:٢٨٤.

الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا قَضَى بَوْلَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ مِّنْ مَّاءٍ فَأُهْرِيقَ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لوگوں نے اسے ڈانٹا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ جب وہ بدوی پیشاب سے فارغ ہوا تو نبی ﷺ نے پانی کا ایک ڈول طلب فرمایا جسے اس جگہ پر بہا دیا گیا (جہاں اس نے پیشاب کیا تھا۔) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أَعْرَابِيٌّ] اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی کہا گیا ہے، یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی اور دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ بعض نے کہا ہے کہ وہ ذو الخویصرۃ یمانی تھے اور وہ شہری آداب سے ناواقف تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ [طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ] مسجد کا ایک کونہ یا کنارہ، یعنی مسجد کی ایک جانب۔ [فَزَجَرَهُ النَّاسُ] لوگوں نے اسے ڈانٹا، جھڑکا، سختی سے منع کیا۔ [فَنَهَاهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ] رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا ضرر رساں ہے اور بسا اوقات ایسا کرنے سے گردے اور مثانے کا خطرناک مرض لاحق ہو جاتا ہے، نیز اس طرح پیشاب کا منقطع کرنا بدن، لباس اور مسجد کے دوسرے حصوں کو نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن سکتا ہے۔ [بِذَنُوبٍ] ''ذال'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ [فَأُهْرِيقَ] دراصل أُرِيقَ تھا، ہمزہ کو ''ہا'' سے بدل کر اس پر مزید ایک ہمزے کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں: انڈیل دیا گیا۔

فوائد و مسائل: ① امام ترمذی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے، نیز یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے، خواہ زمین نرم و سہل ہو یا سخت و صعب۔ ② اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام، نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا، سختی اور درشتی نہ کرنا، نبی ﷺ کا حسن خلق، نہایت عمدہ طریقے سے تعلیم دینا اور دوسرے کئی ایک مسائل نمایاں ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت انس رضی اللہ عنہ] رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص ہیں۔ ان کو ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے آپ کی خدمت کے لیے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ یہ نبی ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے لے کر آخری سانس تک آپ ﷺ کی خدمت کرتے رہے۔ ابوحمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلۂ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بصرہ کو جائے سکونت بنایا اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ نے ۹۱ یا ۹۲ یا ۹۳ ہجری میں وفات پائی جب کہ آپ کی عمر ۹۹ یا ۱۰۳ سال تھی۔

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[11] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ

۱۱ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، الأطعمة، باب الكبد والطحال، حديث: ٣٣١٤، وأحمد: ٢/ ٩٧ وسنده ضعيف، عبدالرحمن بن زيد بن أسلم ضعيف مشهور، وللحديث طريق آخر موقوف له حكم الرفع، وأخرجه البيهقي: ١/ ٢٥٤، وسنده صحيح، وللحديث طرق أخرى.

عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ: فَالْجَرَادُ وَالْحُوتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ: فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

نے فرمایا: ''دو مردار اور دو خون ہمارے لیے حلال کیے گئے ہیں۔ دو مردار (جنھیں ذبح نہ کیا گیا ہو) ٹڈی اور مچھلی ہیں۔ اور دو خون سے مراد جگر اور تلی ہیں۔'' (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں ضعف ہے۔)

فوائد و مسائل: ① مصنف رحمہ اللہ نے اس روایت کو اس باب میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مر جائیں، خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ، وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ہے جو اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے جیسا کہ امام ابوزرعہ اور ابوحاتم رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد، یعنی عبداللہ، عبدالرحمٰن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان سب (زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے، البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ ② گو اس حدیث کا سنداً موقوف ہونا صحیح ہے، مگر یہ حکماً مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا [أُحِلَّتْ لَنَا] یا [حُرِّمَ عَلَيْنَا] کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے، جیسے [أُمِرْنَا] یا [نُهِينَا] کہنا مرفوع کے حکم میں ہے۔ ③ یہ حدیث دلیل ہے کہ ٹڈی بہر صورت حلال ہے، خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سبب سے (اور اس سے مراد وہ ٹڈی نہیں جو عام طور پر گھروں میں ہوتی ہے۔) امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑنے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث مذکور سے امام مالک کے فتوے کی تردید ہوتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے، خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو یا دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو، دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ ④ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مر جائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو وہ حلال نہیں بلکہ حرام ہے۔ یہ حدیث احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداود کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، لہٰذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ ⑤ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دونوں حلال ہیں، چاہے خود مر جائیں یا کسی طریقے سے مار دی جائیں، دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں، ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(١٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً، وَفِي الْآخَرِ شِفَاءً». أَخْرَجَهُ

[12] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہیے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہے۔'' (اسے

١٢ـ أخرجه البخاري، بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب في شراب أحدكم فليغمسه، حديث: ٣٣٢٠، وأبوداود، الأطعمة، حديث: ٣٨٤٤.

الْبُخَارِيُّ وَأَبُودَاوُد، وَزَادَ: «وَ إِنَّهُ يَتَّقِي بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

بخاری اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔) ابوداود کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: ''مکھی (گرتے وقت) اپنے اس پر کے ذریعے سے بچتی ہے جس میں بیماری ہوتی ہے۔''

لغوی تشریح: [اَلذُّبَابُ] ''ذال'' کے ضمہ اور ''با'' کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ سب کی جانی پہچانی چیز' یعنی مکھی۔ اسے ذباب اس لیے کہتے ہیں کہ ذَبَّ کے معنی ہیں: ہٹانا اور اڑانا۔ اسے جب بھی اڑایا جائے یہ پھر آ جاتی ہے' اس لیے اسے بار بار اڑانا پڑتا ہے۔ [شَرَاب] پینے کا ہر مشروب۔ [فَلْيَغْمِسْهُ] ''میم'' کے زیر کے ساتھ۔ غَمْسٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: پانی یا مائع' یعنی بہنے والی چیز میں غوطہ لگانا' ڈبکی مارنا۔ [لِيَنْزِعْهُ] باہر نکالنا' کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں کا ''لام'' لام امر ہے اور معنی یہ ہوئے کہ غوطہ دے کر نکالنا چاہیے۔ [اَلْجَنَاح] سے مراد پر ہے جس کے ذریعے سے پرندہ پرواز کرتا اور اڑتا ہے۔ [دَاءً] بیماری اور مرض اور ایک روایت میں [سَمًّا] (زہر) بھی منقول ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام ابوداود رحمہ اللہ نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ جب مکھی مشروب میں گرنے لگتی ہے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے بیماری والا پر آگے بڑھاتی ہے۔ امام احمد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ کے ہاں یہ ہے کہ مکھی زہر والا پر آگے بڑھاتی ہے اور جس میں شفا ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ (مسند أحمد: ٣/ ٢٤، ٦٧، وسنن ابن ماجه' الطب' باب الذباب يقع في الإناء' حديث: ٣٥٠٤) ② غوطہ دینے اور ڈبکی دے کر نکالنے سے مقصود یہ ہے کہ شفا والے پر کے ذریعے سے بیماری اور زہر زائل ہو جائے۔ ③ حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر مکھی کسی سیال (بہنے والی) چیز میں گر کر مر جائے تو وہ چیز نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس جاندار کے جسم میں بہنے والا خون ہی موجود نہ ہو' مثلاً: شہد کی مکھی' مکڑی' بھڑ وغیرہ اور انھی سے ملتے جلتے دیگر حشرات' اگر یہ پانی میں گر کر مر جائیں تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا' کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو جانور میں وہ خون ہے جو اس کی موت کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ جن حیوانات میں خون گردش ہی نہیں کرتا ان میں یہ (خون رکنے کا) سبب موجود نہیں' اس لیے ایسے جانوروں کے مائع چیز میں گرنے سے چیز ناپاک نہیں ہوگی۔

(١٣) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيمَةِ، وَهِيَ حَيَّةٌ، فَهُوَ مَيِّتٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

[13] حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زندہ جانور میں سے جو کچھ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے۔'' (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور یہ الفاظ بھی انھی کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [مَا قُطِعَ] یہاں مَا موصولہ ہے اور قُطِعَ فعل ماضی مجہول ہے' یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ

١٣_ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصيد، باب إذا قطع من الصيد قطعة، حديث: ٢٨٥٨، والترمذي، الصيد، حديث: ١٤٨٠.

لیا گیا۔ [اَلْبَهِيمَةِ] ہر چار پاؤں والا جانور، مگر چیر پھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ [وَ هِيَ حَيَّةٌ] اس میں ''واؤ'' حالیہ ہے، یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا ہو بلکہ زندہ ہو۔ [فَهُوَ] سے مراد وہ ٹکڑا ہے جو زندہ جانور سے کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو۔ [مَيِّتٌ] وہ مردہ کے حکم میں ہے، اس کا کھانا حرام ہے اور وہ نجس ہے۔ اور پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجاسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

فائدہ: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کاٹا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے، لہٰذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ] ابوواقد کنیت ہے، اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنو عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں، اس لیے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ مکہ کے پڑوس میں رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ یا ۶۸ ہجری میں وفات پائی۔ ان کی عمر ۷۵ یا ۸۵ برس تھی۔ فخ مقام میں مقبرۂ مہاجرین میں دفن کیے گئے۔

٢- بَابُ الْآنِيَةِ

باب:۲- برتنوں کے احکام ومسائل

(١٤) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[14] حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور نہ ان کے پیالوں میں کھایا کرو کیونکہ وہ دنیا میں ان (کافروں) کے لیے ہیں اور آخرت میں تمھارے لیے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [بَابُ الْآنِيَةِ] آنية، إناء کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ أبواب الطهارة کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنھیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاک باز انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ [صِحَافِهَا] یہ صَحْفَة کی جمع ہے جس کے معنی پیالے کے ہیں۔ [لَهُمْ] سے مشرکین مراد ہیں۔ [فِي الدُّنْيَا] یعنی دنیا میں یہ برتن ان کے لیے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کے لیے حلال ہیں بلکہ ان کا عمل بیان کرنا مقصد ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا حرام ہے اور اس پر نص آ چکی

١٤ـ أخرجه البخاري، الأطعمة، باب الأكل في إناء مفضض، حديث: ٥٤٢٦، ومسلم، اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء . . .، حديث: ٢٠٦٧.

ہے نیز ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا ناجائز ہے۔ یہ بات اس حدیث کے عموم میں شامل ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں۔ ② اس حدیث کو اس مقام پر پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ثابت کرنا ہے ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہرات اور یاقوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے' البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملمع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہر حال بہتر اور اولیٰ ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ] حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابیٔ رسول حضرت یمان رضی اللہ عنہ (''میم'' کی تخفیف کے ساتھ) کے بیٹے ہیں۔ راز دان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۵ یا ۳۶ ہجری میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(١٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[15] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [يُجَرْجِرُ] جَرْجَرَةٌ سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت پانی سے جو گلے میں آواز پیدا ہوتی ہے اسے جَرْجَرَة کہتے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خور و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کے لیے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نارجہنم کا ایندھن ہوں گے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا] ان کا نام ہند بنت ابی امیہ ہے۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسود مخزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں' پھر دونوں مدینہ آگئے تھے۔ غزوۂ احد میں ابوسلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے وہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرمالیا۔ ۵۹ یا ۶۲ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس تھی۔ بقیع قبرستان میں دفن ہوئیں۔

(١٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دُبِغَ

[16] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جب کچے چمڑے کو (ادویات

١٥ـ أخرجه البخاري، الأشربة، باب آنية الفضة، حديث: ٥٦٣٤، ومسلم، اللباس، باب تحريم استعمال أواني الذهب والفضة في الشرب وغيره، على الرجال والنساء، حديث: ٢٠٦٥.

١٦ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب طهارة جلود الميتة بالدباغ، حديث: ٣٦٦، وأبوداود، اللباس، حديث: ٤١٢٣، والترمذي، اللباس، حديث: ١٧٢٨، وابن ماجه، اللباس، حديث: ٣٦٠٩، والنسائي، الفرع والعتيرة، حديث: ٤٢٤٦.

الْإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الْأَرْبَعَةِ «أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ».

وغیرہ سے) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔" (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ ہیں: "جونسا چمڑا بھی رنگا جائے۔"

لغوی تشریح: [دُبِغَ] دِباغ سے ماخوذ ہے۔ دُبِغَ صیغۂ مجہول ہے۔ اس کا مطلب ہے: چمڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدبو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ [اَلْإِهَابُ] بروزن اَلْکِتَابُ۔ مطلق چمڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ابھی تک رنگا نہ گیا ہو۔ [أَيُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ] باقی ماندہ الفاظ حدیث یہ ہیں: [فَقَدْ طَهُرَ] اور [أَيُّمَا] عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے' اس لیے اس میں تمام چمڑے شامل ہیں۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چمڑوں کو شامل ہے' البتہ خنزیر' یعنی سور کا چمڑا بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی مستثنیٰ ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چمڑا بھی مستثنیٰ ہے جو غیر مأکول اللحم ہیں' یعنی جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ ② حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چمڑا پاک ہو جاتا ہے' وہ چمڑا خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا' جانور خواہ شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چمڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا' مثلاً: خنزیر کا چمڑا' اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چمڑا' اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ ③ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انھیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے جبکہ یہ رائے صحیح نہیں ہے' اسی طرح احناف کا کتے کے چمڑے کو دباغت کے بعد پاک قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ ④ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ' بال' دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جا سکتی ہیں' نیز ان کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔

(١٧) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ الْمَيْتَةِ طُهُورُهَا». صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[17] حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مردہ جانوروں کے چمڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔" (اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: [سَلَمَہ] "سین' لام اور میم تینوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ [اَلْمُحَبِّق] "میم" کے ضمہ' "حا" کے فتحہ' "با" کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ ہے' البتہ محدثین "با" پر فتحہ کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابوسنان ان کی کنیت ہے۔

١٧۔ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن حبان (موارد الظمآن)، حديث: ١٢٤، وأبوداود، اللباس، حديث: ٤١٢٥، والنسائي، الفرع والعتيرة، حديث: ٤٢٤٨، والحاكم: ٤/ ١٤١، وصححه ووافقه الذهبي -الحسن البصري مدلس وعنعن، والحديث السابق يغني عنه.

بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ ہذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انھیں ان کے بیٹے سنان کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے فرمایا: ''جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔'' ان سے حسن بصری وغیرہ نے حدیثیں روایت کی ہیں۔

(١٨) وَعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِشَاةٍ يَجُرُّونَهَا، فَقَالَ: «**لَوْ أَخَذْتُمْ إِهَابَهَا**» فَقَالُوا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ، فَقَالَ: «**يُطَهِّرُهَا الْمَاءُ وَالْقَرَظُ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[18] حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا گزر ایک (مردہ) بکری کے پاس سے ہوا جسے لوگ گھسیٹتے ہوئے لیے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ''کاش تم اس کی کھال اتار لیتے۔'' انھوں نے کہا: یہ تو مری ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اسے (چمڑے کو) پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دے گی۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْقَرَظُ] ''قاف'' اور ''را'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ کیکر کے پتے اور چھال۔ اس وقت عرب میں اس کے ساتھ چمڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔

فائدہ: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں۔ ان سے برتن بنانا اور ان برتنوں سے وضو وغیرہ کرنا جائز ہے۔

(١٩) وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّا بِأَرْضِ قَوْمٍ أَهْلِ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي آنِيَتِهِمْ؟ قَالَ: «**لَا تَأْكُلُوا فِيهَا إِلَّا أَنْ لَا تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاغْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[19] حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم ایسی قوم کے علاقے میں رہتے ہیں جو اہل کتاب ہیں۔ کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، البتہ اگر ان کے علاوہ اور برتن میسر نہ ہوں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [إِنَّا] ''ہمزہ'' کے کسرہ اور ''نون'' کی تشدید کے ساتھ حرف تاکید ہے اور اس میں ضمیر متکلم بھی ہے۔ [أَهْلِ كِتَابٍ] کتاب والے یہ الفاظ یہود و نصاریٰ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں سوال میں مذکور نصاریٰ ہیں۔ یہ الفاظ یہاں [قَوْمٍ] کی صفت ہیں۔ [أَفَنَأْكُلُ فِي آنِيَتِهِمْ] ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ بعض

١٨ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، اللباس، باب في أهب الميتة، حديث: ٤١٢٦، والنسائي، الفرع العتيرة، حديث: ٤٢٥٣.

١٩ـ أخرجه البخاري، الذبائح والصيد، باب صيد القوس، حديث: ٥٤٧٨، ومسلم، الصيد والذبائح، باب الصيد بالكلاب المعلمة، حديث: ١٩٣٠.

اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے اور ان میں شراب پیتے ہیں جیسا کہ ابوداود اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے پاس رہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ پیو۔'' (سنن أبي داود، الأطعمة، باب في استعمال آنية أهل الكتاب، حديث:٣٨٣٩، ومسند أحمد:١٩٣/٤) آپ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خوردونوش سے احتراز کرنا چاہیے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش آ جائے، پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تو اس صورت میں بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کے لیے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کے لیے ہے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب، یعنی یہود ونصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ان برتنوں میں ناپاک اور نجس چیزیں پکاتے ہیں۔ ② جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود، دہریوں اور ملحدوں کے برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہیے جن میں ناپاک ونجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ] الخشني ''خا'' کے ضمہ اور ''شین'' کے فتحہ کے ساتھ ہے، خشین بن نمر (جس کا تعلق قبیلۂ قضاعہ سے تھا) کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشني کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ انھیں ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ ملک شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۷۵ ہجری میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدے کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور ان کے والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(٢٠) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا : أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَصْحَابَهُ تَوَضَّؤُوا مِنْ مَّزَادَةِ امْرَأَةٍ مُّشْرِكَةٍ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ .

[20] حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزے سے وضو کیا۔ (یہ بخاری ومسلم کی ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَزَادَة] ''میم'' کے فتحہ اور زائے معجمہ کے ساتھ ہے۔ چمڑے کے مشکیزے کو کہتے ہیں جو دو چمڑوں سے بنایا جاتا ہے اور ان کے درمیان تیسرے کو بھی لگا دیا جاتا ہے تاکہ وہ وسیع ہو جائے۔

فائدہ: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی رہنمائی ملتی ہے اور یہ

٢٠ـ أخرجه البخاري، التيمم، باب الصعيد الطيب وضوء المسلم، يكفيه من الماء، حديث: ٣٤٤، ومسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، حديث: ٦٨٢.

اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزے سے آپ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضے میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذبائح تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز اور درست ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ] آپ خزاعی اور کعبی تھے۔ آپ کا شمار اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ آپ کی کنیت ابونجید تھی۔ غزوۂ خیبر کے زمانے میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ یا ۵۳ ہجری میں وفات پائی۔

(٢١) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ اِنْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً مِّنْ فِضَّةٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

[21] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا پیالہ ٹوٹ گیا تو آپ نے اس ٹوٹی ہوئی جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْقَدَح] "قاف" اور "دال" دونوں پر فتحہ ہے۔ چھوٹا پیالہ۔ [اَلشَّعْب] "شین" کے فتحہ اور "عین" کے سکون کے ساتھ ہے۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ [سِلْسِلَة] دونوں جگہ "سین" کے فتحہ کے ساتھ۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانے اور جوڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور دونوں جگہ "سین" کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے: لوہے کی وہ زنجیر جو دھاگے کی طرح باریک ہو۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کے لیے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورتاً اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو اور غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ ② سونے چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور فخر کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور فخر' خالق کائنات کو پسند نہیں' اس لیے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ برتن کو تار کے ذریعے سے پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے' اس میں کبر و غرور کا کوئی عمل دخل نہیں' اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

٣ - بَابُ إِزَالَةِ النَّجَاسَةِ وَبَيَانِهَا

باب: 3- نجاست کا بیان اور اسے دور کرنے کے احکام و مسائل

(٢٢) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى

[22] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

٢١ـ أخرجه البخاري، فرض الخمس، باب ما ذكر من درع النبي ﷺ وعصاه وسيفه وقدحه وخاتمه، حديث: ٣١٠٩.
٢٢ـ أخرجه مسلم، الأشربة، باب تحريم تخليل الخمر، حديث: ١٩٨٣، والترمذي، البيوع، حديث: ١٢٩٤.

عَنْهُ قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الْخَمْرِ تُتَّخَذُ خَلًّا؟ قَالَ: «لَا». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' (اسے مسلم اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَنِ الْخَمْرِ] یعنی حرمت شراب کے بعد شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ [خَلًّا] ''خا'' کے فتحہ اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ ہے اور اس کے معنی شراب یا انگور وغیرہ کے شیرے سے تیار کردہ سرکے کے ہیں، یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنا لینا جائز ہے یا نہیں؟ [قَالَ: «لَا»] اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نہی تحریم کے لیے ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے، البتہ جب شراب خود بخود سرکہ بن جائے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں۔ اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اشیاء میں اصل جواز ہے۔ اور یہی بات راجح ہے۔ ② اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کا حکم آنے کے بعد انھیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اس نقصان سے بچنے کے لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکے میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی جس کے جواب میں آپ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ (سنن أبي داود، الأشربة، باب ما جاء في الخمر تخلل، حديث: ٣٦٧٥) اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ ③ اس حدیث (اور دیگر ادلۂ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(٢٣) وَعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَنَادَى: أَنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ، فَإِنَّهَا رِجْسٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[23] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جس روز غزوۂ خیبر تھا، رسول اللہ ﷺ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا (کہ لوگوں کو مطلع کر دیں) تو انھوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول تمھیں گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ وہ رجس (گندگی) ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [يَوْمُ خَيْبَرَ] غزوۂ خیبر کا دن مراد ہے۔ خیبر مدینہ کی شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ یہ غزوہ یہود کے ساتھ محرم ۷ ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے

٢٣ـ أخرجه البخاري، الجهاد، باب التكبير عند الحرب، حديث: ٢٩٩١، ومسلم، الصيد والذبائح، باب تحريم أكل الحمر الإنسية، حديث: ١٩٤٠.

ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو تیماء اور اریحا کی طرف جلاوطن کر دیا۔ [يَنْهَيَانِكُمْ] میں تثنیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے، یعنی تمھیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ [اَلْحُمُر] ''حا'' اور ''میم'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اس کا واحد حمار ہے، یعنی گدھا۔ [الْأَهْلِيَّةِ] گھریلو یا پالتو (جنگلی نہیں۔) اہل کی طرف نسبت ہے، یعنی وہ جانور جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کی طرح پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ [رِجْسٌ] ''را'' کے کسرہ اور ''جیم'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ ہر وہ چیز جسے انسان گندگی تصور کرتا ہے، خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو، لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

فوائد و مسائل: ① گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے جائز سمجھتے تھے۔ ② گدھے کا جوٹھا پاک ہے یا نہیں، اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ وغیرہ پاک کہتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول ہے کہ یہ نجس ہے۔ امام حسن بصری، ابن سیرین، اوزاعی اور اسحاق رحمہم اللہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اور کوئی پانی نہ ملے تو گدھے کے جوٹھے پانی سے وضو کیا جائے اور تیمم بھی کر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی بات زیادہ قرین صواب ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ واللّٰه أعلم.

راویٔ حدیث: [حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ] ابوطلحہ کنیت اور نام زید بن سہل بن اسود بن حرام انصاری ہے۔ کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتے ہوئے ان کا ہاتھ شل ہو گیا۔ معرکۂ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ یا بقول بعض ۵۱ ہجری میں وفات پائی۔

(٢٤) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ خَارِجَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِمِنًى وَهُوَ عَلٰى رَاحِلَتِهِ، وَلُعَابُهَا يَسِيلُ عَلٰى كَتِفَيَّ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

[24] حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں خطاب فرمایا اور اس سواری (اونٹنی) کا لعاب دہن میرے کندھوں پر بہہ رہا تھا۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِمِنًى] تنوین کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد مکہ مکرمہ کے قریب وہ جگہ ہے جہاں قربانی کے جانور ذبح کیے جاتے ہیں جو کہ حج کے مشہور ترین شعائر میں سے ایک ہے۔ [لُعَابُهَا] ''لام'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی ہے۔

فائدہ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

٢٤ـ [حسن] أخرجه الترمذي، الوصايا، باب ما جاء لا وصية لوارث، حديث: ٢١٢١، وأحمد: ٤/ ١٨٦، ١٨٧ و ٢٣٨، ٢٣٩، وابن ماجه، الوصايا، حديث: ٢٧١٢، والنسائي، الوصايا، حديث: ٣٦٧٢.

راویٔ حدیث: [حضرت عمرو بن خارجہ بن منتفق اسدی رضی اللہ عنہ] بقول بعض اشعری اور بقول شخصے انصاری اور کسی کے بقول جمح قبیلے سے ہیں۔ ابوسفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اشعری ہونے کے بارے میں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی ہیں...... رضی اللہ عنہ...... شام میں سکونت اختیار کی۔ ان کی حدیث اہل بصرہ سے مروی ہے۔

(٢٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَغْسِلُ الْمَنِيَّ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ فِي ذٰلِكَ الثَّوْبِ، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلٰى أَثَرِ الْغَسْلِ فِيهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[25] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) منی کو دھویا کرتے تھے۔ پھر اسی کپڑے کو زیب تن فرما کر نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے جاتے اور میں دھونے کے نشان کو صاف طور پر دیکھ رہی ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

وَ لِمُسْلِمٍ: لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَرْكًا، فَيُصَلِّي فِيهِ.

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

وَفِي لَفْظٍ لَهُ: لَقَدْ كُنْتُ أَحُكُّهُ يَابِسًا بِظُفُرِي مِنْ ثَوْبِهِ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: [أَفْرُكُهُ] اس میں ضمیر متصل "ہ" سے مراد منی ہے۔ "را" کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ جائز ہے۔ باب نَصَرَ يَنْصُرُ اور ضَرَبَ يَضْرِبُ دونوں سے آتا ہے۔ [اَلْفَرْكُ] کے معنی ہیں: مَل کر صاف کرنا یہاں تک کہ نشان اور دھبہ وغیرہ زائل ہو جائے۔ [أَحُكُّهُ] میں بھی ضمیر متصل "ہ" سے مراد منی ہے۔ "حا" کے ضمہ کے ساتھ [حَكٌّ] سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنے اور کھرچنے کے ہیں۔ [يَابِسًا] حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس بارے میں وارد تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں' خواہ وہ خشک ہو یا تر' بلکہ اس کو زائل کرنے کے لیے جبکہ وہ تر ہو اتنا ہی کافی ہے کہ اسے ہاتھ' کپڑے' گھاس یا دیگر اشیاء' مثلاً: لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے صاف کر دیا جائے۔ ② ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تَعَبُّدًا منی کو دھو کر' ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے' اسے مَل کر' کھرچ کر یا رگڑ کر زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کے زائل کرنے کا حکم یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ چیز نجس ہے۔ پس صحیح موقف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے' لہٰذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعے سے اس متاثرہ حصے کو پاک کیا جائے۔ مگر علامہ

٢٥ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب غسل المني وفركه، وغسل ما يصيب من المرأة، حديث: ٢٢٩، ومسلم، الطهارة، باب حكم المني، حديث: ٢٨٩، وانظر حديث: ٢٨٨ للرواية الثانية، وحديث: ٢٩٠ للرواية الأخيرة.

شوکانی رحمہ اللہ ہی نے السیل الجرار اور الدرر البھیّۃ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔ ③ واضح رہے کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آب بینی (ناک کی رطوبت) اور لعاب دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطۂ نظر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام شافعی، داود ظاہری، امام احمد رحمہ اللہ اور صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کرتے ہیں۔ اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرچ دینا ہے۔ چونکہ اس کے بعد کپڑا دھویا نہیں گیا اس لیے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا۔ اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے، ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے۔ اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد، ۳/ ۱۱۹-۱۲۶ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما] ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی شوال ایک ہجری میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف وتوصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ یا ۵۸ ہجری کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ بہت سی احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی براءت آسمان سے نازل ہوئی جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ نور میں ہے۔ نبی ﷺ انھی کے حجرے میں مدفون ہیں۔

(٢٦) وَعَنْ أَبِي السَّمْحِ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ، وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ. وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[26] حضرت ابوسمح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''لڑکی کے پیشاب سے (کپڑا) دھویا جائے اور لڑکے کے پیشاب سے (کپڑے پر) پانی کے چھینٹے مارے جائیں۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ] اس میں مِنْ علت کے لیے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے اور بدن وغیرہ پر لڑکی کا پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ [اَلْجَارِيَة] کے معنی لڑکی، بچی کے ہیں۔ [يُرَشُّ] رَش سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصے پر پانی

٢٦ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب بول الصبي يصيب الثوب، حديث: ٣٧٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ٣٠٥، والحاكم: ١/ ١٦٦، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٥٢٦، وابن خزيمة: ١/ ١٤٣، حديث: ٢٨٣.

غالب آ جائے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے' مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

فوائد ومسائل: ① حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب کی بابت شرعی حکم الگ الگ ہے۔ ② لڑکی کا پیشاب لگنے سے کپڑے کو دھونا اور لڑکے کے پیشاب کے لیے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی مستقل غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کا پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتا ہے۔ ③ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ دلیل نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔ (سبل السلام) ④ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خوارگی کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خوارگی کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ⑤ امام شافعی' امام احمد' ابن وہب' حسن بصری' اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دھونے کو ضروری قرار دیتے ہیں جو کہ صحیح نہیں۔

راویٔ حدیث: [**أبو السَّمح** رضی اللہ عنہ] ''سین'' پر فتحہ اور ''میم'' ساکن۔ "أبو سمح" ان کی کنیت ہے۔ ایاد (''ہمزہ'' کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے خادم تھے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک قول کے مطابق یہ گم ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(٢٧) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي دَمِ الْحَيْضِ يُصِيبُ الثَّوْبَ: «**تَحُتُّهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالْمَاءِ، ثُمَّ تَنْضَحُهُ، ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[27] حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حیض کے خون' جو کپڑے کو لگ جائے' کے متعلق فرمایا: ''پہلے اسے کھرچ ڈالے' پھر پانی سے مل کر دھوئے' پھر اس پر کھلا پانی بہائے اور پھر اس میں نماز پڑھ لے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [تَحُتُّهُ] ''تا'' کے فتحہ' ''حا'' کے ضمہ اور دوسری ''تا'' کی تشدید اور ضمہ کے ساتھ۔ باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ حَتّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ملنے اور کھرچنے کے ہیں۔ اس سے مراد کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کر اور کھرچ کر دور کرنا ہے۔ "ہ" ضمیر منصوب [دم] کی جانب راجع ہے۔ [ثُمَّ تَقْرُصُهُ] اس میں "ہ" ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے۔ تَقْرُصُهُ کی ''را'' پر ضمہ ہے اور باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا جائے' یعنی عورت اس کپڑے پر پانی ڈال کر اچھی طرح

٢٧_ أخرجه البخاري، الوضوء، باب غسل الدم، حديث: ٢٢٧، ومسلم، الإيمان، باب نجاسة الدم وكيفية غسله، حديث: ٢٩١.

بھگو کر تر کر لے' پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اطراف کے ساتھ اچھی طرح مل کر دھوئے تاکہ خون کا جتنا حصہ کپڑے میں جذب ہو چکا تھا' وہ اس سے خارج ہو جائے۔ [ثُمَّ تَنْضَحُهُ] ''ضاد'' پر فتحہ ہے اور اسے کسرہ دینا بھی جائز ہے۔ فَتَحَ يَفْتَحُ اور ضَرَبَ يَضْرِبُ دونوں طرح درست ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ آخر میں اس پر اچھی طرح پانی بہا کر دھو لے۔

فوائد و مسائل: ① خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے' پھر اسے دھونے کا حکم ہے تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھی۔ ② نضح کے لغوی معنی چھینٹے مارنے کے ہیں لیکن اگر پانی سے مل کر دھونے کے بعد وہ کپڑا مشکوک ہے تو محض چھینٹے مار لینا غیر مفید ہے' اس لیے کہ کپڑا اگر پاک ہے تو چھینٹے مارنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر کپڑا ناپاک نہیں ہے تو صرف چھینٹے مارنے سے کپڑا پاک نہیں ہوگا' اس لیے اس مقام پر موقع کی مناسبت سے نضح کے معنی غسل (دھونا) کیے گئے ہیں جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے۔ پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔ ③ خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بہن ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۷۳ ہجری میں اپنے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کیے جانے کے تقریباً ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود ان کا کوئی دانت گرا نہ عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(٢٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَتْ خَوْلَةُ: يَارَسُولَ اللهِ! فَإِنْ لَّمْ يَذْهَبِ الدَّمُ؟ قَالَ: «**يَكْفِيكِ الْمَاءُ، وَلَا يَضُرُّكِ أَثَرُهُ**». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

[28] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا نے استفسار کیا: اے اللہ کے رسول! اگر (خون آلود کپڑے کو دھونے کے باوجود) خون کا نشان ختم نہ ہو تو (پھر کیا کیا جائے)؟ آپ نے فرمایا: ''بس تیرا اسے پانی کے ساتھ دھونا کافی ہے۔ اس کا نشان تیرے لیے ضرر رساں نہیں۔'' (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔)

٢٨_ [حسن] أخرجه الترمذي: لم أجده، وانظر الصحيحة للمحدث الألباني رحمه الله: ١/ ٥٩٣، حديث: ٢٩٨، وأخرجه أبوداود، الطهارة، باب المرأة تغسل ثوبها الذي تلبسه في حيضها، حديث: ٣٦٥ * ابن لهيعة صرح بالسماع عند البيهقي: ٢/ ٤٠٨، وحدث به قبل اختلاطه فالسند حسن، وله طريق آخر عند أحمد: ٢/ ٣٦٤.

لغوی تشریح: [فَإِنْ لَّمْ يَذْهَبْ] یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے، رگڑنے، کھرچنے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا نشان نہ جائے تو [يَكْفِيكَ الْمَاءُ] پانی کے ساتھ دھونا تیرے لیے کافی ہے، اس کے بعد کسی تذبذب، تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے، اس کے باقی ماندہ اثرات ونشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کے لیے شرط نہیں ہے۔

وضاحت: [حضرت خولہ رضی اللہ عنہا] ''خا'' کے فتحہ اور ''واؤ'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی مگر مؤلف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الإصابة)

٤ - بَابُ الْوُضُوءِ

باب: 4- وضو کے احکام ومسائل

(٢٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «**لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ**». أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيقًا.

[29] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری امت مشقت وتکلیف میں مبتلا ہو جائے گی تو میں اسے ضرور ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' (اسے مالک، احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے، نیز اسے بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ الْوُضُوءِ] ''واؤ'' کے ضمہ کے ساتھ۔ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں: ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو مطلق طور پر دھونا۔ اور شرعاً معنی ہیں: وضو کا عمل، جو مشہور ومعروف ہے۔ اگر وضو کو ''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔ [لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ] کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو تکلیف اور مشقت میں مبتلا کر دوں گا۔ [لَأَمَرْتُهُمْ] تو میں ضرور ان کو حکم دیتا، یعنی میں واجب قرار دے دیتا۔ اور رفع مشقت کی غرض سے حکم صادر فرمانے سے رک جانا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسواک کرنے کو مستحب بلکہ اس سے بھی زیادہ مؤکد سمجھا جائے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مستحب ہے۔ صحیح

٢٩ـ [صحيح مرفوعًا] أخرجه مالك في الموطأ، الطهارة، باب ما جاء في السواك: ١/ ٦٦، موقوفًا، وأحمد: ٢/ ٤٦٠، ٥١٧، والنسائي في الكبرى: ٢/ ١٩٨، حديث: ٣٠٤٣، وابن خزيمة: ١/ ٧٣، حديث: ١٤٠، مرفوعًا، والبخاري، تعليقًا، الصوم، باب سواك الرطب واليابس للصائم، قبل حديث: ١٩٣٤، وللحديث شاهد صحيح عند أحمد: ٢/ ٢٥٠، حديث: ٧٤٠٦.

مسلم اور ابوداود میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔(صحیح مسلم، الطهارة، باب السواك، حديث: ۲۵۲، وسنن أبي داود، الطهارة، حديث: ۴۶-۴۷) ② مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ ③ مسند احمد، ابن خزیمہ، حاکم اور دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب بغیر مسواک کیے پڑھی جانے والی نماز سے ستر گنا زیادہ ہے۔ گو یہ روایت سنداً ضعیف ہے، تاہم اس کا ضعف دیگر شواہد کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تخریج صلاۃ الرسول، حافظ عبدالرؤف۔ ④ اگر پہلے سے باوضو ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے مسواک کر لینی چاہیے تاکہ مذکورہ فضیلت حاصل ہو اور اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(٣٠) وَعَنْ حُمْرَانَ مَوْلٰى عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: أَنَّ عُثْمَانَ دَعَا بِوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[30] حضرت حمران مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ (پہلے) اس سے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں۔ پھر منہ میں پانی ڈال کر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھا کر اسے جھاڑ کر صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کہنی سمیت تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر اپنا دایاں پاؤں ٹخنوں سمیت تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں پاؤں ٹخنوں سمیت تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح (ابھی) میں نے وضو کیا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [بِوَضُوءٍ] ''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ [تَمَضْمَضَ] اَلْمَضْمَضَة سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے حرکت دے، پھر باہر پھینک دے۔ [اِسْتَنْشَقَ] اِسْتِنْشَاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کا ناک کے داخلی حصے میں پہنچا کر بذریعۂ سانس اوپر چڑھانا۔ [اِسْتَنْثَرَ] ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا اور اسے جھاڑنا۔ [اَلْمِرْفَقِ] ''میم'' کے کسرہ، ''را'' کے سکون اور ''فا'' کے فتحہ کے ساتھ ہے، یعنی کہنی جو ذراع اور عضد کے درمیان جوڑ والی ہڈی ہے۔ [إِلَى الْكَعْبَيْنِ] ٹخنوں تک۔ پنڈلی اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنھیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے: پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی ﷺ نے اس طرح وضو کر کے فرمایا: [مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا ثُمَّ صَلّٰى

٣٠_ أخرجه البخاري، الوضوء، باب الوضوء ثلاثًا ثلاثًا، حديث: ١٥٩، ومسلم، الطهارة، باب صفة الوضوء وكماله، حديث: ٢٢٦.

رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ ا ''جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا' پھر دو رکعتیں ادا کیں اور اس دوران میں اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

فائدہ: اس حدیث سے اعضائے وضو میں سے ہاتھ، منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں دو دو مرتبہ اور بعض روایات میں ایک ایک مرتبہ دھونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ محدثین فقہاء نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا واجب اور تین تین مرتبہ دھونا مسنون ہے' دو دو مرتبہ دھولیا جائے تو بھی کافی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ واجب صرف ایک مرتبہ دھونا ہے۔

راویٔ حدیث: [حمران رحمہ اللہ] ''حا'' کے ضمہ اور ''میم'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ حمران بن ابان۔ ابان ''ہمزہ'' کے فتحہ اور ''با'' کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک غزوے میں انھیں قید کیا۔ مسیّب بن نجبہ کے حصے میں آئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسیّب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ طبقۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ثقہ ہیں اور ۷۵ ہجری میں فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات ۷۶ اور ۷۱ ہجری بھی ذکر کی ہے۔

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ] عثمان بن عفان تیسرے خلیفۂ راشد اور سابقین اولین میں سے ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو لخت جگر سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں رہیں۔ اسی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ ذوالنورین کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے۔ انھوں نے ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ ہجری کو جمعہ کے روز جام شہادت نوش کیا۔

(۳۱) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ - فِي صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، بَلْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي الْبَابِ.

[31] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ وضو کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا: آپ نے اپنے سر کا مسح ایک مرتبہ کیا۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے' نیز نسائی اور ترمذی نے بھی اسے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے' بلکہ ترمذی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس مسئلے میں یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی فرض ہے۔ اکثر علمائے امت کا یہی مسلک ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ مسح میں تکرار کے قائل ہیں اور دوسرے اعضاء کی طرح تین بار مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال ابوداود کی ایک روایت سے ہے لیکن اکثر احادیث (جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں) کی بنا پر جمہور علماء کا مسلک ہی راجح اور اقرب الی الصواب ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت علی رضی اللہ عنہ] علی بن ابی طالب چوتھے خلیفۂ راشد' حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے والد ماجد اور

۳۱۔ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب صفة وضوء النبي ﷺ، حديث: ١١١ وسنده صحيح، وحديث: ١١٥ وسنده حسن، والترمذي، الطهارة، حديث: ٤٨، والنسائي، الطهارة، حديث: ٩٢-٩٦.

رسول اکرم ﷺ کے حقیقی چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ جنگ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے کیونکہ اس جنگ میں ان کو مدینے میں بطور خلیفہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو منصب خلافت پر فائز ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو جمعہ کے دن بوقت صبح کوفہ میں ایک شقی القلب عبدالرحمٰن بن ملجم نے پے درپے تین وار کر کے شہید کر دیا۔

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[32] حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے طریقہ وضو کے متعلق مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھ آگے لے کر آئے اور پیچھے لے کر گئے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي لَفْظٍ لَّهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتّٰى ذَهَبَ بِهِمَا إِلٰى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ.

بخاری و مسلم کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے: آپ سر کے اگلے حصے سے شروع کر کے ہاتھوں کو (سر کے پچھلے حصے) گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو (سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے) اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لغوی تشریح: [أَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ] یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصے سے شروع کیا اور پھر سر کے آخری حصے یعنی پچھلے حصے تک کیا۔ اس کی وضاحت دوسری روایت میں مذکور جملہ: [بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ] کر رہا ہے۔ [قَفَا] سر کے آخری حصے کو کہتے ہیں جو گردن کے پچھلے حصے کے ساتھ ملحق ہے یعنی گدی۔ [رَجَعَ] رَجْعٌ سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مسح کا آغاز سر کے اگلے حصے سے کرنا چاہیے۔ ائمۂ اربعہ کے علاوہ اسحاق بن راہویہ کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت (جسے امام ترمذی نے حسن کہا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پچھلے حصے سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انھی لوگوں میں سے ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں، اس کا راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حافظے کی وجہ سے جرح کی ہے، لہٰذا مسح کا پہلا طریقہ ہی صحیح ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ] آپ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلۂ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے، اس لیے مازنی کہلائے۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ ہجری میں معرکۂ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوئے۔ یہ عبداللہ بن زید وہ نہیں ہیں جنھوں نے خواب میں اذان سنی تھی بلکہ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبدربہ تھے۔

۳۲۔ أخرجه البخاري، الوضوء، باب مسح الرأس كله، حديث: ۱۸۵، ومسلم، الطهارة، باب آخر في صفة (الوضوء)، حديث: ۲۳۵.

دونوں کے دادا الگ الگ تھے۔ ابن عبدربہ کا ذکر باب الأذان میں آئے گا۔ إن شاء اللّٰه.

(٣٣) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ - قَالَ: ثُمَّ مَسَحَ ﷺ بِرَأْسِهِ وَأَدْخَلَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّاحَتَيْنِ فِي أُذُنَيْهِ، وَمَسَحَ بِإِبْهَامَيْهِ عَلٰى ظَاهِرِ أُذُنَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[33] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے وضو کی کیفیت کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت والی انگلیوں کو کانوں میں داخل کیا اور اپنے انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کیا۔ (اس روایت کو ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلسَّبَّاحَتَيْنِ] إِصْبَعَيْهِ کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اس کا واحد اَلسَّبَّاحَة ہے۔ اَلسَّبَّاحَة اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور انگشت وسطی کے درمیان ہے۔ چونکہ اس سے تسبیح کے وقت اشارہ کیا جاتا ہے اس بنا پر اسے سَبَّاحَة کہتے ہیں۔ سَبَّاحَتَيْنِ اس کا تثنیہ ہے، یعنی دونوں ہاتھوں کی انگشتہائے شہادت۔ [اَلْإِبْهَام] پانچوں انگلیوں میں سب سے پہلی، سب سے زیادہ فائدہ بخش اور رُسغ (گٹ) کے زیادہ قریب، یعنی انگوٹھا۔ [ظَاهِرِ أُذُنَيْهِ] سے مراد دونوں کانوں کا بالائی حصہ ہے۔ یعنی کانوں کی پشت اور بیرونی جانب۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں پر مسح فرمایا ہے۔ ② ظاہر سے مراد کان کا وہ حصہ ہے جو سر کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور باطن وہ ہے جو منہ کی جانب ہوتا ہے، یعنی اندرونی جانب۔ ③ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کانوں کے ظاہر اور باطن پر مسح کی حدیث بیان کر کے کہا ہے کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما] آپ سہمی قریشی ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب کعب بن لؤی پر نبی اکرم ﷺ سے جا ملتا ہے۔ اپنے والد سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اپنے والد محترم سے صرف تیرہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے پائے کے عالم فاضل، حدیث کے حافظ اور عابد تھے۔ بکثرت احادیث نبویہ ان سے مروی ہیں۔ یہ ارشادات نبویہ کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ ٦٣ یا ٧٠ ہجری میں وفات پائی۔ تدفین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ مکہ مکرمہ میں، طائف میں یا مصر میں دفن ہوئے۔

(٣٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ

[34] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین

٣٣_ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الوضوء ثلاثًا ثلاثًا، حديث: ١٣٥، والنسائي، الطهارة، حديث: ١٠٢، وابن خزيمة: ١/ ٧٧، حديث: ١٤٨.

٣٤_ أخرجه البخاري، بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، حديث: ٣٢٩٥، ومسلم، الطهارة، باب الإيتار في الاستنثار والاستجمار، حديث: ٢٣٨.

مِنْ مَنَامِهِ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلاثاً، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيتُ عَلٰى خَيْشُومِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

مرتبہ اپنی ناک جھاڑ کر صاف کرے' اس لیے کہ شیطان اس کی ناک کے نتھنوں کی ہڈی (بانسے) پر رات بسر کرتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [يَبِيتُ] رات گزارتا ہے۔ [خَيْشُومِهِ] ''خا'' کے فتحہ کے ساتھ ہے' اس کے معنی ہیں: ناک کا بالائی حصہ' یعنی ناک کا بانسا۔ بعض کے نزدیک پوری ناک مراد ہے۔

فوائد و مسائل: ① شیطان کا رات گزارنا حقیقت پر بھی محمول ہوسکتا ہے (اور یہی حدیث کے ظاہری معنی کے زیادہ قریب ہے) اور یہ بھی احتمال ہے کہ مجازاً ہو اور اس سے مراد ناک کا وہ فضلہ اور گندگی ہو جو ناک میں جمع ہو کر جم جاتی ہے اور پھر اس کی وجہ سے طبیعت سست اور بوجھل ہو جاتی ہے جو کہ شیطان کی طبیعت اور خوشی کے موافق اور مطابق ہے' اس لیے اس گندگی کو شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ② اس حدیث میں ناک جھاڑنے کا حکم مطلق ہے لیکن اسے یا تو وضو کے ساتھ مقید کیا جائے گا جیسا کہ بعض روایات اس کی تائید بھی کرتی ہیں، تو پھر یہ ناک جھاڑنا افعالِ وضو میں سے شمار ہوگا' یا پھر اسے مطلق ہی شمار کیا جائے گا اور یہ وضو سے پہلے کیا جائے گا اور اسے وضو سے پہلے بطور تیاری کیے جانے والے کاموں سے شمار کیا جائے گا' جیسے استنجا وغیرہ۔ بہر حال جو بھی مراد ہو' مقید یا مطلق' دونوں صورتوں میں یہ حدیث اس باب میں پیش کرنا درست ہے۔

(٣٥) وَعَنْهُ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ حَتّٰى يَغْسِلَهَا ثَلَاثًا، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

[35] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے: ''جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ تین مرتبہ دھونے سے پہلے پانی کے برتن میں نہ ڈالے' کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں کہاں گردش کرتا رہا ہے۔'' (یعنی کس کس چیز کو چھوتا اور مس کرتا رہا ہے۔) (بخاری ومسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [فَلَا يَغْمِسْ] ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کے معنی ہیں: داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ اسے واجب قرار دیتے ہیں۔ جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

فائدہ: حدیث میں مذکور لفظ [فِي الْإِنَاءِ] اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لیے

٣٥۔ أخرجه مسلم، الطهارة، باب كراهة غمس المتوضيء وغيره يده المشكوك ...، حديث: ٢٧٨، والبخاري، الوضوء، باب الاستجمار وترًا، حديث: ١٦٢.

ہے' البتہ نہر اور بڑا حوض وتالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں' ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں یہی رائے بیان کی ہے۔

(٣٦) وَعَنْ لَقِيطِ بْنِ صَبِرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَسْبِغِ الْوُضُوءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الْأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِماً». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَلِأَبِي دَاوُدَ فِي رِوَايَةٍ: «إِذَا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمِضْ».

[36] حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وضو اچھی طرح پورا کرو اور انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں پانی اچھی طرح چڑھاؤ' مگر روزے کی حالت میں (ایسا نہ کرو۔'') (اس روایت کو چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔) اور ابوداود کی ایک روایت کے الفاظ ہیں: '' جب تو وضو کرے تو کلی کر۔''

لغوی تشریح: [أَسْبِغْ] إِسْبَاغ سے فعل امر ہے۔ اسباغ کے معنی ہیں: اعضائے وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔ [خَلِّلْ] تَخْلِيل سے فعل امر ہے۔ خلال یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ [إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا] یعنی روزے دار پانی زیادہ اوپر نہ چڑھائے تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ روزے کے علاوہ عام حالات میں ناک کے اندرون پانی مبالغے سے چڑھانا مستحب ہے۔

فائدہ: اعضائے وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا چاہیے اور ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا چاہیے تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راویٔ حدیث: [حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ] ''لام'' کے فتحہ اور ''قاف'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صبرہ ''صاد'' کے فتحہ اور ''با'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نسب نامہ یوں ہے: لقيط بن صبرة بن عبدالله بن المنتفق بن عامر العامري رضی اللہ عنہ۔ وفد بنو منتفق کے قائد تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں جو ابورزین عقیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ وغیرہ کی رائے یہی ہے۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام مسلم رحمہ اللہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (الإصابة۔ تهذيب)

(٣٧) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ: أَنَّ

[37] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وضو

٣٦۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الاستنثار، حديث: ١٤٢- ١٤٤، والترمذي، الطهارة، حديث: ٣٨، والنسائي، الطهارة، حديث: ٨٧، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٤٤٨، وابن خزيمة: ١/ ٧٨، حديث: ١٥٠.

٣٧۔ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في تخليل اللحية، حديث: ٣١، وقال: "حسن صحيح"، وابن خزيمة: ١/ ٧٨، ٧٩، حديث: ١٥١، ١٥٢ - عامر بن شقيق حسن الحديث ولحديثه شواهد.

النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ فِي الْوُضُوءِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

کرتے ہوئے اپنی ڈاڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: ڈاڑھی کا خلال نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون عمل ہے۔

(٣٨) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِثُلُثَيْ مُدٍّ فَجَعَلَ يَدْلُكُ ذِرَاعَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[38] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے (دھونے اور تر کرنے کے لیے) بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أُتِيَ] فعل مجہول ہے جس کی نسبت مفعول کی طرف ہوتی ہے۔ [مُدٍّ] ''میم'' کے ضمہ اور ''دال'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اور یہ پانی کا پیمانہ ہے جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سماتا ہے۔ یہ آج کل کی اصطلاح میں آٹھ سوملی لیٹر بنتا ہے۔ [يَدْلُكُ] ملتے ہوئے دھونا۔ [ذِرَاعَيْهِ] ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصے کو ذراع، یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ نبی ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

فوائد و مسائل: ① دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث صحیح ہے۔ اور بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مد سے وضو کیا۔ (صحيح البخاري، الوضوء، باب الوضوء بالمد، حديث:٢٠١ وصحيح مسلم، الحيض، حديث: ٣٢٥) ② حجازی مد انگریزی سیر سے کچھ کم کا ہوتا ہے۔ ایک صاع میں چار ''مد'' ہوتے ہیں اور ایک صاع آج کل کے حساب سے تین لیٹر دوسوملی لیٹر کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک مد تین سو تیرہ گرام (تقریباً بارہ چھٹانک) ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(٣٩) وَعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأُذُنَيْهِ مَاءً خِلَافَ الْمَاءِ الَّذِي أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضًا.

[39] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپ جو پانی سر کے مسح کے لیے لیتے تھے، کانوں کے مسح کے لیے اس سے الگ پانی لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ اور اسے ترمذی نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔)

٣٨۔ [صحيح] أخرجه أحمد: ٤/ ٣٩، وابن خزيمة: ١/ ٦٢، حديث: ١١٨ واللفظ له، وصححه ابن حبان (الموارد)، حديث: ١٥٥، والحاكم: ١/ ١٤٤ و ١٦١، ١٦٢ على شرط الشيخين، ووافقه الذهبي.

٣٩۔ [صحيح] أخرجه البيهقي: ١/ ٦٥، وقال: "هذا إسناد صحيح"، ومسلم، الطهارة، باب آخر في صفة (الوضوء)، حديث: ٢٣٦، والحديثان محفوظان، والحمد لله.

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ بِلَفْظِ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ. وَهُوَ الْمَحْفُوظُ.

اور مسلم میں اسی سند سے یہ روایت ان الفاظ سے منقول ہے: آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا۔ یعنی نیا پانی استعمال کیا۔ اور مسلم کی یہی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: [وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ] سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں، ملاحظہ ہو: (صحيح مسلم، الطهارة، باب آخر في صفة الوضوء، حديث:٢٣٦) [مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ] کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ [بِمَاءٍ] "ہمزہ" تنوین کے ساتھ مجرور ہے۔ گرامر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور [غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ] اس کی صفت ہے۔ اور فَضْل کے معنی ضرورت سے زائد چیز کے ہیں، یعنی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملے کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ مسح کے لیے نیا پانی لیا۔ [وَ هُوَ الْمَحْفُوظُ] سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق اور جن الفاظ سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا مشروع ہے، مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کے لیے نیا پانی لینا ثابت نہیں، البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے تحفة الأحوذي: (۱/ ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث، جس پر کلام نہ ہو، سے واقف نہیں ہو سکا جس میں یہ بیان ہو کہ آپ نے کانوں کے لیے نیا پانی لیا۔ ہاں، ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے موطأ میں نافع کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کے لیے نیا پانی لیتے تھے۔ والله أعلم.

فوائد و مسائل: امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا چاہیے۔ مگر امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کے لیے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی، ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے: [فَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَأُذُنَيْهِ] کہ آپ ﷺ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ (السنن الكبرى للبيهقي، الطهارة، باب غسل اليدين: ۱/ ۵۵، ۲۳۷ و ابن خزيمة، حديث: ۱۴۸، و ابن حبان، حديث: ۱۰۸۶ واللفظ له) والله أعلم بالصواب.

(٤٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ

[40] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے

٤٠ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب فضل الوضوء والغر المحجلون من آثار الوضوء، حديث: ١٣٦، ومسلم، الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل في الوضوء، حديث: ٢٤٦ وسنده صحيح ولا عبرة بمن أعله بالإدراج "فمن استطاع" إلى آخره، لأنه لم يأت بدليل قوي. والأصل عدم الإدراج. وللحديث شواهد، ولو كان من قول أبي هريرة رضي الله عنه فله حكم الرفع، والحمد لله.

قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''قیامت کے روز میری امت کے لوگ ایسی حالت میں آئیں گے کہ وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے، چنانچہ تم میں سے جو شخص اس چمک اور روشنی کو زیادہ بڑھا سکتا ہو تو اسے ضرور ایسا کرنا چاہیے۔'' (بخاری ومسلم- اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [غُرًّا] یَأْتُونَ کی هُمْ ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ ''غین'' پر ضمہ اور ''را'' پر تشدید ہے۔ أَغَرّ کی جمع ہے۔ اور أَغَرّ اسے کہتے ہیں جس کے لیے سفیدی ہو۔ اور غُرَّۃ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ [مُحَجَّلِينَ] تَحْجِيل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے۔ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے' ہاتھ اور پاؤں چمک رہے ہوں گے۔ [يُطِيلُ] إِطَالَة سے ماخوذ ہے۔ دراز' لمبا اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ [غُرَّتَهُ] اپنے چہرے کی چمک اور روشنی اور اسی طرح ہاتھ اور پاؤں کی روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک پانی پہنچانا لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچانا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اعضائے وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا' مثلاً: ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راویٔ حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں، مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے مستحب نہیں سمجھتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ حد فرض سے زیادہ دھونا پسندیدہ امر نہیں۔ دیکھیے: (تيسير العلام شرح عمدة الأحكام: ١/ ٤٦-٤٨) دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین تین مرتبہ دھوئے۔ اور تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے۔ اور ہر وقت باوضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ ② اس آخری جملے کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند احمد اور فتح الباری میں ہے۔ (١/ ٢٣٦' حدیث: ١٣٦) اس لیے اس سے مقررہ حد سے زائد حصے کو دھونے کے استحباب پر استدلال محل نظر ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (إغاثة اللهفان: ١/ ٢٠٠)

(٤١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُورِهِ، وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ.

[41] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جوتا پہننے' بالوں میں کنگھی کرنے اور طہارت (وضو' غسل وغیرہ) بلکہ ہر کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔

٤١ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب التيمن في الوضوء والغسل، حديث: ١٦٨، ومسلم، الطهارة، باب التيمن في الطهور وغيره، حديث: ٢٦٨.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ] یعنی آپ کو دائیں جانب کو مقدم کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ [فِي تَنَعُّلِهِ] ''جوتا پہننے میں۔'' [وَ تَرَجُّلِهِ] ''اور بالوں میں کنگھی کرنے میں۔''

فوائد و مسائل: ① نبی ﷺ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے، مثلاً: مسجد میں داخل ہونے، نماز سے فارغ ہونے کے وقت سلام پھیرنے، اعضائے وضو کو دھونے، کھانے پینے، مصافحہ کرنے، دودھ دوہنے، لباس پہننے، سرمہ لگانے اور مسواک وغیرہ کرنے میں۔ ② دور جدید کا مسلمان ان گراں مایہ چیزوں کو فراموش کر بیٹھا ہے اور غیروں کی نقالی میں دائیں کی بجائے بائیں جانب کو پسند کرنے لگا ہے۔ یہ بڑی قابل افسوس بات ہے۔

(٤٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَءُوا بِمَيَامِنِكُمْ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[42] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم وضو کرنے لگو تو اپنی دائیں جانب سے ابتدا کرو۔'' (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن معناً صحیح ہے جیسا کہ دیگر صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آپ کو ہر اچھے کام کی ابتدا میں دایاں پہلو ہی پسند اور محبوب تھا۔ خود بھی اسی پر عمل پیرا رہے اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ دائیں جانب سے ابتدا کرو۔

(٤٣) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَالْخُفَّيْنِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[43] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی کے بالوں، پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِنَاصِيَتِهِ] سر کا اگلا حصہ جہاں سے بال شروع ہوتے ہیں، یعنی پیشانی سے متصل وہ جگہ جہاں بال اگتے ہیں۔ [اَلْعِمَامَةِ] اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا جاتا ہے اور سر پر باندھنے کے لیے اسے کئی بل دینے پڑتے ہیں۔ [اَلْخُفَّيْنِ] خُفٌّ کا تثنیہ ہے۔ پاؤں میں ٹخنوں تک جو چیز پہنی جائے اسے خف، یعنی موزہ کہتے ہیں جو چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ محض پیشانی پر مسح کرنا کافی نہیں۔ ② پگڑی پر مسح کے جمہور

٤٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، اللباس، باب في الانتعال، حديث: ٤١٤١، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٤٠٢، وأحمد: ٢/ ٣٥٤، وابن خزيمة: ١/ ٩١، حديث: ١٧٨، وابن حبان (الموارد)، حديث: ١٤٧، ١٤٥٢ * رواه شعبة عن الأعمش به بلفظ: كان إذا لبس قميصًا (وفي رواية ثوبًا) بدأ بميامنه، رواه الترمذي، اللباس، حديث: ١٧٦٦ وسنده صحيح، والنسائي في الكبرٰى، حديث: ٩٦٦٩.

٤٣ـ أخرجه مسلم، الطهارة، باب المسح على الناصية والعمامة، حديث: ٢٧٤.

قائل نہیں۔ ③ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کبھی صرف ننگے سر پر مسح فرما لیتے اور کبھی پگڑی پر اور کبھی پگڑی اور پیشانی سمیت دونوں پر' البتہ صرف پیشانی پر مسح کرنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ ④ یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موزوں پر مسح کرنا جائز ہے' اسی طرح یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ پگڑی پر مسح جائز اور درست ہے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں: پہلی صورت یہ کہ کچھ مسح سر پر کیا جائے اور کچھ پگڑی پر' اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح کیا جائے۔ ترمذی میں منقول ایک صحیح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے۔ (جامع الترمذي' الطهارة' باب ما جاء في المسح على العمامة' حديث:١٠٠'١٠١) نیز حضرت ابوبکر' عمر' انس اور کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز' حسن بصری' مکحول' ابوثور' امام احمد' اوزاعی' اسحاق بن راہویہ اور وکیع رحمہم اللہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علاوہ باقی ائمۂ ثلاثہ محض پگڑی پر مسح کو ناکافی سمجھتے ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعیسیٰ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ غزوۂ خندق کے ایام میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے' یہ ان کا پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفے کے گورنر مقرر ہوئے اور ۵۰ ہجری میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا - فِي صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ ﷺ: «اِبْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ هٰكَذَا بِلَفْظِ الْأَمْرِ، وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ بِلَفْظِ الْخَبَرِ.

[44] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کے حج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آغاز اسی چیز سے کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے آغاز کیا ہے۔'' (اسے نسائی نے اسی طرح امر کے صیغے کے ساتھ روایت کیا ہے جبکہ اسے امام مسلم نے جملہ خبریہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ] دراصل یہ اشارہ ہے اس لمبی حدیث کی طرف جو کتاب الحج میں بیان ہوگی۔ [اِبْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ] جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے فرمایا ہے اسے عملاً پہلے انجام دیا جائے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ نبی ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا جب آپ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا عزم کیا کہ پہلے صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صفا کا ذکر پہلے کیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرة ٢:١٥٨) لیکن مصنف حدیث کا اتنا ٹکڑا وضو کے باب میں یہ اشارہ کرنے کے لیے لائے ہیں کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خاص ہونے کا' یعنی سبب نزول اگرچہ خاص ہو لیکن لفظ عام ہوں تو دوسرے مسائل سے بھی تعلق ہو سکتا ہے۔ اب یہاں دیکھیے کہ اس فرمان کو آپ نے سعی کے مسئلے کے بارے میں مخصوص طور پر ذکر کیا ہے لیکن اس کے لفظ کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ کے ضمن

٤٤ـ [إسناده صحيح] أخرجه النسائي، مناسك الحج، باب القول بعد ركعتي الطواف، حديث: ٢٩٦٥، ومسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: ١٢١٨.

میں وضو کی آیت بھی داخل ہے اور وہ ہے: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المآئدة ٥:٦) اس بنا پر وضو میں چہرہ پہلے دھویا جائے گا اور باقی ماندہ اعضاء علی الترتیب دھوئے جائیں گے [بِلَفْظِ الْخَبَرِ] سے مراد ہے کہ [اِبْدَءُوا] کی بجائے آپ نے [نَبْدَءُ] فرمایا' چنانچہ نسائی نے صیغۂ امر اِبْدَءُوا اور مسلم نے جملہ خبریہ' یعنی نَبْدَءُ نقل کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① مصنف اس حدیث کو باب الوضوء میں لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اعضائے وضو کے دھونے میں بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہیے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے' جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ﴾ یعنی سعی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے۔ ② آیت وضو میں چہرے کا دھونا پہلے مذکور ہے' ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں' اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما] ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ انصار کے قبیلۂ ''سلم'' سے تعلق کی بنا پر انصاری سلمی کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ جنگ بدر میں شریک تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ انھوں نے بدر و احد کے علاوہ باقی غزوات میں شرکت کی تھی۔ جنگ صفین میں بھی موجود تھے۔ یہ حفاظِ حدیث صحابہ میں سے تھے اور ان سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ ۷۴ ہجری میں ۹۴ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(٤٥) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَدَارَ الْمَاءَ عَلَى مِرْفَقَيْهِ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[45] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی بہاتے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَدَارَ الْمَاءَ] پانی بہانا۔ یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں قاسم بن محمد بن عبداللہ عقیل متروک راوی ہے۔

(٤٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا وُضُوءَ لِمَنْ لَّمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ

[46] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''وضو کا آغاز کرتے وقت جس نے بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں۔'' (اس حدیث کو احمد' ابوداود

٤٥ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الدارقطني، الطهارة، باب وضوء رسول الله ﷺ: ١/ ٨٣ وقال: "[القاسم بن محمد بن عبدالله] ابن عقيل ليس بقوي" قلت: بل هو متروك كما قال أبوحاتم الرازي وغيره، وفيه علة أخرى.

٤٦ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في التسمية على الوضوء، حديث: ١٠١، وأحمد: ٢/ ٤١٨، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٩٩، ومسند ابن ماجه، حديث: ٣٩٧ حسن وبه حسنت الحديث، والترمذي، الطهارة، حديث: ٢٥، ٢٦ وهو حديث ثابت والحمد لله.

وَابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ زَيْدٍ وَأَبِي سَعِيدٍ نَحْوَهُ. وَقَالَ أَحْمَدُ: لَا يَثْبُتُ فِيهِ شَيْءٌ.

اور ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے اس حدیث کو سعید بن زید اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں۔)

فوائد و مسائل: ① [لَا وُضُوءَ] یہ عبارت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بِسْمِ اللّٰہ کا پڑھنا وضو کے لیے رکن یا شرط ہے کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے جیسا کہ لائے نفی جنس سے یہی مراد ہوتا ہے۔ لیکن امام احمد رحمہ اللہ اس کی بابت فرماتے ہیں کہ اس کے متعلق کوئی چیز ثابت نہیں، البتہ اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن صلاح، ابن کثیر اور علامہ عراقی رحمہم اللہ وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر کے عظیم محقق علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے، لہٰذا اسے پڑھنا سنت ہے، اس لیے ہر وضو کرنے والے کو وضو کی ابتدا میں بسم اللہ پڑھ لینی چاہیے۔ ② ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ داود ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عمداً بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا اور یہی بات راجح ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ] سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہیں۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان دس خوش قسمت ترین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنھیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرۂ اسلام میں آنے کا ذریعہ اور سبب یہی خاوند بیوی بنے۔ معرکۂ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵۱ ہجری میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(٤٧) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصَرِّفٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالْاِسْتِنْشَاقِ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[47] حضرت طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا کہ آپ کلی اور ناک صاف کرنے کے لیے الگ الگ پانی لیتے تھے۔ (اس روایت کو ابوداود نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَفْصِلُ] فرق کرتے تھے، یعنی آپ کلی کرنے کے لیے الگ پانی لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کے لیے الگ لیتے تھے۔

فائدہ: اس حدیث سے کلی اور ناک کے لیے الگ الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے

٤٧ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الفرق بين المضمضة والاستنشاق، حديث: ١٣٩، فيه ليث بن أبي سليم ضعيف مدلس، والحديث ضعفه النووي في المجموع: ١/ ٤٦٤.

ضعیف ہے' کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ نبی ﷺ ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کلی بھی کر لیتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آ رہا ہے۔

راوی حدیث: [طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابومحمد یا ابوعبداللہ ہے۔ مصرف کا اعراب ''میم'' کے ضمہ اور ''را'' کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔ ثقہ اور جلیل القدر تابعین میں شمار کیے گئے ہیں۔ طبقہ خامسہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت تھے۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کا والد مصرف مجہول الحال ہے' اسی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔ [عَنْ جَدِّہِ] ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن جحدب یامی رضی اللہ عنہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ ''یام'' کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق انھوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت کا انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

(٤٨) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ -: ثُمَّ تَمَضْمَضَ ﷺ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا، يُمَضْمِضُ وَيَنْثُرُ مِنَ الْكَفِّ الَّذِي يَأْخُذُ مِنْهُ الْمَاءَ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[48] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وضو کے بیان میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا۔ آپ کلی اور ناک میں پانی اسی ہاتھ سے داخل کرتے جس سے پانی لیتے تھے۔ (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يُمَضْمِضُ وَيَنْثُرُ مِنَ الْكَفِّ الَّذِي يَأْخُذُ مِنْهُ الْمَاءَ] یعنی چلو بھر پانی لیتے' اس میں سے کلی کرنے کے لیے کچھ پانی منہ میں داخل کرتے اور بقیہ پانی ناک میں چڑھاتے۔ یہ عمل آپ تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں [يَنْثُرُ] اِسْتِنْشَاق کے معنی میں ہے' یعنی ناک میں پانی ڈالنا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک ہی چلو پانی' منہ اور ناک دونوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ② یہ بھی ثابت ہوا کہ اس عمل کو آپ ﷺ تین مرتبہ کرتے تھے۔ ③ نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ آپ بائیں ہاتھ سے ناک جھاڑتے تھے جبکہ دائیں ہاتھ سے منہ اور ناک میں پانی داخل کرتے تھے۔

(٤٩) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ -: ثُمَّ أَدْخَلَ ﷺ يَدَهُ

[49] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے وضو کے بیان میں مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا' پھر کلی کی

٤٨ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب صفة وضوء النبي ﷺ، حديث: ١١١، والنسائي، الطهارة، حديث: ٩٢.

٤٩ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب من مضمض واستنشق من غرفة واحدة، حديث: ١٩١، ومسلم، الطهارة، باب آخر في صفة (الوضوء)، حديث: ٢٣٥.

فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ، يَفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلَاثًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور ناک میں پانی چڑھایا۔ آپ نے ایک ہی چلو سے تین بار ایسا کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ] کف مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چلو بھر پانی مراد ہے۔ آپ نے کلی کرنے کے لیے تھوڑا سا پانی منہ میں ڈالا اور باقی ناک صاف کرنے کے لیے ناک میں چڑھایا۔

فوائد و مسائل: ① دونوں احادیث کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کے لیے ایک ہی چلو کے کفایت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ ② طلحہ بن مصرف کی حدیث علیحدگی اور تفریق کی مقتضی ہے، لیکن وہ مصرف کے مجہول الحال ہونے اور ضعیف راوی لیث بن ابی سلیم کی بنا پر ضعیف ہے۔ ③ صاحب السبل نے کہا ہے کہ دونوں طرح کی روایات کے بارے میں اقرب الی الصواب بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جس پر چاہے عمل کر لے۔ دونوں طرح سنت ہے اگرچہ جمع کرنے کی روایات تعداد میں زیادہ ہیں اور صحیح بھی ہیں تاہم جب تفریق والی روایات ضعیف ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو روایات صحیح اور متعدد ہیں ان پر عمل کیا جائے۔ واللہ أعلم.

(٥٠) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا وَفِي قَدَمِهِ مِثْلُ الظُّفُرِ لَمْ يُصِبْهُ الْمَاءُ، فَقَالَ: «اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[50]۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جس کے پاؤں میں ناخن برابر جگہ پر پانی نہیں پہنچا تھا، یعنی خشک رہ گئی تھی۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ ''واپس جاؤ اور اچھی طرح عمدہ طریقے سے وضو کرو۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ② ایک دوسری حدیث میں ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کے لیے آگ ہے۔ (صحیح مسلم، الطهارة، باب وجوب غسل الرجلين بكماله، حديث: ۲۴۱) ③ ابوداود میں بھی خالد بن معدان سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ جا، پہلے دوبارہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ (سنن أبي داود، الطهارة، باب تفريق الوضوء، حديث: ۱۷۵) ④ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کا دھونا فرض ہے، مسح ناکافی ہے۔ ⑤ انھی احادیث کی روشنی میں ائمۂ اربعۂ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا ہے۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں ان احادیث سے ان کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

٥٠۔ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب تفريق الوضوء، حديث: ۱۷۳، والنسائي: لم أجده، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٦٦٥، وأحمد: ۳/ ۱٤٦، ومسلم من حديث عمر، الطهارة، حديث: ۲٤۳.

(٥١) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[51] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ''مد'' پانی سے وضو اور ایک ''صاع'' (چار مد) سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [اَلصَّاع] چار مد کا ہوتا ہے اور مد ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجودہ زمانے کے پیمانے کے حساب سے تقریباً تین لیٹر دو سو ملی لیٹر کا ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کے لیے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① وضو اور غسل کے لیے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جتنا نبی اکرم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ ② صحیح مسلم میں ایک ''فرق'' پانی سے نبی ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ (صحیح مسلم' الحیض' باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة...' حدیث:٣١٩) ''فرق'' ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً نو لیٹر اور چھ ملی لیٹر پانی آ تا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی ﷺ دونوں ایک ''فرق'' سے غسل فرمالیا کرتے تھے۔ ③ اسی بنا پر امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین نہیں کی گئی بلکہ یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔

(٥٢) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسْبِغُ الْوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ».

[52] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے' پھر یوں کہے: [أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ] ''میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں' وہ یکتا ہے' اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔'' تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں' جس سے چاہے

٥١۔ أخرجه البخاري، الوضوء، باب الوضوء بالمد، حديث: ٢٠١، ومسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة، وغسل الرجل والمرأة في إناء واحد في حالة واحدة...، حديث: ٣٢٥)

٥٢۔ أخرجه مسلم، الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، حديث: ٢٣٤، دون الزيادة وهو حديث صحيح، والترمذي، الطهارة، حديث: ٥٥، بالزيادة وسند الترمذي ضعيف.

داخل ہو جائے۔'' (اسے مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔)
اور ترمذی نے یہ اضافہ کیا ہے: ''اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں سے کر دے۔''

لغوی تشریح: [إِلَّا فُتِحَتْ] یہ إِلَّا استثنا کا ہے' اس سے مقصود کلام اول میں موجود نفی سے استثنا ہے اور یہ اسلوبِ عبارت کلام میں حصر پیدا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اور [فُتِحَتْ] صیغۂ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغۂ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے۔ جس طرح گزرے ہوئے زمانے کا یقین ہوتا ہے' اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لابدی امر ہے۔ [وَزَادَ] یعنی امام ترمذی نے [مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ] نقل کرنے کے بعد [اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي ...... الخ] کے الفاظ مزید نقل کیے ہیں۔ [اَلتَّوَّابُ] میں ''واؤ'' مشدد ہے۔ اس کے معنی ہیں: کثرت سے توبہ کرنے والا شخص۔

راویٔ حدیث: [حضرت عمر رضی اللہ عنہ] مراد عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی کنیت ابوحفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انھوں نے آفاق ارض کو حکم' عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلۂ قریش کے سفیر تھے۔ ٦ نبوت ذی الحجہ کو دار ارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید اور بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق' فارس' شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے مجوسی غلام ابولؤلؤ کے قاتلانہ حملے سے یکم محرم' ٢٤ ہجری میں شہادت پائی۔

٥ - بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب:5- موزوں پر مسح کرنے کے احکام و مسائل

(٥٣) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: «**دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ**» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[53] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا' آپ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپ کے موزے اتارنے کے لیے جھکا۔ آپ نے فرمایا: ''انھیں چھوڑ دو' میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو یہ دونوں پاؤں (وضو سے) پاک تھے۔'' پھر آپ نے ان دونوں پر مسح فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

٥٣ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب إذا أدخل رجليه وهما طاهرتان، حديث: ٢٠٦، ومسلم، الطهارة، باب المسح على الخفين، حديث: ٢٧٤.

لغوی تشریح: [فَأَهْوَيْتُ] میں نے اپنے ہاتھوں کو بڑھایا' یا پھر یہ معنی ہیں کہ حالت قیام سے نیچے جھکا۔ [لِأَنْزِعَ] أُخْرِجَ کے معنی میں ہے کہ میں اتاروں۔ [خُفَّيْهِ] آپ کے موزے۔ [دَعْهُمَا] اُتْرُكْ کے معنی میں ہے' یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ [طَاهِرَتَيْنِ] حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک حالت میں داخل کیے تھے' اس لیے موزوں کو نہ اتارو۔ اور ابوداود کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کیے تھے اس وقت وہ پاک تھے۔ (سنن أبي داود' الطهارة' باب المسح على الخفين' حديث: ۱۵۱)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ② ابوداود اور موطأ امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔ (سنن أبي داود' الطهارة' باب المسح على الخفين' حديث:۱۴۹' والموطأ للإمام مالك' الطهارة' باب ماجاء في المسح على الخفين' حديث:۴۱)

(٥٤) وَلِلْأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلَّا النَّسَائِيَّ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الْخُفِّ وَأَسْفَلَهُ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

[54] نسائی کے علاوہ باقی (سنن کی) تینوں (کتابوں) میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔ (اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہیے مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح وحسن روایات کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ احادیث میں آ رہا ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں' اس لیے یہ روایت ضعیف ہے۔

(٥٥) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَ الدِّينُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلُ الْخُفِّ أَوْلَى بِالْمَسْحِ مِنْ أَعْلَاهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

[55] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: اگر دین کا دارومدار رائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی نچلی سطح پر مسح کرنا اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزے کے صرف بالائی حصے پر مسح کرتے دیکھا ہے۔ (اسے ابوداود نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① یہ روایت ہمارے محقق کے نزدیک سنداً ضعیف ہے' تاہم جو بات اس میں بیان ہوئی ہے وہ درست ہے۔ علاوہ ازیں دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود للألباني' حديث:

٥٤۔ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب كيف المسح، حديث: ١٦٥، والترمذي، الطهارة، حديث: ٩٧، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٥٥٠، الوليد بن مسلم لم يصرح بالسماع المسلسل، وفيه علة أخرى.

٥٥۔ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب كيف المسح، حديث: ١٦٢، أبوإسحاق عنعن.

۱۶۲) ② اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے' عقل ورائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کی بجائے نچلی سطح پر مسح کرنا زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ گندگی سے نچلا حصہ آلودہ ہوتا ہے' لہٰذا نص کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(٥٦) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْرًا أَنْ لَّانَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ، وَلٰكِنْ مِّنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَصَحَّحَاهُ.

[56] حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم مسافر ہوتے تو نبی ﷺ ہمیں حکم دیتے کہ ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں' الا یہ کہ حالت جنابت لاحق ہو جائے' البتہ بیت الخلا جانے کی صورت میں' نیز پیشاب اور نیند کی وجہ سے بھی اتارنے کی ضرورت نہیں۔'' (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور الفاظ ترمذی کے ہیں، نیز اسے ابن خزیمہ نے بھی روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن خزیمہ دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [سَفْرًا] ''سین'' کے فتحہ اور ''فا'' کے سکون کے ساتھ ہے۔ مُسَافِرِينَ کے معنی میں ہے، سَافِرٌ کی جمع ہے جیسے رَكْبٌ اور تَجْرٌ، رَاكِبٌ اور تَاجِرٌ کی جمع ہیں۔ [خِفَافٌ] خُفٌّ کی جمع ہے۔ [إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ] یہ [أَنْ لَّا نَنْزِعَ] کی نفی سے استثنا ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں' خواہ ابھی تین دن اور تین راتیں مدت پوری نہ ہوئی ہو' البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں' تین دن اور تین راتیں مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

فوائد و مسائل: ① موزوں پر مسح بلااختلاف جائز ہے۔ ② موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد اسی (۸۰) کے لگ بھگ ہے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ ③ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ ④ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔ ⑤ مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے۔ مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے بعد وضو کرتے وقت پہلے مسح سے شروع ہوگا' موزے پہننے کے وقت سے نہیں' مثلاً: ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کے لیے آغاز مدت وضو کرتے وقت پہلے مسح سے ہوگا نہ کہ وضو ٹوٹنے کے وقت سے۔ ⑥ مسح کا طریقہ اس طرح ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پانی سے تر کر کے ان کے پوروں کو پاؤں کی انگلیوں سے پنڈلی کے آغاز تک کھینچ لیا جائے۔ ⑦ حدث لاحق ہونے (بے وضو ہونے) کی صورت میں اگر موزہ اتار لیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اختتام مدت کے بعد بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔ اور بعینہ یہ سارے احکام جرابوں پر مسح کے بھی ہیں۔ اور ہر قسم کی جراب'

٥٦ـ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، الطهارة، باب المسح على الخفين للمسافر والمقيم، حديث: ٩٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ١٢٧، وابن خزيمة: ١/ ٩٩، حديث: ١٩٦.

خواہ موٹی ہو یا باریک' اس پر مسح جائز ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ] صفوان "صاد" کے فتحہ اور "فا" کے سکون کے ساتھ ہے۔ عَسَّال "عین" کے فتحہ اور "سین" کی تشدید کے ساتھ ہے۔ صفوان بن عسال مرادی جملی' مشہور و معروف صحابی ہیں۔ نبی ﷺ کی قیادت میں لڑے جانے والے ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے۔

(٥٧) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِلْمُقِيمِ، يَعْنِي فِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[57] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی ﷺ نے مسافر کے لیے موزوں پر مسح کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن رات مدت مقرر فرمائی ہے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

(٥٨) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَرِيَّةً فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوا عَلَى الْعَصَائِبِ، يَعْنِي الْعَمَائِمَ، وَالتَّسَاخِينِ، يَعْنِي الْخِفَافَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[58] حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ (چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور انھیں پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [سَرِيَّةٌ] "سین" کے فتحہ "را" کے کسرہ اور "یا" کی تشدید کے ساتھ ہے۔ چھوٹا سا لشکر جسے دشمن کے علاقے میں بھیجا جاتا ہے۔ اہل مغازی نے سریہ اس کو قرار دیا ہے جس میں رسول اکرم ﷺ بنفس نفیس شامل نہ ہوئے ہوں۔ اور جس میں آپ نے شمولیت بصورت قیادت فرمائی' اسے علمائے مغازی کی اصطلاح میں غزوہ کہتے ہیں۔ اور اس مقام پر اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ [عَصَائِب] عِصَابَةٌ کی جمع ہے۔ [عَمَائِم] عِمَامَةٌ کی جمع ہے۔ عصابة کے معنی کسی راوی نے پگڑی کے کیے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عصب کے معنی باندھنے کے ہیں اور اس کے ساتھ بھی سر کو باندھا جاتا ہے۔ عصابة دراصل پٹیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مرادی معنی ہیں۔ [تَسَاخِينَ] یہ تَسْخَانٌ کی جمع ہے اور مفرد کی "تا" مفتوح ہے۔ اس کے معنی کسی راوی نے موزے کے کیے ہیں۔ ابن ارسلان نے کہا ہے کہ اَلتَّسَاخِين ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکیں' خواہ وہ موزہ ہو یا جراب۔

فوائد و مسائل: ① پٹیوں سے مراد ایسی پٹیاں ہیں جو زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا بازو یا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں۔ انھی کو عصائب کہا جاتا ہے۔ ② جنگ کے لیے روانہ کرتے وقت اس قسم کا

٥٧ـ أخرجه مسلم، الطهارة، باب التوقيت في المسح على الخفين، حديث: ٢٧٦.

٥٨ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب المسح على العمامة، حديث: ١٤٦، وأحمد: ٥/ ٢٧٧، والحاكم في المستدرك: ١/ ١٦٩.

حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران میں زخمی حضرات اعضائے وضو دھونے کی بجائے زخم کی پٹیوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ③ ابوداود میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سردی کی شکایت کی تو آپ نے پگڑی اور موزوں پر مسح کا حکم دیا۔ (سنن أبي داود' الطهارة' باب المسح على العمامة' حديث:۱۴۶)

راویٔ حدیث: [حضرت ثوبان بن بُجُدُد بن جحدر رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ ثوبان ''ثا'' پر فتحہ اور ''واؤ'' ساکن کے ساتھ ہے۔ بجدد میں ''با'' مضموم' جیم ساکن' دال اول مضموم اور دال ثانی ساکن ہے۔ اور جحدر میں ''جیم'' پر فتحہ' ''حا'' ساکن اور ''دال'' پر فتحہ ہے۔ یہ سراۃ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمیر قبیلے میں سے تھے۔ زندگی بھر حضر و سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ان کو نبی اکرم ﷺ نے خرید کر آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے اور وہیں ۵۴ ہجری میں وفات پائی۔

(٥٩) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مَوْقُوفًا، وَأَنَسٍ مَرْفُوعًا: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبِسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلَا يَخْلَعْهُمَا إِنْ شَاءَ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

[59] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے: ''جب تم میں سے کوئی وضو کر کے موزے پہنے تو ان پر مسح کر لے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے' الا یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔'' (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا يَخْلَعْهُمَا] یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے نہ نکالے۔

(٦٠) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْماً وَلَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[60] حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے مسافر کے لیے تین دن اور تین راتوں تک مسح کرنے کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات تک' جبکہ اس نے باوضو ہو کر موزے پہنے ہوں۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

راویٔ حدیث: [حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ] ان کا نام نفیع (نافع کی تصغیر) بن حارث یا ابن مسروح ہے۔ یہ طائف کے

٥٩ـ [إسناده حسن موقوف] أخرجه الدارقطني، الطهارة، باب ما جاء في المسح على الخفين من غير توقيت: ١/ ٢٠٣، ٢٠٤، والحاكم: ١/ ١٨١، وتعقبه الذهبي. والحديث حسن موقوفًا وأما المرفوع فسنده ضعيف: فيه مقدام بن داود وهو ضعيف، والحديث ليس على عمومه بل خصصه الحديث الآتي.

٦٠ـ [إسناده حسن] أخرجه الدارقطني، الطهارة، باب ما في المسح على الخفين من غير توقيت: ١/ ٢٠٤، وابن خزيمة: ١/ ٩٦، حديث: ١٩٢، وابن حبان (الموارد)، حديث: ١٨٤.

قلعے سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعے سے باہر آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ چرخی کو ''بکرة'' کہتے ہیں' اس لیے ان کی یہ کنیت مشہور ہو گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ فضلاء صحابہ میں شمار کیے جاتے ہیں' کثیر الاولاد تھے۔ ۵۱ یا ۵۲ ہجری میں بصرہ کے مقام پر وفات پائی۔

(٦١) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ عِمَارَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، قَالَ: يَوْمًا؟ قَالَ: «نَعَمْ»، قَالَ: وَيَوْمَيْنِ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، قَالَ: وَثَلَاثَةَ أَيَّامٍ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ.

[61] حضرت ابی بن عمارہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا: ''ہاں' (کر سکتے ہو)۔'' عرض کیا: ایک دن؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' عرض کیا: دو دن؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' میں نے عرض کیا: تین دن؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں' اور جب تک تیری مرضی ہو۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث' جو مدت کی تعیین کرتی ہیں' کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا گیا۔ ② اس حدیث کی سند صحیح نہیں جبکہ وہ احادیث صحیح ہیں جن میں مسافر کے لیے تین دن' تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ ③ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلے میں ضعیف روایت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ④ امام نووی ؒ نے شرح المہذب میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمۂ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے۔ ⑤ امام احمد ؒ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں اور ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راویٔ حدیث: [**أُبَيّ بن عِمارہ** ؓ] ''ہمزہ'' کے ضمہ' ''با'' کے فتحہ اور ''یا'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ عمارہ ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی کبھی اسے ''عین'' مضموم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدنی انصاری مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنھیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر ان کی حدیث کی سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

٦ - بَابُ نَوَاقِضِ الْوُضُوءِ

باب:6- وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

(٦٢) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ

[62] حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت

٦١ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب التوقيت في المسح، حديث: ١٥٨، وقال الدارقطني: "هذا الإسناد لا يثبت . . . وعبدالرحمن ومحمد بن يزيد وأيوب بن قطن مجهولون كلهم".

٦٢ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الوضوء من النوم، حديث: ٢٠٠، والدارقطني: ١/ ١٣١، ومسلم، الصلاة، باب الدليل على أن نوم الجالس لا ينقض الوضوء، حديث: ٣٧٦.

قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ حَتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُمْ، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَصَحَّحَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ.

ماًپ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبۂ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ (مگر) پھر وہ ازسرنو وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ نَوَاقِضِ الْوُضُوءِ] نَوَاقِض' نَاقِضٌ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ [تَخْفِقَ] نیند کے غلبے کی وجہ سے جھک جاتے۔ [رُءُوسُهُمْ] رؤس، رَأْسٌ کی جمع ہے جس کے معنی سر کے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک انسان گہری نیند نہ سوئے اس وقت تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ ② اس سے پہلے حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کی روایت گزشتہ باب میں گزر چکی ہے جو مطلق نیند سے وضو کے ٹوٹنے پر دلالت کرتی ہے۔ ③ اُس روایت کی روشنی میں اس روایت کو گہری نیند پر محمول کیا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث میں نبیٔ اکرم ﷺ نے نیند سے مراد مخصوص نیند (اونگھ) لی ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس نیند سے واقف تھے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس نیند سے بھی باخبر تھے جس سے وضو نہیں ٹوٹتا' اس لیے وضاحت اور بیان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہرصورت یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹیک یا تکیہ لگا کر سو جانے کی وجہ سے جبکہ انسان کا شعور اور احساس زائل ہو جائے تو ایسی نیند ناقض وضو ہو گی۔ اور عموماً شعور زائل ہو جاتا ہے بصورت دیگر اونگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ④ ٹیک لگانے یا تکیے کا سہارا لینے کی حالت میں جسمانی جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیٹ سے ہوا کے خروج کا غالب امکان ہوتا ہے' اسی بنیاد پر احتیاط کے پیش نظر وضو نئے سرے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔

(٦٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ؟ قَالَ: «**لَا، إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[63] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ استحاضے کے خون میں مبتلا رہتی ہوں' پاک ہوتی ہی نہیں۔ کیا ایسی حالت میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں' یہ تو ایک رگ ہے' (جو پھٹ جاتی ہے اور خون بہتا رہتا ہے۔) حیض کا خون نہیں ہے۔ ہاں' جب ایام حیض شروع ہوں تو نماز کو چھوڑ دو۔ اور جب یہ ایام پورے ہو جائیں تو خون دھو کر

٦٣ـ أخرجه البخاري، الحيض، باب غسل الدم، حديث: ٢٢٨، ٣٢٠، ومسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث: ٣٣٣، ٣٣٤.

نماز پڑھو۔‘‘ (بخاری ومسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: «ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ». وَأَشَارَ مُسْلِمٌ إِلَى أَنَّهُ حَذَفَهَا عَمْدًا.

اور بخاری میں مزید یہ الفاظ ہیں: ’’پھر ہر نماز کے لیے وضو کرو۔‘‘ اور امام مسلم نے اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے یہ عبارت عمداً چھوڑی ہے۔

لغوی تشریح: [أُسْتَحَاضُ] یہ اِسْتِحَاضَة سے ماخوذ واحد متکلم کا صیغۂ مجہول ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کی اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ [أَفَأَدَعُ] اس میں ہمزہ استفہام کا ہے اور ’’فا‘‘ تعقیب کے لیے ہے۔ اور [أَدَعُ] وَدَعَ سے واحد متکلم کا صیغۂ مضارع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ [إِنَّمَا ذٰلِكِ] اس میں ’’کاف‘‘ کے نیچے کسرہ ہے‘ اس لیے کہ مخاطب عورت ہے اور اس کا مشارالیہ ’’خون کا بہنا‘‘ ہے۔ [عِرْقٌ] ’’عین‘‘ کے کسرہ اور ’’را‘‘ کے سکون کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ رگ سے خون بہنے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عاذل یا عاذر ہے۔ [وَلَيْسَ بِحَيْضٍ] یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ [فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ] ’’حا‘‘ کے فتحہ کے ساتھ‘ اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ [فَدَعِي] چھوڑ دو۔ [وَإِذَا أَدْبَرَتْ] یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس میں فاعل ضمیر حَيْضَة کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون بند ہو جائے۔ [ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ] پھر ہر نماز کے لیے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

فوائد ومسائل: ① عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے: ایک حیض کا خون‘ یہ خون ہر ماہ چند مخصوص ایام میں عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ دوسرا نفاس کا خون ہے۔ یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچے کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن تک‘ یا اس سے کم وبیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے۔ یہ خون مذکورہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ ② یہ خون‘ عاذل یا عاذر نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور بغیر کسی وقفے کے مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے‘ اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے۔ عرصۂ دراز تک بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا] حبیش‘ حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ قبیلۂ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبدالعزی بن قصی ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انھوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(٦٤) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ

[64] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بہت مذی والا

٦٤ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب من استحيا فأمر غيره بالسؤال، حديث: ١٣٢، ومسلم، الحيض، باب المذي، حديث: ٣٠٣.

تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «فِيهِ الْوُضُوءُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

مرد تھا۔ میں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبی ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کریں۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہوگا یا غسل جنابت؟) آپ نے فرمایا: ''ایسی حالت میں وضو ہی ہے۔'' (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [مَذَّاءً] ''ذال'' پر تشدید ہے۔ یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی آتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید' رقیق اور لیس دار پانی ہے جو بیوی سے بوس و کنار اور جماع کی یاد اور ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتا ہے۔ [فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ] حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو مسئلے کی بابت پوچھنے کے لیے کہا' اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم ﷺ کی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیا داری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

راویٔ حدیث: [حضرت مقداد رضی اللہ عنہ] ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: مقداد بن عمرو بن ثعلبة البهراني اور حلف کی وجہ سے الکندی کہلائے۔ ان کی کنیت ابوالاسود یا ابوعمرو ہے اور مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں۔ اور اسود سے مراد اسود بن عبد یغوث زہری ہے۔ چونکہ اس نے مقداد کو متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنا لیا تھا اور جاہلیت میں اس کے ساتھ حلیفانہ تعلقات و روابط قائم کر لیے تھے' چنانچہ اس کی طرف نسبت کے ساتھ مشہور ہو گئے۔ اسلام لانے والوں میں ان کا چھٹا نمبر ہے۔ دو مرتبہ ہجرت کے شرف سے شرف یاب ہوئے۔ کبار' فضلاء اور بہترین اوصاف و خصائل کے مالک صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں واقع ہونے والے تمام غزوات میں شریک رہے۔ معرکۂ بدر کے روز گھڑ سواروں میں شامل تھے۔ فتح مصر میں حاضر تھے۔ ۳۳ ہجری میں جوف کے مقام پر' جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے' وفات پائی۔ ان کی میت کو مدینہ لایا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن کیے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس تھی۔

(٦٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَائِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَضَعَّفَهُ الْبُخَارِيُّ.

[65] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی کسی اہلیہ کو بوسہ دیا اور نماز کے لیے نکل گئے اور وضو نہیں فرمایا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو محض چھونے اور بوسہ دینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

٦٥ـ [حسن] أخرجه أحمد: ٦/ ٢١٠، والترمذي، الطهارة، حديث: ٨٦، وله شاهد حسن عند البزار (انظر نصب الراية: ١/ ٧٤).

② حضرت عائشہ ؓ سے یہ روایت ابراہیم تیمی بیان کرتے ہیں جبکہ ابراہیم نے حضرت عائشہ ؓ سے کچھ نہیں سنا' اس لیے یہ مرسل ہے' مگر تعدد طرق سے اس ضعف کا ازالہ ہو جاتا ہے' علاوہ ازیں صحیح بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ اور وہ یہ ہے: حضرت عائشہ ؓ ہی فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدے کے لیے جانے سے پہلے آپ میرے پاؤں کو ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ (صحیح البخاري' الصلاة' باب الصلاة علی الفراش' حدیث:٣٨٣) ③ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضائے جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ دینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا' خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ ④ صحابۂ کرام ؓ میں سے حضرت علی اور عبداللہ بن عباس ؓ اس کے قائل ہیں۔ اور ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ ؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی ؒ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(٦٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ، أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لَا؟ فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ، حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا**». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[66] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں' تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کے لیے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے' تاوقتیکہ ہوا کے خارج ہونے کی آواز نہ سنے یا بدبو محسوس نہ کرے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَجَدَ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا] اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا' گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ [أُشْكِلَ] مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ [أَخَرَجَ] ہمزہ اس میں استفہام کا ہے' یعنی اسے یہ شک پڑ جائے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ [فَلَا يَخْرُجَنَّ] محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ [حَتّٰى يَسْمَعَ] یہاں تک کہ وہ ہوا کے باآواز خارج ہونے کو سنے۔ [أَوْ يَجِدَ رِيحًا] یا پھر پیٹ سے خارج ہونے والی بے آواز ہوا کی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے' خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ اس کے یقین میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ② اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم اور اصل پر قائم رہتی ہے' تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

٦٦ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ثم شك في الحدث . . . ، حديث: ٣٦٢.

(٦٧) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسِسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلَاةِ أَعَلَيْهِ وُضُوءٌ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «**لَا، إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِّنْكَ**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ ابْنُ الْمَدِينِيِّ: هُوَ أَحْسَنُ مِنْ حَدِيثِ بُسْرَةَ.

[67] حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا: میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہیے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''نہیں' وہ تو تیرے جسم کا ایک حصہ ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن مدینی کہتے ہیں: حضرت بسرہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوْ قَالَ] اس میں فاعل هُوَ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس مرد کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ [اَلرَّجُلُ يَمَسُّ] یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ [بَضْعَةٌ] ''با'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور ''ضاد'' ساکن ہے۔ اس کے معنی گوشت کے ٹکڑے کے ہیں۔ [مِنْكَ] یعنی تیرے جسم کا ٹکڑا ہے۔ جس طرح دیگر اعضائے جسم ہیں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں وغیرہ کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصے کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

فائدہ: علی بن عبداللہ جو ابن مدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۶۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۳۴ ہجری میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری اور امام ابوداود رحمہما اللہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ بہت سے صحابہ اور تابعین مس ذکر (شرمگاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ ابن مدینی' ابن مبارک اور اہل کوفہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ دوسری طرف بہت سے صحابہ و تابعین مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل حضرت بسرہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جو آگے آرہی ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ] ابوعلی ان کی کنیت ہے۔ ''طا'' پر فتحہ ہے اور ''لام'' ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے: طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی سُحَیمی' یمامی۔ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے، اسی وقت یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبوی کی تعمیر میں زور و شور اور شوق و ذوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

٦٧ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الرخصة في ذلك، حديث: ١٨٢، والترمذي، الطهارة، حديث: ٨٥، والنسائي، الطهارة، حديث: ١٦٥، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٤٨٣، وأحمد: ٤/ ٢٣، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٢٠٧، ٢٠٩، (الإحسان): ٢/ ٢٢٣، حديث: ١١١٦ وقال، ص: ٢٢٤: "خبر طلق بن علي الذي ذكرناه خبر منسوخ، لأن طلق بن علي، كان قدومه على النبي ﷺ أول سنة من سني الهجرة حيث كان المسلمون يبنون مسجد رسول الله ﷺ بالمدينة...."

(٦٨) وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ الْبُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هٰذَا الْبَابِ.

[68] حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا اسے وضو کرنا چاہیے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: اس مسئلے میں یہ صحیح ترین حدیث ہے۔)

لغوی تشریح: [مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ] جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا (ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔) [فَلْيَتَوَضَّأْ] تو اسے وضو کرنا چاہیے' یعنی نئے سرے سے نماز کے لیے وضو کرنا چاہیے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث صریح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے' اس لیے کہ یہ کلام میں ایک مقرر اور مستحکم حکم ہے' اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ ② امام شافعی' ابوزرعہ' ابوحاتم' دارقطنی' بیہقی اور ابن جوزی رحمہم اللہ نے حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو ضعیف اور حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ جہاں تک ابن مدینی کے اس قول کا تعلق ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت بسرہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے زیادہ بہتر ہے' اس رائے کو ائمہ نے قبول نہیں کیا۔ ③ تقریباً اٹھارہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بسرہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کی تائید میں احادیث مروی ہیں' مزید یہ کہ بسرہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کی سند کے راوی صحیحین کے ہیں جبکہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت کی سند کے راویوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو صحیحین کے راویوں میں سے ہو۔ ④ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے متعلق روایت کرتے ہیں۔ یہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی آمد کے چھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد اسلام لائے تھے جبکہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ابتدا ہی میں (جب نبی اکرم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی) مدینے آئے تھے' پھر اپنے وطن یمامہ واپس چلے گئے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ٦ ہجری کے آخر میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس صورت میں بھی بعد میں حاضر ہونے والے صحابی کی روایت راجح ہے۔ یاد رہے کہ مَسِّ ذکر (شرم گاہ کے چھونے) کا مطلب ہے کہ بغیر کپڑے کے ہاتھ لگ جائے تو ایسا چھونا صحیح نہیں' اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

راویٔ حدیث: [حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا] بسرہ کی ''با'' پر ضمہ اور ''سین'' ساکن ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: بسرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد بن عبدالعزی قرشیہ اسدیہ رضی اللہ عنہا۔ ان کا شمار سابقین صحابہ رضی اللہ عنہم اور پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار تک حیات رہیں۔

(٦٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ

[69] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ

٦٨ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الوضوء من مس الذكر، حديث: ١٨١، والترمذي، الطهارة، حديث: ٨٢، والنسائي، الطهارة، حديث: ١٦٣، ١٦٤، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٤٧٩، وأحمد: ٦/ ٤٠٦، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٢١١، ٢١٤.

٦٩ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، إقامة الصلوات والسنة فيها، باب ما جاء في البناء على الصلاة، حديث: ١٢٢١.◀◀

رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلْسٌ أَوْ مَذْيٌ، فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَبْنِ عَلٰى صَلَاتِهِ، وَهُوَ فِي ذٰلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَحْمَدُ وَغَيْرُهُ.

نے فرمایا: ''جس کو نماز میں قے آ جائے یا نکسیر پھوٹ پڑے یا صفراوی مادہ آ جائے یا مذی کا خروج ہو جائے تو اسے نماز سے نکل کر وضو کرنا چاہیے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی اسی پر بنا کر لے بشرطیکہ اس دوران میں اس نے گفتگو نہ کی ہو۔'' (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رُعَافٌ] ''را'' پر ضمہ اور ''عین'' پر تخفیف ہے۔ ناک سے جو خون نکلتا ہے اسے ''رعاف'' یعنی نکسیر کہتے ہیں۔ [قَلْسٌ] ''قاف'' پر فتحہ ہے اور ''لام'' ساکن ہے۔ خور ونوش کی کوئی چیز جو پیٹ سے منہ کے راستے باہر آ جائے۔ [لِيَبْنِ] اس کا لام لام امر ہے۔ اور بنا یہ ہے کہ آدمی نے نماز شروع کی، ایک یا دو یا زیادہ رکعات پڑھ چکا تھا کہ بے وضو ہو گیا' اب نیا وضو کر کے بغیر کسی قسم کی گفتگو کیے آ کر نماز شروع کر دے' جتنی پہلے پڑھ چکا تھا اسے شمار کرے اور باقی ماندہ رکعات پوری کر کے سلام پھیر دے۔ اس کی بے وضو ہونے سے پہلے پڑھی ہوئی رکعات بھی ضائع نہیں جائیں گی اور ازسرنو پوری نماز بھی پڑھنا نہیں پڑے گی۔ [وَ هُوَ فِي ذٰلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ] ''اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے'' یہ جملہ حالیہ ہے جو شرط پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بنا کے لیے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بنا نہیں کر سکتا' ازسرنو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ تاہم یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

فوائد ومسائل: ① مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں' البتہ قے آنے' پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستے سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے' یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ وضو نہ ٹوٹنے کا قائل ہے۔ ② اسی طرح بنا کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ دونوں بنا کے قائل ہیں جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے امام احمد نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب نمازی بے وضو ہو گیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بنا کس پر ہوگی۔ ③ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلے میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ④ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عبداللہ بن عمر' جابر بن یزید' عبداللہ بن عباس' ابن ابی اوفی اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے سعید بن مسیب' مکحول اور ربیعہ رحمہم اللہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔ ⑤ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث ضعیف اور مرسل ہے' نیز احادیث صحیحہ کے معارض ومخالف بھی ہے' اس لیے اس کے ذریعے سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

◄◄ وقال البوصيري: "هذا إسناد ضعيف، لأنه من رواية إسماعيل (بن عياش) عن الحجازيين وهي ضعيفة".

(٧٠) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: «إِنْ شِئْتَ». قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: «نَعَمْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[70] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: کیا میں بکری کا گوشت کھاؤں تو بعد میں وضو کروں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تو چاہے تو کر لے۔'' اس نے (پھر) عرض کیا: اور اونٹ کے گوشت سے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: | أَتَوَضَّأُ | ہمزہ استفہام اس جگہ محذوف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ | مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ | بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے اور اسے کھانے کے بعد وضو کرنا چاہیے۔ اکثر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا ضروری نہیں کیونکہ تعبدی احکام کی حکمت کا عقل میں آنا ضروری نہیں۔ ② علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''اعلام الموقعین'' (۱/ ۱۴۷) میں اس کی بڑی عمدہ اور معنوی اعتبار سے بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: روایات میں آیا ہے کہ ہر اونٹ کی کوہان پر شیطان ہوتا ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ اونٹ جنوں میں سے ہیں اور انھیں سے پیدا کیے گئے ہیں' لہٰذا ان میں قوت شیطانیہ ہوتی ہے اور کھانے والے کی مشابہت کھانے کے ساتھ ہوگی' اس لیے جب کوئی شخص اونٹ کا گوشت کھائے گا تو اس میں ازخود قوت شیطانیہ پیدا ہوگی۔ اور شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی کے ذریعے سے بجھایا جاتا ہے۔ حدیث مذکور بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب بندہ اونٹ کا گوشت کھا کر بعد میں وضو کرے گا تو اس کے وضو میں وہ چیز شامل ہوگی جو اس شیطانی قوت کو بجھائے گی اور ایسی صورت میں یہ فساد انگیز چیز زائل ہوجائے گی۔ ③ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمۂ اہل سنت میں اختلاف ہے۔ امام احمد' اسحاق بن راہویہ' ابن منذر اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ وغیرہ محدثین علماء کا یہی مذہب ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو برقرار نہیں رہتا۔ بیہقی اور تمام اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ اور بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کسی بھی حلال جانور کے گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک وضو برقرار رہتا ہے۔ ان کی دلیل ابوداود' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن حبان وغیرہ کی روایت ہے۔ (سنن أبي داود' الطهارة' باب في ترك الوضوء مما مست النار' حديث:١٨٧) یہ حضرات اس حدیث میں بیان ہونے والے وضو سے ہاتھ منہ دھونا مراد لیتے ہیں جس طرح خورونوش سے فارغ ہوکر ہاتھ منہ دھویا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک وضو کے لغوی معنی مراد ہوں گے' اصطلاحی معنی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری حکم یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے مضبوط ہے۔ ابوداود وغیرہ کی حدیث عام ہے اور صحیح مسلم کی یہ حدیث خاص اونٹ

٧٠۔ أخرجه مسلم، الحيض، باب الوضوء من لحوم الإبل، حديث: ٣٦٠.

کے بارے میں ہے' اس لیے خاص حکم' عام حکم سے مقدم ہے' نیز ایک شرعی لفظ وضو کو بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا بھی درست نہیں۔

راویِ حدیث: [حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ] جابر بن سمرہ بن جنادہ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھانجے ہیں۔ کوفہ میں رہے۔ وہیں انھوں نے اپنا گھر بنایا۔ ان سے تقریباً ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ۷۴ یا ۶۶ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے باپ سمرہ (''سین'' پر فتحہ اور ''میم'' پر ضمہ کے ساتھ) بن جنادہ السوائی العامری بھی صحابی ہیں رضی اللہ عنہ۔

(۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَقَالَ أَحْمَدُ: لَايَصِحُّ شَيْءٌ فِي هٰذَا الْبَابِ.

[71] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میت کو غسل دیا' وہ خود بھی غسل کرے۔ اور جس نے میت کو اٹھایا وہ وضو کرے۔'' (اس حدیث کو احمد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔ اور احمد کا قول ہے کہ اس مسئلے میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے۔)

لغوی تشریح: [قَالَ أَحْمَدُ] سے مراد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ [لَا يَصِحُّ شَيْءٌ فِي هٰذَا الْبَابِ] اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے' صرف ہاتھوں کو دھو لینا ہی کافی ہے۔'' (المستدرك للحاكم: ۱/ ۳۸۶' والسنن الكبرىٰ للبيهقي: ۱/ ۳۹۸)

فائدہ: صحیح یہ ہے کہ [مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا فَلْيَغْتَسِلْ] میں حکم استحباب کے لیے ہے' یعنی میت کو نہلانے والے کے لیے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دارقطنی میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے' پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ (سنن الدارقطني: ۲/ ۷۲' حديث: ۱۷۹۶) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس' ابن عمر' عائشہ رضی اللہ عنہم' حسن بصری' ابراہیم نخعی' امام شافعی' اسحاق رحمہم اللہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے' البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں۔ مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ رَحِمَهُمَا اللهُ، أَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ

[72] حضرت عبداللہ بن ابی بکر رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (احکام کی) جو تحریر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ

۷۱ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في الغسل من غسل الميت، حديث: ۹۹۳، وأحمد: ۲/ ۲۸۰، ۴۳۳، وله طريق حسن عند أبي داود، حديث: ۳۱۶۲، وغيره والنسائي: لم أجده.

۷۲ـ [حسن] أخرجه مالك في الموطأ، القرآن، باب الأمر بالوضوء لمن مس القرآن: ۱/ ۱۹۹ وسنده ضعيف، وللحديث شاهد قوي عند الدارقطني: ۱/ ۱۲۱، حديث: ۴۲۹، والرواية عن الكتاب صحيحة مالم يثبت الجرح القادح فيه.

لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: أَنْ لَا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا، وَوَصَلَهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

کر دی تھی اس میں تحریر تھا کہ قرآن پاک کو پاکیزہ انسان ہی (جس نے وضو کیا ہو) ہاتھ لگائے۔ (اسے امام مالک نے مرسل روایت کیا ہے اور نسائی اور ابن حبان نے موصول بیان کیا ہے۔ (دراصل) یہ حدیث معلول ہے۔)

لغوی تشریح: [إِلَّا طَاهِرٌ] بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہو یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہیے۔ [وَهُوَ مَعْلُولٌ] مصنف نے اس روایت کو غالباً اس بنا پر معلول کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داود یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے' حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سلیمان بن داود خولانی ہے اور وہ ثقہ ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے' اس لیے یہ حدیث معلول نہیں۔ (سبل السلام)

فائدہ: طہارت دو قسم کی ہے: ایک طہارت تو وہ ہے جو حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر' یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا' ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ بے وضو ہونے کی صورت میں بہتر یہ ہے کہ باوضو ہو کر ہاتھ لگایا جائے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن ابی بکر رحمہ اللہ] یہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری رحمہ اللہ مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس تھی۔

[عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ] عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابوضحاک ان کی کنیت ہے۔ سب سے پہلے غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لیے بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم دیں اور قرآن مجید پڑھائیں، نیز لوگوں سے صدقات کی وصولی کے لیے حسابات و نصابات تحریر کر کے ان کے سپرد کیے۔ اس تحریر میں فرائض' سنن' صدقات اور دیت کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۰ ہجری کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ.

[73] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے تعلیقاً نقل کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس کا مطلب یہ ہے کہ جماع اور بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے' باقی اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ ② احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت کے علاوہ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ زبان پاک ہے' اس لیے زبانی ذکر الٰہی ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔

۷۳۔ أخرجه البخاري، تعليقًا، الأذان، باب هل يتتبع المؤذن فاه هاهنا وهاهنا؟...، قبل الحديث: ٦٣٤، ومسلم، الحيض، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها، حديث: ٣٧٣.

(٧٤) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِحْتَجَمَ وَصَلّٰى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلَيَّنَهُ.

[74] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے پچھنے لگوائے اور (نیا) وضو کیے بغیر نماز ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کمزور کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [اِحْتَجَمَ] پچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سینگ یا کسی دیگر آلے کے ذریعے سے جسم سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس آلے کو عربی میں محجمة کہتے ہیں۔ [لَيَّنَهُ] تلیین سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دارقطنی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

فائدہ: یہ روایت سنداً ضعیف ہے، تاہم دیگر صحیح احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں کے علاوہ بدن سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر، ابن عباس اور دوسرے کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اور تابعین عظام کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(٧٥) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**اَلْعَيْنُ وِكَاءُ السَّهِ، فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالطَّبَرَانِيُّ، وَزَادَ: «**وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ**».

[75] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”آنکھیں دبر کا بندھن ہیں۔ جب آنکھیں سوتی ہیں تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔“ (اسے احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے۔) اور طبرانی نے یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے: ”جس شخص کو نیند آ جائے وہ از سر نو وضو کرے۔“

وَهٰذِهِ الزِّيَادَةُ فِي هٰذَا الْحَدِيثِ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ دُونَ قَوْلِهِ: «**اِسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ**» وَفِي كِلَا الْإِسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اور یہی اضافہ ابوداود کی اسی روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ہے، البتہ اس روایت میں [اِسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ] ”بندھن کھل جاتا ہے۔“ والی عبارت نہیں ہے۔ (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں۔)

وَلِأَبِي دَاوُدَ أَيْضًا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا مَرْفُوعًا: «**إِنَّمَا الْوُضُوءُ عَلٰى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعًا**». وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ أَيْضًا.

اور ابوداود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے بھی مرفوعاً آیا ہے: ”وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔“ (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔)

٧٤ـ [**إسناده ضعيف**] أخرجه الدارقطني: ١/ ١٥١، ١٥٢، فيه صالح بن مقاتل وليس بالقوي وأبوه غير معروف، وفيه علة أخرى.

٧٥ـ [**إسناده ضعيف**] أخرجه أحمد: ٤/ ٩٧، والطبراني في الكبير: ١٩/ ٣٧٢، ٣٧٣، حديث: ٨٧٥ وفيه أبوبكر ابن أبي مريم وهو ضعيف لاختلاط، وللحديث شواهد معنوية عند أبي داود، الطهارة، حديث: ٢٠٣ وغيره ※ حديث ابن عباس أخرجه أبوداود، حديث: ٢٠٢، وسنده ضعيف، أبوخالد الدالاني وقتادة مدلسان وعنعنا وقال ابوداود: "منكر".

لغوی تشریح: [وِ کَاءُ السَّہِ] اَلْوِ کَاءُ کے ''واو'' کے نیچے کسرہ اور ''الف'' پر مد ہے۔ اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزے وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ [اَلسَّہِ] ''سین'' پر فتحہ اور ''ہا'' مخفف ہے۔ دبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [اِسْتَطْلَقَ] کھل جانا' ڈھیلا ہونا۔ [مُضْطَجِعًا] پہلو کے بل لیٹنا۔

فوائد و مسائل: ① حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہٖ ناقض وضو نہیں بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک ''بقیہ'' نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ اس کی احادیث صاف (صحیح) نہیں ہیں۔ مگر یہ ضعف خفیف سا ہے' تاہم منذری' نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ ② حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں تطبیق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضائے جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان غالب ہوتا ہے جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ ③ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا۔ گہری نیند جس صورت میں بھی ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے' اس لیے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راویٔ حدیث: [حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ] معاویہ سے مراد حضرت معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہما ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر باپ بیٹے دونوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ ہجری کا واقعہ ہے۔ ۶۰ ہجری ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(٧٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**يَأْتِي أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلَاةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَتِهِ، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحْدَثَ، وَلَمْ يُحْدِثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ فَلَا يَنْصَرِفْ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا**». أَخْرَجَهُ الْبَزَّارُ.

[76] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے' حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا' لہٰذا جب تم میں سے کوئی ایسا محسوس کرے تو ریح کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔'' (اسے بزار نے

٧٦۔ [حسن] أخرجه البزار (كشف الأستار): ١/ ١٤٧، حديث: ٢٨١ واللفظ له، حديث عبدالله بن زيد: أخرجه البخاري، الوضوء، حديث: ١٣٧، ومسلم، الطهارة، حديث: ٣٦١، حديث أبي هريرة: أخرجه مسلم، الطهارة، حديث: ٣٦٢، حديث أبي سعيد: أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٢٩، وابن حبان (الموارد)، حديث: ١١٨٧، صححه الحاكم على شرط الشيخين: ١/ ٣٢٤، ووافقه الذهبي.

روایت کیا ہے۔)

وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِاللهِ ابْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ.

اور اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں عبداللہ بن زید سے مروی ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ نَحْوُهُ.

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کی مثل الفاظ مروی ہیں۔)

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا: «إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحْدَثْتَ، فَلْيَقُلْ: إِنَّكَ كَذَبْتَ». أَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ بِلَفْظِ: «فَلْيَقُلْ فِي نَفْسِهِ».

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطے سے مرفوعاً بیان کیا ہے: ''جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور (ذہن میں) وسوسہ اور خیال ڈالے کہ تو بے وضو ہو گیا ہے تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔'' اسے ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: ''وہ (شخص) اپنے دل میں کہے (کہ تو جھوٹا ہے)۔''

٧ - بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الْحَاجَةِ

باب: 7- قضائے حاجت کے آداب کا بیان

(٧٧) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

[77] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو اپنی انگوٹھی (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الْحَاجَةِ] قضائے حاجت' یہ بول و براز سے کنایہ ہے۔ [اَلْخَلَاءَ] ''خا'' کے فتحہ اور الف ممدودہ کے ساتھ ہے۔ خالی جگہ اور خالی مکان کو کہتے ہیں۔ پھر یہ قضائے حاجت کی جگہ کے لیے کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ اسے بیت الخلاء بھی کہتے ہیں کیونکہ قضائے حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے' اور اس لیے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کے لیے اس میں خلوت اور تنہائی میسر آتی ہے۔ [وَضَعَ خَاتَمَهُ] اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے کیونکہ اس میں ''محمد رسول اللہ'' منقش تھا۔ اور اس میں تنبیہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگہوں

٧٧ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الخاتم يكون فيه ذكر الله تعالى يدخل به الخلاء، حديث: ١٩، وقال: "هذا حديث منكر"، والترمذي، اللباس، حديث: ١٧٤٦، والنسائي، الزينة، حديث: ٥٢١٦، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٠٣، ابن جريج مدلس وعنعن.

سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ [وَهُوَ مَعْلُولٌ] معلول اس لیے ہے کہ ہمام نے یہ روایت ابن جریج سے بیان کی ہے اور وہ زہری کے واسطے سے روایت کرتا ہے' حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی بلکہ اس نے زیاد بن سعد کے واسطے سے زہری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے چاندی کی انگوٹھی بنوائی، پھر اسے اتار دیا۔

فائدہ: یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ اس کو امام ابوداود نے منکر قرار دیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ اس میں ہمام راوی کو وہم ہوا ہے۔ تاہم ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ بیت الخلا وغیرہ ناپاک اور گندی جگہوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ و دانستہ داخل نہیں ہونا چاہیے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(٧٨) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

[78] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے: [اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ] ''اے اللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں' خبیث جنوں اور خبیث جنیوں سے۔'' (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِذَا دَخَلَ] یعنی جب بیت الخلا میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ [اَلْخُبُث] ''خا'' اور ''با'' دونوں پر ضمہ ہے اور ''با'' پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خبیث کی جمع ہے۔ [اَلْخَبَائِث] خَبِيثَةٌ کی جمع ہے۔ اول کے معنی نر شیطان اور ثانی کے معنی مادہ شیطان کے ہیں۔ اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلا میں مذکورہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہئیں' بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو' تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلا نہ ہو تو رفع حاجت کے لیے نیچے بیٹھتے ہوئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہیے۔

فوائد و مسائل: ① گندے مقامات پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بسیرا کرتے ہیں' اس لیے نبی اکرم ﷺ نے قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخلے سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ ② چونکہ انسان کی مقعد (پیٹھ) بھی قضائے حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے' اس لیے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں' ان سے محفوظ رہنے کے لیے دعا کی تعلیم دی ہے۔

(٧٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ

[79] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی

٧٨۔ أخرجه البخاري، الوضوء، باب ما يقول عند الخلاء، حديث: ١٤٢، ومسلم، الحيض، باب ما يقول إذا أراد دخول الخلاء، حديث: ٣٧٥، وأبوداود، الطهارة، حديث: ٤، ٥، والترمذي، الطهارة، حديث: ٥، ٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ١٩، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٢٩٦، وأحمد: ٣/ ٩٩.

٧٩۔ أخرجه البخاري، الوضوء، باب حمل العنزة مع الماء في الاستنجاء، حديث: ١٥٢، ومسلم، الطهارة، باب الاستنجاء بالماء من التبرز، حديث: ٢٧١.

رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدْخُلُ الْخَلاءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي إِدَاوَةً مِّنْ مَّاءٍ، وَعَنَزَةً فَيَسْتَنْجِي بِالْمَاءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ہے کہ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہوتے تو میں اور ایک میرے جیسا لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک چھوٹا سا نیزہ لے کر ہمراہ جاتے۔ اس پانی سے آپ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [إِدَاوَةً] ''ہمزہ'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ چمڑے کا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ [مِنْ مَّاءٍ] پانی سے بھرا ہوا۔ [وَعَنَزَةً] یہ إداوۃ پر عطف کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کے ''عین'' اور ''نون'' دونوں پر فتحہ ہے، یعنی ایسی لمبی لاٹھی جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا چھوٹا تیر بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں، مثلاً: اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے شخص سے خدمت لینا۔ ② پانی کے ساتھ استنجا کرنا۔ ③ پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ④ صرف ڈھیلوں پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے، اور ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(٨٠) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**خُذِ الْإِدَاوَةَ**»، فَانْطَلَقَ حَتّٰى تَوَارٰى عَنِّي، فَقَضٰى حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[80] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''پانی کا برتن (ساتھ) لے چلو۔'' پھر آپ رفع حاجت کے لیے (اتنی دور) تشریف لے گئے کہ میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ بالآخر آپ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [تَوَارٰى] چھپ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

فائدہ: نبی ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردے کا انتظام کرنا چاہیے یا ایسی جگہ ہو جہاں اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔

(٨١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اِتَّقُوا اللَّاعِنَيْنِ: الَّذِي يَتَخَلّٰى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ**».

[81] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لعنت کا سبب بننے والے دو امور سے اجتناب کرو۔ ایک لوگوں کے راستے میں، دوسرا (ان کے

٨٠ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب الصلاة في الجبة الشامية، حديث: ٣٦٣، ومسلم، الطهارة، باب المسح على الخفين، حديث: ٢٧٤.

٨١ـ أخرجه مسلم، الطهارة، باب النهي عن التخلي في الطرق والظلال، حديث: ٢٦٩ * حديث معاذ عند أبي داود، الطهارة، حديث: ٢٦ وسنده ضعيف - وحديث ابن عباس عند أحمد: ١/ ٢٩٩ وفيه رجل مجهول، لم يسم فالسند ضعيف، وحديث ابن عمر أخرجه الطبراني في الأوسط: ٣/ ١٩٩، ٢٠٠، حديث: ٢٤١٣ وسنده ضعيف جدًا، فيه فرات بن السائب وهو متروك الحديث.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضائے حاجت کرنے سے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: «وَالْمَوَارِدِ». وَلَفْظُهُ: «اِتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلَاثَةَ: اَلْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيقِ، وَالظِّلِّ». وَلِأَحْمَدَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا: «أَوْ نَقْعِ مَاءٍ». وَفِيهِمَا ضَعْفٌ.

اور ابوداود نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ''گھاٹوں'' کا لفظ زائد بیان کیا ہے۔ اور اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھاٹوں پر، شاہراہ عام پر اور سائے کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔'' اور امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے روایت بیان کی ہے (اس میں ہے:) ''یا جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہیے۔'' (ان دونوں روایتوں میں کچھ ضعف ہے۔)

وَأَخْرَجَ الطَّبَرَانِيُّ النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الْحَاجَةِ تَحْتَ الْأَشْجَارِ الْمُثْمِرَةِ وَضَفَّةِ النَّهْرِ الْجَارِي، مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

اور طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پھل دار درختوں کے نیچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضائے حاجت کرنے سے ممانعت والی روایت بیان کی ہے۔ (اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [اِتَّقُوا] پرہیز کرو، اجتناب کرو۔ [اَللَّاعِنَيْنِ] اَللَّاعِن سے تثنیہ ہے۔ اس کا مطلب ہے: ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لَاعِن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صَاحِبُ اللَّبَنِ کو لَابِن اور صَاحِبُ التَّمر کو تَامِر کہہ دیتے ہیں۔ (اسی کو فاعل ذی کذا کہتے ہیں۔) اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لَاعِنٌ مَلْعُونٌ کے معنی میں ہے۔ [اَلَّذِي يَتَخَلّٰى] جو قضائے حاجت، یعنی پاخانہ کرتا ہے۔ [فِي طَرِيقِ النَّاسِ] لوگوں کے عام آمدورفت کے راستے میں۔ یہ لعنت کے اسباب میں سے ایک ہے۔ اور دوسرا [أَوْ فِي ظِلِّهِمْ] وہ مقام اور جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں، قیلولہ کے لیے استعمال میں لاتے ہوں، اپنے اترنے اور آرام کی خاطر بیٹھنے کے لیے استعمال کرتے ہوں۔ اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سائے کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضائے حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ [اَلْمَلَاعِنَ] مَلْعَنٌ کی جمع ہے۔ ''میم'' پر فتحہ ہے۔ ایسی جگہیں جو لعنت کا موجب ہوں۔ [اَلثَّلَاثَةَ] ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ [اَلْبَرَازَ] ''با'' پر فتحہ ہے۔ اور براز اصل میں کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں، مگر یہ اَلْغَائِط، یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والے فضلے سے کنایہ ہے۔ اگر اَلْبَرَاز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ [فِي الْمَوَارِدِ] مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ، چشمے یا نہر وغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کے لیے پانی لینے جاتے ہیں (جنھیں گھاٹ کہتے ہیں۔) [قَارِعَةِ الطَّرِيقِ] ایسے کھلے راستے کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے، پاؤں اور سواریوں کے ذریعے سے اسے پامال کرتے ہوں۔ [أَوْ نَقْعِ مَاءٍ] ''نون'' پر فتحہ

اور ''قاف'' ساکن ہے۔جمع شدہ پانی یا پانی کے جمع ہونے کی جگہ۔[فِيهِمَا ضَعْفٌ] اس سے مراد ہے کہ حضرت معاذ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابوسعید حمیری' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے' حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا' لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے' جب اس کی کتابیں جل گئیں تو اس نے روایات کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے۔ اس کا نام نہیں لیا گیا۔[تَحْتَ الْأَشْجَارِ الْمُثْمِرَةِ] پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے۔ یہ اس خطرے کی وجہ سے منع کیا گیا ہے کہ جو پھل پک کر نیچے گرے گا وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا اور کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں اسے اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کے لیے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ [ضَفَّةِ النَّهْرِ] ''ضاد'' پر فتحہ اور ''فا'' پر تشدید ہے۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں۔ اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔[بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ] اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ بھی ضعیف ہے۔

فوائد و مسائل: ① صحیح مسلم کی روایت کے علاوہ دیگر روایات سنداً کمزور ہیں تاہم شواہد کی بنا پر حسن کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ ② ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ ③ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے اور وہ یہ ہیں: عام راستے پر' سایہ دار درخت کے نیچے' پانی کے گھاٹ پر' پھل دار درخت کے نیچے اور رواں دواں نہر کے کنارے پر۔ شارع عام پر رفع حاجت ممنوع ہے' البتہ جو راستہ متروک ہو چکا ہو' عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت معاذ رضی اللہ عنہ] آپ انصاری صحابی تھے۔ قبیلۂ خزرج سے تعلق تھا' اس لیے خزرجی کہلائے۔ بڑے معزز اور بزرگ فقہائے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے ان کو یمن کا والی (گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ١٧ ہجری میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ١٨ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ٣٨ سال تھی۔

(٨٢) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلَانِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلَا يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللّٰهَ يَمْقُتُ عَلٰى ذٰلِكَ». رَوَاهُ

[82] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو آدمی قضائے حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردے اور اوٹ میں ہونا چاہیے۔ اور وہ ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں' اس لیے کہ

٨٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أحمد: ٣/ ٣٦، وأبوداود، الطهارة، باب كراهية الكلام عند الحاجة، حديث: ١٥، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٤٢، وصححه ابن خزيمة، حديث: ٧١، وابن حبان(موارد)، حديث: ١٣٧، والحاكم: ١/ ١٥٧، ١٥٨، والذهبي. عكرمة بن عمار مضطرب الحديث عن يحيى بن أبي كثير. وللحديث شواهد ضعيفة.

أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطان نے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معلول ہے۔)

لغوی تشریح: [تَغَوَّطَ] قضائے حاجت کے لیے نکلے اور اپنی حاجت پوری کرے۔ [فَلْيَتَوَارَ] اس میں ''لام'' امر کا ہے اور ''را'' پر فتحہ ہے۔ معنی ہیں کہ چھپنا چاہیے' پردے میں ہونا چاہیے۔ [وَلَا يَتَحَدَّثَا] قضائے حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہیے۔ [يَمْقُتُ] مَقْت سے ماخوذ ہے۔ سخت ناراضی کو کہتے ہیں۔ [عَلٰى ذٰلِكَ] اس کا مشار الیہ مذکورہ تمام چیزیں ہیں' یعنی دونوں کے مابین پردے کا نہ ہونا اور رفع حاجت کے وقت بات چیت کرنا مراد ہے۔ [وَهُوَ مَعْلُولٌ] کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے' البتہ امام مسلم اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یحییٰ کی روایت کو بطور استشہاد ذکر کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحییٰ بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے' تاہم دوسری صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے' نیز قضائے حاجت' یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے' اس لیے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے۔ ② اگر یہ فعل بقول بعض مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر نبی اکرم ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کا مؤید ہے۔

(٨٣) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لَا يَمَسَّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَهُوَ يَبُولُ، وَلَا يَتَمَسَّحْ مِنَ الْخَلَاءِ بِيَمِينِهِ، وَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[83] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی شخص پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو نہ چھوئے' اور نہ قضائے حاجت کے بعد دائیں ہاتھ سے استنجا کرے' اور نہ پانی پیتے وقت برتن میں سانس لے۔'' (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [لَا يَمَسَّنَّ] مَسّ سے نہی کا صیغہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کے لیے ہے۔ [وَلَا يَتَمَسَّحْ] یعنی استنجا نہ کرے۔ تَمَسُّح کے معنی ہیں: ہاتھ کو پھیرنا اور ملنا تاکہ بہنے والی گندگی دور ہو جائے، یا ناپاک چیز سے لتھڑی ہوئی شے کو ہاتھ سے صاف کرنا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں تین مسئلے بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو

٨٣ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب النهي عن الاستنجاء باليمين، حديث: ١٥٣، ١٥٤، ومسلم، الطهارة، باب النهي عن الاستنجاء باليمين، حديث: ٢٦٧.

پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ دوسرا یہ کہ اس ہاتھ سے استنجا نہ کرے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب اور کم ظرفی بھی۔ اور تیسرا یہ کہ کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس نہ لے۔ ② برتن میں سانس لینا اس لیے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعے سے خارج ہونے والے جراثیم پیے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدے میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ ③ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پیے اور سانس باہر نکالے۔

(٨٤) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِينِ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[84] حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضائے حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [نَسْتَنْجِي] اَلْاِسْتِنْجَاء سے ماخوذ ہے' یعنی پتھر یا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اَلنَّجْو اس گندگی کو کہتے ہیں جو مقعد سے خارج ہوتی ہے۔ [اَلرَّجِيع] لید یا گوبر۔

راویٔ حدیث: [حضرت سلمان رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب سلمان الخیر ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہو گئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی ﷺ پر ایمان لے آئے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ الٰہی میں خیرات کر دیتے۔ مدینے میں ٣٢ یا ٣٣ ہجری کو وفات پائی۔ ان کی عمر ٢٥٠ یا ٣٥٠ برس بیان کی جاتی ہے۔

(٨٥) وَلِلسَّبْعَةِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أَيُّوبَ: «لَاتَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا.»

[85] اور ساتوں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''قضائے حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب رخ کرو۔''

لغوی تشریح: [لَا تَسْتَدْبِرُوهَا] اس کی طرف پشت نہ کرو۔ [وَ لٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا] التشریق والتغریب سے امر

٨٤ـ أخرجه مسلم، الطهارة، باب الاستطابة، حديث: ٢٦٢.

٨٥ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب لا تستقبل القبلة بغائط أو بول، حديث: ١٤٤، ومسلم، الطهارة، باب في الاستطابة، حديث: ٢٦٤، وأبوداود، الطهارة، حديث: ٩، والترمذي، الطهارة، حديث: ٨، والنسائي، الطهارة، حديث: ٢١، ٢٢، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣١٨، وأحمد: ٥/ ٤١٦، ٤٢١.

کے صیغے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قضائے حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا' وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے' اس طرح وہ لوگ استقبال اور استدبار دونوں سے بچ جائیں گے۔ اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہوگا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ چونکہ استقبال و استدبار قبلہ سے بچنے کے لیے ہی اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے حکم کا دارومدار اسی علت وسبب پر ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں [لَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَ لَا تَسْتَدْبِرُوهَا] کا حکم نہی ایسی جگہ کے لیے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ ② گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو وہاں کے لیے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے واضح ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمشیرہ سیدہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے حجرے کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کے لیے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں کہ) رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کر رہے تھے اور اس وقت آپ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ (صحیح مسلم' الطہارۃ' باب الاستطابۃ' حدیث:۲۶۵) ③ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضائے حاجت کے وقت اپنا رخ قبلے کی طرف کرے نہ پشت۔ یہ حکم اہل مدینہ کے لیے مخصوص ہے' اس لیے کہ ان کے لیے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ] ابوایوب ان کی کنیت ہے۔ ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی اکرم ﷺ کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار جلیل القدر اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے ۵۰ ہجری میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔ یہ جگہ بزار کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔

(٨٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**مَنْ أَتَى الْغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

[86] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو قضائے حاجت کے لیے جائے اسے پردہ کرنا چاہیے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

(٨٧) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْغَائِطِ قَالَ: «**غُفْرَانَكَ**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ أَبُو حَاتِمٍ

[87] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ (جب قضائے حاجت سے فارغ ہوکر) بیت الخلا سے باہر آتے تو [غُفْرَانَكَ] کہتے ''اے اللہ! میں تیری بخشش طلب

٨٦ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الاستتار في الخلاء، حديث: ٣٥، فيه حُصين وهو مجهول كما في تقريب التهذيب وغيره.

٨٧ـ **[إسناده صحيح]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا خرج من الخلاء، حديث: ٣٠، والترمذي، الطهارة، حديث: ٧، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٣٠٠، وأحمد: ٦/ ١٥٥، والنسائي في الكبرٰى: ٦/ ٢٤، حديث: ٩٩٠٧، وصححه ابن خزيمة وابن حبان والحاكم: ١/ ١٥٨ والذهبي وغيرهم.

وَالْحَاكِمُ.

کرتا ہوں۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' نیز ابوحاتم اور حاکم دونوں نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [غُفْرَانَكَ] أَطْلُبُ فعل محذوف کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں۔ یا پھر اِغْفِرْ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ مجھے بخش دے اچھی طرح بخشنا۔

(٨٨) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ الْغَائِطَ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثًا، فَأَتَيْتُهُ بِرَوْثَةٍ، فَأَخَذَهُمَا وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: «إِنَّهَا رِكْسٌ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

[88] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ قضائے حاجت کو جانے لگے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کے لیے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے' تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً) گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپ نے دونوں پتھر تو لے لیے لیکن گوبر کو دور پھینک دیا اور فرمایا: ''یہ تو (بذات خود) پلید ہے۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ «اِئْتِنِي بِغَيْرِهَا».

احمد اور دارقطنی نے یہ اضافہ کیا ہے: ''اس کی بجائے اور لے آؤ۔''

لغوی تشریح: [بِرَوْثَةٍ] چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ (صحیح ابن خزیمة: ١/٣٩' حدیث: ٧٠) [رِكْسٌ] ''را'' کے نیچے کسرہ ہے اور ''کاف'' ساکن ہے۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ [اِئْتِنِي بِغَيْرِهَا] إتيان سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضائے حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کے لیے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے' خواہ صفائی تین سے کم ڈھیلوں سے حاصل ہو جائے۔ اور اگر تین سے مکمل صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں' البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ (پانچ' سات علی ہذا القیاس)

فوائد و مسائل: ① اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی' لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ② تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے' خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ] ان کا نام عبداللہ ہے۔ سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ بزرگ اور نہایت عقل مند و دانش مند فقہاء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ غزوۂ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضر و سفر کے ساتھی تھے۔ انھیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ ان کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی۔

٨٨ـ أخرجه البخاري، الوضوء، باب لا يستنجى بروث، حديث: ١٥٦، وهو حديث صحيح * والدارقطني: ١/ ٥٥، وأحمد: ١/ ٤٥٠، حديث: ٤٢٩٩ وسنده ضعيف، أبواسحاق عنعن.

(٨٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰى أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، وَقَالَ: «**إِنَّهُمَا لَا يُطَهِّرَانِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ.

[89] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا' اور (ساتھ ہی) فرمایا: ''یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے۔'' (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِنَّهُمَا لَا يُطَهِّرَانِ] ''یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے'' گوبر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے۔ اور ہڈی ملائم ہوتی ہے' اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہوسکتی' یہ تری کو خشک نہیں کر سکتی' نیز ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہڈی جنوں کا طعام ہے اور لید ان کے جانوروں کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں' ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بیہقی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہڈی اور گوبر سے استنجا نہ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نصیبین کے علاقے سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انھوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو میں نے اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوبر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔'' (صحيح البخاري' مناقب الأنصار' باب ذكر الجن' حديث:٣٨٦٠) لہٰذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے' اسے گندا نہ کرو۔ ② بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی (نہ دیکھی جانے والی) چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(٩٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اِسْتَنْزِهُوا مِنَ الْبَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلِلْحَاكِمِ: «**أَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ**» وَهُوَ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ.

[90]۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پیشاب (کے چھینٹوں) سے بچو کیونکہ عمومی عذاب قبر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔) اور حاکم کی روایت میں ہے: ''اکثر عذاب قبر پیشاب (کے چھینٹوں) کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: [اِسْتَنْزِهُوا] اجتناب کرو۔ بچو۔ [مِنْهُ] میں مِن تعلیلیہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ پیشاب سے پرہیز اور اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

٨٩۔ [حسن] أخرجه الدارقطني، الطهارة، باب الاستنجاء: ١/ ٥٦ وقال: إسناده صحيح.

٩٠۔ [ضعيف] أخرجه الدارقطني: ١/ ١٢٨ وقال: "الصواب مرسل"، والحاكم في المستدرك: ١/ ١٨٣ وصححه على شرط الشيخين، ووافقه الذهبي، سليمان الأعمش مدلس وعنعن.

(٩١) وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْخَلَاءِ أَنْ نَقْعُدَ عَلَى الْيُسْرٰى وَنَنْصِبَ الْيُمْنٰى. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

[91] حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قضائے حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: ''ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر بیٹھیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں (اس پر بوجھ کم ڈالیں)۔'' (اسے بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَلَّمَنَا] عَلَّم، تعلیم سے ماخوذ صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ ''نا'' ضمیر جمع متکلم کی ہے اور مفعول واقع ہو رہی ہے۔ [فِي الْخَلَاءِ] قضائے حاجت کے آداب کے بارے میں۔ [نَنْصِبَ] نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑا کرنے اور قائم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ [بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ] سند ضعیف ہے' اس لیے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ] ''سین'' پر ضمہ ہے۔ سراقہ بن مالک بن جعشم۔ جعشم کے ''جیم'' پر ضمہ ''عین'' ساکن اور ''شین'' پر ضمہ ہے۔ قبیلۂ مدلج میں سے تھے' اس لیے مدلجی کہلائے اور بنوکنانہ میں سے ہونے کی بنا پر کنانی کہلائے۔ ابوسفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہیں جو ہجرت کے موقع پر انعام کے لالچ میں نبی ﷺ کو گرفتار کرنے کے لیے آپ کے تعاقب میں نکلے اور جب آپ کے قریب پہنچے تو ان کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا' چنانچہ انھوں نے امان طلب کی تو آپ نے امان دے دی۔ ۲۴ ہجری میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(٩٢) وَعَنْ عِيسَى بْنِ يَزْدَادَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلْيَنْتُرْ ذَكَرَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

[92] عیسیٰ بن یزداد اپنے والد سے روایت بیان کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو اپنے عضو مخصوص کو تین مرتبہ سوت لے۔'' (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَلْيَنْتُرْ] نتر سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد عضو مخصوص کو کھینچ کر نچوڑ لے یعنی زور سے دبا کر کھینچے تاکہ اس کے اندر پیشاب کے جو قطرات باقی ہیں' وہ نکل جائیں۔ بعض نسخوں میں [فَلْيَنْتُرْ] کی بجائے [فَلْيَنْثُرْ] کے الفاظ ہیں' یعنی ''تا'' کی بجائے ''ثا'' ہے۔ تاہم مفہوم دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔

فوائد و مسائل: ① پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سوتنا یا جھاڑنا اس لیے ہے کہ اگر قابل خارج قطرۂ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ ② یہ روایت گو ضعیف ہے مگر

٩١ـ [إسناده ضعيف] أخرجه البيهقي في السنن الكبرٰى: ١/ ٩٦ وفيه رجل من بني مدلج عن أبيه وهما مجهولان.

٩٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، الطهارة، باب الاستبراء بعد البول، حديث: ٣٢٦، قال البوصيري: "إسناده ضعيف" وزمعة ضعيف، وعيسى بن يزداد مجهول الحال.

پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ ''انھیں عذاب قبر اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔''

راویٔ حدیث: [عیسیٰ بن یزداد] یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں: عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں: ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ان کا تعارف ہے۔ یزداد کو ''یا'' اور ''زا'' کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ''با'' اور ''را'' سے بھی پڑھا گیا ہے، یعنی برداد۔

(٩٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَاءٍ فَقَالَ: «**إِنَّ اللّٰهَ يُثْنِي عَلَيْكُمْ**». فَقَالُوا: إِنَّا نُتْبِعُ الْحِجَارَةَ الْمَاءَ. رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَصْلُهُ فِي أَبِي دَاوُدَ، وَالتِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، بِدُونِ ذِكْرِ الْحِجَارَةِ.

[93] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے (اس کی وجہ کیا ہے؟) انھوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے (استعمال کے) بعد مزید طہارت کے لیے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے بزار نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور اس کی اصل ابوداود اور ترمذی میں ہے۔ (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے، البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے۔)

لغوی تشریح: [أَهْلَ قُبَاءٍ] سَأَلَ فعل کا مفعول ہے اور [قباء] ''قاف'' کے ضمہ اور آخر میں الف ممدودہ اور ''با'' کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے۔ مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ [يُثْنِي عَلَيْكُمْ] یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمھاری تعریف کی ہے: ﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبة ٩:١٠٨) ''ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' [نُتْبِعُ الْحِجَارَةَ الْمَاءَ] یعنی پہلے ہم پتھروں سے استنجا کرتے ہیں، پھر اس کے بعد پانی سے صفائی کرتے ہیں اور [نُتْبِعُ] باب افعال سے ہے۔ [اَلْحِجَارَةَ] اس کا مفعول اول ہے اور [اَلْمَاءَ] مفعول ثانی ہے۔ [بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ] یہ اس لیے ضعیف ہے کہ امام زہری سے محمد بن عبدالعزیز نے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شبیب بھی ضعیف راوی ہے، تاہم ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ جس میں صرف پانی سے استنجا کرنے کا ذکر ہے، وہ صحیح ہے، اس لیے ترجمۃ الباب کے تحت مذکور روایت پتھروں کے ذکر کے سوا اس روایت کی تائید کی بنا پر حسن بن جاتی ہے۔

٩٣ـ **[إسناده ضعيف جدا]** أخرجه البزار (كشف الأستار): ١/ ١٣٠، ١٣١، حديث: ٢٤٧، فيه محمد بن عبدالعزيز بن عمر وهو منكر الحديث، وحديث أبي هريرة أخرجه أبوداود، الطهارة، حديث: ٤٤، والترمذي، تفسير القرآن، حديث: ٣١٠٠، بغير هذا اللفظ، وهو حسن بالشواهد (انظر مسند أحمد: ٦/ ٦، حديث: ٢٣٧٢٣ وسنده حسن قوي) وابن خزيمة من حديث أبي هريرة.

٨ - بَابُ الْغُسْلِ وَحُكْمِ الْجُنُبِ

باب:8-غسل اور جنبی کے حکم کا بیان

(٩٤) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

[94] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانی کا استعمال خروج پانی سے ہے۔'' (جب تک منی کا خروج نہ ہو اس وقت تک غسل واجب نہیں ہوتا۔) (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ] اس میں مِنْ تعلیل کا ہے۔ اور بعض روایات میں [إِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ] کلمۂ حصر کے ساتھ ہے۔ پہلے الماء سے معروف پانی' یعنی نہانا اور دوسرے الماء سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہوگا۔ اگر اتنے عمل کے باوجود منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضی یہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوتا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ اس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اب محض جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے' خواہ انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ اگرچہ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی مگر الفاظ چونکہ عام ہیں' اس لیے اس کو بھی یہ شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس کے خلاف بھی کچھ وارد نہیں ہوا بلکہ اس کی تائید موجود ہے۔

فوائد و مسائل: ① جمہور علماء کے نزدیک یہ حدیث احتلام کے بارے میں ہے' جماع سے اس کا تعلق نہیں۔ ② حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب انزال ہو لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ ③ قاضی ابن العربی نے کہا ہے کہ اس مسئلے میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضائے مخصوص ایک دوسرے سے مل جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے' خواہ انزال نہ ہو۔

(٩٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا جَلَسَ بَيْنَ

[95] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص عورت کی

٩٤ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب إنما الماء من الماء، حديث: ٣٤٣ واللفظ له، والبخاري، الوضوء، باب من لم ير الوضوء إلا من المخرجين من القبل والدبر، حديث: ١٨٠.

٩٥ـ أخرجه البخاري، الغسل، باب إذا التقى الختانان، حديث: ٢٩١، ومسلم، الحيض، باب نسخ الماء من الماء ووجوب الغسل بالتقاء الختانين، حديث: ٣٤٨.

شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَإِنْ لَّمْ يُنْزِلْ».

چار شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے‘ پھر اس میں کوشش کرے تو اس پر غسل واجب ہو گیا۔‘‘ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے یہ اضافہ نقل کیا ہے: ’’خواہ انزال نہ ہو۔‘‘

لغوی تشریح: [إِذَا جَلَسَ] یعنی جب مرد بیٹھ جائے۔ [بَيْنَ شُعَبِهَا] عورت کی شاخوں میں۔ [شُعَب] شُعْبَةٌ کی جمع ہے۔ ’’شین‘‘ پر ضمہ اور ’’عین‘‘ پر فتحہ ہے۔ درخت کی شاخ کے لیے استعمال ہوتا ہے یا کسی چیز کا کچھ حصہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ عورت کی چار شاخوں سے مراد اس کے دو بازو اور دو ٹانگیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عورت کے پاؤں اور رانیں ہیں۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اس سے عورت کی دونوں پنڈلیاں اور دونوں رانیں مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہو مقصود جماع سے کنایہ ہے۔ اور ابوداود کی ایک روایت میں [وَ أَلْزَقَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ] بھی مروی ہے۔ ’’عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ سے ملاپ پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔‘‘ (سنن أبي داود، الطهارة، باب في الإكسال، حديث:٢١٦) [ثُمَّ جَهَدَهَا] اس میں کنایہ ہے مرد کے عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ میں دخول سے۔

فوائد و مسائل: ① مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ حشفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ ② خلفائے اربعہ اور ائمۂ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(٩٦) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ -وَهِيَ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ- قَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّ اللّٰهَ لَايَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ الْغُسْلُ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ»، اَلْحَدِيثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[96] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیا نہیں کرتا تو بتائیں کیا عورت کو جب احتلام ہو جائے تو اس پر بھی غسل فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ’’ہاں! جب وہ پانی دیکھے۔‘‘ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ] ’’حا‘‘ کے بعد دو یا ہیں۔ ’’حا‘‘ اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق بیان کرنے سے رکتا ہے نہ حیا کرنے والے کی طرح حق کو ترک کرتا ہے۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ یہ بات انھوں نے اعتذار کے طور پر کہی کیونکہ عورتیں اس قسم کی باتیں پوچھنے سے شرماتی ہیں۔ [إِذَا احْتَلَمَتْ] یعنی جب اسے احتلام ہو جائے۔ ایک دوسری روایت میں: [إِذَا رَأَتْ أَنَّ زَوْجَهَا يُجَامِعُهَا فِي الْمَنَامِ] کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ (مسند أحمد:٦/ ٣٧٦، ٣٧٧) یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات قائم کیے ہوئے ہے۔ [إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ] جب نیند سے

٩٦- أخرجه البخاري، الغسل، باب إذا احتلمت المرأة، حديث:٢٨٢، وانظر، حديث:١٣٠، ومسلم، الحيض، باب وجوب الغسل على المرأة بخروج المني منها، حديث:٣١٣.

بیدار ہو کر منی دیکھے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا] ان کا نام رمیصاء یا غمیصاء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نضر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہوگئیں۔ انھوں نے اپنے خاوند کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ اسی وجہ سے ناراض ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا اور فوت ہوگیا۔ مالک بن نضر کی وفات کے بعد ابوطلحہ نے ان کو پیغام نکاح دیا۔ ابوطلحہ ابھی مشرک تھے۔ ام سلیم نے شرط پیش کی کہ اسلام قبول کرلو تو میں تمھارے ساتھ نکاح کرلوں گی۔ اس شرط کو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور مسلمان ہوگئے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان سے نکاح کرلیا۔ ان کے بہت زیادہ فضائل و مناقب ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٩٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فِي الْمَرْأَةِ تَرٰى فِي مَنَامِهَا مَا يَرَى الرَّجُلُ، قَالَ: «تَغْتَسِلُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَهَلْ يَكُونُ هٰذَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشَّبَهُ؟».

[97] حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے متعلق جو خواب میں وہی کچھ دیکھے جو مرد دیکھتا ہے (یعنی احتلام)، آپ نے فرمایا: ”وہ غسل کرے۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے (آپ کے جواب دینے پر) مزید دریافت کیا: کیا ایسا (عورت کے ساتھ) بھی ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں (اگر ایسا نہ ہوتا) تو مشابہت کہاں سے ہوتی؟“

لغوی تشریح: [مَا يَرَى الرَّجُلُ] اس سے مراد احتلام ہے۔ [فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشِّبْهُ؟] شبہ میں ”شین“ پر کسرہ ہے اور ”با“ ساکن ہے اور دونوں پر فتحہ بھی جائز ہے۔ مماثلت کے معنی ہیں۔ اور اس میں أَيْنَ استفہامیہ ہے جو دراصل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس خیال کی تردید کے لیے ہے کہ آیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مشابہت رکھتا ہے اور کبھی ماں اور خالاؤں سے۔ اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ شہوت کے وقت عورت کے اندر سے بھی منی کود کر خارج ہو اور بچے کی خلقت و ساخت میں حصہ دار بنے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا انکار اس پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو احتلام نادر طور پر، یعنی بہت کم ہوتا ہے، مردوں کی طرح کثرت سے نہیں ہوتا۔

فائدہ: جس طرح مردوں کو احتلام لاحق ہوتا ہے اور ان پر غسل کرنا فرض ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی یہ صورت لاحق ہوتی ہے، ایسی صورت میں ان پر بھی غسل کرنا فرض ہے۔ باقی رہا بچے کی مشابہت کا مسئلہ تو اس بارے میں حدیث سے ثابت ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہوتا ہے تو نومولود کی مشابہت باپ سے ہوتی ہے اور جب ماں کا پانی غالب ہو تو بچے کی مشابہت والدہ سے ہوتی ہے۔ (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث:٣٩٣٨)

٩٧ـ أخرجه البخاري: لم أجده من حديث أنس رضي الله عنه، ومسلم، الحيض، باب وجوب الغسل على المرأة بخروج المني منها، حديث: ٣١٠ـ٣١٢.

(٩٨) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنَ الْجَنَابَةِ، وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَمِنَ الْحِجَامَةِ، وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[98] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل کیا کرتے تھے: جنابت سے، جمعے کے روز، سینگی لگوانے کے بعد اور میت کو غسل دینے کی وجہ سے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں سے غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ ② جمعے کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے، البتہ امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ فرض ہے۔ امام داود ظاہری اور ابن خزیمہ رحمہما اللہ کا بھی یہی موقف ہے، اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا بھی زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ ③ سینگی لگوانے سے غسل مسنون ہے، فرض نہیں۔ پیچھے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپ نے سینگی لگوائی اور وضو کیے بغیر نماز پڑھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے سینگی لگوانے کے بعد کبھی غسل کیا اور کبھی وضو بھی نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل تو اس کے بارے میں بھی بیان گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے، فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے۔

(٩٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ -فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ عِنْدَمَا أَسْلَمَ- وَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ. رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصْلُهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[99] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے کے متعلق مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اسے غسل کرنے کا حکم فرمایا۔ (اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی اصل بخاری و مسلم میں ہے۔)

فوائد و مسائل: ① کافر جب اسلام کے لیے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہیے۔ ② یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب، اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ] دونوں لفظوں کے پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف تخفیف کے ساتھ ہے۔ یمامہ کے قبیلے بنوحنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ انھیں مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انھیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین دن بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انھیں آزاد کر دیا۔ اس کے

٩٨۔ [حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الغسل للجمعة، حديث: ٣٤٨، وانظر، حديث: ٣١٦٠، وابن خزيمة: ١/ ١٢٦، حديث: ٢٥٦، وضعفه أبوداود، والسند حسن، وللحديث شواهد.

٩٩۔ [صحيح] أخرجه عبدالرزاق، ومن طريقه ابن خزيمة: ١/ ١٢٥، حديث: ٢٥٣، والبيهقي: ١/ ١٧١، والبخاري، المغازي، حديث: ٤٣٧٢، ومسلم، الجهاد، حديث: ١٧٦٤.

بعد یہ مسلمان ہو گئے اور اسلام کا بہت عمدہ ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب ان کی قوم کے لوگ مسیلمہ کذاب کے فتنے کا شکار ہو گئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(١٠٠) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ**». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

[100] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعے کے روز غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے۔'' (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُحْتَلِمٍ] بالغ کو کہتے ہیں۔

فائدہ: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو یوم جمعہ کے غسل کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں ''واجب'' کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ لیکن جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کے لیے سمجھتے ہیں۔

(١٠١) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ**». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

[101] حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جمعے کے روز وضو کیا اس نے اچھا اور بہتر کیا۔ اور جس نے غسل کیا تو غسل افضل اور بہترین ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَبِهَا] ''ہا'' سے مراد ''سنت'' یا ''رخصت'' یا ''خصلت حمیدہ'' ہے اور یہ جار مجرور أَخَذَ محذوف کے متعلق ہے۔ [نِعْمَتْ] یہ فعل مدح ہے۔ اس کا فاعل هِيَ ضمیر مستتر ہے جس کا مرجع ''سنت'' یا ''رخصت'' یا ''خصلت حمیدہ'' ہے اور مخصوص بالمدح محذوف ہے' یعنی هٰذِهِ.

فائدہ: یہ حدیث جمعے کے روز غسل کے عدم وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے جیسا کہ جمہور کا موقف ہے۔ لیکن جو حدیث اس (جمعے کے روز غسل کرنے) کے وجوب پر دلالت کرتی ہے وہ عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے

١٠٠ـ أخرجه البخاري، الجمعة، باب فضل الغسل يوم الجمعة...، حديث: ٨٧٩، ومسلم، الجمعة، باب الطيب والسواك يوم الجمعة، حديث: ٨٤٦، وأبوداود، الطهارة، حديث: ٣٤١، وأشار إليه الترمذي، الصلاة، حديث: ٤٩٢، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٠٨٩، والنسائي، الصلاة، حديث: ١٣٧٦، وأحمد: ٣/ ٦٠.

١٠١ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الرخصة في ترك الغسل يوم الجمعة، حديث: ٣٥٤، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤٩٧، والنسائي، الصلاة، حديث: ١٣٨١، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٠٩١ من حديث أنس رضي الله عنه، وأحمد: ٥/ ١٥، ١٦، ٢٢، والحسن البصري صرح بالسماع عند الطوسي في مختصر الأحكام: ٣/ ١٠، حديث: ٣٣٤/ ٤٦٧ وسنده حسن.

صحیح' زیادہ راجح اور زیادہ قوی ہے' اس لیے اصح' راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سَمُرَہ رضی اللہ عنہ] ''سین'' کے فتحہ اور ''میم'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ [جُنْدُب] ''جیم'' پر ضمہ' ''نون'' ساکن اور ''دال'' پر بھی ضمہ ہے۔ مشہور صحابیٔ رسول ہیں۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ فزار قبیلہ کے فرد ہونے کی وجہ سے فزاری کہلائے۔ انصار سے حلیفانہ روابط و تعلقات تھے۔ یہ ان حفاظ میں سے تھے جنھیں بکثرت احادیث و قرآن یاد تھا۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ خوارج کے گروہ حروریہ کے سلسلے میں بڑے سخت تھے۔ ۵۹ ہجری کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۰۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ مَا لَمْ يَكُنْ جُنُبًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْخَمْسَةُ، وَهٰذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[102] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں ہمیں قرآن مجید پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور انھوں نے اسے حسن کہا ہے جبکہ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل کیے بغیر قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہیے' یعنی قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہیے۔ ② امام ابویعلی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو دیکھا' آپ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور فرمایا: ''جس کسی کو جنابت لاحق نہ ہو اس کے لیے مناسب طریقہ یہی ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے۔) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔'' (مسند أبي يعلیٰ بتحقيق الشيخ الأثري: ۱/ ۲۰۸) ③ جو علماء جنابت اور حیض کی حالت میں بھی تلاوت قرآن سمیت اللہ کا ذکر کرنے کی اجازت دیتے ہیں' ان کے نزدیک یہ حدیث درجۂ صحت کو نہیں پہنچتی۔

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَتٰى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوءًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ الْحَاكِمُ: «فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ».

[103] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس جائے' (تعلق زن و شو قائم کرے) پھر دوبارہ (لطف اندوز ہونے کا) ارادہ ہو تو دونوں باریوں کے درمیان میں وضو کر لے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

۱۰۲ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الجنب يقرأ القرآن، حديث: ۲۲۹، والترمذي، الطهارة، حديث: ۱۴۶، والنسائي، الطهارة، حديث: ۲۶۷، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ۵۹۴، وأحمد: ۱/ ۸۳.

۱۰۳ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب جواز نوم الجنب واستحباب الوضوء له، حديث: ۳۰۸، والحاكم في المستدرك: ۱/ ۱۵۲ وسنده صحيح، وأبوداود، الطهارة، حديث: ۲۲۸، والترمذي، الطهارة، حديث: ۱۱۸، والنسائي في الكبرٰى: ۵/ ۳۳۲، حديث: ۹۰۹۲، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، وإسناده ضعيف، أبوإسحاق السبيعي لم يثبت تصريح سماعه.

اور حاکم میں یہ اضافہ بھی ہے: ''یہ (وضو) دوبارہ مباشرت کے لیے زیادہ باعث نشاط ہے۔''

وَ لِلْأَرْبَعَةِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَنَامُ وَهُوَ جُنُبٌ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَمَسَّ مَاءً. وَهُوَ مَعْلُولٌ.

اور سنن اربعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے تھے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: [أَنْشَطُ] اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہت مسرت، فرحت اور تازگی بخش ہے۔ طبیعت میں تروتازگی اور عمدگی پیدا کرتا ہے۔ [مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّمَسَّ مَاءً] اس جملے میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ غسل ہی کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ہے وہ مستحب ہے، واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ [وَهُوَ مَعْلُولٌ] اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواسحاق کا ابوالاسود کے واسطے سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواسحاق کا ابوالاسود سے سماع ثابت نہیں، لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انھوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی معلول اس لیے کہا ہے کہ ان کے نزدیک بھی ابواسحاق کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں۔ مگر امام بیہقی رحمہ اللہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے جس کے باعث حدیث معلول نہیں رہتی۔

فوائد و مسائل: ① صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ خور و نوش اور مباشرت کے لیے عضو مخصوص دھو کر وضو فرما لیتے تھے۔ (صحیح مسلم، الحیض، باب جواز نوم الجنب واستحباب الوضوء.....، حدیث: ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷) ② اکثر علمائے امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

(١٠٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِينِهِ عَلٰى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَاءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي أُصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلٰى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلٰى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ،

[104] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے کہ پہلے ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنی شرم گاہ دھوتے۔ پھر وضو کرتے، پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعے سے سر کے بالوں کی جڑوں میں (پانی) داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے جسم پر پانی بہاتے اور (آخر میں) دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم۔

١٠٤ـ أخرجه البخاري، الغسل، باب الوضوء قبل الغسل، حديث: ٢٤٨، ومسلم، الحيض، باب صفة غسل الجنابة، حديث: ٣١٦، وحديث ميمونة أخرجه البخاري، الغسل، حديث: ٢٦٦ وغيره، ومسلم، الحيض، حديث: ٣١٧.

وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ مَيْمُونَةَ: ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الْأَرْضَ.

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ ؓ کی روایت میں اس طرح ہے: پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے (اور صاف کرتے۔)

وَفِي رِوَايَةٍ: فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ. وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالْمِنْدِيلِ فَرَدَّهُ، وَفِيهِ: وَجَعَلَ يَنْفُضُ الْمَاءَ بِيَدِهِ.

اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے: پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح صاف کرتے۔ اس روایت کے آخر میں ہے: پھر میں نے آپ کی خدمت میں رومال (تولیہ) پیش کیا مگر آپ نے اسے واپس لوٹا دیا۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ آپ نے (بدن پر جو پانی رہ گیا تھا اسے) اپنے ہاتھ سے جھاڑنا شروع کر دیا۔

لغوی تشریح: [يُفْرِغُ] إِفْرَاغ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کہ آپ پانی ڈالتے یا انڈیلتے تھے۔ [يَغْسِلُ فَرْجَهُ] عضو مخصوص اور اس کے اردگرد کے حصے کو جو رانوں کے ساتھ ملحق ہوتا تھا' دھوتے تھے جیسا کہ ابوداود میں مَرَافِغ کے لفظ ہیں: مَرَافِغ' مرفغ کی جمع ہے' یعنی شرم گاہ کا اردگرد۔ [فَيُدْخِلُ] یہ باب افعال ہے۔ [فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ] اپنی انگلیوں کو داخل کرتے۔ [فِي أُصُولِ الشَّعْرِ] بالوں کی جڑوں میں اپنی انگلیوں کو دائیں اور پھر بائیں جانب داخل کرتے تاکہ بالوں کی جڑوں اور جسم کی کھال تک پانی کی تری پہنچ جائے۔ [ثُمَّ حَفَنَ] پھر دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی بھر کر ڈالتے۔ [حَفَنَاتٍ] حَفْنَة کی جمع ہے۔ ''حا'' اور ''فا'' دونوں پر فتحہ ہے۔ حَفْنَة کے معنی لپ اور چلو کے آتے ہیں' یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں ہتھیلیوں کو پانی سے بھرنا۔ [ثُمَّ أَفَاضَ الْمَاءَ] پھر پانی بہاتے یا انڈیلتے' یعنی تمام جسم پر پانی بہا دیتے۔


فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں کچھ پہلو وضاحت طلب ہیں۔ مختلف احادیث کے ملانے سے واضح ہو جاتا ہے کہ غسل کرنے سے پہلے آپ ہاتھ دھوتے۔ اس میں تعداد کا ذکر نہیں کہ کتنی بار دھوتے۔ ام المومنین حضرت میمونہ ؓ کی روایت میں دو یا تین بار دھونے کا ذکر ہے' پھر آپ اپنی شرمگاہ کو دھوتے' پھر ہاتھ مٹی پر مار کر ہاتھ پاک کرتے' پھر اسی طرح وضو کرتے جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔ پھر تین مرتبہ سر کے بالوں کا خلال کرتے۔ پہلے سر کے دائیں جانب پانی کی تری جڑوں تک پہنچاتے' پھر بائیں طرف اسی طرح کرتے' پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ ② حضرت میمونہ ؓ کی روایت میں ہے کہ پھر فارغ ہو کر ایک طرف ہو جاتے اور دونوں پاؤں دھوتے۔ ③ اسی غسل میں کیے گئے وضو سے نبی اکرم ﷺ نے صبح کی دو سنتیں اور نماز فجر کے فرض ادا فرمائے' گویا دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت و حاجت نہیں' بشرطیکہ وضو کے بعد ہاتھ شرمگاہ کو نہ لگا ہو۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد چہرے' ہاتھوں اور باقی بدن پر پانی کے اثرات کو تولیے یا رومال وغیرہ سے صاف کرنا ضروری نہیں، البتہ

جائز ہے کیونکہ بعض روایات میں کپڑے سے پانی خشک کرنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ ⑤ وضو کے پانی کو ہاتھ سے جھاڑنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور جس روایت میں ہاتھ سے پانی جھاڑنے کی ممانعت آئی ہے وہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح حدیث کی موجودگی میں ضعیف کی کوئی وقعت وحیثیت نہیں۔

(١٠٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ شَعْرَ رَأْسِي، أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ؟ وَفِي رِوَايَةٍ: وَلِلْحَيْضَةِ؟ فَقَالَ: «**لَا، إِنَّمَا يَكْفِيكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[105] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے سر کے بال (مینڈھیوں کی شکل میں) مضبوطی سے باندھ لیتی ہوں۔ کیا غسل جنابت کے موقع پر ان کو کھولوں؟ اور ایک روایت میں حیض سے فارغ ہو کر غسل کے وقت کے الفاظ ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں! (کھولنے کی ضرورت نہیں) بس تیرے لیے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین لپ پانی بہا دیا کرے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَشُدُّ] شَدَّ يَشُدُّ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: مضبوطی کے ساتھ باندھنا۔ [تَحْثِي] تو انڈیل، تو ڈال۔ نصبی حالت کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے۔ تَحْثِي کی ''یا'' ساکن رہے گی۔ [حَثَيَاتٍ] حَفَنَاتٍ کے معنی میں ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھوں کے چلو۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جسے جنابت لاحق ہو جائے اس کے لیے غسل کرتے وقت بالوں کا کھولنا ضروری نہیں' البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے' جسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' کہ آپ نے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا۔ (سنن ابن ماجه' الطهارة و سننها' باب في الحائض كيف تغتسل' حديث: ٦٤١) مگر یہ دونوں روایتیں باہم متعارض نہیں کیونکہ بال کھولنے کا حکم اس وقت ہے جب عورت حیض سے غسل کرے' لیکن غسل جنابت میں عورت پر واجب نہیں کہ وہ سر کے بال کھولے' بلکہ صرف بالوں کی جڑ یا سر کا چمڑا تر ہونا چاہیے، سارے بال تر ہونا ضروری نہیں۔ ② صحیح مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی ذریعے سے اطلاع ملی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما عورتوں کو غسل جنابت وحیض کے وقت سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ابن عمرو پر تعجب ہے کہ وہ غسل کے وقت عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں تو وہ ان کو سر منڈوانے کا حکم کیوں نہیں دیتے۔ (اس سے تو بہتر ہے کہ وہ عورتوں کو سر منڈوانے کا حکم ہی دے دیں۔) میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی ٹب نما برتن میں غسل کر لیا کرتے تھے اور میں سر پر صرف تین بار پانی ڈال لیتی تھی۔ اور (غسل جنابت میں) سر کے بال کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ (صحيح مسلم' الحيض' باب حكم ضفائر المغتسلة' حديث:٣٣١) ③ [وَفِي رِوَايَةٍ: وَلِلْحَيْضَةِ؟] کے الفاظ شاذ ہیں جیسا کہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے الصحيحة (١/٣٦٦) میں وضاحت کی ہے۔

١٠٥ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب حكم ضفائر المغتسلة، حديث: ٣٣٠.

(١٠٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنِّي لَاأُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَاجُنُبٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[106] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں حیض والی عورت اور جنبی کے لیے مسجد (میں داخلہ) حلال نہیں کرتا۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ] إحلال سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں مسجد میں داخلے کو حلال نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح اور بہت واضح ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ② اگر مسجد کے علاوہ دوسرا گزرنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ ③ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت: ﴿إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ﴾ (النساء4:43) ہے، یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے۔ ہاں، اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے۔ اور حدیث میں جو ممانعت آئی ہے وہ ٹھہرنے کی ہے، نہ کہ گزرنے کی۔ ④ امام احمد رحمہ اللہ تو آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہو گئی تو ایسے آدمی کے لیے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا ضروری ہے۔

(١٠٧) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ، مِنَ الْجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ ابْنُ حِبَّانَ: وَتَلْتَقِي أَيْدِينَا.

[107] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ میں اور رسول اللہ ﷺ دونوں ایک ہی برتن سے غسل جنابت کر لیا کرتے تھے۔ اس برتن میں ہمارے ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے یہ اضافہ مزید نقل کیا ہے: ''بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔''

لغوی تشریح: [تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ] کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے، مثلاً: پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں نبی ﷺ کا، یا پھر پہلے نبی ﷺ کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ [مِنَ الْجَنَابَةِ] جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ [تَلْتَقِي] ایک دوسرے سے مل جاتے، چھو جاتے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر

١٠٦ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الجنب يدخل المسجد، حديث: ٢٣٢، وابن خزيمة، حديث: ١٣٢٧ - جسرة بنت دجاجة: "لا ينزل حديثها عن درجة الحسن".

١٠٧ـ أخرجه البخاري، الغسل، باب هل يدخل الجنب يده في الإناء....، حديث: ٢٦١، ومسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة....، حديث: ٣٢١ واللفظ له، وابن حبان: لم أجده بلفظ "وتلتقي".

دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کے لیے باعث نقصان نہیں' لہٰذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔

(١٠٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةً، فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا الْبَشَرَ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَاهُ، وَلِأَحْمَدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا نَحْوُهُ، وَفِيهِ رَاوٍ مَجْهُولٌ.

[108] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ہر بال کے نیچے جنابت کا اثر ہوتا ہے' اس لیے بالوں کو (اچھی طرح) دھویا کرو اور جسم کو اچھی طرح (مل کر) صاف کیا کرو۔'' (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے' اور اسے ان دونوں نے ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے۔)

لغوی تشریح: [أَنْقُوا] إِنْقَاء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [اَلْبَشَرَ] ''با'' اور ''شین'' پر فتحہ ہے۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد کی اوپر والی سطح۔ [وَضَعَّفَاهُ] اسے دونوں (ابوداود اور ترمذی) نے ضعیف قرار دیا ہے' اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث بن وجیہ ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن یہی بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ غسل جنابت میں سارا جسم دھونا فرض ہے' البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ ② احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ ③ بہرحال احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتی کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔

٩ - بَابُ التَّيَمُّمِ

باب:9- تیمم کے احکام ومسائل

(١٠٩) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**أُعْطِيتُ**

[109] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ

١٠٨ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في الغسل من الجنابة، حديث:٢٤٨ وقال: "الحارث بن وجيه حديثه منكر وهو ضعيف"، والترمذي، الطهارة، حديث:١٠٦، وابن ماجه، الطهارة، حديث:٥٩٧ * وأحمد:٦/ ١١٠، ١١١، ٢٥٤ وسنده ضعيف، فيه ضعيف ومجهول.

١٠٩ـ أخرجه البخاري، التيمم، باب(١)، حديث:٣٣٥، ومسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، حديث:٥٢١، [وحديث حذيفة، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، حديث:٥٢٢] * وحديث علي أخرجه أحمد:١/ ٩٨ وهو حديث حسن صحيح.

خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي : نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا، فَأَيُّمَا رَجُلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ» . وَذَكَرَ الْحَدِيثَ .

سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں: مجھے ایک مہینے کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دبدبے سے مدد دی گئی ہے۔ اور ساری زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ اب جس آدمی کو (جہاں بھی) نماز کا وقت آ جائے اسے نماز پڑھ لینی چاہیے۔'' اور راوی نے آگے پوری حدیث ذکر کی۔

وَفِي حَدِيثِ حُذَيْفَةَ عِنْدَ مُسْلِمٍ : «وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُورًا، إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ» .

مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''جب ہمیں پانی دستیاب نہ ہو تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے۔''

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ : «وَجُعِلَ التُّرَابُ لِي طَهُورًا» .

مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''مٹی میرے لیے حصول طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔''

لغوی تشریح: [بَابُ التَّيَمُّمِ] تیمّم کے لغوی معنی ہیں: قصد و ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں نماز وغیرہ کو مباح کرنے کی غرض سے چہرے اور ہاتھوں پر ملنے کے لیے پاک مٹی کے قصد و ارادہ کو تیمّم کہتے ہیں۔ [أُعْطِيتُ] مجھے دی گئی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ [خَمْسًا] پانچ ممیزات و خصائص۔ [نُصِرْتُ] میں مدد دیا گیا ہوں۔ صیغۂ مجہول ہے۔ [بِالرُّعْبِ] ''را'' پر ضمہ اور ''عین'' ساکن ہے۔ خوف۔ [مَسِيرَةَ شَهْرٍ] مہینے بھر کی مسافت اور دوری سے میرے دشمن پر میرا رعب و دبدبہ پڑ جاتا ہے۔ ممیّزات خمسہ میں سے یہ پہلا امتیاز ہے اور دوسرا [جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا] کا امتیاز ہے۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی نہیں دیا گیا، کیونکہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ صرف اپنے گرجوں اور عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ [وَطَهُورًا] ''طا'' پر فتحہ ہے، یعنی پاکیزگی و طہارت حاصل کرنے اور جنابت و ناپاکی کو دور کرنے کا ذریعہ۔ اس طرح سے ادائیگی نماز کا موقع پیدا کیا گیا ہے۔ [أَدْرَكَتْهُ] اس کا وقت آ پہنچے، یعنی نماز کا وقت ہو جائے۔ [فَلْيُصَلِّ] تو اسے نماز پڑھ لینی چاہیے، خواہ مسجد نہ ملے اور پانی مہیا نہ ہو سکے۔ [وَذَكَرَ] یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یا راوی نے باقی حدیث بیان کی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں سے مصنف نے بالخصوص آپ کو عطا کیے جانے والے دو امتیازات و خصائص کا ذکر کیا ہے اور باقی تین یہ ہیں: غنائم کا حلال کیا جانا، یعنی دوران جنگ میں دشمن سے جو اموال افواج اسلام کے قبضے میں آئیں وہ آپ کے لیے اور امت مسلمہ کے لیے حلال کیے گئے ہیں۔ نیز شفاعت کبریٰ بھی آپ ہی فرمائیں گے، یہ امتیاز بھی صرف آپ ہی کا ہے، تاکہ روز محشر کی تکلیف سے لوگوں کو آرام و سکون اور راحت نصیب ہو۔ اور روئے ارض کے تمام انسانوں اور جنوں کے لیے آپ کو نبی بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ ② مصنف رحمہ اللہ نے یہاں آخری تین امتیازات کو حذف کر دیا ہے اور انھی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق طہارت اور نماز سے ہے۔ ③ پانی کے دستیاب نہ ہونے کی

صورت میں شریعت اسلامیہ نے تیمم کی سہولت بہم پہنچا کر امت مسلمہ کے لیے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ مٹی سے تیمم جائز ہے' البتہ زمین سے نکلنے والی دوسری اشیاء سے تیمم جائز ہے یا نہیں' اس کے متعلق فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ احتیاط اسی میں ہے کہ زمین سے نکلنے والی اشیاء پر مٹی' غبار ہو تو تیمم جائز ہے ورنہ نہیں۔

(١١٠) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي حَاجَةٍ، فَأَجْنَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ، فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَّغُ الدَّابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذٰلِكَ، فَقَالَ: «**إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هٰكَذَا**». ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشِّمَالَ عَلَى الْيَمِينِ وَظَاهِرَ كَفَّيْهِ وَوَجْهَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[110] حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے کسی حاجت کے لیے بھیجا۔ میں جنبی ہو گیا اور مجھے پانی دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ پھر (ضرورت سے فارغ ہو کر) میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپ کے گوش گزار کیا۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔'' پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا' پھر بائیں کو دائیں پر' یعنی اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر ملا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: وَضَرَبَ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ.

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ آپ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور ان دونوں میں پھونک ماری، پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: [فَأَجْنَبْتُ] میں جنبی ہو گیا۔ [فَتَمَرَّغْتُ] لوٹ پوٹ ہوا۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کے لیے ایک ہی ضرب کافی ہے اور صرف ہتھیلیوں کی اندرونی و بیرونی سطح پر مسح کرنا ہے' کہنیوں تک نہیں۔ اس مسئلے میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلے میں جو دوسری روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف' جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ (سبل السلام) ② اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کے لیے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے' البتہ احناف اور شوافع دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ہاتھوں کے لیے۔ ③ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے مروی مذکورہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ اس مسئلے میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ ④ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے' اس لیے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہیے۔ ⑤ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انھوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس

١١٠ـ أخرجه البخاري، التيمم، باب التيمم ضربة، حديث: ٣٤٨، ومسلم، الحيض، باب التيمم، حديث: ٣٦٨.

کی کوئی حیثیت نہیں' لہٰذا جب قیاس' نص کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کے لیے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ ⑥ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک ماری' لہٰذا ضرب لگانے کے بعد پھونک مارنا بھی مسنون ہے۔ ⑦ ایک جنبی کے لیے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمّم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ''عین'' پر فتحہ اور ''میم'' پر فتحہ اور تشدید ہے۔ ان کی کنیت ابویقظان تھی۔ سابقین اولین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انھیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایۂ ثبات میں ذرہ بھر لرزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں' یعنی ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ کیں۔ غزوۂ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: ''افسوس' اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' ۳۶ ہجری میں معرکۂ صفین میں یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۳ برس تھی۔

(۱۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الْأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

[111] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تیمّم دو ضربوں سے ہوتا ہے' ایک ضرب چہرے کے لیے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کے لیے۔'' (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔)

فائدہ: [اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ......الخ] والی حدیث کو حاکم نے بھی مرفوعاً روایت کیا ہے۔ (المستدرك للحاكم: ۱/۱۸۰) ائمۂ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کیے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اَلصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ، وَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ**». رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْقَطَّانِ، وَلٰكِنْ صَوَّبَ

[112] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مٹی مومن مسلمان کا وضو ہے' خواہ دس برس تک اسے پانی نہ ملے۔ مگر جب پانی دستیاب ہو جائے تو پھر اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اپنے جسم پر پانی پہنچانا چاہیے۔'' (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور ابن قطان نے صحیح

۱۱۱ـ [ضعيف] أخرجه الدارقطني في سننه: ۱/ ۱۸۰، وقال الذهبي في تلخيص المستدرك: ۱/ ۱۷۹، "بل (علي بن ظبيان) واه، قال ابن معين: ليس بشيء، وقال النسائي: "ليس بثقة"، وللحديث شواهد ضعيفة.

۱۱۲ـ [حسن] أخرجه البزار، في كشف الأستار: ۱/ ۱۵۷، حديث: ۳۱۰ وهو حديث حسن بالشواهد، والترمذي، الطهارة، حديث: ۱۲٤، من حديث أبي ذر رضي الله عنه، وأبوداود، الطهارة، حديث: ۳۳۲ وسنده حسن.

الدَّارَقُطْنِيُّ إِرْسَالَهُ، وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُهُ، وَصَحَّحَهُ وَالْحَاكِمُ أَيْضًا.

قرار دیا ہے لیکن دارقطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست کہا ہے۔ اور ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (ترمذی) اور حاکم نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلصَّعِيدُ] پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ [وَإِنْ لَّمْ يَجِدْ] اس میں إن وصلیہ ہے جس کے معنی ہیں: اگرچہ۔ اس کی جزا ہمیشہ محذوف ہوتی ہے جس پر اس کا ماقبل دلالت کررہا ہوتا ہے۔ [عَشْرَ سِنِينَ] دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ [فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ] ''اللہ سے ڈرنا چاہیے'' کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ [وَلْيُمِسَّهُ] إِمْسَاس سے ماخوذ ہے یعنی پانی پہنچائے۔ [بَشَرَتَهُ] ''با'' اور ''شین'' دونوں پر فتحہ ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ [صَوَّبَ] تَصْوِيب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کے لیے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔ ② اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا گیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جا سکتی ہیں۔ ③ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدث کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے جب نماز سے فارغ ہوگا تو پھر پہلے کی طرح بے وضو یا جنبی شمار ہوگا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن مسیّب، حسن بصری، زہری اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ مگر امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذور کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کے لیے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض (جس کے لیے تیمم کیا گیا ہو) ادا ہو سکتا ہے۔ ④ ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اس طرح ہے: ''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ نے ان کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوذر تو تباہ ہوگیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: ''کیا ہوا؟'' انھوں نے عرض کیا کہ جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا جسے پانی نہ ملے اس کے لیے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔'' ترمذی کی روایت میں اختصار ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (سنن أبي داود، الطهارة، باب الجنب يتيمم، حديث: ٣٣٢، ٣٣٣)

راویٔ حدیث: [حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ] ''را'' پر تشدید ہے۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں ''جیم'' پر ضمہ ہے۔ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے جو زاہد اور دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتدائے اسلام ہی میں دائرۂ اسلام

میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی ﷺ کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی' اور وہیں پر ۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ بہت متقی' پرہیز گار اور اللہ پر توکل کرنے والے تھے۔

(۱۱۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلَانِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيدًا طَيِّبًا، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِي الْوَقْتِ، فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الصَّلَاةَ وَالْوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، فَذَكَرَا ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: **«أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ»**، وَقَالَ لِلْآخَرِ: **«لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ»**. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[113] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے' نماز کا وقت آ گیا مگر ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمّم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر دونوں کو نماز کی ادائیگی کے وقت ہی میں پانی بھی دستیاب ہو گیا تو ان میں سے ایک صاحب نے وضو کیا اور نماز دوبارہ ادا کر لی مگر دوسرے نے وضو کیا نہ نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی' فرمایا: ''تو نے سنت کے مطابق کیا اور تجھے تیری نماز کافی ہو گئی۔'' اور دوسرے سے فرمایا: ''تجھے دگنا اجر ملے گا۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَصَبْتَ السُّنَّةَ] تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ [أَجْزَأَتْكَ] یعنی تجھے کافی ہو گئی۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمّم کر کے نماز ادا کر لی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی میں پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔ ② جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دوگنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ ③ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم محنت وکوشش پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(۱۱٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الْجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْقُرُوحُ، فَيُجْنِبُ، فَيَخَافُ أَنْ يَمُوتَ إِنِ اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ

[114] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ کے متعلق مروی ہے کہ جب کسی شخص کو اللہ کی راہ میں زخم اور پھوڑوں کا سامنا کرنا پڑے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے اور غسل کرنے کی صورت میں مر جانے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمّم

۱۱۳۔ **[إسناده حسن]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في المتيمم يجد الماء بعد ما يصلي في الوقت، حديث: ۳۳۸، والنسائي، الطهارة، حديث: ۴۳۳.

۱۱٤۔ **[إسناده ضعيف]** أخرجه الدارقطني: ۱/ ۱۷۷، وابن خزيمة: ۱/ ۱۳۸، حديث: ۲۷۲، وابن الجارود: ۱۲۹ * جرير سمع من عطاء بن السائب بعد اختلاطه.

مَوْقُوفًا وَرَفَعَهُ الْبَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ.

کرلے۔ (اس روایت کو دارقطنی نے موقوف اور بزار نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَرْضٰی] الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔ مریض کی جمع ہے' یعنی بیمار آدمی۔ [عَلٰی سَفَرٍ] عَلٰی' فِي کے معنی میں استعمال ہوا ہے' یعنی مسافر ہو۔ اس آیت کے بعد والے کچھ الفاظ یہ ہیں: ﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (المآئدة٥:٦) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر یوں بیان فرمائی کہ جب کسی شخص کو......الخ [اَلْجِرَاحَةُ] جَرح سے ماخوذ ہے اور اس سے ایسا زخم مراد ہے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو۔ [اَلْقُرُوْحُ] قَرح کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں' اور قرآنی آیت میں قروح ان زخموں اور گھاؤ کے لیے استعمال ہوا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے لگیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ (آل عمران ٣:١٤٠) ''اگر (آج) تمھیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔''

فوائد و مسائل: ① ''اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمھیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ ② اس آیت میں بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا' پھنسی اور خراش تو بہر حال نہیں ہو سکتے' لہٰذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ بیماری کس درجے کی ہو تو تیمم جائز ہے' اس بارے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری میں تیمم جائز ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصۂ جسم کے ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ ④ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ⑤ ہمارے محقق کے نزدیک یہ روایت سنداً ضعیف ہے جبکہ دیگر محدثین کی بھی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملے میں دارقطنی کی رائے زیادہ صحیح ہے جیسا کہ بزار کہتے ہیں کہ اس روایت کو جریر کے علاوہ کسی ثقہ راوی نے عطاء سے بیان نہیں کیا۔ اور ابن معین نے کہا ہے کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظے میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(١١٥) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: اِنْكَسَرَتْ إِحْدٰى زَنْدَيَّ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ

[115] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا ایک کلائی کا جوڑ' یعنی گٹا ٹوٹ گیا' چنانچہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

١١٥_ [إسناده موضوع] أخرجه ابن ماجه، الطهارة، باب المسح على الجبائر، حديث:٦٥٧ * عمرو بن خالد الواسطي كذاب كما قال أحمد وغيره، وقال البخاري: منكر الحديث.

اللهِ ﷺ فَأَمَرَنِي أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الْجَبَائِرِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه بِسَنَدٍ وَاهٍ جِدًّا.

(وضو کے بارے میں) پوچھا تو آپ نے مجھے پٹیوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے ابن ماجہ نے نہایت ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [زَنْدَيَّ] ''زا'' پر فتحہ، نون ساکن اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ ''زند'' کا تثنیہ ہے اور یائے متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اور ''زند'' سے مراد ہتھیلی کی جانب بازو کا جوڑ ہے جسے رُسْغ، یعنی گٹا (کلائی) کہتے ہیں۔ [اَلْجَبَائِرِ] جَبِیرَۃ کی جمع ہے۔ کپڑے یا لکڑی کا ٹکڑا جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر مضبوطی سے لپیٹ کر باندھا جاتا ہے۔ [وَاہٍ] وَھٰی یَھِي وَھِیًا اور وُھِیًّا سے ماخوذ ہے۔ نہایت کمزور اور ضعیف۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عمرو بن خالد واسطی ہے۔ وہ نہایت جھوٹا اور دروغ گو آدمی تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے۔

(١١٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، فِي الرَّجُلِ الَّذِي شُجَّ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَتَيَمَّمَ وَيُعَصِّبَ عَلٰى جُرْحِهِ خِرْقَةً، ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا، وَيَغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِهِ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ ضَعْفٌ، وَفِيهِ اخْتِلَافٌ عَلٰى رَاوِيهِ.

[116] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے بارے میں مروی ہے جس کے سر پر زخم آیا تھا اور اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا اور وفات پا گیا تھا' کہ اسے تو اتنا ہی کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور اپنے زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرتا اور باقی بدن کو دھو لیتا۔ (اس روایت کو ابوداود نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کے ایک راوی پر اختلاف ہے۔)

لغوی تشریح: [شُجَّ] اَلشَّج سے ماخوذ ہے اور یہ صیغۂ ماضی مجہول ہے۔ سر میں جو زخم آئے اسے شج کہتے ہیں۔ امام ابوداود رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے اس واقعے کو بیان کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں اسے احتلام ہو گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ میرے لیے تیمم کی گنجائش و رخصت رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ جب تمھیں پانی کے استعمال کی طاقت ہے تو ہم تیرے لیے کوئی رخصت نہیں پاتے۔ اپنے ساتھیوں کے کہنے پر اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ جب ہم واپس آئے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فوت ہونے کی اطلاع دی۔ (اور سارا واقعہ بیان کیا) تو آپ نے فرمایا: ''ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر۔ جب انھیں مسئلے کی نوعیت کا علم نہیں تھا تو انھوں نے دریافت کیوں نہیں کیا۔ بے خبری اور عدم واقفیت کا علاج' سوال کرنا اور دریافت کرنا ہے۔'' پھر آپ نے مندرجہ بالا ارشاد فرمایا: ''اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور اپنے ...... الخ.'' [یُعَصِّبُ] تعصیب سے ماخوذ ہے۔ یعنی پٹی کو مضبوطی سے باندھنا۔ زخمی جگہ پر پٹی وغیرہ باندھنے سے پہلے تیمم کرنا جنابت کا اثر زائل کرنے کے لیے ہے جیسا کہ موزے پہننے سے پہلے پاؤں دھونا طہارت کے لیے ہوتا ہے تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھر ان پر مسح کیا جا سکے۔

١١٦۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب المجدور يتيمم، حديث: ٣٣٦ - الزبير بن خريق، حديثه ضعيف.

[وَفِيهِ اخْتِلَافٌ عَلٰى رَاوِيهِ] اس کے راوی' یعنی عطاء میں اختلاف ہے کہ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے۔ ایک نسخے میں [عَلٰى رُوَاتِهِ] بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء جو حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں ان کے نیچے' یعنی عطاء سے نقل کرنے میں ان کے اصحاب و تلامذہ کے متعلق ان کے شاگردوں میں یہ اختلاف ہے۔

فائدہ: ہمارے فاضل محقق نے مذکورہ مکمل روایت کو ضعیف قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے حدیث کے آخری حصے [إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ......الخ] کو ضعیف قرار دیا ہے' باقی روایت کو حسن کہا ہے۔ اس کی تائید سنن ابوداود کی روایت (۳۳۷) سے ہوتی ہے۔

(۱۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَّا يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ إِلَّا صَلَاةً وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلَاةِ الْأُخْرٰى. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جِدًّا.

[117] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: سنت یہی ہے کہ تیمّم کرنے والا شخص تیمّم سے ایک ہی نماز پڑھے اور دوسری نماز کے لیے از سر نو تیمّم کرے۔ (اسے دارقطنی نے نہایت ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِنَ السُّنَّةِ] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ مراد ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث ضعیف ہے' اس لیے کہ اس کا راوی حسن بن عمارہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث (۱۱۲) جو بزار نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' اس کے بظاہر خلاف ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمّم وضو کا قائم مقام ہے' اس لیے تیمّم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔ ② اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ سے فقہائے محدثین اس کے قائل نہیں ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کا قائم مقام بنایا ہے اور جب وضو حدث لاحق ہونے سے واجب ہوتا ہے تو نیا تیمّم بھی اسی طرح حدث سے واجب ہوگا۔

١٠ - بَابُ الْحَيْضِ

باب: 10- حیض کے احکام و مسائل

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ دَمَ الْحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ

[118] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضے کی (دائمی) مریضہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ''حیض کے خون کی رنگت سیاہ ہے

۱۱۷۔ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الدارقطني: ۱/ ۱۸۵، فيه الحسن بن عمارة وهو متروك.

۱۱۸۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: ۲۸٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ۳٦۳، وابن حبان (الإحسان): ۲/ ۳۱۸، حديث: ۱۳٤۵، الزهري مدلس وعنعن * وأبوداود، الطهارة، حديث: من حديث أسماء بنت عميس رضي الله عنها وسنده ضعيف [الزهري عنعن].

يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ، فَإِذَا كَانَ الْآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

ہے' اسے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ جن ایام میں یہ خون آ رہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب دوسرے ایام ہوں تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے' ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم نے منکر کہا ہے۔)

وَفِي حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ: «وَلْتَجْلِسْ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ الْمَاءِ فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا وَاحِدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ غُسْلًا وَاحِدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلًا وَاحِدًا، وَتَتَوَضَّأُ فِي مَا بَيْنَ ذٰلِكَ».

ابوداود میں حضرت اسماء بنت عمیس ؓ سے مروی حدیث میں ہے: ''ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں کے لیے ایک غسل کر لے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازوں کے لیے ایک غسل کر لے اور نماز فجر کے لیے بھی ایک غسل کر لے اور ان کے درمیان میں وضو کر لے۔''

لغوی تشریح: [بَابُ الْحَيْضِ] حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینے خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص ایام میں ہوتا ہے' اولاد سے ناامیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری یا ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ [يُعْرَفُ] معرفت سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ يُعْرِفُ باب افعال سے ماخوذ بصیغۂ معروف ہے۔ اس صورت میں ''یا'' پر ضمہ اور ''را'' مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ یہ بدبودار ہوتا ہے۔ [فَإِذَا كَانَ ذٰلِكِ] ''کاف'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ [فَأَمْسِكِي] امر کا صیغۂ واحد مؤنث ہے اور اس کے معنی ہیں: نماز سے رک جا۔ [فَإِذَا كَانَ الْآخَرُ] جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ [مِرْكَنٍ] بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا۔) اس میں ''میم'' کے نیچے کسرہ اور ''کاف'' پر فتحہ ہے۔ [فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ الْمَاءِ] جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہیے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ [فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا وَاحِدًا] تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کے لیے ایک ہی غسل کر لینا چاہیے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے' اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی' اور اسی طرح مغرب وعشاء کی نمازوں کے لیے کر لے۔ [وَ تَتَوَضَّأُ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ] ان دونوں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کے لیے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

 فوائد ومسائل: ① نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے: ایک حیض (ایام ماہواری)' دوسرا خون

نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم وبیش جاری رہتا ہے اور تیسرا خون استحاضہ۔ ② استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس دنوں کے علاوہ جاری رہے۔ ③ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہوسکتا ہے۔ ملکی، موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ درست ہوسکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا] آپ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی، وہاں اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد سے نوازا، جن میں سے ایک لڑکے کا نام عبداللہ ہے۔ غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ ذہن نشین رہے کہ عُمَیس عربی قواعد کی رو سے عَمِیس کی تصغیر ہے۔

(١١٩) وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْسَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَّعِشْرِينَ أَوْثَلَاثَةً وَّعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذٰلِكَ يُجْزِئُكِ، وَكَذٰلِكَ فَافْعَلِيْ كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ، فَإِنْ قَوِيتِ عَلٰى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَطْهُرِينَ، وَتُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جمِيعًا، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ الْعِشَاءَ، ثُمَّ

[119] حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے استحاضے میں مبتلا رہتی تھی جو کثرت سے آتا رہتا تھا۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں استفسار کے لیے حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا: ''یہ تو شیطان کی چوک (لات مارنا) ہے، لہٰذا تو چھ یا سات ایام کو ایام حیض شمار کر کے پھر نہا لے۔ جب تو اچھی طرح پاک صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تئیس دن روزے رکھ اور نماز پڑھ۔ یقیناً یہ تیرے لیے کافی ہے۔ اور ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب کہ پاک صاف ہو جائے اور ظہر وعصر دونوں کو اکٹھا کر کے پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر

١١٩ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب من قال إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: ٢٨٧، والترمذي، الطهارة، حديث: ١٢٨، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٦٢٢، ٦٢٧، وأحمد: ٦/ ٤٣٩، الزهري عنعن.

تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ وَتُصَلِّينَ»، قَالَ: «وَهُوَ أَعْجَبُ الْأَمْرَيْنِ إِلَيَّ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ الْبُخَارِيُّ.

کے غسل کر لے اور دونوں نمازوں کو جمع کر لے‘ یعنی اگر تو یہ طاقت رکھتی ہے تو ایسا کر لے۔ اور صبح کی نماز کے لیے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔‘‘ پھر فرمایا: ’’دونوں باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔‘‘ (اسے نسائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے حسن کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَسْتَفْتِيهِ] میں نے آپ سے فتویٰ پوچھا۔ [رَكْضَةٌ] چوک مارنا وغیرہ۔ [فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ] یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کچھ کو سات روز۔ اس سلسلے میں عورت کو اپنی ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ [فَإِذَا اسْتَنْقَأْتِ] جب تو پاک صاف ہو جائے۔ [صُومِي وَصَلِّي] روزہ رکھ اور نماز پڑھ‘ فرضی ہو یا نفلی‘ جو جی میں آئے۔ [وَهُوَ أَعْجَبُ الْأَمْرَيْنِ إِلَيَّ] الأمرين سے مراد ہر نماز کے لیے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا ہے‘ یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا: ایک ظہر اور عصر کے لیے‘ دوسرا مغرب اور عشاء کے لیے اور تیسرا نماز فجر کے لیے۔ ② اس سے پہلی حدیث میں فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کو ہر نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضے کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے‘ البتہ ہر نماز کے لیے از سر نو وضو ضرور فرض ہے۔ غسل بس مستحب ہے‘ وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا] دونوں اسموں کے پہلے حرف پر فتحہ اور دوسرا ساکن ہے۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ پہلے یہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوۂ احد میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو یہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آ گئیں۔

(١٢٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الدَّمَ، فَقَالَ: «امْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، فَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلَاةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[120] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے استحاضے کے خون کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: ’’تمھارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے (سے متعین تھے اور نماز روزے سے) روکتے تھے‘ اب بھی اتنے دن ٹھہری رہ۔ پھر اس کے بعد

١٢٠ـ أخرجه مسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث:٣٣٤، والبخاري، الوضوء، حديث:٢٢٨، وأبوداود، الطهارة، حديث:٢٩٨.

غسل کر لے۔'' ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس کے بعد ہر نماز کے لیے غسل کیا کرتی تھیں۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ: «وَتَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ». وَهِيَ لِأَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ.

اور بخاری کی روایت میں ہے: ''پھر ہر نماز کے لیے (از سرنو) وضو کر لیا کر۔'' ابوداود اور دیگر محدثین نے اس حدیث کو دوسرے طریق (سند) سے روایت کیا ہے۔

لغوی تشریح: [تَحْبِسُكِ] تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کے لیے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا تھا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ' استحاضے اور حیض کے خون میں تین میں سے کسی ایک بنیاد پر فرق کر سکتی ہے۔ پہلی صورت دونوں خونوں میں تمیز (پہچان) کی ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے' اس کی بو بھی بڑی کریہہ ہوتی ہے۔ اور استحاضے کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ زردی مائل اور رقیق' یعنی پتلا ہوتا ہے۔ یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے۔ یا پھر تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آ سکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں۔ ② اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقے اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ ③ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا' پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ ④ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند بلکہ کند ذہن عورت بھی اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے۔ ⑤ جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں' وہ بحث بڑی دقیق' گنجلک اور مغلق ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید بلکہ بہت ہی دور ہے' نیز یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو آسان فہم ہے' وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ ⑥ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کے لیے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جمہور کے نزدیک تطوع (نفل) کی ہے ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کے لیے غسل کرنا فرض قرار نہیں دیا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ ⑦ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کے لیے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے' اس کے بعد ہر نماز کے لیے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ ⑧ مذکورہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنی چاہیے۔ پھر جس علامت سے اس کو حیض کی پہچان ہو جائے' اسی پر کاربند ہو جائے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا] بعض کا خیال ہے کہ اس سے حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی مراد ہیں، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ صحیح مسلم کی روایت کی رو سے انھیں مسلسل سات سال تک استحاضے کا مرض لاحق رہا۔ انھوں نے ۴۴ ہجری میں وفات پائی۔ بعض نے کہا ہے کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضۂ استحاضہ کا شکار تھیں: ایک ام المومنین زینب، دوسری حمنہ اور تیسری ام حبیبہ رضی اللہ عنہن۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضے سے محفوظ تھیں۔ کہتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو استحاضے کے عارضے میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لَا نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

[121] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم (ایام ماہواری کے اختتام پر) نہا دھو کر پاک صاف ہونے کے بعد گدلے اور زرد رنگ کی چیز (خارج ہونے) کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ (اسے بخاری اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور الفاظ ابوداود کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [اَلْكُدْرَةَ] میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ [وَالصُّفْرَةَ] کچ لہو کی طرح کا پانی جس پر زردی غالب ہو۔ [بَعْدَ الطُّهْرِ] ایام حیض سے پاک صاف ہونے کے بعد۔ [شَيْئًا] یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جب کہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جائے، حیض شمار نہیں کیا جائے گا۔

فوائد و مسائل: ① ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گدلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور اس حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ② بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی ایام حیض کے دوران میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے گا اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور بَعْدَ الطُّهْرِ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ③ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گدلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے حیض شمار کرتی تھیں۔ ④ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا، اگر یہ حیض میں سے شمار ہوتا تو شریعت میں بذریعۂ وحی اس کے متعلق حکم جاری کر دیا جاتا۔ آپ کی اس پر خاموشی، تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا] ان کا اسم گرامی نُسَيْبَه (تصغیر کے ساتھ) تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی

۱۲۱۔ أخرجه البخاري، الحيض، باب الصفرة والكدرة في غير أيام الحيض، حديث: ۳۲۶، وأبوداود، الطهارة، باب في المرأة ترى الصفرة والكدرة بعد الطهر، حديث: ۳۰۷.

تھیں۔ مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی ﷺ کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انھوں نے بڑی صفائی سے ان کو نہلایا۔ بصرہ کے دوران اقامت میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی حدیث غسل میت کے بارے میں اصل ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(١٢٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اِصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[122]۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ اس عورت کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تم ان (عورتوں) کے ساتھ جماع کے سوا ہر قسم کا فعل کر سکتے ہو۔“ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: لَمْ يُؤَاكِلُوهَا یعنی اس (ایام ماہواری میں مبتلا) عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے نہ تھے۔ إِلَّا النِّكَاحَ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فوائد و مسائل: ① نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، لیٹنا، کھانا اور پینا سب جائز ہے۔ صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ② یہ چھوت چھات کی بیماری ہنود و یہود کے ہاں ہے، مسلمانوں کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(١٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ، فَيُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[123]۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے تہبند مضبوطی سے باندھنے کا حکم فرماتے، پھر میرے ساتھ لیٹ جاتے، حالانکہ میں اس وقت حالت حیض میں ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: فَأَتَّزِرُ باب افتعال سے صیغۂ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں: میں ازار پہن لیتی۔ فَيُبَاشِرُنِي مجھے چھوتے، میرے جسم کے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے بغیر ہوتا تھا، یعنی مباشرت۔

فوائد و مسائل: ① بَاشَرَ يُبَاشِرُ مُبَاشَرَةً کے معنی ہیں: ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں۔ مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لیے جاتے ہیں۔ ② منکرین حدیث کی ستم ظریفی دیکھیے کہ انھوں نے عوام کو احادیث نبویہ سے بدظن اور متنفر کرنے کے لیے اس کے معنی کیے ہیں کہ نعوذ باللہ نبی ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں

١٢٢۔ أخرجه مسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله...، حديث: ٣٠٢.

١٢٣۔ أخرجه البخاري، الحيض، باب مباشرة الحائض، حديث: ٣٠٠، ٣٠٢، ومسلم، الحيض، باب مباشرة الحائض فوق الإزار، حديث: ٢٩٣.

کہ احادیث جھوٹی ہیں یا قابل اعتبار نہیں' حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانے کے ہیں۔ اس سے جماع کے معنی کرنا بدیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لینے کے لیے دلیل ہونی چاہیے۔ بلکہ اس جگہ تو حقیقی معنی مراد لینے کی دلیل موجود ہے کہ آپ تہبند باندھنے کا حکم دیتے تھے۔ ③ شریعت نے ایام حیض میں جماع کے سوا عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(١٢٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فِي الَّذِي يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، قَالَ: «**يَتَصَدَّقُ بِدِينَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِينَارٍ**». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَرَجَّحَ غَيْرُهُمَا وَقْفَهُ.

[124] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں روایت کرتے ہیں جو اپنی بیوی سے حالت حیض میں مجامعت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''**وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ و خیرات کرے۔**'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ حاکم اور ابن قطان دونوں نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے اس کا موقوف ہونا راجح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: يَأْتِي امْرَأَتَهُ کے معنی ہیں کہ اپنی بیوی سے جماع کرے۔

فائدہ: جہاں تک دینار یا نصف دینار خیرات کرنے کا تعلق ہے تو ایک گروہ نے اسے جائز رکھا ہے جبکہ دوسروں نے حدیث میں اضطراب اور عدم صحت ثابت کر کے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ جو لوگ کفارے کے قائل ہیں ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ دینار یا نصف دینار بیان کرنا راوی کا تردد ہے۔ اور بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ یہاں نوعیت بتانا مقصود ہے کہ اگر حیض کا آغاز ہو تو ایسی حالت میں جماع کرنے والا ایک دینار صدقہ کرے اور اگر آغاز حیض نہ ہو تو نصف دینار خیرات کرے۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اختیار دیا گیا ہے' خواہ دینار صدقہ کرے خواہ نصف دینار۔ بہرحال یہاں امر وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ ندب واستحباب کے لیے ہے۔ باعتبار دلیل یہی رائے قابل ترجیح ہے۔ تاہم مخصوص ایام میں جنسی عمل حرام ہے' اگر ہو جائے تو صدقہ دینا چاہیے' قاعدہ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (ہود ١١٤:١١) ''نیکیاں گناہوں کا ازالہ کر دیتی ہیں۔''

(١٢٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟**». مُتَّفَقٌ

[125] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''**کیا عورت جب حالت حیض میں ہوتی ہے تو نماز اور روزہ چھوڑ نہیں دیتی؟**'' (بخاری و

١٢٤ـ **[إسناده صحيح]** أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في إتيان الحائض، حديث: ٢٦٤، والترمذي، الطهارة، حديث: ١٣٦، والنسائي، الطهارة، حديث: ٢٩٠، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٦٤٠، وأحمد: ١/ ٢٣٠، ٢٧٢، ٣٦٦، والحاكم في المستدرك: ١/ ١٧٢ وصححه، ووافقه الذهبي في تلخيصه المستدرك.

١٢٥ـ أخرجه البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، حديث: ٣٠٤، ومسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات . . .، حديث: ٧٩.

عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿أَلَيْسَ﴾ اس میں ہمزہ انکار کے لیے ہے۔ جب نفی کا انکار ہو تو اثبات ثابت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ شریعت میں ایسی عورت کے لیے ترک صلاۃ و صوم ثابت ہے' البتہ دیگر دلائل کی رو سے روزوں کی قضا دوسرے ایام میں ادا کرے گی جبکہ نماز کی قضا نہیں' اس لیے کہ اس قضا کا ادا کرنا عورت کے لیے نہایت مشکل ہے اور یہ عورت کے حق میں ثابت بھی نہیں ہے۔

(١٢٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا جِئْنَا سَرِفَ حِضْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اِفْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

[126] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم مقام سرف میں آئے تو مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے' چنانچہ (میرے بتانے پر) نبی ﷺ نے فرمایا: ''مناسک حج تم بھی اسی طرح ادا کرو جس طرح دوسرے حاجی کرتے ہیں' البتہ طواف بیت اللہ ان ایام سے فارغ ہو کر نہا دھو کر کرنا۔''
(بخاری و مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿لَمَّا جِئْنَا﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے سفر کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿سَرِفَ﴾ ''سین'' پر فتحہ اور ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اور یہ دو اسباب کی وجہ سے غیر منصرف ہے: ایک علمیت' یعنی جگہ کا نام اور دوسرا تانیث۔ مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلے پر۔ ﴿حِضْتُ﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔

فائدہ: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی' اس لیے کہ اکثر علماء کے نزدیک طواف کے لیے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے اور ناپاک عورت کا مسجد میں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی جائز نہیں' خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے' اس لیے طواف بدرجۂ اولیٰ نہیں کر سکتی بلکہ ایسی حالت میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ علاوہ ازیں اب مسعیٰ (سعی کرنے کی جگہ) بھی مسجد میں شامل ہو گئی ہے' اس لیے اب سعی بھی نہیں کر سکتی۔ اسی لیے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(١٢٧) وَعَنْ مُعَاذٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: مَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنِ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الْإِزَارِ». رَوَاهُ

[127] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ جب عورت ایام ماہواری میں ہو تو اس کی اپنے شوہر کے لیے کیا کیا چیز حلال ہے؟ آپ

١٢٦ـ أخرجه البخاري، الحيض، باب تقضي الحائض المناسك كلها إلا الطواف بالبيت، حديث: ٣٠٥، ومسلم، الحج، باب بيان وجوه الإحرام...، حديث: ١٢١١.

١٢٧ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب في المذي، حديث: ٢١٣ * عبدالرحمن بن عائذ أحد رواة السند لم يدرك معاذ بن جبل رضي الله عنه، انظر جامع التحصيل، ص: ٢٢٣.

أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

نے فرمایا: ''ازار سے اوپر والا حصہ اس کے لیے حلال ہے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَا فَوْقَ الْإِزَارِ] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک تو ازار سے مراد جماع اور باہم ہم بستری ہیں، یعنی شوہر کے لیے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کرنا جائز ہے۔ اور دوسرے معنی ہیں: پاجامہ و تہ بند کی جگہ، یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصۂ جسم سے مباشرت حلال ہے۔ اور دوسرے معنی کی رو سے یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث [اِصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ] کے معارض ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے جبکہ اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے حصے سے استمتاع کی ممانعت ہے۔ مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے، ثانیاً اس سے پہلے معنی صرف جماع اور وطی مراد لیے جائیں گے تاکہ دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے۔ سنن نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی کسی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں لیٹ جاتے جبکہ اس نے نصف ران تک ازار باندھا ہوتا۔ (سنن النسائي، الطهارة، باب مباشرة الحائض، حديث:٢٨٨) اس حدیث اور مذکورہ دونوں احادیث پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دوران حیض مباشرت کے لیے ناف سے گھٹنوں تک ازار بند کا ہونا شرط نہیں ہے، گھٹنوں سے اوپر والے حصے سے بھی استمتاع جائز ہے۔ ازار سے مقصود جماع اور خون سے تحفظ ہے، خواہ وہ گھٹنوں تک ہو یا نصف ران تک یا اس سے بھی کم۔

(١٢٨) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتِ النُّفَسَاءُ تَقْعُدُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ نِفَاسِهَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظُ لِأَبِي دَاوُدَ.

[128] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں عورتیں بچے کی ولادت کے بعد چالیس روز تک (نماز، روزے سے) بیٹھی رہتی تھیں۔ (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ ابوداود کے ہیں۔)

وَفِي لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَاءِ صَلَاةِ النِّفَاسِ. وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

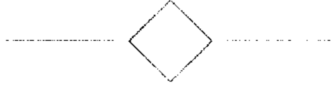
اور اس کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایام نفاس میں چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [نُفَسَاءُ] ''نون'' پر ضمہ اور ''فا'' پر فتحہ ہے یا ''نون'' اور ''فا'' دونوں پر فتحہ ہے یا ''نون'' پر فتحہ اور ''فا'' ساکن ہے۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنھوں نے بچے کو جنم دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا رہتا ہے۔ [أَرْبَعِينَ يَوْمًا] چالیس روز نفاس کی آخری مدت ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی آخری مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں۔

١٢٨ـ [إسناده حسن] أخرجه أبو داود، الطهارة، باب ما جاء في وقت النفساء، حديث: ٣١١، ٣١٢، والترمذي، الطهارة، حديث: ١٣٩، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٦٤٨، وأحمد: ٦/ ٣٠٠، ٣٠٣، ٣٠٤، ٣٠٩، ٣١٠، والحاكم: ١/ ١٧٥ وصححه، ووافقه الذهبي.

ہاں' اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی اور اس حالت میں نماز روزہ ترک نہ کیے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں' البتہ نفاس کا حکم حیض کی طرح ہے۔ نفاس والی عورت کو نماز روزہ کی رخصت ہے' مسجد میں نہیں ٹھہر سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں کر سکتی۔ اور علماء کے ایک گروہ کی رائے کے مطابق وہ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے بھی اجتناب کرے گی۔ اس دوران میں جتنے روزے چھوٹ گئے تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی جبکہ نماز کی قضا نہیں دے گی۔



٢ - كِتَابُ الصَّلَاةِ

نماز سے متعلق احکام و مسائل

١ - بَابُ الْمَوَاقِيتِ

باب: 1 - اوقات نماز کا بیان

(١٢٩) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ، مَالَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ، وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَالَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَالَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[129] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے آدمی کا سایہ اس کے برابر ہونے تک ہے، جب تک کہ عصر کا وقت شروع نہ ہو۔ اور عصر کا وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے۔ اور نماز مغرب کا وقت شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ اور عشاء کی نماز کا وقت رات کے پہلے نصف تک ہے۔ اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے طلوع سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ بُرَيْدَةَ فِي الْعَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ» وَمِنْ حَدِيثِ أَبِي

اور مسلم ہی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے: ''سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں

١٢٩ـ أخرجه مسلم، المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس، حديث:٦١٢، وحديث بريدة أخرجه مسلم، المساجد، حديث:٦١٣، وحديث أبي موسى أخرجه مسلم، المساجد، حديث:٦١٤.

مُوسٰی: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ»

ہو'' (زردی میں داخل نہ ہو۔) اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: '' آفتاب بلند ہو'' (غروب کی طرف مائل نہ ہو۔)

لغوی تشریح: [كِتَابُ الصَّلَاةِ] صلاۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں معروف عبادت کو کہتے ہیں۔ [بَابُ الْمَوَاقِيتِ] [مَوَاقِيتُ] میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کے لیے مقرر کیا گیا ہو' بلحاظ زمان یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ [إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ] جب سورج زوال پذیر ہو' یعنی آسمان کے تین درمیان سے مغرب کی جانب ڈھل جائے۔ [وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ] اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو' یعنی ظہر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ [مَالَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ] جب تک نماز عصر کا وقت نہ ہو جائے' یعنی آدمی کا اصلی سایہ اس کے قد کے برابر ہونے کے ساتھ عصر کا وقت شروع نہ ہو جائے۔ [الشَّفَقُ] غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ [إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ] یہاں لفظ [الْأَوْسَطِ] نِصْفِ اللَّيْلِ کی صفت بن رہا ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا نصف ہے۔ اس پہلے نصف حصے کو اوسط (درمیانے) سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ رات کے وسط اور درمیان پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے' لہٰذا رات کے پہلے نصف حصے تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ [نَقِيَّةٌ] فعيلة کے وزن پر ''صاف ستھرا'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے' یعنی ایسا صاف شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ [مُرْتَفِعَةٌ] آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کیے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اور اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل تک ثابت ہوتا ہے' اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمۂ ثلاثہ: امام شافعی' امام مالک' امام احمد کے علاوہ امام ابو یوسف اور امام زفر رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ایک روایت کی رو سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے بھی اسی طرح ہے' لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ ② علمائے احناف نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس روایت کو قبول کیا ہے مگر کسی صحیح مرفوع حدیث سے دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ ③ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ ④ اس حدیث میں مذکور ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر نمودار ہونے والی سرخی کے فوراً بعد جو سفیدی ظاہر ہوتی ہے شفق سے وہ مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ⑤ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے' کیونکہ اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اسی طرح عین غروب شمس کے وقت بھی نماز شروع نہیں کرنی چاہیے۔ ⑥ اس

حدیث سے اوقات صلوات خمسہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے لیے اول اور آخر وقت یہی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ ۞ رہا یہ مسئلہ کہ دھوپ کے زردی مائل ہو جانے کے بعد عصر کا وقت اور آدھی رات کے بعد عشاء کا وقت رہتا بھی ہے یا نہیں؟ اس حدیث سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ مختار وقت نہیں رہتا۔ سورج کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنے والے کو حدیث میں منافق کہا گیا ہے۔

راویٔ حدیث: [**حضرت بریدہ** رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ اور بریدہ بن حصیب نام ہے۔ بریدہ اور حصیب دونوں تصغیر کے ساتھ ہیں۔ قبیلۂ اسلم سے ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلائے۔ جب نبی ﷺ ہجرت مدینہ کے دوران میں اس قبیلے کے پاس سے گزرے تو اس موقع پر جو تقریباً ۸۰ آدمی مسلمان ہوئے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ غزوۂ احد کے بعد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بصرہ کی طرف چلے گئے تھے' پھر وہاں سے خراسان کی جانب جہاد کے لیے نکل گئے اور مرو میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ۶۲ یا ۶۳ ہجری میں ان کی وفات ہوئی اور تدفین عمل میں آئی۔

[**حضرت ابوموسیٰ اشعری** رضی اللہ عنہ] ان سے مراد عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبید اور عدن پر عامل مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ کوفہ اور بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے ہاتھوں تستر فتح ہوا اور دیگر بہت سے شہر بھی انھوں نے فتح کیے۔ ۴۲ ہجری میں وفات پائی۔ اس کے علاوہ بھی سن وفات منقول ہے۔

(۱۳۰) وَعَنْ أَبِي بَرْزَةَ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي الْعَصْرَ، ثُمَّ يَرْجِعُ أَحَدُنَا إِلٰى رَحْلِهِ فِي أَقْصَى الْمَدِينَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ، وَكَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ مِنَ الْعِشَاءِ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيثَ بَعْدَهَا، وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ حِينَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيسَهُ، وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسِّتِّينَ إِلَى الْمِائَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[130] حضرت ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر پڑھاتے' پھر ہم میں سے ایک آدمی اپنے گھر لوٹتا جو مدینے کے آخری کنارے پر ہوتا اور ابھی سورج زندہ (روشن صاف) ہی ہوتا۔ آپ نماز عشاء کو کچھ تاخیر سے پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ اور نماز عشاء سے پہلے سونے کو اور بعد میں (غیر ضروری) باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے۔ اور نماز فجر سے ایسے وقت میں فارغ ہوتے جب کہ نمازی اپنے ساتھ والے شخص کو پہچان لیتا۔ آپ (عموماً) ساٹھ سے سو آیات تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

وَعِنْدَهُمَا مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

اور بخاری و مسلم ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں

۱۳۰۔ أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، باب وقت العصر، حديث: ٥٤٧، ومسلم، المساجد، باب وقت العشاء وتأخيرها، حديث: ٦٤٧، وحديث جابر أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: ٥٦٠، ومسلم، المساجد، حديث: ٦٤٦، وحديث أبي موسى أخرجه مسلم، المساجد، حديث: ٦١٤.

عَنْهُ: وَالْعِشَاءَ أَحْيَانًا يُقَدِّمُهَا، وَأَحْيَانًا يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَآهُمُ اجْتَمَعُوا عَجَّلَ، وَإِذَا رَآهُمْ أَبْطَؤُوا أَخَّرَ، وَالصُّبْحَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيهَا بِغَلَسٍ.

ہے کہ آپ نماز عشا، کبھی جلدی پڑھ لیتے اور کبھی تاخیر سے ادا کرتے۔ جب آپ دیکھتے کہ نمازی جمع ہو گئے ہیں تو جلد پڑھا دیتے اور اگر دیکھتے کہ نمازیوں نے آنے میں دیر کر دی ہے تو تاخیر کر دیتے' البتہ صبح کی نماز آپ اندھیرے ہی میں پڑھتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: فَأَقَامَ الْفَجْرَ حِينَ انْشَقَّ الْفَجْرُ، وَالنَّاسُ لَا يَكَادُ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا.

اور مسلم میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرما دی یہاں تک کہ (اندھیرے کی وجہ سے) صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح: [رَحْلِه] ''را'' پر فتحہ اور ''حا'' ساکن ہے' یعنی جائے سکونت۔ [فِي أَقْصَى الْمَدِينَةِ] گرامر کے اعتبار سے یہ رَحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینے کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ [وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ] اس میں ''واؤ'' حالیہ اور یَرْجِعُ کی ضمیر سے یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ نماز سے فراغت کے بعد واپس جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (عصر کی نماز جلدی ادا کی جاتی تھی۔) اور سورج کے زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی' تپش والی روشنی اور حرارت باقی ہوتی تھی۔ [مِنَ الْعِشَاءِ] اس میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپ کو پسند تھی۔ [يَنْفَتِلُ] يَنْصَرِفُ کے معنی میں ہے' یعنی فارغ ہوتے' پھرتے۔ [الْغَدَاةِ] فجر' صبح۔ [بِالسِّتِّينَ] ساٹھ آیات۔ [إِلَى الْمِائَةِ] سوتک' یعنی جب نماز میں اختصار کرنا چاہتے یا اگر آیات لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور جب نماز لمبی کرنا چاہتے یا اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو اچھی طرح پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قراءت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے۔ [الْغَلَسِ] صبح کی سیاہی اور تاریکی جو اس کے اول وقت میں ہوتی ہے اسے غلس کہتے ہیں۔ [انْشَقَّ] پھٹنا' تاریکی شب سے سپیدۂ صبح کا ظاہر ہونا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں لفظ غلس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر اول وقت (اندھیرے) میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی ترتیل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجیے کہ آپ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ ② اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت (اندھیرے) میں پڑھنی چاہیے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے' اس لیے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ] ابو برزہ ان کی کنیت ہے۔ نضلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور دوسرے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی' پھر بعد میں

خراسان چلے گئے۔ اور ایک قول کے مطابق مرو یا بصرہ میں ۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ ہجری ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[131] حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز مغرب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھتے' پھر ہم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتا تو اپنے تیروں کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [مَوَاقِعَ نَبْلِهِ] مَوَاقِع' موقع کی جمع ہے' مراد ہے تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ اور نَبْل کے معنی ہیں: تیر۔ ''نون'' پر فتحہ اور ''با'' ساکن ہے۔ انھی لفظوں سے اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔

فائدہ: نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث: [حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ کم عمری کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ یا ۷۴ ہجری میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالْعِشَاءِ، حَتّٰى ذَهَبَتْ عَامَّةُ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلّٰى، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَوَقْتُهَا، لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي»، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[132] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کہ رات کا اکثر حصہ گزر گیا' پھر آپ تشریف لائے اور نماز پڑھی، پھر فرمایا: ''عشاء کا (افضل) وقت یہ ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں اپنی امت کو مشقت میں ڈالوں (تو میں یہی وقت مقرر کرتا۔'') (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَعْتَمَ] تاخیر کی' دیر کی۔ یہ إِعْتَام سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: اندھیرے کے وقت میں داخل ہونا۔ اَلْعَتَمَة شفق کے غائب ہونے کے بعد رات کے ابتدائی ثلث (تیسرے حصے) کو کہتے ہیں' یا غروب شفق کے بعد مطلق تاریکی کو کہتے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق یہ اَلْعَتَم سے ماخوذ ہے جس کے معنی تاخیر کرنے اور دیر کرنے کے ہیں۔ [عَامَّةُ اللَّيْلِ] رات کا اکثر حصہ۔ [إِنَّهُ لَوَقْتُهَا] اس سے مختار اور افضل وقت مراد ہے۔

فائدہ: یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول

۱۳۱۔ أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، باب وقت المغرب، حديث: ٥٥٩، ومسلم، المساجد، باب بيان أن أول وقت المغرب عند غروب الشمس، حديث: ٦٣٧.

۱۳۲۔ أخرجه مسلم، المساجد، باب وقت العشاء وتأخيرها، حديث: ٦٣٨.

اللہ ﷺ اس نماز کے لیے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے' اگر وہ دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ گویا نبی ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے' جو چیز افراد امت کے لیے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اس میں آسانی کرنے کی کوشش فرماتے۔

(۱۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[133] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب گرمی کی شدت ہو تو ٹھنڈے وقت میں نماز پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ سے ہے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [فَأَبْرِدُوا] إبراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ [بالصَّلَاة] سے مراد نماز ظہر ہے' یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ [مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ] فَيْح کی ''فا'' پر فتحہ اور ''یا'' ساکن ہے۔ جہنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ' اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور اس کی بھاپ۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہیے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہیے؟ اس بارے میں ابوداود اور سنن نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے پانچ قدم تک ہو جاتا۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب في المواقيت' حديث: ٤٠٠' و سنن النسائي' المواقيت' باب آخر وقت الظهر' حديث: ٥٠٤) ② علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تمام ممالک کے لیے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد اور عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہرحال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے' یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔ ③ علامہ سندھی نے سنن نسائی کے حاشیے میں اس حدیث کی بابت لکھا ہے کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ آپ زوال کے بعد جو زیادہ سے زیادہ تاخیر کرتے وہ اسی قدر ہوتی تھی کہ گرمیوں میں سایہ تین قدم اور سردیوں میں پانچ سے سات قدم تک ہوتا تھا اور اس سائے میں اصل اور زائد دونوں سائے شمار ہوئے ہیں۔

(۱۳٤) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَصْبِحُوا بِالصُّبْحِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأُجُورِكُمْ».

[134] حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''روشن کرو صبح کو (لمبی قراءت کر کے۔) ایسا کرنا تمھارے اجر میں اضافے کا موجب ہے۔''

۱۳۳ـ أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر، حديث: ٥٣٦، ومسلم، المساجد، باب استحباب الإبراد بالظهر في شدة الحر ...، حديث: ٦١٥.

۱۳٤ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب وقت الصبح، حديث: ٤٢٤، والترمذي، الصلاة، حديث: ١٥٤، والنسائي، الصلاة، حديث: ٥٤٩، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٦٧٢، وأحمد: ٤/ ١٤٠، وابن حبان (الإحسان) حديث: ١٤٨٩ ٭ هذا حديث منسوخ كما بينته في نيل المقصود في التعليق على سنن أبي داود، وغيره.

رَوَاهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

(اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَصْبِحُوا بِالصُّبْحِ] اور ایک دوسری روایت میں [أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ] کے الفاظ ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث غلس والی حدیث کے معارض ہو جاتی ہے' اس لیے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قراءت لمبی کی جائے حتی کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے' اس طرح دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ حافظ ابن قیم اور علامہ طحاوی ؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد اور امام شافعی ؒ وغیرہ نے ''اسفار'' کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ طلوع فجر کے تیقن کے بغیر فجر کی نماز پڑھنا صحیح نہیں۔

فوائد و مسائل: ① احناف نے اس حدیث کو مدار استدلال بنا کر اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے دائمی عمل' خلفائے راشدین' جمہور صحابہ ؓ اور تابعین ؒ کے عمل کی بنا پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ② ابوداود میں حضرت ابن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک بار نماز فجر غلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ غلس ہی میں پڑھتے رہے۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب في المواقيت' حدیث: ۳۹۴) ③ اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد ؒ وغیرہ نے فرمایا ہے۔ یا پھر مراد لمبی قراءت کرکے روشن کرنا ہے۔

(۱۳۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[135] حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت پالی' اس نے صبح کی نماز پالی۔ اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی' اس نے عصر کی نماز پالی۔'' (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُهُ، وَقَالَ: «سَجْدَةً» بَدَلَ «رَكْعَةً» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرَّكْعَةُ.

اور مسلم میں حضرت عائشہ ؓ کی حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے مگر اس میں (رَكْعَةً) کی جگہ (سَجْدَةً) کا لفظ ہے' پھر کہا کہ سَجْدَة سے مراد رکعت ہی ہے۔

لغوی تشریح: [مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً] جس نے ایک رکعت پالی' یعنی مکمل ایک رکعت' قیام' قراءت فاتحہ اور رکوع و سجود پا لیے۔ [قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ] یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور دوسری رکعت طلوع شمس کے بعد پڑھ

۱۳۵۔ أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك من الفجر ركعة، حديث: ۵۷۹، ومسلم، المساجد، باب من أدرك ركعة من الصلاة فقد أدرك تلك الصلاة، حديث: ۶۰۸، وحديث عائشة أخرجه مسلم، المساجد، حديث: ۶۰۹.

لی۔[فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ] تو اس نے صبح پالی‘ یعنی اس کی نماز ادا ہو گئی (قضا نہیں ہوئی۔)

فائدہ: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کر لی پھر طلوع یا غروب آفتاب ہو گیا تو نمازی کو چاہیے کہ دوسری رکعت یا باقی رکعتیں پوری کر لے‘ اس کی نماز ہو جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کا یہی مطلب ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ عصر کو ناقص وقت میں شروع کر کے ناقص وقت میں ختم کر رہا ہے‘ لہٰذا اس کی نماز ہو جائے گی کیونکہ جس طرح فریضہ عائد ہوا اسی طرح اس کی ادائیگی کی۔ اس کے برعکس فجر کو کامل وقت میں شروع کر کے ناقص وقت میں ختم کر رہا ہے‘ لہٰذا اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ جس طرح فریضہ عائد ہوا اسی طرح سے اس کی ادائیگی نہیں کی۔ اس طرح ایک ہی حدیث کے ایک ٹکڑے کو مانتے ہیں اور دوسرے ٹکڑے کا محض اپنے موقف کے خلاف ہونے کی وجہ سے‘ انکار کر دیتے ہیں اور اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا مصداق بنتے ہیں۔ یہ ہیں احناف کی فقہی موشگافیاں۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ.

(١٣٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغِيبَ الشَّمْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ».

[136] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ”صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم کے الفاظ ہیں: ”نماز فجر کے بعد کوئی نماز نہیں۔“

وَلَهُ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيهِنَّ وَأَنْ نَقْبُرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا: حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتّٰى تَرْتَفِعَ، وَحِينَ يَقُومُ قَائِمُ الظَّهِيرَةِ حَتّٰى تَزُولَ الشَّمْسُ، وَحِينَ تَتَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ.

مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے: اول‘ یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو‘ تا آنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم‘ جب دوپہر کو سورج سیدھا کھڑا ہو جب تک کہ ڈھل نہ جائے اور سوم‘ جس وقت سورج غروب ہونے کے لیے جھک جائے۔

١٣٦ــ أخرجه البخاري، مواقيت الصلاة، باب لا تتحرى الصلاة قبل غروب الشمس، حديث: ٥٨٦، ومسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، حديث: ٨٢٧، وحديث عقبة بن عامر أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، حديث: ٨٣١، وحديث أبي هريرة أخرجه الشافعي في مسنده: ١/ ١٣٩ وإسناده ضعيف جدًا، وحديث أبي قتادة أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٨٣ وسنده ضعيف، وللحديث شواهد ضعيفة * سند ابي داود منقطع وفيه ليث بن أبي سليم وهو ضعيف، ترك من أجل اختلاطه.

وَالْحُكْمُ الثَّانِي عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ وَزَادَ: «**إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ**» وَكَذَا لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

دوسرا حکم امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے' مگر اس میں [إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ] کے الفاظ زیادہ ہیں' یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو اور ابوداود نے بھی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے اس کے مانند روایت نقل کی ہے۔

لغوی تشریح: [لَا صَلَاةَ] یعنی نفلی نماز نہیں۔ [بَعْدَ الصُّبْحِ] یعنی نماز فجر کی ادائیگی کے بعد۔ لیکن اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان کی قضا نماز فجر کے بعد جائز ہے۔ علاوہ ازیں طلوع فجر کے بعد سبھی نماز کے بعد مطلقاً نوافل کی ادائیگی مکروہ ہے۔ [نَقْبُرَ] "با" پر ضمہ اور کسرہ دونوں درست ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں۔ [مَوْتَانَا] مَوْتیٰ میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو..... [بَازِغَةً] چمکتے ہوئے' روشن۔ [اَلظَّهِيرَةِ] نصف النہار' یعنی آدھے دن کا وقت۔ [قَائِمُ الظَّهِيرَةِ] سے مراد دوپہر کا سایہ ہے اور قَائِمُ الظَّهِيرَةِ کھڑے ہونے اور قائم ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب سورج چند ساعت کے لیے سیدھا قائم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کے اوپر ہوتا ہے۔ ادھر ادھر' مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ [تَزُولُ] آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہونا۔ [تَتَضَيَّفُ] بھی مائل ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [وَالْحُكْمُ الثَّانِي] یعنی عین نصف النہار میں نماز پڑھنے کی نہی' کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ [وَكَذَا لِأَبِي دَاوُدَ] ابوداود میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ [نَحْوُهُ] جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ لیکن حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی روایات ضعیف ہیں' اس لیے ان سے جمعے کے دن زوال کے وقت نماز پڑھنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ جمعے کے دن بھی زوال کے وقت نوافل کی ادائیگی ممنوع ہی ہے۔ امام شافعی وغیرہ کی رائے' جس کی بنیاد ضعیف احادیث ہیں' مرجوح ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جن کاموں سے روکا گیا ہے ان کا ذکر ہے۔ ② ممنوع کام یہ ہیں کہ ہم ان اوقات میں نہ نماز ادا کریں اور نہ میت دفن کریں۔ ③ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے' البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ پہلا وقت طلوع آفتاب کا ہے کہ جب وہ طلوع ہو رہا ہو تو نماز اور جنازہ ممنوع ہیں حتی کہ وہ بلند ہو جائے۔ اور دوسرا وقت دوپہر کا ہے' جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو' مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی (نفلی) نماز یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ اور تیسرا وقت غروب آفتاب کا ہے' اس میں بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ ④ حدیث میں طلوع آفتاب کے بعد تَرْتَفِعَ کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے' اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابوداود اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزے کی مقدار مذکور ہے۔ جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزوں کے برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ] ''عین'' پر ضمہ اور ''قاف'' ساکن ہے۔ ان کی کنیت ابوحماد یا ابوعامر ہے۔ ہجرت' صحبت اور اسلام میں سبقت حاصل کرنے والے قدیم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ معرکۂ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ان کی طرف سے تین سال مصر کے والی رہے' نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ ہجری میں وفات پائی اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَابَنِي عَبْدِ مَنَافٍ! لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ، وَصَلّٰى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

[137] حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عبد مناف کی اولاد! بیت اللہ کا طواف کرنے والے اور (اس میں) نماز پڑھنے والے کسی شخص کو نہ روکو' خواہ وہ شب و روز کی کسی گھڑی میں یہ کام کرے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' نیز ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَابَنِي عَبْدِ مَنَافٍ] عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لیے کیا ہے کہ یہ اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ [وَصَلّٰى أَيَّةَ سَاعَةٍ ......الخ] یہ الفاظ تین ممنوعہ اوقات میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ حدیث اس عام حکم میں تخصیص کر دیتی ہے' یعنی بیت اللہ میں ہر وقت نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں مذکورہ کون سی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے؟ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں' عام نوافل مراد نہیں۔ مگر ابوداود میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل بھی مراد ہیں۔ (سنن أبي داود' المناسك' باب الطواف بعد العصر، حديث: ١٨٩٤) امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ ② جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے' جمہور علماء اسے خانۂ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی بیت اللہ شریف میں نماز وغیرہ پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابومحمد یا ابوامیہ ہے۔ ''جبیر'' تصغیر ہے جابر سے۔ پورا نام جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی ہے۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندان قریش کے نسب ناموں کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴' ۵۷ یا ۵۹ ہجری کو مدینے میں فوت ہوئے۔

[عبد مناف] مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد مناف کہلایا ورنہ

١٣٧ــ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب الطواف بعد العصر، حديث: ١٨٩٤، والترمذي، الحج، حديث: ٨٦٨، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٢٩٢٧، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٢٥٤، وأحمد: ٤/ ٨٠، وابن حبان (الإحسان): ٣/ ٤٦، حديث: ١٥٥٠.

اس کا اصل نام مغیرہ تھا' کنیت ابوعبد شمس تھی۔ بنومخزوم اور بنوعبد مناف دونوں سے تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ ﷺ کا جد امجد تھا۔ قریش کا ذی وقار سردار شمار ہوتا تھا۔

(١٣٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اَلشَّفَقُ الْحُمْرَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَقْفَهُ.

[138] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''شفق سے مراد سرخی ہے۔'' (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلشَّفَقُ الْحُمْرَةُ] شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔ بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ یہاں لغوی بحث ہے اور اس کے لیے اہل لغت ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں اور خالص عربی ہیں' اس لیے یہ روایت امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق گو موقوف ہے' تاہم ''شفق'' کے معنی بیان کرنے میں دلیل و حجت ہے۔ لغت کی مشہور کتاب ''القاموس'' میں بھی ہے کہ شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب کے بعد آسمان پر نمودار ہوتی ہے اور عشاء تک یا عشاء کے قریب تک یا اندھیرے کے قریب تک رہتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ ② اس تعریف پر تمام ائمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تنہا اس موقف کے خلاف ہیں۔ وہ شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ ③ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشید: امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(١٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلْفَجْرُ فَجْرَانِ: فَجْرٌ يُحَرِّمُ الطَّعَامَ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلَاةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلَاةُ، أَيْ صَلَاةُ الصُّبْحِ، وَيَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ». رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ. وَلِلْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ. وَزَادَ فِي الَّذِي يُحَرِّمُ الطَّعَامَ: «إِنَّهُ يَذْهَبُ

[139] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فجر دو قسم کی ہے: ایک فجر وہ ہے جو کھانے کو حرام کر دیتی ہے اور نماز اس میں حلال ہے۔ اور ایک فجر وہ ہے جس میں نماز (فجر) پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔'' (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے صحیح بھی قرار دیا ہے۔) اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس میں اس

١٣٨ـ [ضعيف] أخرجه الدارقطني: ١/ ٢٦٩ وهو حديث شاذ، هارون بن سفيان لم أجد له ترجمة، ورواه الثقات موقوفًا، وابن خزيمة: ١/ ١٨٢، ١٨٣، حديث: ٣٥٤.

١٣٩ـ [حسن] أخرجه ابن خزيمة: ١/ ١٨٤ و ٣/ ٢١٠، حديث: ٣٥٦، ١٩٢٧، والحاكم: ١/ ١٩١، ٤٢٥ وصححاه، وللحديث شاهد عند الحاكم من حديث جابر رضي الله تعالى عنه: ١/ ١٩١، حديث: ٦٨٨ وسنده حسن.

مُسْتَطِيلاً فِي الْأُفُقِ». وَفِي الْآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَنَبِ السِّرْحَانِ».

فجر کے بارے میں جو کھانے کو حرام کر دیتی ہے' یہ اضافہ ہے کہ وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں لمبے رخ پھیل جاتی ہے۔ اور دوسری فجر کے بارے میں ہے کہ وہ بھیڑیے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔

لغوی تشریح: [يُحَرِّمُ الطَّعَامَ] روزے دار کے لیے سحری کا کھانا حرام کرتی ہے۔ [وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلَاةُ] اور اس میں نماز جائز اور حلال ہے' یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد حقیقی صبح ہے جس کا نام صبح صادق ہے۔ [زَادَ] یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ [فِي الَّذِي يُحَرِّمُ الطَّعَامَ: إِنَّهُ يَذْهَبُ مُسْتَطِيلًا] اس فجر کے بارے میں فرمایا جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے' یعنی مشرقی کنارے پر۔ [اَلْأُفُقِ] افق آسمان کے اس حصے کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ [وَ فِي الْآخَرِ] ''خا'' پر فتحہ ہے۔ اور اس سے مراد وہ فجر ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کے لیے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ [كَذَنَبِ السِّرْحَانِ] ''کاف'' برائے تشبیہ اور ذَنَبٌ میں ''ذال'' اور ''نون'' دونوں پر فتحہ ہے' یعنی بھیڑیے کی دم۔ اور [سرحان] ''سین'' کے نیچے کسرہ اور ''را'' ساکن ہے۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(١٤٠) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ: اَلصَّلَاةُ فِي أَوَّلِ وَقْتِهَا». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

[140] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اول وقت میں نماز پڑھنا سب اعمال سے افضل ہے۔'' (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے جب کہ دوسری احادیث میں ایمان' صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ تمام احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں۔ ② ان میں موافقت اور تطبیق اس طرح ہوگی: ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے' لہٰذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے' اور نماز کا تعلق بدنی عبادت سے ہے' یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے' صدقے کا تعلق مالیات سے ہے' مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی' توانائی اور صحت کا سب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی

١٤٠ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الوقت الأول من الفضل، حديث: ١٧٣، والحاكم: ١/ ١٨٨، ١٨٩ واللفظ له وصححاه على شرط الشيخين، وابن خزيمة، حديث: ٣٢٧، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٢٨ وسنده صحيح * والبخاري، مواقيت الصلاة، حديث: ٥٢٧، ومسلم، الإيمان، حديث: ٨٥ بأصله.

منافات نہیں رہتی۔ ③ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کیونکہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ اور اسی طرح سخت گرمی میں نماز ظہر بھی مستثنیٰ ہے۔ گرمی میں اسے بھی قدرے تاخیر سے پڑھنے کا حکم ہے۔

(١٤١) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: **أَوَّلُ الْوَقْتِ رِضْوَانُ اللّٰهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللّٰهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللّٰهِ»**. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جِدًّا، وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ دُونَ الْأَوْسَطِ وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضًا.

[141] حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ''اول وقت (میں نماز پڑھنا) رضائے الٰہی کا موجب ہے۔ اور درمیانے وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الٰہی کا سبب ہے۔ اور آخر وقت (میں ادا کرنا) اللہ تعالیٰ سے معافی کا باعث ہے۔'' (اسے دارقطنی نے نہایت ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن اس میں لفظ [أَوْسَط] مذکور نہیں اور وہ بھی ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [دُونَ الْأَوْسَطِ] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانے وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک سنن دارقطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطے سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا اس کے بارے میں قول ہے کہ یہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے۔ اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ اور امام ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث وضع کیا کرتا (خود گھڑتا اور اپنی طرف سے بناتا) تھا۔ اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے جسے متہم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ ② محدثین ناقدین کے نقد و جرح کے بعد یہ حدیث قابل اعتنا ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: [حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ] ان کا نام سمرہ یا اوس بن معیر (میم کے نیچے کسرہ، عین ساکن اور یا پر فتحہ ہے) جمحی ہے۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ نماز پنجگانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ ہجری میں وفات پائی۔

(١٤٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[142] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ

١٤١ـ **[إسناده ضعيف جدًا]** أخرجه الدارقطني: ١/ ٢٥٠ * إبراهيم بن زكريا ضعيف وحديثه منكر، وقال ابن عدي: "حدث بالبواطيل"، وحديث ابن عمر أخرجه الترمذي، حديث: ١٧٢ وفيه يعقوب بن الوليد، كذبه أحمد وغيره.

١٤٢ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، التطوع، باب من رخص فيهما إذا كانت الشمس مرتفعة، حديث: ١٢٧٨، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤١٩، وابن ماجه، السنة، حديث: ٢٣٥ مختصرًا، وأحمد: ٢/ ١٠٤، وعبدالرزاق: ٣/ ٥٣، حديث: ٤٧٥٧، ابن الحصين: مجهول، وحديث ابن عمرو أخرجه الدارقطني: ١/ ٤١٩ وسنده ضعيف.

عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ إِلَّا سَجْدَتَيْنِ**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

ﷺ نے فرمایا: ''فجر کے طلوع ہونے کے بعد دو سنتوں کے علاوہ اور کوئی (نفل) نماز نہیں۔'' (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «**لَا صَلَاةَ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ**» وَمِثْلُهُ لِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ.

اور عبدالرزاق کی روایت میں ہے: ''طلوع فجر کے بعد صرف فجر کی دو رکعات ہیں۔'' اور دارقطنی میں حضرت ابن عمرو بن عاص ؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

لغوی تشریح: [لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ] بَعْدَ الْفَجْرِ سے مراد طلوع فجر ہے۔ [إِلَّا سَجْدَتَيْنِ] یہاں سجدتین کے معنی رکعتیں ہیں اور ایک نسخہ میں سجدتین کی جگہ رکعتین ہے۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

فائدہ: مذکورہ روایات کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور ابوداود کی تحقیق میں لکھا ہے کہ اس مسئلے کی بابت صحیح مسلم کی روایت: ۷۲۳ کفایت کرتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے شیخ البانی ؒ اور دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا معلوم ہوا کہ طلوع فجر کے بعد فرضوں سے پہلے صرف دو رکعت سنتیں ہی پڑھی جائیں۔

(١٤٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ الْعَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ بَيْتِي، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: «**شُغِلْتُ عَنْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الْآنَ**». فَقُلْتُ: أَفَنَقْضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا قَالَ: «**لَا**». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا بِمَعْنَاهُ.

[143] حضرت ام سلمہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے آپ سے ان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''ظہر کے (فرائض کے) بعد کی دو سنتیں مشغولیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تھا' میں نے وہ اب پڑھی ہیں۔'' میں نے پھر عرض کیا: اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضا دیا کریں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداود میں حضرت عائشہ ؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔)

لغوی تشریح: [شُغِلْتُ] صیغۂ مجہول۔ اس کے معنی ہیں کہ مجھے روک دیا گیا' اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلۂ عبدالقیس کے کچھ لوگ آ گئے تھے یا صدقے کا مال آ گیا تھا۔ مال کی تقسیم یا ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں، وہ آپ نے عصر کے بعد پڑھیں۔ [فَصَلَّيْتُهُمَا الْآنَ] یعنی میں نے ان دونوں کی اب قضا دی ہے۔ حضرت ام سلمہ ؓ نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا دیں؟ آپ نے فرمایا: ''تم اس وقت انھیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو۔'' علامہ یمانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد

١٤٣_ [صحيح] أخرجه أحمد: ٦/ ٣١٥ وفيه ذكوان أبوعمرو، فالسند صحيح، وحديث عائشة أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٢٧٣، والبخاري، السهو، حديث: ١٢٣٣، ومسلم، الصلاة، حديث: ٨٣٤.

ان سنتوں کی قضا نبی ﷺ کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کے لیے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد آپ کا ہمیشہ انھیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیتے تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی۔

فائدہ: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی رہ جانے والی سنتوں کی قضا رسول اللہ ﷺ کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی اور علامہ یمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ [أَفَنَقْضِيهِما إِذَا فَاتَتَا؟ قَالَ: ((لَا))] "جب یہ رہ جائیں تو کیا ہم ان کی قضا دیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں۔" ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضا نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ اس کی تفصیل أعلام أهل العصر میں شارح ابوداود شیخ شمس الحق محدث ڈیانوی نے خوب بیان کی ہے۔

٢- بَابُ الْأَذَانِ

باب:2- اذان کے احکام ومسائل

(١٤٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: طَافَ بِي - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اَللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الْأَذَانَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ، وَالْإِقَامَةَ فُرَادٰى، إِلَّا «قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ»، اَلْحَدِيثَ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

[144] حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو: [اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ]، پھر اس نے ساری اذان کہی، چار مرتبہ [اَللّٰهُ أَكْبَرُ] کہا۔ بغیر ترجیع کے اذان کہی اور اقامت (تکبیر) ایک ایک مرتبہ کہی، مگر [قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ] کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپ کو سنایا۔) آپ نے فرمایا: "یقیناً یہ خواب سچا ہے۔" یہ لمبی حدیث ہے۔ (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلَالٍ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ «اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ».

اور احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں [اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ] کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے۔

وَ لِابْنِ خُزَيْمَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا

اور ابن خزیمہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

١٤٤ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب كيف الأذان، حديث: ٤٩٩، وأحمد: ٤/ ٤٣، والترمذي، الصلاة، حديث: ١٨٩، وابن خزيمة: ١/ ١٩٨، بالأسانيد. وحديث بلال أخرجه أحمد: ٤/ ٤٣ وهو حديث حسن، ابن إسحاق والزهري عنعنا، وللحديث شواهد صحيحة، وحديث أنس أخرجه ابن خزيمة: ١/ ٢٠٢، حديث: ٣٨٦.

قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْفَجْرِ «حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ» قَالَ: «الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ».

انھوں نے فرمایا: جب مؤذن صبح کی اذان میں [حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ] کہے تو وہ کہے: [اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ]۔ یہ (کہنا) سنت ہے۔

لغوی تشریح: [بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ] اللّٰہ أکبر چار مرتبہ کہنا۔ [بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ] ترجیع کے معنی ہیں کہ اذان میں شہادتین کو پہلے دو مرتبہ پست (آہستہ) آواز سے ادا کرنا، پھر دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا۔ [وَالْإِقَامَةَ] اس سے مراد کلمات اقامت ہیں۔ [فُرَادَى] اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا، البتہ [قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ] دو مرتبہ ادا کرنا۔ [لَرُؤْيَا حَقٌّ] ''لام'' اس میں برائے تاکید ہے اور رُؤْيَا' حَقّ کی طرف مضاف ہے، رؤیا سے مراد خواب ہے۔ خواب سے مراد وہ چیز ہے جسے آدمی نیند کی حالت میں دیکھتا ہے۔ [اَلْحَدِيثَ] اس کی تین اعرابی حالتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے، تو اس صورت میں یہ مبتدا ہوگا اور اس کی خبر بِتَمَامِهٖ محذوف ہوگی۔ یا پھر دوسری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے، تو اس صورت میں عبارت اِقْرَأِ الْحَدِيثَ وَ تَمِّمْهُ ہوگی اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے، اس صورت میں عبارت إِلٰى آخِرِ الْحَدِيثِ ہوگی۔ [زَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهٖ] حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے، حالانکہ یہ اضافہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، نہ کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں، اس لیے مراد یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں [اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ] کا اضافہ نقل کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کے لیے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ بعض نے کہا: نماز کے لیے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے بوق (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا لیکن یہ سب مشورے رد کر دیے گئے کیونکہ گھڑیال بجانا عیسائیوں کا، بگل بجانا یہودیوں کا اور آگ جلانا مجوسیوں کا شعار ہے۔ اسی دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کے لیے اذان دی جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بآواز بلند اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں، نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت کیا: اللہ کے بندے! کیا تم ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا کہ تم اس سے کیا کرو گے؟ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم اس کے ذریعے سے (لوگوں کو) نماز باجماعت کے لیے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا: میں تمھیں اس سے بہتر طریقے سے آگاہ نہ کر دوں؟ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، (ضرور بتائیں۔) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انھیں سکھائے۔ یہی خواب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے بیان کیا جسے آپ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ ② اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے۔ اہلحدیث حضرات کی رائے یہی ہے۔ اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے

ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا' اس لیے کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ جنھیں آپ نے یہ تعلیم دی' نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اور أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا' چنانچہ نبی ﷺ نے انھیں دوبارہ یہ کلمات کہنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ تاویل درست نہیں۔ نبی ﷺ نے محض سکھلانے کے لیے شہادتین کے الفاظ دوبارہ نہیں کہلوائے بلکہ آپ نے انھیں اذان دینے کا طریقہ ہی یہی سکھلایا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لیے اس کا انکار محض مجادلہ ہے۔ درست بات یہ ہے کہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح ثابت ہے۔ اور صحیحین کی روایات کی بنا پر راجح یہ ہے کہ ترجیع والی اذان کے ساتھ اقامت دوہری اور عام اذان کے ساتھ اقامت اکہری کہی جائے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ] ابومحمد ان کی کنیت ہے۔ انصار کے قبیلۂ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاری خزرجی کہلائے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر میں شریک ہوئے' نیز ان کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال انھوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی۔ اور یہ واقعہ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انھوں نے ۳۲ ہجری میں ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔

[حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ] قبیلۂ تیم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ انھیں بھی غزوات بدر و احد اور احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن تھے۔ آپ کی وفات کے بعد انھوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک دفعہ وہاں سے مدینے آئے اور لوگوں کے اصرار پر اذان شروع کی تو کہا جاتا ہے کہ وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ اس قدر ان پر رقت طاری ہوگئی کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ۱۷ھ یا ۱۸ یا ۲۰ ہجری میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(۱٤٥) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ الْأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلٰكِنْ ذَكَرَ التَّكْبِيرَ فِي أَوَّلِهِ مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الْخَمْسَةُ فَذَكَرُوهُ مُرَبَّعًا.

[145] حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انھوں نے ترجیع کا ذکر کیا ہے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں اذان کے آغاز میں ''اللہ اکبر'' صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور انھوں نے ''اللہ اکبر'' کو شروع میں چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَلَّمَهُ الْأَذَانَ] عَلَّمَ تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت

۱٤٥ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب صفة الأذان، حديث: ۳۷۹، وأبوداود، الصلاة، حديث: ۵۰۰، ۵۰۵، والترمذي، الصلاة، حديث: ۱۹۱، والنسائي، الصلاة، حديث: ٦۳۰، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ۷۰۸، وأحمد: ۳/ ٤۰۹.

ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کے لیے ہم دس ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو مسلمانوں کا مذاق اور استہزا اڑانے کے لیے انھوں نے بھی اذان کی نقل اتارنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے ان لوگوں میں سے ایک خوش الحان آدمی کی اذان سنی ہے۔'' پھر ہماری طرف کسی کو بھیج کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور ہم سے فرداً فرداً اذان کہلوا کر سنی۔ میں سب سے آخری آدمی تھا جس نے اذان کہی۔ میری اذان سن کر آپ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے روبرو بٹھا کر میری پیشانی پر دست مبارک پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: ''جاؤ اور مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر اذان کہو۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے پہلے اذان تو سکھائیں' پھر انھوں نے حدیث اذان بیان کی۔ [فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ] اس میں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے ترجیع کا بھی ذکر کیا' یعنی کلمہ شہادتین کو دو دو مرتبہ دہرایا۔ جمہور علماء نے اس سے ترجیع والی اذان (دوہری اذان) کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں۔ [فَذَكَرَهُ] انھوں (پانچوں) نے اذان کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ [مُرَبَّعًا] یعنی تکبیر کو چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔ [مُرَبَّعًا] تَرْبِيع سے ہے جس کے معنی ہیں: چار مرتبہ۔ صاحب السبل شارح بلوغ المرام نے کہا ہے کہ یہ جملہ (یعنی چار بار تکبیر) ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے' اس لیے یہ محفوظ ہے۔ (دو بار تکبیر والا جملہ شاذ ہے۔)

فوائد و مسائل: ① حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ اذان کے آغاز میں اللہ اکبر دو دفعہ نہیں بلکہ چار مرتبہ کہنا ہی صحیح ہے۔ ② اذان کے لیے ایسا مؤذن منتخب کیا جائے جس کی آواز اچھی اور بلند ہو۔ اس سلسلے میں انتخاب کے لیے مقابلۂ اذان کا ثبوت ملتا ہے۔

(١٤٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ، وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ إِلَّا الْإِقَامَةَ. يَعْنِي إِلَّا «قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الْاِسْتِثْنَاءَ. وَلِلنَّسَائِيِّ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِلَالًا.

[146] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور تکبیر میں [قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ] کے علاوہ باقی جملہ کلمات کو ایک ایک مرتبہ کہنے کا حکم دیا گیا۔ (بخاری و مسلم) البتہ مسلم نے [قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ] کے استثنا کا ذکر نہیں کیا۔ اور نسائی میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔

لغوی تشریح: [أُمِرَ] صیغۂ مجہول ہے۔ اس میں حکم صادر فرمانے والے خود نبی اکرم ﷺ ہیں۔ سنن نسائی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ [أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ] یعنی ہر کلمہ دو دو مرتبہ ادا کرے۔ [وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ] اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہے۔ [إِلَّا الْإِقَامَةَ] بجز اقامت' یعنی قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کے۔ اسے دو دو مرتبہ کہا جائے گا۔ [وَ لَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الْاِسْتِثْنَاءَ] اور مسلم نے إِلَّا الْإِقَامَةَ یعنی استثنا والی عبارت نقل نہیں کی۔

١٤٦ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب الأذان مثنى مثنى، حديث: ٦٠٥، ومسلم، الصلاة، باب الأمر بشفع الأذان وإيتار الإقامة...، حديث: ٣٧٨، والنسائي، الأذان، حديث: ٦٢٨ وسنده صحيح.

(١٤٧) وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ بِلَالًا يُؤَذِّنُ، وَأَتَتَبَّعُ فَاهُ هٰهُنَا وَهٰهُنَا، وَإِصْبَعَاهُ فِي أُذُنَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

[147] حضرت ابو جحیفہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال ؓ کو اذان دیتے دیکھا اور میں نے ان کے چہرے کو بغور دیکھا کہ وہ اپنا چہرہ ادھر ادھر (دائیں بائیں جانب) پھیرتے تھے۔ اور ان کی دونوں انگلیاں (انگشت ہائے شہادت) ان کے کانوں میں تھیں۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِابْنِ مَاجَه: وَجَعَلَ إِصْبَعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: لَوّٰى عُنُقَهُ لَمَّا بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» يَمِينًا وَشِمَالًا، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کر لیں۔ اور ابوداود میں ہے کہ جب وہ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ پر پہنچے تو اپنی گردن دائیں بائیں جانب موڑی اور خود نہیں گھومے۔ اور اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لغوی تشریح: [أَتَتَبَّعُ فَاهُ] تَتَبُّع باب تفعل سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ان کے چہرے کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کا بغور ملاحظہ کر رہا تھا۔ [هٰهُنَا] دائیں جانب۔ [وَهٰهُنَا] اور بائیں جانب [لَوّٰى] تَلْوِيَة سے ہے جو باب تفعیل سے ہے، یعنی موڑا۔ [وَلَمْ يَسْتَدِرْ] إِسْتِدَارَة سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: گھومنا، یعنی اپنے جسم کو انھوں نے نہیں گھمایا۔

فوائد و مسائل: ① اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کہتے وقت دائیں بائیں چہرے کو پھیرنا بھی مسنون ہے۔ ② اذان کہتے ہوئے کانوں میں انگلیاں داخل کرنے کے تین فائدے ہیں: کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بہرہ آدمی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کے لیے اذان دی جا رہی ہے، نیز دوسروں کی آواز کے اختلاط سے مؤذن محفوظ رہتا ہے۔

راوی حدیث: [حضرت أبو جحیفه ؓ] أبو جحیفه کنیت ہے۔ وہب بن عبداللہ سوائی نام ہے۔ جحیفه میں "جیم" پر ضمہ ہے۔ یہ تصغیر ہے۔ "جیم" "حا" سے پہلے ہے۔ سوائی میں "سین" پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صغار صحابہ میں شمار کیے گئے ہیں۔ کوفے میں سکونت اختیار کی۔ حضرت علی ؓ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ ان کے ہمراہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفے میں ۷۴ ہجری میں وفات پائی۔

١٤٧ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في إدخال الإصبع في الأذن عند الأذان، حديث: ١٩٧، وأحمد: ٣٠٨/٤، ٣٠٩، وأصله في الصحيحين، البخاري، الأذان، حديث: ٦٣٤، ومسلم، الصلاة، حديث: ٥٠٣، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٧١١، وأبوداود، الصلاة، حديث: ٥٢٠.

(١٤٨) وَعَنْ أَبِي مَحْذُورَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْجَبَهُ صَوْتُهُ فَعَلَّمَهُ الْأَذَانَ. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[148] حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کو اس کی آواز بہت پسند آئی' چنانچہ آپ نے اسے خود اذان سکھلائی۔ (اسے ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور تقرر میں آواز کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ② اچھی آواز دلوں پر اثر رکھتی ہے اور اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

(١٤٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ اَلْعِيدَيْنِ، غَيْرَ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَنَحْوُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهِ.

[149] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ عیدین کی نمازیں ادا کیں۔ اس کے لیے نہ اذان دی جاتی تھی اور نہ اقامت کہی جاتی تھی۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں عیدین کی نمازیں باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن ان کے لیے اذان کہی جاتی تھی نہ اقامت۔ امت کا عمل بھی اسی پر ہے۔

(١٥٠) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فِي الْحَدِيثِ الطَّوِيلِ فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلَاةِ: ثُمَّ أَذَّنَ بِلَالٌ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[150] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں ہے' جس میں (دوران سفر میں غلبۂ نیند اور تھکاوٹ کی وجہ سے) نماز کے وقت صحابہ کے سوئے رہ جانے کا ذکر ہے۔ (جب نیند سے بیداری ہوئی تو) حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ آپ کا معمول تھا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى الْمُزْدَلِفَةَ، فَصَلّٰى بِهَا الْمَغْرِبَ

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپ نے مغرب اور عشاء کی نمازیں

١٤٨ـ [صحيح] أخرجه ابن خزيمة: ١/ ١٩٥، حديث: ٣٧٧.

١٤٩ـ أخرجه مسلم، صلاة العيدين، حديث: ٨٨٧، وحديث ابن عباس أخرجه مسلم، صلاة العيدين، حديث: ٨٨٦، والبخاري، العيدين، حديث: ٩٦٠.

١٥٠ـ أخرجه مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، حديث: ٦٨١ وحديث جابر أخرجه مسلم، الحج، حديث: ١٢١٨ وحديث ابن عمر أخرجه مسلم، الحج، حديث: ١٢٨٨، وأبوداود، المناسك، حديث: ١٩٢٧، ١٩٣٠.

وَالْعِشَاءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ.

ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھیں۔

وَلَهُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُودَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلَاةٍ» وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: وَلَمْ يُنَادِ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

اور مسلم ہی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں۔ اور ابوداود نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کے لیے تکبیر کہی گئی۔ اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لیے بھی اذان نہیں دی گئی۔

لغوی تشریح: [فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلَاةِ] سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ نبی ﷺ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصے میں کہیں پڑاؤ کیا۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیدار رہنے کا حکم فرمایا تاکہ جب فجر طلوع ہو تو وہ انھیں جگا دیں۔ نبی اکرم ﷺ سو گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر نیند کا غلبہ ہوا تو وہ بھی سو گئے، چنانچہ طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو (یہ صورت حال ملاحظہ فرما کر) نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا۔ (تعمیل حکم میں) سب صحابہ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اور آپ نے نماز پڑھائی۔ [مُزْدَلِفَة] یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے درمیان واقع ہے۔ ۹ اور ۱۰ ذوالحجہ کی درمیانی رات وہاں گزارنا حج کے شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ [وَلَمْ يُنَادِ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا] ان دونوں میں سے کسی کے لیے بھی منادی (اذان) نہیں کہی گئی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ فوت شدہ نماز اگر جماعت سے پڑھی جائے تو اس کے لیے اذان دینا مشروع ہے۔ ② ابن عمر رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض ہیں کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث مزدلفہ کے قیام کے دوران میں مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان دینے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث زیادہ قوی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اذان کی نفی ہے اور حدیث جابر میں اس کا اثبات ہے۔ اور مثبت روایت منفی پر مقدم ہوتی ہے۔

(١٥١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ، قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ

[151] حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقینا

١٥١ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب أذان الأعمى إذا كان له من يخبره، حديث: ٦١٧، ومسلم، الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم يحصل بطلوع الفجر ...، حديث: ١٠٩٢ * وفي آخره إدراج، يعني كلام بعض الرواة أدرج في الحديث وليس من كلام النبي ﷺ، وهو قوله: "وكان رجلاً أعمى ..." فإنه من كلام الزهري أو ابن عمر رضي الله عنهم.

بِلَالًا يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلًا أَعْمٰى لَا يُنَادِي حَتّٰى يُقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي آخِرِهِ إِدْرَاجٌ.

بلال (رضی اللہ عنہ) رات کو اذان کہتا ہے۔ تم لوگ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) کی اذان تک کھاپی لیا کرو۔" حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا آدمی تھے، جب تک لوگ انھیں یہ نہ کہتے کہ صبح ہوگئی، صبح ہوگئی، وہ اذان نہیں کہتے تھے۔ (بخاری ومسلم۔ اس کے آخر میں مدرج کلام ہے۔)

لغوی تشریح: [یُؤَذِّنُ بِلَیْلٍ] رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ [فَکُلُوا وَاشْرَبُوا] کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے' کھا پی سکتے ہو۔ [إِدْرَاجٌ] کا مطلب ہے: حدیث میں راوی کا اپنی طرف سے تشریح و توضیح کی صورت میں اضافہ کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں [وَکَانَ رَجُلًا أَعْمٰی] کا فقرہ ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری رحمہ اللہ کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری اذان وقت سے مؤخر کر کے دی جاتی تھی کیونکہ اطلاع دینے والا حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب اطلاع دیتا یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا اس وقت انھیں مطلع کرتا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے لیکن یہ اذان اس غرض کے لیے نہیں ہوتی جس غرض کے لیے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ یا تہجد گزاروں کو آگاہ کرنا تاکہ وہ تہجد کی نماز ختم کرلیں اور فجر کی نماز کے لیے تیار ہو جائیں۔ ② ان دونوں اذانوں کے درمیان وقفہ زیادہ نہیں ہوتا تھا' زیادہ سے زیادہ ۱۰' ۱۵ منٹ کا وقفہ ہوتا ہوگا۔ ③ مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کے لیے دو مؤذن رکھنا درست ہے۔

(١٥٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا: أَنَّ بِلَالًا أَذَّنَ قَبْلَ الْفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِيَ: «أَلَا إِنَّ الْعَبْدَ نَامَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

[152] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ وہ دوبارہ جائیں اور یہ اعلان کریں کہ "خبردار! بے شک بندے کو نیند آگئی تھی۔" (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَذَّنَ قَبْلَ الْفَجْرِ] طلوع فجر سے قبل اذان کہی اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی۔) یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ طلوع فجر صادق سے پہلے اذان دینا شروع نہیں تھا۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے یہاں ضعیف قرار دیا ہے جبکہ ابوداود کی تحقیق میں انھوں نے اسے حسن

١٥٢ـ [ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في الأذان قبل دخول الوقت، حديث: ٥٣٢ * حماد بن سلمة أخطأ في رفعه كما اتفق أئمة الحديث كأحمد والبخاري والذهلي وأبي داود والترمذي وغيرهم، والصحيح أنه موقوف، كما عند البيهقي: ١/ ٣٨٣.

قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے لہٰذا مذکورہ روایت حسن یا صحیح ہونے کی صورت میں اس موقع پر محمول ہوگی جب ابتدا میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مؤذن مقرر کیا گیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح صادق سے پہلے دیتے اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ صبح صادق ہونے کے بعد دوسری اذان نماز فجر کے لیے دیتے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ] ان کا نام عمرو یا عبداللہ بن قیس قرشی عامری ہے جن کا ذکر مفسرین نے سورۂ عبس کی شان نزول میں کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دیں۔ آپ کی آنکھوں کی بینائی نہیں تھی۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(١٥٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُولُوا: مِثْلَ مَايَقُولُ الْمُؤَذِّنُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[153] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح مؤذن کہہ رہا ہو۔'' (بخاری ومسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُهُ.

بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ الْقَوْلِ كَمَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ كَلِمَةً كَلِمَةً سِوَى الْحَيْعَلَتَيْنِ، فَيَقُولُ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

اور مسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے جو مؤذن کے جواب میں اسی طرح ایک ایک کلمہ کہنے کی فضیلت کے بارے میں ہے بجز حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے کہ ان کلمات کی جگہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے اسی طرح سننے والا بھی کہتا جائے۔ اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہے خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں۔ ② حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے جواب میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہا جائے۔ ③ جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو تو یہ حکم عام ہے اور حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے جواب میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہنے کا حکم خاص ہے۔ اور یہ طے شدہ اصول

١٥٣۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب ما يقول إذا سمع المنادي، حديث: ٦١١، ومسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه، حديث: ٣٨٣، وحديث معاوية أخرجه البخاري، الأذان، حديث: ٦١٢، وحديث عمر أخرجه مسلم، الصلاة، حديث: ٣٨٥.

ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(١٥٤) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! اِجْعَلْنِي إِمَامَ قَوْمِي. فَقَالَ: «أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَا يَأْخُذُ عَلٰى أَذَانِهِ أَجْرًا». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[154] حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے میری قوم کا امام مقرر فرما دیجیے۔ آپ نے فرمایا: ''تم ان کے امام ہو، ان میں سے سب سے زیادہ کمزور کو اپنا نمونہ بناؤ اور مؤذن ایسے آدمی کو مقرر کرو جو اذان کہنے کی اجرت نہ لے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ اقتداء سے فعل امر ہے، یعنی اپنے نمازیوں میں سے سب سے زیادہ ضعیف کو اپنا نمونہ بناؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا خیال رکھو گویا تم اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہو۔

فوائد و مسائل: ① مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضے کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لیے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔ ② اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بنا پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہیں کرنا چاہیے کہ کمزور و ناتواں لوگ اکتا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ ④ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط کما حقہ پورے کرنے کی صورت میں اس کا سوال کرنا بھی جائز ہے۔

راویٔ حدیث: حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ابوعبداللہ ان کی کنیت ہے۔ طائف سے جو وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انھوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ ہجری میں فوت ہوئے۔

(١٥٥) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللّٰهُ

[155] حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، نبی

١٥٤_ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب أخذ الأجر على التأذين، حديث: ٥٣١، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٠٩، والنسائي، الصلاة، حديث: ٦٧٣، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٧١٤، وأحمد: ٤/ ٢١٧، والحاكم في المستدرك: ١/ ٢٠١ وقال: على شرط مسلم وصححه، ووافقه الذهبي.

١٥٥_ أخرجه البخاري، الأذان، باب ليؤذن في السفر مؤذن واحد، حديث: ٦٢٨، ومسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، حديث: ٦٧٤، وأبوداود، الصلاة، حديث: ٥٨٩، والنسائي، الصلاة، حديث: ٦٣٦، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٩٧٩، وأحمد: ٣/ ٤٣٦ و ٥/ ٥٣.

تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ» اَلْحَدِيثَ، أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

ﷺ نے ہم سے فرمایا: ''جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی ایک تمھارے لیے اذان کہے۔'' پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے۔)

راویٔ حدیث: [حضرت مالک بن حویرث لیثی رضی اللہ عنہ] حویرث کی ''حا'' پر ضمہ ''واؤ'' پر فتحہ ''یا'' ساکن اور ''راء'' مکسور ہے۔ ان کی کنیت ابوسلمان ہے۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حصول تعلیم دین کے لیے آئے تھے اور بیس روز تک آپ کے پاس قیام کیا۔ جب واپس جانے لگے تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''راستے میں جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔'' اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔

(١٥٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِبِلَالٍ: «إِذَا أَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْدُرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ وَإِقَامَتِكَ مِقْدَارَ مَا يَفْرُغُ الْآكِلُ مِنْ أَكْلِهِ» اَلْحَدِيثَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

[156] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جب اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہو اور جب تکبیر کہو تو ذرا جلدی جلدی کہو۔ اذان اور اقامت کے مابین اتنا وقفہ کرو کہ کھانا کھانے والا اپنے کھانے سے فارغ ہو جائے (تاکہ جماعت میں شریک ہو سکے)۔'' پھر حدیث پوری بیان کی۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا يُؤَذِّنُ إِلَّا مُتَوَضِّئٌ». وَضَعَّفَهُ أَيْضًا.

اور ترمذی ہی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''باوضو شخص کے علاوہ کوئی اذان نہ کہے۔'' (اسے بھی ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «وَمَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ». وَضَعَّفَهُ أَيْضًا.

اور ترمذی نے حضرت زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔'' (اسے بھی انھوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔)

١٥٦ـ [ضعيف] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الترسل في الأذان، حديث: ١٩٥ * عبدالمنعم متروك وشيخه ضعيف، انظر التقريب وغيره، وللحديث شواهد ضعيفة عند الحاكم: ١/ ٢٠٤ وغيره، وحديث أبي هريرة أخرجه الترمذي، الصلاة، حديث: ٢٠٠ وسنده ضعيف، قال البيهقي: ١/ ٣٩١ هكذا رواه معاوية بن يحيى وهو ضعيف، وحديث زياد بن الحارث أخرجه الترمذي، الصلاة، حديث: ١٩٩ وسنده ضعيف، فيه الإفريقي وهو ضعيف مشهور بالضعف، وحديث عبدالله بن زيد أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٥١٢ وسنده ضعيف، محمد بن عمرو الواقفي، حديثهما ضعيف، وعلله البخاري بأن بعض رواته لم يذكر سماعه من شيخه.

وَلِأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَنَا رَأَيْتُهُ، يَعْنِي الْأَذَانَ، وَأَنَا كُنْتُ أُرِيدُهُ، قَالَ: «فَأَقِمْ أَنْتَ». وَفِيهِ ضَعْفٌ أَيْضًا

اور ابوداود میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں نے اسے، یعنی اذان کو خواب میں دیکھا تھا اور میری تمنا تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: ''تم تکبیر کہو۔'' (اس میں بھی ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: [فترسّل] [ترسُّل] سے امر کا صیغہ ہے، یعنی ٹھہر ٹھہر کر آرام سے کلمات اذان ادا کر۔ جلدی اور تیزی نہ کر۔ [فاحدُر] [باب نصر ینصُر] سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: جلدی جلدی ادا کرنا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالمنعم راوی ہے جسے محدثین نے متروک کہا ہے۔ لیکن اس مفہوم کی متعدد روایات ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے آہستہ آہستہ اذان دینے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں اونچی آواز سے اذان دینے کی ترغیب ہے۔

[وَ ضَعَّفَهُ أَيْضًا] اس کو بھی امام ترمذی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاویہ بن یحییٰ یہ حدیث زہری سے روایت کرتا ہے اور زہری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔ معاویہ نہایت ضعیف ہے اور زہری کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ روایت منقطع ہے۔

[وَ مَنْ أَذَّنَ] کا ماقبل پر عطف ہے اور وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے: [إِنَّ أَخَاصُدَاءٍ أَذَّنَ] یعنی صداء قبیلے کے ایک شخص نے اذان کہی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: [وَ مَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ] کہ جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔ اس حدیث سے مصنف رحمہ اللہ نے یہ ٹکڑا حذف کر دیا۔ مکمل حدیث اس طرح ہے کہ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے قبیلۂ صداء کے آدمی! اذان کہو۔'' میں نے اذان کہی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب فجر روشن ہو چکی تھی۔ جب آپ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھانے لگے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہنا چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صدائی بھائی اقامت کہے گا کیونکہ جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔'' اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے بیان کیا ہے۔ (سنن أبي داود، الصلاة، باب الرجل يؤذن ويقيم آخر، حديث: ٥١٤) [صُدَاء] کے ''صاد'' پر ضمہ اور ''دال'' مخفف ہے۔ ایک قبیلے کا نام ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کا ضعف اس وجہ سے ہے کہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن زیاد بن انعم افریقی ہے، امام ابن قطان وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے لیکن ثوری رحمہ اللہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ مقارب الحدیث ہے۔ امام ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے۔ طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تائید بھی موجود ہے جس کے الفاظ ہیں: ''ٹھہرو، اے بلال! اقامت وہی کہے جس نے اذان کہی ہے۔'' امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہل علم کی اکثریت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کا حقدار ہے۔ ہاں، یہ حدیث حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے معارض ہے جو اسی روایت کے آخر میں ابوداود کے حوالے سے مروی ہے۔ اور ان دونوں احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وسعت ہے، دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ [وَ فِيهِ ضَعْفٌ أَيْضًا] اور اس میں بھی ضعف ہے۔ امام بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور ''حضرت الصدائی'' رضی اللہ عنہ کی یہ

دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو صدائی کی حدیث راجح ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بعد کی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ] صداء ("صاد" پر ضمہ اور "دال" مخفف) قبیلہ کے فرد ہیں۔ یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی ہوئی تھی۔ آپ کے روبرو اذان دی۔ بصریوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(١٥٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**الْمُؤَذِّنُ أَمْلَكُ بِالْأَذَانِ، وَالْإِمَامُ أَمْلَكُ بِالْإِقَامَةِ**». رَوَاهُ ابْنُ عَدِيٍّ، وَضَعَّفَهُ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ.

[157] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مؤذن اذان کا زیادہ حقدار ہے اور امام تکبیر کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔ اور بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی طرح منقول ہے۔)

لغوی تشریح: [رَوَاهُ ابْنُ عَدِيٍّ وَضَعَّفَهُ] ابن عدی نے اسے ضعیف اس بنا پر قرار دیا ہے کہ شریک قاضی تنہا اسے روایت کرتا ہے۔ لیکن ابن معین نے کہا ہے کہ شریک صدوق' ثقہ ہے۔ البتہ اگر وہ دوسروں کی مخالفت کرے تو پھر ہمیں دوسرا راوی اس سے زیادہ محبوب ہے۔ اور امام نسائی نے کہا: [لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ] "اس میں کوئی حرج نہیں۔" اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ عاقل اور صدوق ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس سے متابعتاً روایت لی ہے۔

فوائد و مسائل: ① ہمارے فاضل محقق نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی بابت لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے' لہٰذا مذکورہ روایت میں بیان کردہ مسئلہ درست ہے۔ ② مؤذن اذان کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے کیونکہ اسے اذان کے وقت کا محافظ بنایا گیا ہے' لہٰذا مؤذن کو اپنی یہ ذمہ داری صحیح طریقے سے ادا کرنی چاہیے۔ اور امام تکبیر کہلانے میں زیادہ حقدار ہے' یعنی اس کے اشارے واجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔

(١٥٨) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ**». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[158] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "اذان اور اقامت کے درمیانی وقفے میں دعا مسترد نہیں کی جاتی۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذان اور اقامت کا درمیانی وقت انتہائی قیمتی ہوتا ہے۔ اس میں دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ دیگر آداب و شرائط کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو' بالخصوص صحت عقیدہ' رزق حلال' صدق مقال اور اخلاص و یقین وغیرہ

١٥٧ــ **[إسناده ضعيف]** أخرجه ابن عدي في الكامل: ٤/ ١٣٢٧ * شريك القاضي والأعمش عنعنا، وفيه علة أخرى، وقول علي أخرجه البيهقي: ٢/ ١٩ وسنده صحيح.

١٥٨ــ **[صحيح]** أخرجه النسائي في الكبرى، حديث: ٩٨٩٥، وعمل اليوم والليلة: ٦٧، وابن خزيمة: ١/ ٢٢٢، حديث: ٤٢٧، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٢٩٦، وانظر مثله أبي داود بتحقيقي: ٥٢١.

کامل ہو لہٰذا اس وقت دعا وغیرہ میں مصروف رہنا چاہیے جبکہ دیکھا گیا ہے لوگ حتی کہ امام مسجد اور مساجد کے خادمین تک اس وقت کو ضائع کر دیتے ہیں۔

(١٥٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ، حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ.

[159] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا کی تو اس کے لیے قیامت کے روز میری شفاعت لازم ہوگئی: [اللّٰهم رب هذه الدعوة...... الذي وعدته] ''اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور ہمیشہ رہنے والی نماز کے مالک! محمد (ﷺ) کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور انھیں اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔'' (اسے چاروں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلنِّدَاء] اذان۔ [رَبَّ] منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے' یا پھر یہ دوسرا مستقل منادی ہے اور مضاف ہو رہا ہے [هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ] کے قول کی طرف۔ [اَلدَّعْوَةِ التَّامَّةِ] اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے تامّۃ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے' اس لیے کہ دعوت توحید ہی کاملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتی ہے' اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے۔ [وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ] قیامت تک باقی رہنے والی نماز۔ [اَلْوَسِيلَةَ] اس کی وضاحت خود نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرما دی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے' اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو ملے گا اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا۔ (صحيح مسلم' الصلاة' باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن...... حديث: ٣٨٤) [وَالْفَضِيلَةَ] اس مرتبے کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو۔ [وَابْعَثْهُ] آپ کو وہاں پہنچا دے' بھیج دے۔ [مَقَامًا مَّحْمُودًا] یہ وہ مقام ہے جہاں نبی اکرم ﷺ قیامت کے دن رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد وستائش کریں گے جو اس موقع پر انھیں الہام کیے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپ کو نہیں ہوگا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہوگی۔ (صحيح البخاري' التوحيد' باب قول الله تعالى: ﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ حديث: ٧٤٤٠) [حَلَّتْ] واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔ [اَلَّذِي وَعَدْتَهُ] جس کا وعدہ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ٧٩) میں کیا گیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہوگا کہ پڑھنے والے کے لیے بروز قیامت نبی ﷺ کی شفاعت لازمی ہوگی۔ جس کی آپ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ ② ''مقام محمود'' کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ بنی

١٥٩_ أخرجه البخاري، الأذان، باب الدعاء عند النداء، حديث: ٦١٤، وأبوداود، الصلاة، حديث: ٥٢٩، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢١١، والنسائي، الصلاة، حديث: ٦٨١، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٧٢٢.

اسرائیل کی آیت (۷۹) میں ہے: ﴿عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾ یعنی امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

٣ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ

باب:3- شرائط نماز کا بیان

(١٦٠) عَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[160] حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دوران نماز میں جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے' ازسرنو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ] شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو لیکن اس کے لیے اس طرح لازمی اور ضروری ہو کہ اس کے نہ ہونے سے اس چیز کا وجود بھی ناپید ہو جائے' یعنی اس چیز کا ہونا اس شرط کے ساتھ لازم ہو۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام بھی نہ ہو۔ [إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ] جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ [فَسَا] [فَسْوٌ] سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مراد ہے مقعد سے بغیر آواز کے خارج ہونے والی ہوا۔ [وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ] [وَلْيُعِدْ] اعادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: لوٹانا' دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے ازسرنو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نواقض وضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو ہو جانے والا آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ چونکہ وہ حدیث ضعیف ہے' لہٰذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے مقابلہ نہیں ہو سکتا' لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راویٔ حدیث: [حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ] پورا نام علی بن طلق (''طا'' پر فتحہ اور ''لام'' ساکن ہے) بن منذر بن قیس سحیمی یمامی حنفی ہے' بنوحنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں۔ صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

(١٦١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا،

[161] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے روایت کرتی

١٦٠ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب من يحدث في الصلاة، حديث: ٢٠٥، والترمذي، الرضاع، حديث: ١١٦٤، وأحمد: ١/ ٨٦، والنسائي في الكبرٰى، حديث: ٩٠٢٤-٩٠٢٦، [illegible] ابن حبان (الموارد)، حديث: ٢٠٤.

١٦١ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب المرأة تصلي بغير خمار، حديث: ٦٤١، والترمذي، الصلاة، ◄◄

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ، قَالَ: «لا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

ہیں' آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کسی بالغہ عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔'' (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [حائض] اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے نہ کہ وہ عورت جو حیض کے دن گزار رہی ہو۔ [الخمار] ''خا'' کے نیچے کسرہ ہے' اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہیے حتی کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔ ② ایسے کپڑے جن سے عورت کے سر کے بال نظر آتے ہوں ان میں نماز جائز نہیں۔

(١٦٢) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «إِنْ كَانَ الثَّوْبُ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِهِ، يَعْنِي فِي الصَّلَاةِ». وَلِمُسْلِمٍ: «فَخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقًا فَاتَّزِرْ بِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[162]۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو اسے نماز میں جسم پر لپیٹ لو۔'' اور مسلم کی روایت میں ہے: ''(کہ کپڑا کشادہ ہو تو) کپڑے کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے کے مخالف کندھوں پر ڈال لو۔ اور اگر کپڑا تنگ ہو تو اسے تہبند کی صورت میں باندھ لو۔'' (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «لَا يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَاتِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''تم میں سے کوئی شخص بھی ایک کپڑے میں (اس طرح) نماز نہ پڑھے کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھے پر نہ ہو۔''

لغوی تشریح: [فالتحف] التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی ہیں: چادر اوڑھنا یا پہننا۔ اس اوڑھنے کی کیفیت کی وضاحت اگلا جملہ: [فخالف بین طرفیہ] کر رہا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ کپڑے کے درمیان کو اپنے جسم کے درمیان میں پچھلی جانب رکھے' پھر دائیں جانب کو پکڑ کر سامنے سے بائیں کندھے پر ڈال دے اور اسی طرح بائیں جانب کو دائیں کندھے پر ڈال دے اور گردن کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ (گرہ) دے لے۔ [فَاتَّزِرْ] باب افتعال سے امر کا صیغہ ہے' معنی ہیں: تہ بند باندھنا' ازار پہننا۔

فائدہ: اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ چادر اگر بڑی ہو تو اس کا ایک حصہ ازار کے طور پر اور کچھ رداء (اوپر والی

◀◀ حديث: ٣٧٧، وابن ماجه، الطهارة، حديث: ٦٥٥، وأحمد: ٦/ ٢١١، وابن خزيمة: ١/ ٣٨٠، حديث: ٧٧٥.

١٦٢ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب إذا كان الثوب ضيقا، حديث: ٣٦١، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ ودعائه بالليل، حديث: ٧٦٦، ٣٠١٠، وحديث أبي هريرة أخرجه البخاري، الصلاة، حديث: ٣٥٩، ومسلم، الصلاة، حديث: ٥١٦.

چادر) کے طور پر اس طرح اوڑھ لے کہ اس کے دونوں کنارے (ایک دوسرے کے مخالف) کندھوں پر ہوں کندھے ننگے نہ رہیں۔ اور اگر چادر چھوٹی ہو تو پھر اسے ازار (تہ بند) کے طور پر باندھ لے۔ مشہور قول کے مطابق مرد کے لیے قابل ستر حصہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ (سبل السلام)

(١٦٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي دِرْعٍ وَخِمَارٍ بِغَيْرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا يُغَطِّي ظُهُورَ قَدَمَيْهَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَ الْأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

[163] حضرت ام سلمہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: کیا کوئی عورت تہبند کے بغیر محض قمیص اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ”جب قمیص اتنی لمبی اور فراخ ہو کہ قدموں کے اوپر والے حصوں تک پہنچ جائے تو جائز ہے۔“ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [دِرْع] ”دال“ کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن ہے۔ قمیص۔ [سابغا] اتنی لمبی چوڑی اور فراخ کہ پورے جسم کو ڈھانپ لے۔ [يُغَطِّي] تغطية سے ماخوذ ہے۔ پردہ پوشی کرتا ہو، ڈھانپتا ہو۔ [ظُهُورَ قَدَمَيْهَا] پاؤں کا اوپر والا حصہ۔ پاؤں کی بالائی سطح۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت ضعیف ہے تاہم دیگر صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت نماز میں اپنا جسم ڈھانپے کیونکہ اسے سر سمیت سارا جسم ڈھانپنے کا حکم ہے جیسا کہ حدیث نمبر ۱۶۱ میں گزر چکا ہے۔ ② دوسری بات جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عورت اپنے پاؤں کی پشت کو ڈھانپے۔ اس کی بابت علامہ محققین کہتے ہیں کہ اگر اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی نماز کی حالت میں عورت کے لیے پیروں کا ڈھانپنا ضروری نہیں اس کو زیادہ سے زیادہ پردے کے عمومی حکم کے اعتبار سے ضروری کہا جا سکتا ہے۔ بعض علماء پاؤں کی پشت کو ڈھانپنے کے لیے ترمذی کی حدیث (۱۷۳۱) سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت ام سلمہ ؓ کے جواب میں فرمایا کہ اگر عورت کے پاؤں مردوں کے لباس سے ایک بالشت زیادہ لٹکانے پر بھی ننگے رہتے ہوں تو وہ ایک ہاتھ زیادہ لٹکا لیا کریں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز میں عورت کو پاؤں کی پشتوں سمیت اپنا پورا جسم ڈھانپ کر رکھنا چاہیے لیکن حضرت ام سلمہ ؓ کی اس حدیث کا تعلق پردے کے عمومی حکم سے ہے نمازی عورت کے لیے بھی اسے ضروری قرار دینا محل نظر ہے۔ اس طرح تو پھر نماز پڑھتے وقت عورت کے لیے چہرے کو ڈھانپنا بھی ضروری قرار دینا پڑے گا کیونکہ پردے کے حکم میں عورت کا چہرہ بھی شامل ہے۔ اگر عورت کے لیے نماز کی حالت میں چہرہ ڈھانپنا ضروری نہیں ہے تو پھر حضرت ام سلمہ ؓ کی حدیث سے نماز کی حالت میں پیروں کی پشت کے ڈھانپنے کو بھی ضروری قرار دینا غلط ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ: ۲۲/ ۱۱۶-۱۲۰، طبع جدید ۱۹۹۸ء الریاض)

١٦٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في كم تصلي المرأة، حديث: ٦٣٩ (موقوفا)، و ٦٤٠ (مرفوعا) وسنده ضعيف أيضًا.

(١٦٤) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، فَأَشْكَلَتْ عَلَيْنَا الْقِبْلَةُ، فَصَلَّيْنَا. فَلَمَّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا إِلٰى غَيْرِ الْقِبْلَةِ. فَنَزَلَتِ الْآيَةُ: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

[164] حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک اندھیری رات میں ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے تو قبلے کا رخ شناخت کرنا ہم پر دشوار ہو گیا۔ ہم نے (اندازاً قبلے کا رخ متعین کر کے) نماز پڑھ لی۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے غیر قبلے کی جانب نماز پڑھی تھی' چنانچہ (اس موقع پر) یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ ''پس جدھر تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا چہرہ ہے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُظْلِمَةٍ] ''میم'' پر ضمہ اور ''لام'' مکسور ہے۔ تاریک رات۔ [فَأَشْكَلَتْ] مشتبہ ہو گئی۔ [تُوَلُّوا] رخ کرو گے۔ [فَثَمَّ] ''ثا'' پر فتحہ اور ''میم'' پر تشدید اور فتحہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: وہاں۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل، رقم: ۲۹۱) بنابریں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم واقفیت' ابر آلودگی یا دیگر کسی سبب کے باعث سمت قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے اور آدمی اپنی دانست کے مطابق غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد فیصلہ کر کے نماز پڑھ لے تو اس اندازے میں اگر غلطی ہو جائے تو معاف ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة ۲: ۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کام کرنے کا مکلف نہیں ٹھہراتا۔'' ② امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے' نیز وہ اس حدیث کو ضعیف کہتے ہیں۔ ③ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے' مگر امام ترمذی رحمہ اللہ اس مسئلے کی بابت (كتاب الصلاة' باب ماجاء في الرجل يصلي...... حديث: ۳۴۵ میں) لکھتے ہیں: ''اکثر علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بادل کی وجہ سے قبلے کے سوا دوسری طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے پھر نماز کے بعد اسے پتہ چلے کہ اس نے قبلہ رخ نماز ادا نہیں کی تو اس کی وہ نماز درست ہے۔ سفیان ثوری' ابن مبارک' احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا یہی موقف ہے۔'' ④ اگر نماز کے دوران میں پتہ چل جائے تو نمازی کو چاہیے کہ دوران نماز ہی میں قبلہ رخ ہو جائے جیسا کہ اہل قبا نے تحویل قبلہ کی خبر سن کر نماز ہی میں اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا' اور باقی نماز صحیح سمت ہو کر مکمل کر لے۔

راوی حدیث: [حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ] قبیلۂ عنز بن وائل میں سے ہیں۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے' عنز ان کا بھائی تھا۔ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوۂ بدر اور

١٦٤ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة البقرة، حديث: ٢٩٥٧، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٠٢٠ * عاصم بن عبيدالله ضعيف (تقريب)، والحديث له شاهد ضعيف عند البيهقي: ٢/ ١١.

دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کے سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۳۲' ۳۳ یا ۳۵ ہجری میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

(١٦٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ**». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ الْبُخَارِيُّ.

[165] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرق اور مغرب کے مابین قبلہ ہے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کے لیے ہے' اس لیے کہ مدینہ' مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینے والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے' لہٰذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلے سے دور دراز فاصلے پر ہو تو اس کے لیے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کے لیے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کے لیے ادھر اپنا چہرہ اور رخ کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کے لیے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کے لیے ہے۔

(١٦٦) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي عَلٰى رَاحِلَتِهِ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ الْبُخَارِيُّ: يُومِئُ بِرَأْسِهِ، وَلَمْ يَكُنْ يَصْنَعُهُ فِي الْمَكْتُوبَةِ.

[166] حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے دیکھا ہے' وہ جس طرف بھی آپ کو لیے پھرتی۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ اپنے سر مبارک سے اشارے (کے ساتھ نماز ادا) فرماتے' اور فرض نماز میں ایسا نہیں کرتے تھے۔

وَلِأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ: وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ، اِسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ الْقِبْلَةَ، فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلّٰى حَيْثُ كَانَ وَجْهُ رِكَابِهِ. وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اور ابوداود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ سفر کرتے اور نفلی نماز پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی اونٹنی کا رخ قبلے کی طرف موڑ دیتے اور تکبیر کہتے' اس کے بعد پھر سواری کا رخ جس جانب بھی ہو جاتا' نماز پڑھتے رہتے۔

١٦٥ـ **[صحيح]** أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء أن ما بين المشرق والمغرب قبلة، حديث: ٣٤٢-٣٤٤، وقال: حسن صحيح.

١٦٦ـ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب صلاة التطوع على الدواب وحيثما توجهت، حديث: ١٠٩٣-١٠٩٧، ومسلم، صلاة المسافرين، باب جواز صلاة النافلة على الدابة في السفر حيث توجهت، حديث: ٧٠١. وحديث أنس أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٢٢٥، وإسناده حسن كما قال الحافظ رحمه الله.

(اس حدیث کی سند حسن ہے۔)

لغوی تشریح: یُومِیءُ بِرَأْسِهِ اپنے سر سے رکوع و سجود کے لیے اشارہ کرتے اور سجدے کے لیے رکوع کی بہ نسبت ذرا زیادہ جھکتے۔ اَلْمَکْتُوبَۃ لکھی ہوئی یعنی فرض نماز۔ اَلرِّکَاب "را" کے کسرہ اور "کاف" مخفف کے ساتھ ہے۔ سواری کو کہتے ہیں یعنی اونٹ یا وہ چیز جس سے سواری کا کام لیا جائے۔ یہاں اونٹنی مراد ہے۔

فائدہ: حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں نفل نماز سواری پر ادا کی جا سکتی ہے، فرض نہیں، نیز ایک دفعہ سواری کا رخ یا اپنا رخ قبلہ کی طرف کر کے شروع کر لے، پھر اگر سواری کا رخ کسی دوسری جانب ہو جائے تب بھی نماز درست ہے۔ مگر یہ اس وقت ہے جب سواری مسافر کے اپنے تصرف میں ہو۔ ہمارے دور کی سواریاں، مثلاً: ریل گاڑی اور ہوائی جہاز وغیرہ چونکہ مسافروں کے اپنے تصرف میں نہیں ہوتیں، اس لیے ایسے سفروں میں جمع تقدیم (ظہر اور عصر کو اکٹھا ظہر کے وقت میں اور مغرب و عشاء کو اکٹھا مغرب کے وقت میں پڑھنا) یا جمع تاخیر (ظہر اور عصر کو اکٹھا عصر کے وقت میں اور مغرب و عشاء کو اکٹھا عشاء کے وقت میں پڑھنا) کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر سفر اتنا لمبا ہو کہ دونمازوں (ظہر و عصر یا مغرب و عشاء) کا وقت دوران سفر ہی میں گزر جائے گا تو پھر سواری پر فرض بھی ادا کر سکتے ہیں، جیسے کشتی یا بحری جہاز میں اگر ساحل قریب نہ ہو تو بالاتفاق ان میں فرض نماز جائز ہے۔

(١٦٧) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اَلْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

[167] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: "قبرستان اور حمام کے سوا ساری زمین مسجد ہے۔ (جہاں چاہو نماز پڑھ لو)۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک علت ہے۔)

لغوی تشریح: وَلَهُ عِلَّةٌ "اور اس میں ایک علت ہے۔" وہ علت یہ ہے کہ حماد نے اسے موصول روایت کیا ہے جبکہ امام ثوری رحمہ اللہ نے اسے مرسل روایت کیا ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل سند ہی سے محفوظ ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اس کا موصول ہونا صحیح قرار دیا ہے اور یہی راجح ہے۔ اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان اور حمام میں نماز درست نہیں۔ حمام میں اس لیے کہ وہ جگہ ناپاک ہے اور قبرستان میں ممانعت کا سبب سد ذرائع کے طور پر شرک سے بچنے کے لیے ہے۔

(١٦٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى أَنْ يُصَلَّى فِي سَبْعِ

[168] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا

١٦٧ـ [إسناده صحيح] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء أن الأرض كلها مسجد إلا المقبرة والحمام، حديث: ٣١٧، وللحديث شواهد عند أبي داود.

١٦٨ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في كراهية ما يصلى إليه وفيه، حديث: ٣٤٦ وسنده ◄◄

مَوَاطِنَ: اَلْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيقِ، وَالْحَمَّامِ، وَمَعَاطِنِ الْإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

ہے: کوڑے (کوڑا ڈالنے کی جگہ) ذبح خانے' قبرستان' شارع عام' حمام' باڑوں (اونٹ باندھنے کی جگہوں) میں اور بیت اللہ کی چھت پر۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْمَزْبَلَة] ''میم'' اور ''با'' دونوں پر فتحہ ہے۔ وہ جگہ جہاں گوبر اور لید وغیرہ ڈالے جاتے ہوں۔ [اَلْمَجْزَرَة] ''میم'' اور ''زا'' دونوں پر فتحہ ہے۔ وہ جگہ جہاں جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ [مَعَاطِن] مَعْطَن کی جمع ہے۔ ''میم'' پر فتحہ اور ''طا'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ (باڑا) جو عموماً حوض کے اردگرد بنائی جاتی ہے۔ [وَضَعَّفَهُ] امام ترمذی نے اسے ضعیف کہا ہے کیونکہ اس روایت کی سند میں ایک راوی زید بن جبیرہ ہے جس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ متروک ہے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ روئے زمین کو مسجد قرار دینے کے باوجود کچھ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنا شرعاً ممنوع ہے۔ ② جہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں' ظاہر ہے وہ جگہ پاک تو نہیں رہ سکتی اس لیے جب جگہ ہی ناپاک ہوگی تو نماز کیسے ہوگی؟ کیونکہ جگہ کا پاک ہونا نماز کے لیے شرط ہے۔ اسی طرح ذبح خانہ جہاں جانور ذبح کیے جاتے ہیں' خون اور اس طرح کی دوسری چیزیں اس جگہ کو صاف نہیں رہنے دیتیں' اس لیے یہ جگہ بھی نماز کی ادائیگی کے لیے درست نہیں۔ ③ شارع عام جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ جہاں گزرنے کی پہلے ہی دقت اور دشواری ہو وہاں نماز پڑھنا لوگوں کے لیے موجب اذیت ہوگا۔ توجہ اور خشوع و خضوع بھی نہیں رہ سکتا۔ ④ خانہ کعبہ کی چھت پر نماز اس لیے ممنوع ہے کہ نماز میں بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی شرط ہے۔ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسا ناممکن ہے۔ جب شرط ہی نہ پائی گئی تو نماز کیسے ہوگی۔

(١٦٩) وَعَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الْغَنَوِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ، وَلَا تَجْلِسُوا عَلَيْهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[169] حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''نہ تو قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ ② بعض حضرات بزرگوں کی قبروں کے پاس اس لیے مسجدیں تعمیر کرتے ہیں کہ بزرگوں کی ارواح سے فیض حاصل ہوگا۔ اس کی بھی ممانعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بالکل واضح طور پر یہ ارشاد نبوی ہے: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (مسجد) بنا لیا۔'' (صحیح البخاري، الجنائز، باب ما یکره من

◆◆ ضعيف، وله شاهد ضعيف عند ابن ماجه، الصلاة، حديث: ٧٤٦.

١٦٩ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، حديث: ٩٧٢.

اتخاذ المساجد على القبور، حديث: ١٣٣٠) ③ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو افعال مساجد میں اللہ تعالیٰ کے لیے انجام دیے جاتے ہیں ان کو قبروں پر نہ کیا جائے۔ اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھی جائے۔ اس سے شرک کا شبہ پڑ سکتا ہے۔ ④ قبروں پر بیٹھنے کے بھی کئی مفہوم ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے۔ جس طرح تکیے پر ٹیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے۔ اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا' نیز قبروں پر قضائے حاجت کے لیے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابومرثد غنوی ؓ] ابومرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کناز کے ''کاف'' پر فتحہ اور ''نون'' پر تشدید ہے۔ کناز بن حصین بن یربوع الغنوی۔ غنوی ''غین'' اور ''نون'' دونوں پر فتحہ کے ساتھ ہے۔ غطفان کے ایک قبیلے غنی بن یعصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ کے حلیف اور دوست تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ١٢ ہجری میں ٦٦ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ مرثد کی ''میم'' پر فتحہ' ''را'' ساکن اور ''ثا'' پر فتحہ ہے۔

(١٧٠) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ، فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذًى أَوْ قَذَرًا فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[170] حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو (مسجد میں داخل ہونے سے پہلے) اسے چاہیے کہ (اپنے جوتے) دیکھ لے۔ اگر جوتوں میں کوئی گندگی یا ناپاک چیز لگی ہوئی ہو تو اسے صاف کر دے اور ان میں نماز پڑھ لے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَذًى] طبیعت جس سے اذیت محسوس کرے۔ [قَذَرًا] طبائع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے۔ [أَذًى أَوْ قَذَرًا] راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ نبی ﷺ نے أَذًى کا لفظ استعمال کیا تھا یا قَذَرًا کا۔ معنی دونوں کے ایک ہی ہیں' یعنی نجاست۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک صاف ہوں۔ ② جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک اور صاف ہو جاتا ہے۔ ③ حدیث کے بظاہر الفاظ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ ④ اس ارشاد نبوی کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے۔ دوران نماز ہی میں جبریل امین ؑ نے آپ کو مطلع فرمایا کہ آپ کے جوتے نجاست سے آلودہ ہیں۔ آپ نے نماز

١٧٠ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الصلاة في النعل، حديث: ٦٥٠، وابن خزيمة، حديث: ١٠١٧، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٣٦٠، والحاكم: ١/ ٢٦٠، وصححه على شرط مسلم، ووافقه الذهبي.

ہی میں جوتے اتار دیے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے بھی فعل نبوی کی اتباع میں اپنے جوتے اتار دیے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے صحابہ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ انھوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہم نے آپ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں، پھر آپ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ (مسند أحمد: ٣/ ٢٠، و سنن أبي داود، الصلاة، باب الصلاة في النعل، حديث: ٦٥٠) ⑤ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز میں کسی طرح علم ہو جائے تو وہ اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کرلے تو نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(١٧١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَطِىءَ أَحَدُكُمُ الْأَذٰى بِخُفَّيْهِ فَطَهُورُهُمَا التُّرَابُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[171] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے موزوں سے گندگی روندے تو مٹی اسے پاک صاف کرنے والی ہے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَطِیءَ أَحَدُكُمُ الْأَذٰى] نجاست کو اپنے پاؤں سے روندے اور اس پر سے گزرے اور چلے۔ وَطِیءَ باب سَمِعَ يَسْمَعُ سے ہے۔ [بِخُفَّيْهِ] خف کا تثنیہ ہے جو ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ اس میں ''با'' حرف جر ہے۔ یہ اور پہلے گزری ہوئی حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جوتے، موزے اور ایسی دوسری چیزیں مٹی پر رگڑنے سے پاک ہو جاتی ہیں، خواہ نجاست خشک ہو یا تر۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے محقق نے سنداً ضعیف کہا ہے، تاہم معناً صحیح ہے۔ غالباً اسی بنا پر امام ابن حبان اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ بنابریں جوتوں اور موزوں پر اگر کسی قسم کی نجاست لگ جائے، خواہ وہ خشک ہو یا تر، مرئی (نظر آنے والی) ہو یا غیر مرئی، خفیف ہو یا غلیظ تو وہ پاک مٹی پر اچھی طرح رگڑنے سے پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ دھونے کی چنداں ضرورت نہیں، بشرطیکہ جوتے نیچے سے برابر ہوں اور گندگی ان میں پھنس نہ جاتی ہو۔ ② امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے، البتہ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کو صحیح مانا ہے۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی رائے دی ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر صرف زمین پر جوتا یا موزہ اچھی طرح رگڑنے سے پاک صاف ہو جاتا ہے، پانی سے دھو کر پاک صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(١٧٢) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ هٰذِهِ

[172] حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ نماز میں انسانی گفتگو

١٧١ـ [ضعيف] أخرجه أبوداود، الطهارة، باب الأذى يصيب النعل، حديث: ٣٨٥، وسنده ضعيف، ٣٨٦، وسنده ضعيف، ٣٨٧ وسنده ضعيف، وابن حبان (ابن بلبان): ٤/ ١٤٠٣، ١٤٠٤، وابن خزيمة: ١/ ١٤٨، حديث: ٢٩٢، والحاكم: ١/ ١٦٦.

١٧٢ـ أخرجه مسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة ونسخ ما كان من إباحته، حديث: ٥٣٧.

الصَّلَاةَ لَايَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کی کوئی گنجائش نہیں۔ نماز میں تو صرف تسبیح (سبحان اللہ) تکبیر (اللہ اکبر) اور تلاوت قرآن ہونی چاہیے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز میں ایک نمازی نے چھینک ماری' اس کے جواب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حالت نماز میں [يَرْحَمُكَ اللّٰهُ] کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے مندرجہ بالا حدیث فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا منع ہے۔ ② یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدی پر نماز میں قراءت قرآن فرض ہے کیونکہ یہ جماعت کی نماز تھی اور رسول اللہ ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر مقتدی کو کہا کہ نماز میں کلام الناس جائز نہیں' نماز میں تو تسبیح و تکبیر اور قراءت قرآن ہوتی ہے۔ اور مقتدی پر کون سی قراءت واجب ہے؟ اس کی وضاحت دیگر متعدد صحیح احادیث میں موجود ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی قراءت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں روایت ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ] ''جو شخص بھی نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔'' (صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها.....، حديث:٧٥٦)

راوئ حدیث: [حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ] ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی اور بنو سلیم میں رہنے لگے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ۱۱۷ ہجری میں وفات پائی۔ حکم کی ''حا'' اور ''کاف'' دونوں پر فتحہ ہے۔

(١٧٣) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَتَكَلَّمُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، يُكَلِّمُ أَحَدُنَا صَاحِبَهُ بِحَاجَتِهِ، حَتَّى نَزَلَتْ: ﴿حَٰفِظُواْ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلْوُسْطَىٰ وَقُومُواْ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ﴾ فَأُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ، وَنُهِينَا عَنِ الْكَلَامِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[173] حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہم دوران نماز میں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے تھے اور اپنی ضرورت و حاجت ایک دوسرے سے بیان کر دیتے تھے تا آنکہ یہ آیت نازل ہوگئی: ﴿حافظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ﴾ ''نمازوں کی اور بالخصوص درمیانی نماز (عصر) کی حفاظت کرو۔ اور اللہ کے سامنے خاموشی سے کھڑے ہو۔'' تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں گفتگو اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [إِنْ كُنَّا] یہ إِنْ مخففه من المثقله ہے یعنی إِنَّ سے إِنْ بنایا گیا ہے۔ اور اس کا اسم محذوف ہے'

١٧٣- أخرجه البخاري، العمل في الصلاة، باب ما ينهى من الكلام في الصلاة، حديث:١٢٠٠، ومسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة ونسخ ما كان من إباحته، حديث:٥٣٩.

یعنی إِنَّا یا إِنَّهُ۔ اور کُنَّا اس کی خبر ہے۔ [وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰی] ''واؤ'' اس جگہ تخصیص کے لیے ہے' یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطیٰ کی حفاظت کرو۔ اور صحیح ترین قول کے مطابق اس سے نماز عصر مراد ہے۔ [قَانِتِیْنَ] ڈرتے' سہمے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے متعدد معانی ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے سکوت کے معنی ہی لیے ہیں۔ انھوں نے یہ معنی قرائن کی بنا پر اخذ کیے ہیں یا نبی ﷺ کی تفسیر کی روشنی میں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں ہر قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔ ② آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راویٔ حدیث: [زید بن ارقم رضی اللہ عنہ] انصار کے قبیلۂ خزرج میں سے ہیں' اس لیے انصاری خزرجی کہلائے۔ ان کی کنیت ابوعمرو ہے۔ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شامل ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکۂ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں میں سے تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحاب میں شامل تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ٦٦ ہجری میں فوت ہوئے۔

(١٧٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «**فِي الصَّلَاةِ**».

[174] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مردوں کے لیے تسبیح (سبحان اللہ کہہ کر امام کو نماز میں مطلع کرنا) اور عورتوں کے لیے تالی بجانا ہے۔'' (بخاری و مسلم) اور مسلم نے لفظ [فِي الصَّلَاةِ] ''نماز میں'' کا اضافہ نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: [اَلتَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ] جب نمازی امام کو درپیش ناگہانی صورت حال یا بھول سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے۔ اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے' بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب) مارے۔

فوائد و مسائل: ① جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کے لیے مرد مقتدی سُبْحَانَ اللّٰہِ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ تالی بجا کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سُبْحَانَ اللّٰہِ وغیرہ نہیں کہے گی۔ ② عیسیٰ بن ایوب نے تالی پیٹنے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کی پشت' یعنی الٹی جانب پر مارے۔ ③ بعض نادان لوگ سُبْحَانَ اللّٰہِ کی بجائے اَللّٰہُ أَکْبَرُ کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ سنت سے ثابت نہیں۔

(١٧٥) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الشِّخِّيرِ

[175] حضرت مطرف رحمہ اللہ اپنے باپ عبداللہ بن شخیر

١٧٤ـ أخرجه البخاري، العمل في الصلاة، باب التصفيق للنساء، حديث: ١٢٠٣، ومسلم، الصلاة، باب تسبيح الرجل وتصفيق المرأة إذا نابهما شيء في الصلاة، حديث: ٤٢٢.

١٧٥ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب البكاء في الصلاة، حديث: ٩٠٤، والترمذي في الشمائل: ٣١٥،

عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ الْمِرْجَلِ، مِنَ الْبُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں' انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا' اس وقت آپ کے سینۂ مبارک سے گریہ وزاری کی وجہ سے ہنڈیا کے ابلنے کی سی آواز آرہی تھی۔ (اسے ابن ماجہ کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَزِيزٌ] ''ہمزہ'' پر فتحہ اور ''زا'' کے نیچے کسرہ ہے۔ وہ آواز جو جوش مارتے وقت ہنڈیا سے آتی ہے۔ [اَلْمِرْجَلِ] ''میم'' کے نیچے کسرہ' ''را'' ساکن اور ''جیم'' پر فتحہ ہے۔ ہنڈیا کے معنی میں ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز میں خوف الٰہی سے رونا نماز کے لیے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راویٔ حدیث: [حضرت مُطَرِّف رحمہ اللہ] ''میم'' پر ضمہ اور ''را'' پر تشدید اور کسرہ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: مطرف بن عبداللہ بن شخیر۔ ''شین'' کے نیچے کسرہ اور ''خا'' پر تشدید ہے۔ حرشی عامری بصری۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں۔ عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ ہجری میں فوت ہوئے۔

[عَنْ أَبِيهِ] اس سے مراد عبداللہ بن شخیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ ہیں۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ بنو عامر کا جو وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(۱۷٦) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِي مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَدْخَلَانِ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحْنَحَ لِي. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه.

[176] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے میرے دو وقت تھے۔ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ نماز ادا فرما رہے ہوتے تو مجھے مطلع کرنے کے لیے کھنکھار دیتے۔ (اسے نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَدْخَلَانِ] ''میم'' اور ''خا'' دونوں پر فتحہ اور درمیان میں واقع ''دال'' ساکن ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ [تَنَحْنَحَ] حلق میں آواز کو گردش دینا' کھنکھارنا۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز میں ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کے لیے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[177] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں

◄◄ والنسائي، الصلاة، حديث: ۱۲۱۵، وأحمد: ٤/ ۲٥، وابن حبان (الإحسان): ۲/ ٦٦، حديث: ۷٥٠.

۱۷٦ـ [صحيح] أخرجه النسائي، السهو، باب التنحنح في الصلاة، حديث: ۱۲۱۲، وابن ماجه، الأدب، حديث: ۳۷٠۸.

۱۷۷ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب رد السلام في الصلاة، حديث: ۹۲۷، والترمذي، الصلاة، حديث: ۳٦۸.

عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبِلَالٍ: كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِينَ يُسَلِّمُونَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يُصَلِّي؟ قَالَ: يَقُولُ هٰكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: آپ نے نبی ﷺ کو کس طرح جواب دیتے ہوئے دیکھا' جب کہ آپ نماز پڑھ رہے ہوتے اور لوگ آپ کو سلام کہتے؟ انھوں نے کہا کہ آپ اس طرح کرتے۔ اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَرُدُّ عَلَيْهِمْ] عليهم میں هم ضمیر سے اہل قبا مراد ہیں۔ [يَقُولُ هٰكَذَا] عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ [وَبَسَطَ كَفَّهُ] دراز کیا' پھیلایا۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ بعد میں جب نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہو گیا۔ اور اس لیے کہ یہ اشارہ معنوی کلام ہے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ اگر یہ اس موقع کی بات ہوتی جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارے سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت تھی؟ ② گفتگو کی ممانعت اور اشارے سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارے سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلا ریب و تردد نماز کی حالت میں اشارے سے سلام کا جواب دینا جائز ہے۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے نمازی کے لیے نماز میں مصروف نمازیوں کو سلام کرنا درست اور جائز ہے' البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارے سے دیا جائے گا۔ ④ اس اشارے کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ اس بارے میں مسند احمد میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اور جامع الترمذی میں حضرت ابن عمر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہاتھ یا انگلی کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے تھے۔ دیکھیے: (مسند أحمد: ٢/ ١٠' وجامع الترمذي' الصلاة' باب ماجاء في الإشارة في الصلاة' حديث: ٣٦٨)

(١٧٨) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ: وَهُوَ يَؤُمُّ

[178] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو اٹھائے ہوئے ہوتے۔ آپ جب سجدے میں جاتے تو اسے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے

١٧٨ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه في الصلاة، حديث: ٥١٦، ومسلم، المساجد، باب جواز حمل الصبيان في الصلاة....، حديث: ٥٤٣.

النَّاسَ فِي الْمَسْجِدِ.

ہوتے تو اسے (دوبارہ) اٹھا لیتے۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم میں یہ اضافہ بھی ہے: آپ لوگوں کو مسجد میں امامت کرا رہے ہوتے تھے۔

لغوی تشریح: [حَامِلٌ] مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ [أُمَامَةَ] حَامِلٌ کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ [وَهُوَ يَؤُمُّ النَّاسَ] أَمَّ يَؤُمُّ، باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے ہے' لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ فرض نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں' خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل' نمازی بچے وغیرہ کو اٹھا سکتا ہے' خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو اور نمازی امام ہو یا منفرد۔ اور یہ ایسا ''عمل کثیر'' نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر آدمی سر پر رکھ سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھا لیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے؟ یعنی اٹھانا جائز ہے۔ اتنا عمل' عمل کثیر نہیں۔ اور اس حدیث سے پتہ چلا کہ بچوں کے کپڑے اور بدن پاک ہوتے ہیں کیونکہ یہی اصل ہے بشرطیکہ ان میں نجاست ظاہر نہ ہو۔ (سبل السلام)

وضاحت: [حضرت امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا] امامہ نبی ﷺ کی لخت جگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور انھی کے ہاں انھوں نے وفات پائی۔

(١٧٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «اُقْتُلُوا الْأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ: اَلْحَيَّةَ وَالْعَقْرَبَ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[179] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''نماز میں دو سیاہ جانوروں: سانپ اور بچھو کو مار دیا کرو۔'' (اس حدیث کو چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْحَيَّةَ] سانپ۔ [اَلْعَقْرَبَ] بچھو۔ دونوں أَسْوَدَيْنِ سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ أسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں' خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لازماً ان کی رنگت سیاہ ہو۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ اور بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ ② یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ ③ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران میں سانپ اور بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ ④ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت

١٧٩- [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب العمل في الصلاة، حديث: ٩٢١، والترمذي، الصلاة، حديث: ٣٩٠، والنسائي، الصلاة، حديث: ١٢٠٣، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٢٤٥، وابن حبان (الإحسان): ٤/ ٤٢، حديث: ٢٣٤٥.

بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔ دیکھیے: (جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في قتل الأسودين في الصلاة، حديث:٣٩٠)

٤ - بَابُ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي

باب:4-نمازی کے سترے کا بیان

(١٨٠) عَنْ أَبِي جُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ؟ لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْرًا لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي الْبَزَّارِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ: «**أَرْبَعِينَ خَرِيفًا**».

[180] حضرت ابوجُہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے (نمازی کے آگے سے گزرنے) کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔'' (بخاری و مسلم) یہ الفاظ بخاری کے ہیں' نیز یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے جس میں ''چالیس سال'' کا ذکر ہے۔

لغوی تشریح: ‏[بَابُ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي] سترہ کے ''سین'' پر ضمہ اور ''تا'' ساکن ہے۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کر لے یا رکاوٹ بنا لے' خواہ دیوار ہو' ستون ہو' نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ' تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ [اَلْمَارُّ] مُرُور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا۔ [خَرِيفًا] بمعنی سال۔ خریف' ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے' اس لیے یہاں جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوجہیم بن حارث رضی اللہ عنہ] کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ بن حارث بن صمہ انصاری ہے۔ خزرج قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جُهَيْم' جَهْم کی تصغیر ہے اور [الصِّمَّة] ''صاد'' کے نیچے کسرہ اور ''میم'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔

(١٨١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «**مِثْلُ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ**».

[181] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے نمازی کے سترے کے متعلق پوچھا گیا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے؟) تو آپ

١٨٠ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب إثم المار بين يدي المصلي، حديث:٥١٠، ومسلم، الصلاة، باب منع المار بين يدي المصلي، حديث:٥٠٧.

١٨١ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب سترة المصلي والندب إلى الصلاة إلى سترة ...، حديث:٥٠٠.

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

نے فرمایا: ''اونٹ کے پالان کے پچھلے حصے والی لکڑی کی اونچائی کے برابر ہونا چاہیے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ] یہ غزوہ رجب ۹ ہجری میں رومیوں کے خلاف ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے۔ [مُؤخِرَةِ] ''میم'' پر ضمہ' ''ہمزہ'' ساکن اور ''خا'' پر فتحہ یا کسرہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ اور ''ہمزہ'' پر فتحہ اور ''خا'' پر تشدید اور فتحہ یا کسرہ دونوں جائز ہیں' نیز ''میم'' پر فتحہ اور ''واؤ'' پر سکون' ہمزہ کے بغیر اور ''خا'' کے نیچے کسرہ بھی درست ہے۔ یہ کجاوے کی وہ لکڑی ہوتی ہے جس کے ساتھ سواری کرنے والا ٹیک لگاتا ہے۔ [الرَّحْلِ] کجاوہ وغیرہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

فائدہ: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازی کے سامنے سترہ ہونا چاہیے۔ سترے کی اونچائی اتنی ہونی چاہیے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(۱۸۲) وَعَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِيَسْتَتِرْ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ». أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ.

[182] حضرت سبرہ بن معبد جُہَنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز ادا کرتے وقت تم میں سے ہر ایک کو سترہ قائم کرنا چاہیے اگرچہ تیر ہی ہو۔'' (اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَلَوْ بِسَهْمٍ] اگرچہ تیر ہی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا باریک و پتلا بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہونا چاہیے۔ اور حدیث کے عموم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد ہو یا غیر مسجد سترے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

راویِ حدیث: [حضرت سَبْرہ بن مَعْبد جہنی رضی اللہ عنہ] مدنی صحابی ہیں۔ ذی مروہ میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابوثریہ تھی۔ ثریہ کی ''ثا'' پر ضمہ' ''را'' پر فتحہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد سب سے پہلے جس غزوہ میں شامل ہوئے وہ غزوۂ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں انھیں اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کے لیے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۸۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَقْطَعُ

[183] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مرد کی نماز کو عورت' گدھا اور کالا

۱۸۲ـ [إسناده صحيح] أخرجه الحاكم في المستدرك: ۱/ ۲۵۲، وأحمد: ۳/ ٤٠٤.

۱۸۳ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب قدر ما يستر المصلي، حديث: ۵۱۰، وحديث أبي هريرة أخرجه مسلم، الصلاة، حديث: ۵۱۱، وحديث ابن عباس أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ۷۰۳، والنسائي، الصلاة، حديث: ۷۵۲، وسنده صحيح.

صَلَاةَ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ - إِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ مُؤَخِّرَةِ الرَّحْلِ - اَلْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ الْأَسْوَدُ». اَلْحَدِيثَ. وَفِيهِ: «اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

کتا توڑ دیتے ہیں جب کہ اس کے آگے پالان کے پچھلے حصے کے برابر سترہ نہ ہو۔'' یہ لمبی حدیث ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں: ''کالا کتا شیطان ہوتا ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوُهُ دُونَ الْكَلْبِ. وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُونَ آخِرِهِ، وَقَيَّدَ الْمَرْأَةَ بِالْحَائِضِ.

اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے' نیز ابوداود اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے۔ اور عورت کے متعلق بالغہ ہونے کی قید اور شرط بھی ذکر کی ہے۔

لغوی تشریح: [يَقْطَعُ صَلَاةَ الْمَرْءِ] اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے۔ اَلْمَرْأَةُ' يَقْطَعُ کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ [وَفِيهِ] یعنی اس حدیث کے آخر میں ہے۔ [اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ] ''کالا کتا شیطان ہے۔'' کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا ہے۔ [وَلَهُ] میں [ہ] ضمیر صحیح مسلم کی طرف راجع ہے۔ [عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوُهُ دُونَ الْكَلْبِ] اس عبارت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے' اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے' حالانکہ صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے۔ تو پھر دُونَ الْكَلْبِ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کا ذکر ہے لیکن اس کی صفت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی [اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ] کے الفاظ نہیں ہیں۔ [وَلِأَبِي دَاوُدَ...... نَحْوُهُ] ابوداود اور نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرح مروی ہے۔ [دُونَ آخِرِهِ] سوائے آخری حصے کے' یعنی ابوذر کی روایت کے آخر میں جو [اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ] ہے وہ ابوداود اور نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں نہیں ہے۔ نَحْوُهُ اور آخِرِهِ دونوں میں ضمیر مجرور کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت بعید ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں بطور اصل ذکر ہوئی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث متابعت کے طور پر ہے' پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں ہے کہ جس کی طرف ضمیر لوٹے۔ [قَيَّدَ] التقييد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے: ''بالغ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔'' (عون المعبود مطبوعہ هند: ۱/ ۲۵۹)

فوائد و مسائل: ① سترے کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ نمازی کے خشوع و خضوع میں فرق نہ پڑے اور شیطان وسوسے ڈال کر نماز کا ثواب کم یا ضائع نہ کر دے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سترے کو شیطان سے بچاؤ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اگر نمازی کے آگے سترہ موجود ہو تو سترے سے ماوراء گزرنے والا کوئی بھی انسان یا حیوان انسان کے خشوع و خضوع کو کم

کرتا ہے نہ ہی اس سے نماز باطل ہوتی ہے۔ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے۔ اور یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے کافی ہے' ہر شخص کو نماز باجماعت میں الگ سے سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے سترہ رکھنے کا حکم دیا ہے' تاہم صحت نماز کے لیے سترہ شرط نہیں ہے' اگرچہ نہ ہونے کی وجہ سے نماز کے خشوع وخضوع اور ثواب میں کمی آ جاتی ہے۔ مذکورہ حدیث میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ اگر کسی نے سترہ قائم نہ کیا یا اس کے اور سترے کے درمیان سے عورت' گدھا یا کالا کتا گزر گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس حدیث میں قطع صلاۃ کے مفہوم کے تعین میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے: اہل علم کے ایک گروہ نے قطع صلاۃ کے اس حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور حدیث [لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ] ''نماز کو کوئی چیز قطع نہیں کرتی۔'' (سنن أبي داود' حديث: ٧١٩) کو اس کا ناسخ کہا ہے۔ لیکن ان کا دعوائے نسخ بلا دلیل ہے جیسا کہ امام نووی اور ابن حجر ؒ نے کہا ہے۔ (المجموع: ٣/٢٥١) شیخ البانی ؒ نے حدیث [لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ] کو ضعیف قرار دیا ہے اور قطع صلاۃ والی روایت کو صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا نسخ تو تب ثابت ہو گا جب دونوں روایات کو صحیح تسلیم کریں۔ لیکن اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے' تب بھی نسخ کی بجائے دونوں حدیثوں کے مابین تطبیق اور جمع کی صورت نکالیں گے جیسا کہ معروف قاعدہ ہے کہ نصوص کے تعارض کی صورت میں اگر جمع ممکن ہو تو سب سے پہلے جمع کریں گے کہ مذکورہ حدیث کے منطوق کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم کہیں گے کہ ان تین چیزوں کا حصر ہے کہ ان سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور باقی سے خشوع وخضوع میں فرق آ جاتا ہے۔ شیخ احمد محمد شاکر ؒ نے محلی ابن حزم (١٤/١) کے حاشیے میں نسخ والا موقف اختیار کیا ہے لیکن جن روایات کو بنیاد بنایا ہے وہ ضعیف ہیں۔ ② اہل علم کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ مذکورہ حدیث میں قطع سے نماز کا باطل ہونا مراد نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے خشوع وخضوع میں کمی آ جاتی ہے اور نماز کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ ③ اہل علم کے تیسرے گروہ نے حدیث کا ظاہری مفہوم مراد لیا کہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نماز کی برکت تو سترہ نہ ہونے کی صورت میں مرد کے گزرنے سے بھی ختم ہو جاتی ہے اور خشوع وخضوع میں کمی آ جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کو سختی سے روکنے اور اسے گناہ گار کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی' لہٰذا ان تین چیزوں کا بطور خاص ذکر کرنا اپنے اندر ایک زائد مفہوم رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے گزرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور دیگر چیزوں کے گزرنے سے خشوع وخضوع میں کمی آ جاتی ہے' ورنہ یہ تحصیل حاصل ہو گی اور حصر بے معنی ہو گا جو رسول اللہ ﷺ سے ممکن نہیں۔ پھر اس موقف کی تائید سیدنا ابوذر ؓ کی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے' جنھیں شیخ البانی ؒ نے الصحيحة میں ذکر کیا ہے' وہ الفاظ یہ ہیں: [تُعَادُ الصَّلَاةُ مِنْ مَمَرِّ الْحِمَارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْكَلْبِ الْأَسْوَدِ] ''گدھے' عورت اور سیاہ فام کتے کے گزرنے سے نماز لوٹائی جائے۔'' (صحيح ابن خزيمة وابن حبان بحواله الصحيحة: ٧/ ٩٥٩' حديث: ٣٣٢٣) یہی موقف صحابۂ کرام ؓ میں سے سیدنا انس' سیدنا ابوہریرہ' سیدنا ابن عباس' سیدنا ابن عمر ؓ وغیرہ کا ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری' ابوالاحوص اور ائمہ میں سے امام احمد ؒ اور متاخرین میں سے امام شوکانی اور شیخ البانی ؒ ان مذکورہ تین چیزوں کے آگے سے گزرنے پر نماز کے باطل ہونے کے قائل ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (أصل صفة صلاة النبي: ١/ ١٣٠' ومحلى ابن حزم: ٤/ ١٨' وفتاوى الدين الخالص: ٣/ ٥٨١) ④ یاد رہے عورت سے مراد بالغ عورت

ہے جیسا کہ دوسری روایت میں صراحت ہے۔ واللہ أعلم. ⑤اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھی تین چیزوں کے نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز کیوں باطل ہوتی ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ اور حکمت یہ ہے کہ شارع ﷺ نے انھی تین چیزوں کو خاص کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی زیادہ گمان کی جاتی ہیں' دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان تینوں سے نماز کے فاسد ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپانے کی چیز ہے' چنانچہ جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے۔ (جامع الترمذي' الرضاع' باب استشراف الشيطان المرأة إذا خرجت' حديث:۱۱۷۳) اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے۔ (صحيح مسلم' النكاح' باب ندب من رأى امرأة...... حديث: ۱۴۰۳) اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر آواز نکالتا ہے۔ (سنن أبي داود' الأدب' باب في الديك والبهائم' حديث:۵۱۰۲) اور جہاں تک کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں [اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ] کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (صحيح مسلم' اللباس والزينة' باب تحريم تصوير صورة الحيوان.....' حديث: ۲۱۰۶) اور جس شخص نے ایسا کتا پالا جس کی شرع میں اجازت نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر وثواب میں سے دو قیراط کی کمی کر لی۔ (صحيح البخاري' الذبائح والصيد' باب من اقتنى كلبا ليس بكلب صيد أو ماشية' حديث: ۵۴۸۰ - ۵۴۸۲) هذا ما عندنا والله أعلم.

(١٨٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ إِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «فَإِنَّ مَعَهُ الْقَرِينَ».

[184] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص سترہ قائم کر کے نماز پڑھنے لگے اور کوئی آدمی اس کے سامنے (سترے اور نمازی کے درمیان) سے گزرنے لگے تو وہ (نمازی) اسے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ (گزرنے والا پھر بھی) باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان (بصورت انسان) ہے۔'' (بخاری ومسلم) اور ایک روایت میں ہے: ''اس کے ساتھ اس کا ساتھی (شیطان) ہوتا ہے۔''

لغوی تشریح: [يَجْتَازُ] گزرتا ہے۔ [بَيْنَ يَدَيْهِ] اس کے آگے سے' سامنے سے' یعنی نمازی اور قائم شدہ سترے کی درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم' یعنی دفع کرنا اور لڑنا وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ

١٨٤ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب يرد المصلي من مر بين يديه، حديث: ٥٠٩، ومسلم، الصلاة، باب منع المار بين يدي المصلي، حديث: ٥٠٥، وانظر حديث: ٥٠٦، وفيه (فإن معه القرين) لكن من حديث عبدالله بن عمر.

واجب نہیں مندوب ہیں۔ [فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ] اس کا یہ عمل شیطان کے اکسانے سے ہے۔ [اَلْقَرِينَ] ساتھی، مراد وہ شیطان ہے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اس کام پر اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

فوائد و مسائل: ① نمازی کے سامنے سے گزرنا جب کہ اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ② ظاہر یہ کے نزدیک تو زور اور شدت کے ساتھ اسے روکنا واجب ہے۔ انھوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ ③ نمازی گزرنے والے کو اشارے سے روکنے کی کوشش کرے، اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بضد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے، پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ ④ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ ⑤ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز میں اتنے عمل سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

(١٨٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ شَيْئًا، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصًا، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَخُطَّ خَطًّا، ثُمَّ لَا يَضُرُّهُ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

[185] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے چہرے کے سامنے کوئی چیز رکھ لے۔ اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاٹھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاٹھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) لکیر ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔'' (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے، اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن ہے۔)

لغوی تشریح: [فَلْيَنْصِبْ] نَصْبٌ سے ماخوذ ہے۔ یہ باب ضَرَبَ اور نَصَرَ دونوں سے آتا ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا، قائم کرنا، کھڑا کرنا وغیرہ۔ [لَمْ يُصِبْ] إِصَابَة سے ماخوذ ہے، یعنی وہ صواب اور درستی کو نہیں پہنچ سکا۔ سترے کے لیے صرف لکیر کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اس سے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے اور انھوں نے سترے کے لیے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں لکیر کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترے کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ ہلالی صورت کا ہونا چاہیے، یعنی محراب کی طرح قوس دار۔ اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لمبا خط کھینچا جائے۔ اور یہ بھی رائے ہے کہ دائیں سے بائیں کھینچا جائے۔

١٨٥ـ [ضعيف] أخرجه أحمد: ٢/ ٢٤٩، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ٩٤٣، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٤٠٧ * ابن عمرو بن حريث وجده مجهولان.

فائدہ: اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن صلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی ابن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے، نیز ہمارے فاضل محقق اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے اس لیے کہ اس میں شدید اضطراب ہے اور دو مجہول راوی ہیں۔ دیکھیے: (ضعيف سنن أبي داود، حديث: ١٣٤) لہذا سترے کے لیے خط (لکیر) کھینچنا درست نہیں ہے۔

(١٨٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ، وَادْرَءُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

[186] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی اور جہاں تک ممکن ہو (سامنے سے گزرنے والی شے کو) روکنے کی کوشش کرو۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ] اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی۔ [اِدْرَءُوا] دفع کرو، ہٹاؤ، دور کرو۔ اس کی سند میں ''مجالد'' نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے، یعنی اسے اکثر ائمۂ جرح وتعدیل نے ضعیف کہا ہے۔ لیکن دیگر شواہد کی بنا پر مذکورہ روایت حسن درجے تک پہنچ جاتی ہے جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے تحقیق وتخریج میں وضاحت کی ہے۔

٥ - بَابُ الْحَثِّ عَلَى الْخُشُوعِ فِي الصَّلَاةِ

باب:5- نماز میں خشوع وخضوع کی ترغیب کا بیان

(١٨٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِرًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَمَعْنَاهُ أَنْ يَّجْعَلَ يَدَهُ عَلٰى خَاصِرَتِهِ.

[187] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوکھوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری ومسلم- یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔) اور اس (مُخْتَصِرًا) کے معنی یہ ہیں کہ نمازی اپنے پہلو پر ہاتھ رکھے۔

وَفِي الْبُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا: «أَنَّ ذٰلِكَ فِعْلُ الْيَهُودِ فِي صَلَاتِهِمْ».

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''یہ یہودیوں (کی نماز) کا طریقہ ہے۔''

لغوی تشریح: [بَابُ الْحَثِّ] حَثَّ يَحُثُّ حَثًّا، ترغیب دلانا، ہمت دلانا، نشاط اور چستی پیدا کرنا، ابھارنا۔

١٨٦- [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب من قال لا يقطع الصلاة شيء، حديث: ٧١٩، والحديث شاهد قوي عند الدارقطني: ١/ ٣٦٧.

١٨٧- أخرجه البخاري، العمل في الصلاة، باب الخصر في الصلاة، حديث: ١٢٢٠، ومسلم، المساجد، باب كراهة الاختصار في الصلاة، حديث: ٥٤٥، وحديث عائشة أخرجه البخاري، أحاديث الأنبياء، حديث: ٣٤٥٨.

[اَلْخُشُوع] ظاہری اور باطنی عاجزی' یعنی تمام اعضائے انسانی آنکھ' دل' ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو۔ [مُخْتَصِرًا] اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے' یعنی کوکھوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصرة انسان کے جسم کے اس حصے کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر اور پسلیوں کے نیچے ہوتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① نماز چونکہ خالص اللہ کے لیے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہیے' لہٰذا اس دوران میں ایسی ہیئت' حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہیے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ ② پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عجز و انکسار کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار' فروتنی اور مسکین کی سی صورت و ہیئت ہونی چاہیے جو اللہ کو پسند ہے۔ ③ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے' اس لیے نماز میں "اختصار" (کوکھوں پر ہاتھ رکھنے) کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے' نیز یہ ہیئت یہودکی ہے' اس لیے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(١٨٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ الْعَشَاءُ فَابْدَءُوا بِهِ قَبْلَ أَنْ تُصَلُّوا الْمَغْرِبَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[188] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا کھالو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [قُدِّمَ] تقدیم سے مجہول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: حاضر کیا گیا' پیش کیا گیا۔ [اَلْعَشَاءُ] "عین" پر فتحہ اور آخر میں مد کے ساتھ ہے۔ رات کا کھانا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اگر کھانا تیار ہو چکا ہو (اور بھوک لگی ہو) تو پہلے کھانا تناول کر لینا چاہیے تاکہ نماز کے خشوع میں نقص پیدا نہ ہو کیونکہ بھوک کی صورت میں دھیان کھانے کی طرف ہی رہے گا۔

(١٨٩) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلَا يَمْسَحِ الْحَصٰى، فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

[189] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو (سجدہ گاہ سے) سنگریزوں (کنکریوں) کو اپنے ہاتھ سے نہ ہٹائے کیونکہ (اس وقت) رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی

١٨٨ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، حديث: ٦٧٢، ومسلم، المساجد، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام، حديث: ٥٥٧.

١٨٩ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في مسح الحصى في الصلاة، حديث: ٩٤٥، والترمذي، الصلاة، حديث: ٣٧٩، والنسائي، الصلاة، حديث: ١١٩٢، وابن ماجه، الصلاة، حديث: ١٠٢٧، وأحمد: ٥/ ١٥٠، وحديث معيقيب أخرجه البخاري، العمل في الصلاة، حديث: ١٢٠١، ومسلم، الصلاة، حديث: ٥٤٦.

ہے۔'' (اسے پانچوں نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَاحِدَةً أَوْ دَعْ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ مُعَيْقِيبٍ نَحْوُهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ.

مسند احمد میں یہ اضافہ ہے: (اگر کنکریاں ہٹانی ہی ہیں تو) ''ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو۔'' اور صحیح بخاری میں حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ سے یہی روایت مروی ہے لیکن اس میں سبب کا بیان نہیں ہے۔

لغوی تشریح: [فَلَا يَمْسَح] یعنی پیشانی رکھنے یا سجدہ کرنے کی جگہ سے کنکریاں نہ ہٹائے۔ [الْحَصٰى] چھوٹے سنگریزے' چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ [زَادَ أَحْمَدُ] امام احمد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر کنکریوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹا لے یا چھوڑ دے' ہاتھ بھی نہ لگائے۔ [بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ] اس میں علت' سبب اور وجہ بیان نہیں کی گئی' یعنی اس روایت میں یہ نہیں کہ رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث راہنمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہیے' اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ ② اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں' نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہیں ہونا چاہیے۔ اگر سجدے کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز میں اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہیے' اس لیے کہ اس موقع پر رحمت الٰہی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے' اگر نمازی ایسا فعل کرے گا تو رحمت سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے' البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ] ''میم'' پر ضمہ اور ''عین'' پر فتحہ ہے۔ معیقیب بن ابو فاطمہ قبیلۂ دوس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دوسی کہلائے۔ مکہ کے قدیم الاسلام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی ان کے پاس ہوتی تھی یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر پر متعین تھے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

(۱۹۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الْاِلْتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، فَقَالَ: «**هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[190] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے دوران میں ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ تو ایک جھپٹ ہے جس کے ذریعے سے شیطان انسان کی نماز میں سے کچھ حصہ جھپٹ لیتا ہے۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ - وَصَحَّحَهُ -: «**إِيَّاكَ وَالْاِلْتِفَاتَ فِي الصَّلَاةِ، فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَفِي**

ترمذی کی حدیث' جسے انھوں نے صحیح قرار دیا ہے' میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز میں ادھر ادھر نظر دوڑانے

۱۹۰ــ أخرجه البخاري، الأذان، باب الالتفات في الصلاة، حديث: ۷۵۱، وحديث أنس أخرجه الترمذي، الجمعة، حديث: ۵۸۹.

التَّطَوُّعِ». سے بچو کیونکہ یہ موجب ہلاکت ہے، البتہ شدید اور ناگزیر مجبوری کی بنا پر نوافل میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔"

لغوی تشریح: [اَلْاِلْتِفَات] دائیں بائیں نظر کرنا۔ [اَلْاِخْتِلَاسُ] کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ [إِيَّاكَ] "کاف" پر فتحہ ہے۔ مرد کو خطاب ہے۔ اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: "بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو التفات سے بچاؤ..." الخ (جامع الترمذي، الجمعة، باب ما ذكر في الالتفات في الصلاة، حديث:٥٨٩) [إِيَّاكَ] منصوب ہے تحذیر کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور التفات سے بچو [هَلَكَةٌ] "ہا" "لام" اور "کاف" تینوں پر فتحہ ہے۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ اس میں شیطان کی اطاعت ہے اور وہی اس پر برانگیختہ کرتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا حتی کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھیرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزو سے غافل اور بے پروا ہو جائے اور ثواب سے محروم رہ جائے، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ② شدید اور سخت ضرورت کے وقت التفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے نہ پائے، صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(١٩١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ فَلَا يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلٰكِنْ عَنْ شِمَالِهِ تَحْتَ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ».

[191] حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی نماز میں ہوتا ہے تو اپنے پروردگار سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے، لہٰذا (ایسی حالت میں) اپنے سامنے کی طرف اور دائیں جانب نہ تھوکے بلکہ اپنی بائیں جانب اپنے پاؤں کے نیچے (تھوکے)۔" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے: "یا اپنے پاؤں کے نیچے۔"

لغوی تشریح: [يُنَاجِي] مناجاة سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ [فَلَا يَبْصُقَنَّ] لہٰذا نہ تھوکے۔ یہ ممانعت تھوک اور منہ کے دیگر فضلوں کو شامل ہے۔ [وَلَا عَنْ يَمِينِهِ] دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب دائیں جانب کی تعظیم و تکریم ہے اور بعض کے نزدیک اس کی وجہ فرشتے کا دائیں جانب ہونا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران میں تھوک یا بلغم وغیرہ آ جائے تو سامنے اور دائیں

١٩١ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب ليبصق عن يساره أو تحت قدمه اليسرى، حديث:٤١٣، ومسلم، المساجد، باب النهي عن البصاق في المسجد...، حديث:٥٥١.

جانب تھوکنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ② اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آ جائے تو کسی رومال یا کپڑے وغیرہ پر لے کر اسے مل دینا چاہیے۔ اگر کوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوک وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے پھینک دے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسجد میں قالین وغیرہ نہ ہو۔ ③ یہ حکم گویا اس وقت کے لیے ہے جب فرش کچا ہو۔ آج کل عام طور پر صورت حال اس سے مختلف ہے۔ بہرحال نماز میں قبلہ رو تھوکنا نہیں چاہیے بلکہ عام حالت میں بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ نماز سے باہر بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ادب واحترام اور پاکیزگی کا یہی تقاضا ہے۔ ④ سنن ابوداود وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک امام کو نماز کے دوران میں قبلہ رخ تھوکنے کی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرما دیا تھا۔ (سنن أبي داود، الصلاة، باب في كراهية البزاق في المسجد، حديث: ٤٨١)

(١٩٢) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا، فَإِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ لِي فِي صَلَاتِي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[192] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک زیبائشی چادر تھی جو انھوں نے اپنے حجرے کے ایک طرف لٹکا رکھی تھی۔ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اپنی اس زیبائشی چادر کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو کیونکہ اس کے نقش ونگار میری نماز میں مسلسل میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

وَاتَّفَقَا عَلَى حَدِيثِهَا فِي قِصَّةِ أَنْبِجَانِيَّةِ أَبِي جَهْمٍ، وَفِيهِ: «فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلَاتِي».

بخاری اور مسلم دونوں ابوجہم کی انبجانیہ چادر کے قصے میں متفق ہیں۔ اور اس میں ہے: ''اس چادر نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔''

لغوی تشریح: قِرَام ''قاف'' کے نیچے کسرہ اور ''را'' پر تخفیف ہے۔ مختلف رنگوں والا باریک کپڑا۔ أَمِيطِي مجھ سے دور کر دو۔ تَصَاوِيرُهُ اس کی علامات اور نقوش۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش حیوانات کے ہوں کہ جسے حیوان اور انسان کی تصویر کے جواز کی دلیل بنا لیا جائے۔ تَعْرِضُ ظاہر اور نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ فِي قِصَّةِ أَنْبِجَانِيَّة ''ہمزہ'' مفتوح ''نون'' ساکن ''با'' کے نیچے کسرہ اور ''جیم'' مخفف ہے۔ ''الف'' کے بعد والا ''نون'' مکسور اور یائے نسبتی پر تشدید ہے یعنی اونی چادر بغیر نقوش کے۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ابوجہم رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک چادر تحفے کے طور پر پیش کی' اس چادر میں کچھ نقوش واعلام تھے اور وہ تھی بھی باریک۔ آپ نے اسے پہن کر یا اوڑھ کر نماز ادا فرمائی تو آپ کی نظر اعلام ونقوش کی جانب مبذول ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی آپ نے فرمایا: ''اس چادر کو ابوجہم ہی کے پاس لے جاؤ اور اس سے مجھے أنبجانيه چادر لا دو۔'' آپ نے ابوجہم رضی اللہ عنہ کی خميصة (نقش دار چادر) کے بدلے

١٩٢ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب إذا صلى في ثوب مصلّب أو تصاوير...، حديث: ٣٧٤، وحديث أنبجانية أبي جهم أخرجه البخاري، الصلاة، حديث: ٣٧٣، ومسلم، المساجد، حديث: ٥٥٦.

میں بغیر نقوش والی انبجانیہ چادر اس سے طلب فرمائی تاکہ ایسا نہ ہو کہ ابوجہم رضی اللہ عنہ کی دل شکنی ہو کہ اس کے تحفے کو سرکار دوعالم ﷺ نے واپس کر دیا ہے۔ [فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلَاتِي] یعنی ابوجہم رضی اللہ عنہ کی چادر نے مجھے غافل اور مشغول کر دیا۔ لَهِيَ يَلْهَى "ہا" کے نیچے کسرہ بمعنی غافل کر دینا اور یہ لَهَا يَلْهُو لَهْوًا سے ماخوذ نہیں ہے جس کے معنی کھیلنے کے آتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے نمازی کی توجہ نماز سے ہٹ کر اس چیز کی طرف ہو جانے کا اندیشہ ہو اسے دور کر دینا چاہیے تاکہ وہ نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ ② اگر اسے دور کرنا اور ہٹانا بس میں نہ ہو تو خود سامنے سے ہٹ جانا چاہیے تاکہ خشوع و خضوع اور توجہ میں کمی پیدا نہ ہو۔

وضاحت: [حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ] یہ ابن حذیفہ بن غانم قرشی العدوی ہیں۔ عدی قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے عدوی کہلائے۔ ان کا اصل نام عامر یا عبید ہے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں سے تھے۔ جب قریش نے کعبہ کو تعمیر کیا' یہ اس موقع پر موجود تھے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کعبہ کے وقت بھی موجود تھے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی ایام میں وفات پائی۔

(۱۹۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلَاةِ، أَوْ لَا تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[193] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ نماز میں اپنی نظریں آسمان کی جانب اٹھانے سے ضرور باز آ جائیں' ایسا نہ ہو کہ پھر ان کی نظریں واپس ہی نہ آئیں (نابینے ہو جائیں)۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا صَلَاةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ».

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے: ''نماز نہیں ہوتی جب کہ کھانا حاضر ہو اور نہ اس وقت جب اسے پیشاب پاخانہ دھکیل رہا ہو۔''

لغوی تشریح: [لَيَنْتَهِيَنَّ] انتہاء سے ماخوذ ہے اور اس میں لام' قسم محذوف کے جواب میں آیا ہے۔ آخر میں نون مشددہ تاکید کے لیے ہے اور یہ خبر امر کے معنی میں ہے' یعنی رک جائیں' باز آ جائیں۔ [أَوْ لَا تَرْجِعُ] یعنی ان کی نظریں واپس نہیں لوٹیں گی۔ [إِلَيْهِمْ] ان کی طرف' یعنی وہ نابینے ہو کر رہ جائیں گے۔ دونوں میں سے ایک کا وقوع لازمی ہے یا تو لوگ نماز میں اپنی نظریں اٹھانے سے باز آ جائیں گے یا پھر بطور سزا اللہ تعالیٰ ان کی آنکھیں چھین لے گا۔ [وَلَا وَهُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ] یعنی اس وقت بھی نماز نہیں ہوتی جب نمازی پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز پڑھے۔ وَهُوَ کی ''واؤ''

۱۹۳۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب النهي عن رفع البصر إلى السماء في الصلاة، حديث:٤٢٨. وحديث عائشة أخرجه مسلم، المساجد، حديث: ٥٦٠.

حالیہ ہے۔اور دو خبیث چیزوں سے مراد پیشاب اور پاخانہ ہے۔ مدافعت باب مفاعلہ ہے جس میں مشارکت کا خاصا ہے۔اس کے معنی ہیں: ایک دوسرے کو دھکیلنا۔ گویا نمازی ان کو دھکیلتا اور روکتا ہے اور وہ نمازی کو فراغت کی طرف کھینچتے اور دھکیلتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① نماز کے دوران میں آسمان کی جانب نظریں اٹھانا حرام ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسا کرنے والے کی نماز ہی نہیں رہتی۔ (المحلی لابن حزم: ۴/ ۷، مسئلة: ۳۸۲) امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں کہا ہے کہ اس میں سخت نہی اور وعید ہے۔ انھوں نے اس نہی کے تحریمی ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووي: ۴/ ۱۹۹، ۲۰۰ - مطبوعه مؤسسه قرطبه) ② اسی طرح نماز شروع کرنے سے پہلے قضائے حاجت کی اگر شدید حاجت ہو تو اسے روک کر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے۔ ایسی نماز نہیں ہوگی۔ بول و براز کی جب شدید حاجت ہو تو اس وقت یہ دونوں نمازی کو ان سے فراغت کی جانب بزور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔

(۱۹٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اَلتَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَإِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «فِي الصَّلَاةِ».

[194] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جمائی کا آنا شیطانی حرکت ہے۔تم میں سے اگر کسی کو جمائی آجائے تو حتی الوسع اسے روکنے کی کوشش کرے۔'' (اسے مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اپنی روایت میں ''نماز میں (جمائی آنے)۔'' کا اضافہ نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: اَلتَّثَاؤُبُ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ التثاؤب کے معنی ہیں: دل کے عضلات میں جو بخارات اور گیسیں جمع ہو جاتی ہیں ان کو خارج کرنے کے لیے منہ کا کھولنا تا کہ وہ خارج ہو جائیں۔ مِنَ الشَّيْطَانِ جمائی شیطان کی طرف سے ہے کیونکہ جمائی' معدے کے خوب پُر ہونے' بدن کے بوجھل اور بھاری ہونے اور حواس کے مکدر ہونے' جو سوئے فہم' سستی اور نیند کا موجب ہوتا ہے' کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سب چیزیں شیطان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں' اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جمائی شیطانی حرکت ہے۔ فَلْيَكْظِمْ یائے مضارع پر فتحہ اور ''ظا'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی اس کو روکے' باز رکھے' اسے روکنے کے لیے دونوں ہونٹوں کو بند رکھے یا منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

فوائد و مسائل: ① جمائی سستی' کاہلی اور معدہ کو خوب پُر کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ ② صحیح بخاری میں ہے کہ ''ھا'' نہ کہے' یعنی آواز نہ نکالے' اس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ (صحیح البخاري' الأدب' باب ما یستحب من العطاس' وما یکره من التثاؤب' حدیث: ۶۲۲۳)

۱۹٤۔ أخرجه مسلم، الزهد، باب تشمیت العاطس، وکراهة التثاؤب، حدیث: ۲۹۹٤، والترمذي، الصلاة، حدیث: ۳۷۰.

٦ - بَابُ الْمَسَاجِد

باب: 6- مساجد کا بیان

(١٩٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّورِ، وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِرْسَالَهُ.

[195] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور یہ کہ انھیں صاف ستھرا رکھا جائے اور ان میں خوشبو لگائی جائے۔ (اسے احمد ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ الْمَسَاجِد] مساجد، مسجد کی جمع ہے۔ مسجد کی ''جیم'' کے نیچے کسرہ ہے جس کے معنی ہیں: وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہو اور ''جیم'' پر فتحہ بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی مطلق سجدہ کرنے کی جگہ کے ہوں گے یعنی سجدہ کرنے کی کوئی بھی جگہ۔ [فِي الدُّور] دور، دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر کے ہیں اور اس سے مراد محلہ یا قبیلہ ہے' اس لیے کہ محلے اور قبیلے میں بہت سے گھر ہوتے ہیں' یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلے معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہیں۔ [وَ أَنْ تُنَظَّفَ] تنظیف سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے' گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے۔ [وَ تُطَيَّبَ] تطییب سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے یعنی اس میں خوشبو وغیرہ لگائی جائے۔

فوائد و مسائل: ① مسجد اور نماز پڑھنے کی جگہوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہیے اور ان میں خوشبو لگانی چاہیے۔ ② اس حدیث میں دور سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہییں۔ انھیں خوشبو سے معطر رکھنا چاہیے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہیے جہاں سنن و نوافل ادا کیے جا سکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(١٩٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ، اِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «**وَالنَّصَارٰى**».

[196] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت و برباد کرے' انھوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔'' (بخاری و مسلم) مسلم نے ''نصاریٰ'' کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا: «**كَانُوا إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ**

نیز بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے: ''جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا تو یہ اس کی قبر کو سجدہ

١٩٥- [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور، حديث: ٤٥٥، والترمذي، الجمعة، حديث: ٥٩٤، ٥٩٥، وأحمد: ٥/ ١٧، ٦/ ٢٧١، ٢٧٩.

١٩٦- أخرجه البخاري، الصلاة، باب (٥٥)، حديث: ٤٣٧، ومسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور ...، حديث: ٥٣٠، وحديث عائشة أخرجه البخاري، الصلاة، حديث: ٤٢٧، ومسلم، المساجد، حديث: ٥٢٨.

بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا». وَفِيهِ: «أُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ». ‎ گاہ بنا لیتے۔'' اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''یہ بدترین مخلوق ہیں۔''

لغوی تشریح: [قَاتَلَ] لَعَنَ اور أَهْلَكَ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں: اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انھیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنا لینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ [زَادَ مُسْلِمٌ «وَالنَّصَارٰى»] امام مسلم نے یہود کے بعد لفظ ''نصاریٰ'' کا اضافہ نقل کیا ہے۔ (اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں)۔ [شِرَارُ] شَرٌّ کی جمع ہے۔ یہ اسم تفضیل أَشَرُّ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور [الْخَلْقِ] ''مخلوق'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں سے یہ بدترین مخلوق ہیں۔

فوائد و مسائل: ① قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتاب ہیں جنھیں آسمانی کتب دی گئیں مگر ان بدبختوں نے اپنے انبیائے کرام ﷺ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا اور ان سے اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ ② اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ ③ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہیے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور کس جرم کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرے میں شامل ہو رہے ہیں؟ ④ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب! یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکے میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے؟ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آ رہی ہے' ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے' ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیحہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ⑤ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف اللہ کے لیے انجام دیے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیے جائیں' مثلاً: سجدہ اور رکوع کیا جائے یا ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں اور میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر دوسری مساجد سے انھیں متبرک سمجھا جائے' یہ شرعاً درست نہیں ہے۔

(١٩٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْلًا، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، فَرَبَطُوهُ بِسَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ». اَلْحَدِيثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[197] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک گھڑ سوار دستہ روانہ کیا۔ یہ لوگ ایک شخص کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں لائے اور اسے مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ یہ لمبی حدیث ہے۔ (بخاری و مسلم)

١٩٧ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب الاغتسال إذا أسلم، وربط الأسير ...، حديث: ٤٦٢، ومسلم، الجهاد والسير، باب ربط الأسير وحبسه وجواز المن عليه، حديث: ١٧٦٤.

لغوی تشریح: [خیلا] گھڑ سواروں کا دستہ۔ [فربطوہ] انھوں نے اسے باندھ دیا۔ [بِسَارِیَۃٍ] اس کی جمع سَوَارِي ہے، معنی ستون کے ہیں۔ یہ قیدی ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے، بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا اور اسے وہاں قید کر کے رکھنا جائز ہے۔ ② حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، تلاوت قرآن سنیں، صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں، امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بستہ کھڑے دیکھیں اور ان سے متأثر ہوں۔ ③ قید ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرے کی غرض سے آ رہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسجد نبوی میں اسے نبی ﷺ نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا، آخر کار وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(۱۹۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانَ يُنْشِدُ فِي الْمَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أُنْشِدُ فِيهِ، وَفِيهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[198] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزر ہوا، وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا۔ (اس پر) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا: (گھورتے کیوں ہو؟) میں مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب کہ مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی، یعنی رسول اللہ ﷺ۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [يُنْشِدُ] إِنْشَاد سے ماخوذ ہے۔ ''یا'' پر ضمہ اور ''شین'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اشعار پڑھنا۔ [فَلَحَظَ إِلَيْهِ] ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا، یعنی گھور کر۔ [فقال] سے مراد حضرت حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ [وَفِيهِ] اس میں ''واو'' حالیہ ہے، یعنی اس حالت میں کہ وہ مسجد میں تھے۔ [مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ] اس سے نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید و رسالت کے خلاف ہوں، جن سے شرک و بدعت کی بو آتی ہو یا مذموم اور برے ہوں یا نمازیوں کے لیے خلل اور حرج کا باعث ہوں کہ نماز سے ان کی توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ آپ سن کر فرماتے تھے: ''روح القدس تیری مدد فرمائے۔'' (صحیح البخاري، الصلاۃ، باب الشعر في المسجد، حدیث:۴۵۳)

وضاحت: [حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ] انصار کے قبیلۂ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول اللہ ﷺ کے لقب سے مشہور تھے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سب سے بڑے شاعر

۱۹۸۔ أخرجه البخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم، حديث: ۳۲۱۲، ومسلم، فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابت، حديث: ۲۴۸۵.

تھے۔ ۴۰ ہجری سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ ساٹھ سال دور جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ سال حالت اسلام میں۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ سمع رجلا ينشد ضالة فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عليك، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[199] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی آدمی کو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرتے سنے تو اسے یہ کہے کہ اللہ کرے وہ چیز تمھیں واپس نہ ملے۔ مسجدیں اس مقصد کے لیے تو نہیں بنائی گئیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: | يَنْشُدُ | ''یا'' پر فتحہ اور ''شین'' پر ضمہ۔ باب نَصَرَ يَنْصُرُ کے وزن پر ہے۔ تلاش وطلب کرنا' یا تلاش کرنے کے لیے اونچی آواز سے اعلان کرنا۔ | ضَالَّة | گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں' پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کرلیا جاتا ہے۔ | لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ | بظاہر تو اس میں لا نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کے لیے کہ اللہ کرے وہ چیز جسے وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ | لَمْ تُبْنَ | بناء سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے' یعنی مساجد کی تعمیر اس غرض کے لیے نہیں کی گئی۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں جو زجر وتوبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ ② آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے' البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ ③ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر تو گم نہیں ہوتے' پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

[200] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے دیکھو تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے کاروبار اور تجارت میں نفع نہ دے۔'' (اس حدیث کو نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: | يَبْتَاعُ | يَشْتَرِي کے معنی میں ہے' یعنی خریدنا۔ | لَا أَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ | یعنی اللہ تعالیٰ تیری اس

۱۹۹۔ أخرجه مسلم، المساجد، باب النهي عن نشد الضالة في المسجد ...، حديث: ٥٦٨.

۲۰۰۔ [إسناده صحيح] أخرجه الترمذي، البيوع، باب النهي عن البيع في المسجد، حديث: ١٣٢١، والنسائي في الكبرى: ٦/ ٥٢، حديث: ١٠٠٠٤، وعمل اليوم والليلة، حديث: ١٦٠، وأصله في صحيح مسلم، المساجد، حديث: ٥٦٨.

تجارت کو نفع بخش نہ بنائے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے مساجد میں خرید و فروخت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ ② اس سے مقصود یہ ہے کہ مسجدیں تجارتی منڈیاں نہ بنالی جائیں۔ مسجدیں تو صرف عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں' اگر ان میں بھی تجارت شروع ہو جائے تو یہ اپنا مقصد تعمیر کھو بیٹھیں گی۔ ③ مساجد کو صرف یاد الٰہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

(٢٠١) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تُقَامُ الْحُدُودُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَلَا يُسْتَقَادُ فِيهَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

[201] حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مساجد میں نہ حدیں قائم کی جائیں اور نہ ان میں قصاص (خون کا بدلہ) ہی لیا جائے۔'' (اس حدیث کو ابوداود اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا تُقَامُ] إقامة سے ماخوذ ہے' یعنی (حدیں) نافذ نہ کی جائیں۔ [اَلْحُدُودُ] وہ سزائیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے کہ فلاں جرم کی سزا فلاں ہے۔ [وَلَا يُسْتَقَادُ] صیغۂ مجہول۔ قصاص نہ لیا جائے۔ [بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ] ضعیف سند سے' یعنی یہ حدیث ضعیف ہے لیکن خود مصنف' یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے التلخيص میں اس کی سند کے بارے میں [لَا بَأْسَ بِإِسْنَادِهِ] ''اس کی سند میں کوئی حرج نہیں'' کہا ہے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے دیگر شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے' بنابریں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدوں میں حدیں قائم نہ کی جائیں اور قصاص بھی نہ لیا جائے کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ سزا پانے والے کا خون یا گندگی پیٹ سے خارج ہو جائے یا مسجد میں شور وغوغا ہو۔ ② مسجد میں فیصلے کے لیے عدالت قائم کی جاسکتی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ] حزام کی ''حا'' کے نیچے کسرہ ہے۔ ان کی کنیت ابوخالد ہے۔ قریش کے قبیلۂ بنو اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں۔ اشراف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ واقعۂ فیل سے ۱۳ سال پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا۔ ۵۴ ہجری میں یا اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(٢٠٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُصِيبَ سَعْدٌ يَوْمَ الْخَنْدَقِ، فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْمَةً فِي الْمَسْجِدِ، لِيَعُودَهُ مِنْ

[202] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے روز حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے مسجد میں خیمہ لگوا دیا تاکہ قریب سے ان کی

٢٠١ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الحدود، باب في إقامة الحد في المسجد، حديث: ٤٤٩٠، وأحمد: ٣/ ٤٣٤، وللحديث شواهد ضعيفة عند ابن ماجه، الحدود، حديث: ٢٥٩٩ وغيره.

٢٠٢ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب الخيمة في المسجد للمرضى وغيرهم، حديث: ٤٦٣، ومسلم، الجهاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد، حديث: ١٧٦٩.

قَرِيبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

تیمارداری (بآسانی) کر سکیں۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [أُصِيبَ سَعْدٌ] سعد سے مراد سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو اوس کے سردار تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر ان کے بازو کی رگ (اکحل ہفت اندام رگ) میں دشمن کا تیر لگا اور خون جاری ہو گیا۔ خون رکنے میں نہیں آتا تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی کہ وہ انھیں اس وقت تک موت نہ دے جب تک وہ بنوقریظہ کا انجام نہ دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ خون بہنا بند ہو گیا۔ پھر بنوقریظہ نے ان کو حَکَم بنایا کہ جو وہ فیصلہ کریں ہمیں منظور ہے۔ جب بنوقریظہ ان کے فیصلے کے مطابق گڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا گیا تو خون دوبارہ جاری ہو گیا' یہاں تک کہ وہ وفات پا گئے۔ اور ان کی وفات غزوۂ خندق میں تیر لگنے کے ایک ماہ بعد ہوئی۔ اور غزوۂ احزاب شوال ۵ ہجری میں پیش آیا۔ اس معرکہ میں قریش' غطفان وغیرہ قبائل یہودی سازش سے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے اور سب نے مل کر مدینے کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کو جب ان لوگوں کی سازش کا علم ہوا تو انھوں نے مدینے کی شمالی جانب خندق کھود لی۔ محاصرے نے پچیس (۲۵) روز تک طول کھینچا۔ پھر وہ ناکام ونامراد ہو کر گئے۔ [ضَرَبَ عَلَيْهِ] خیمہ اس کے لیے نصب کیا۔ [لِيَعُودَهُ] ''تاکہ ان کی تیمارداری کر سکیں۔'' عیادۃ سے ماخوذ ہے۔ عیادت مریض کے حال احوال پوچھنے کے لیے جانے اور ملاقات کرنے کو کہتے ہیں۔

فوائد ومسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مسجد میں مریض کے قیام کے لیے خیمہ وغیرہ نصب کرنا جائز ہے۔ ② مسجد میں سونا' بیمار یا زخمی کی تیمارداری کرنا اور اس کے علاج کا بندوبست کرنا جائز ہے۔

وضاحت: [حضرت سعد رضی اللہ عنہ] یہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلۂ اوس کے سردار تھے۔ کبار صحابہ میں سے ہیں' انھوں نے بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ میں شرکت کی اور اسلام قبول کیا۔ اور ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بنوعبدالاشہل نے اسلام قبول کیا۔ اپنی قوم میں سردار اور شریف انسان تھے۔ قوم ان کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتی۔ ان کی رگ اکحل میں غزوۂ خندق کے موقع پر ایک تیر لگا جس کی وجہ سے ذی قعدہ ۵ ہجری کو واقعۂ بنوقریظہ کے بعد فوت ہوئے۔

(٢٠٣) وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتُرُنِي، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الْحَبَشَةِ يَلْعَبُونَ فِي الْمَسْجِدِ. اَلْحَدِيثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[203] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ میرے لیے پردہ بنے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی جو مسجد میں کھیل رہے تھے۔ یہ طویل حدیث ہے۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [يَسْتُرُنِي] آپ نے مجھے چھپایا ہوا تھا' یعنی نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھ رہی تھیں۔ [الْحَبَشَةِ] حبشي کی جمع ہے' یعنی ملک حبش کے باشندے۔ [يَلْعَبُونَ] گرامر میں یہ جملہ ''حبشۃ'' سے حال واقع ہو رہا ہے۔ روایات سے یہ واضح

٢٠٣ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب أصحاب الحراب في المسجد، حديث: ٤٥٤، ومسلم، صلاة العيدين، باب الرخصة في اللعب، حديث: ٨٩٢.

ہوتا ہے کہ ان کا کھیل نیزے اور ڈھال کے ساتھ تھا اور عید کا دن تھا۔ اس قسم کا کھیل جنگی مشق کی قسم میں سے ہے۔ اس قسم کی جنگی مشق کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ اس سے مطلقاً ہر قسم کے کھیل کا استدلال درست نہیں ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خوشی کے دن جنگی کرتب کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ ② عورت اجنبی مرد کو مجمل طور پر دیکھ سکتی ہے مگر تفصیل سے نہیں، یعنی اجنبی مرد کے اعضائے جسم کا بغور ملاحظہ نہیں کر سکتی۔ ایسے موقع پر مقصود کھیل دیکھنا ہوتا ہے نہ کہ کھلاڑی، نیز ضروری ہے کہ مرد کا جسم مستور ہو۔ ③ دور حاضر میں عموماً کھیلنے والوں کے جسم نیم برہنہ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری شرعی رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں، لہٰذا ان سے اجتناب ضروری ہے۔

(٢٠٤) وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ وَلِيدَةً سَوْدَاءَ كَانَ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَتْ تَأْتِينِي، فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. اَلْحَدِيثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[204] حضرت عائشہ ؓ ہی سے مروی ہے کہ ایک سیاہ فام لڑکی کا خیمہ مسجد میں تھا، وہ میرے پاس باتیں کرنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ یہ لمبی حدیث ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [وَلِيدَةً] لونڈی۔ [خِبَاءٌ] "خا" کے نیچے کسرہ اور "با" مخفف ہے۔ خیمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [فَتَحَدَّثُ] اصل میں تَتَحَدَّثُ تھا۔ تتکلّمُ کے معنی میں ہے، یعنی بات چیت کرنے، گفتگو کرنے کے لیے آتی تھی۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مسجد میں رات بسر کر سکتی ہے بشرطیکہ کسی فتنہ و فساد کا خطرہ نہ ہو اور اس کے لیے مسجد میں خیمہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث صحیح بخاری میں ہے۔

(٢٠٥) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اَلْبُصَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ، وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[205] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ تھوک کو دفن کرنا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کے لیے تعمیر کی جاتی ہے، اسے ظاہری اور باطنی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ ② مسجد میں تھوکنا آداب مسجد، شائستگی اور نظافت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ذوق سلیم پر بھی گراں گزرتا ہے، اس لیے تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے تاکہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ ③ یہ حکم اس وقت کا ہے جب فرش مٹی کا ہوتا تھا۔ اب پکے فرش پر کوئی تھوکے گا تو اسے پانی یا کپڑے وغیرہ سے صاف کرنا ضروری ہے۔

(٢٠٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

[206] حضرت انس ؓ ہی نے بیان کیا کہ رسول

٢٠٤۔ أخرجه البخاري، الصلاة، باب نوم المرأة في المسجد، حديث: ٤٣٩، ومسلم: لم أجده بسند البخاري.

٢٠٥۔ أخرجه البخاري، الصلاة، باب كفارة البزاق في المسجد، حديث: ٤١٥، ومسلم، المساجد، باب النهي عن البصاق في المسجد، حديث: ٥٥٢.

٢٠٦۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في بناء المساجد، حديث: ٤٤٩، والنسائي، المساجد، ◂◂

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت (اس وقت تک) قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں (کی تعمیر) میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔'' (اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَتَبَاهَى] ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ [فِي الْمَسَاجِدِ] یعنی مسجدوں کی عمارتوں کے بلند و بالا اور عالی شان ہونے میں، ان کی زیبائش و تزیین اور خوبصورتی میں، یا اس سے مراد یہ ہے کہ مسجدوں میں بیٹھ کر اپنے معاملات پر فخر کریں گے، ان کا احترام نہیں کریں گے بلکہ اس مقام پر جہاں نماز، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی وغیرہ ہونا چاہیے تھا وہاں فخر اور تکبر جیسے قبیح کام کا ارتکاب کریں گے۔

فائدہ: قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدیں تعمیر کریں گے اور انھیں خوب نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کریں گے، پھر باہمی مقابلہ کریں گے کہ ہماری مسجد فلاں کی مسجد سے خوبصورت اور بہترین بنی ہوئی ہے، مگر آباد نہ ہوں گی، نمازیوں سے خالی ہوں گی اور تعمیر کرنے والوں کی بے حسی اور عدم توجہ کا نوحہ کر رہی ہوں گی۔

(۲۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيدِ الْمَسَاجِدِ». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[207] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے مساجد کی آرائش و زیبائش اور چونا گچ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَا أُمِرْتُ] اس میں ما نافیہ اور أمرت صیغۂ مجہول ہے۔ [بِتَشْيِيدِ الْمَسَاجِدِ] چونا گچ کرنا، آرائش کرنا اور نقش نگاری کرنا۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے، تاہم اس میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ صحیح ہے کیونکہ یہ مسئلہ دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ غالباً انھی شواہد کی بنا پر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا منع ہے۔ اور یہ کام غیر مستحسن اور غیر ممدوح ہے۔ ③ مسجدوں کو ذکر الٰہی اور خالص عبادت سے آباد کرنے کا حکم ہے۔ تزئین و آرائش سے توجہ الی اللہ میں فرق آ جاتا ہے۔ ④ مسجد کی عمارت سے مقصود تو عبادت گاہ کی علامت ہے۔ گرمی، سردی اور بارش وغیرہ سے تحفظ اور بچاؤ ہے۔ مساجد کی آرائش اور نقش و نگاری بادشاہوں کا طریقہ ہے۔ ولید بن عبدالملک پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی

◀ حدیث: ۶۹۰، وابن ماجه، المساجد، حديث: ۷۳۹، وأحمد: ۳/ ۱۳٤، ۱٤٥، ۱٥٢، ۲۳۰، ۲۸۳، وابن حبان: ۲/ ۲۸۲، حديث: ۱۳۲۳.

۲۰۷ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في بناء المساجد، حديث: ٤٤٨، وابن حبان (الإحسان): ۳/ ۷۰، سفيان الثوري مدلس وعنعن.

میں نقش و نگار کرائے ورنہ عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں کہیں دور دور تک بھی اس کے نشانات نہیں ملتے۔ علمائے حق کو مجبوراً خاموشی اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔

(۲۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي، حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[208] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ پر میری امت کے ثواب (اور نیکیاں) پیش کیے گئے حتی کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے (یہ بھی نیکیوں میں شامل تھا)۔'' (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے غریب کہا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عُرِضَتْ] صیغۂ غائب مجہول ہے۔ ظاہر کیے گئے، سامنے لائے گئے۔ [أُجُورُ أُمَّتِي] یہ عُرِضَتْ کا نائب فاعل ہے۔ میری امت کے نامۂ اعمال۔ [عَلَيَّ] ''یا'' پر تشدید ہے۔ حرف جر عَلٰی کی ''یا'' کو یائے متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ [اَلْقَذَاةُ] ''قاف'' پر فتحہ اور ''ذال'' مخفف ہے۔ تنکا وغیرہ جو مشروب میں گر جاتا ہے یا آنکھ میں پڑ جاتا ہے یا گھروں کے اندر عموماً پڑا ہوتا ہے۔ [وَاسْتَغْرَبَهُ] اسے غریب کہا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی کام بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ ② مساجد کی صفائی اور پاکیزگی کی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ تنکا بھی مسجد میں رہنے نہ دیا جائے۔ جو شخص اتنا سا معمولی کام کرتا ہے (تنکا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے) تو اس پر بھی اسے ضرور اجر ملے گا۔ ③ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو غریب اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کی سند میں مطلب بن عبداللہ راوی ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کرتا ہے، حالانکہ مطلب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بلکہ کسی بھی صحابی سے سماع نہیں کیا۔ بہر حال دوسری صحیح روایات سے مسجد کی صفائی ستھرائی کی فضیلت ثابت ہے جیسے کہ ایک صحابیہ نے مسجد کی صفائی کو اپنا معمول بنایا ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی قبر پر جا کر اس کا جنازہ پڑھا تھا۔ (صحيح البخاري، الصلاة، حديث: ۴۵۸)

(۲۰۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ».

[209] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جب (بھی) کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو دو رکعتیں پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔'' (بخاری و مسلم)

۲۰۸ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب كنس المسجد، حديث: ٤٦١، والترمذي، فضائل القرآن، حديث: ٢٩١٦، وابن خزيمة: ٢/ ٢٧١، حديث: ١٢٩٧ * ابن جريج لم يسمع من المطلب شيئًا والمطلب لا يعرف له سماع من أنس رضي الله عنه.

۲۰۹ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب إذا دخل المسجد فليركع ركعتين، حديث: ٤٤٤، ومسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تحية المسجد بركعتين، حديث: ٧١٤.

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

فوائد و مسائل: ① حدیث میں جن نوافل کے پڑھنے کا حکم ہے انھیں تَحِيَّةُ الْمَسْجِد کہتے ہیں۔ ② بعض علماء کے نزدیک یہ واجب ہیں جبکہ جمہور علماء انھیں مستحب کہتے ہیں۔ ③ حدیث کے ظاہر الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء نے ان نوافل کو مکروہ اوقات میں بھی پڑھنے کی اجازت دی ہے لیکن بعض علماء اوقات ممنوعہ میں ممنوع کہتے ہیں۔ ④ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خطیب منبر پر خطبۂ جمعہ دے رہا ہو تب بھی مسجد میں داخل ہونے والا دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔

٧ - بَابُ صِفَةِ الصَّلَاةِ

باب:7-نماز کی صفت کا بیان
(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)

(٢١٠) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَأَسْبِغِ الْوُضُوءَ، ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ مَاتَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا، ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِي صَلَاتِكَ كُلِّهَا**». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[210] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہونے کا ارادہ کرو تو پہلے اچھی طرح وضو کر لو پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر (اللہ اکبر) کہو پھر قرآن کا جو حصہ تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ پھر رکوع کرو اور پوری طرح اطمینان سے رکوع کرو پھر (رکوع سے) سر اٹھاؤ اور پورے اطمینان سے کھڑے ہو۔ پھر سجدہ کرو اور پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدے سے اپنا سر اٹھا کر پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ پھر دوسرا سجدہ کرو اور پورے اطمینان سے سجدہ کرو۔ پھر اپنی ساری (باقی) نماز میں اسی طرح (اطمینان سے ارکان نماز ادا) کرو۔'' (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

وَلِابْنِ مَاجَه بِإِسْنَادِ مُسْلِمٍ: «**حَتّٰى تَطْمَئِنَّ قَائِمًا**» وَمِثْلُهُ فِي حَدِيثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعِ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ أَحْمَدَ وَابْنِ حِبَّانَ: «**حَتّٰى تَطْمَئِنَّ**

اور ابن ماجہ نے مسلم کی سند سے (رکوع سے کھڑے ہونے کے وقت) یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''پورے اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔'' احمد اور ابن حبان میں رفاعہ بن رافع

٢١٠ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب أمر النبي ﷺ الذي لا يتم ركوعه بالإعادة، حديث:٧٩٣، ومسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث:٣٩٧، وأبوداود، الصلاة، حديث:١٥٦، والترمذي، الصلاة، حديث:٣٠٣، والنسائي، الافتتاح، حديث:٨٨٥، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث:١٠٦٠، وأخرجه أحمد:٢/ ٤٣٧، وحديث رفاعة أخرجه أحمد:٤/ ٣٤٠، وابن حبان (الإحسان):١٧٨٤، والنسائي، التطبيق، حديث:١١٣٧، وأبوداود، الصلاة، حديث:٨٥٨.

قَائِمًا». وَلِأَحْمَدَ: «فَأَقِمْ صُلْبَكَ حَتَّى تَرْجِعَ الْعِظَامُ».

بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: ''اپنی کمر (پشت) کو سیدھا کرو یہاں تک کہ ہڈیاں (اپنے مقام پر) واپس آ جائیں۔''

وَلِلنَّسَائِيِّ وَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ رِفَاعَةَ ابْنِ رَافِعٍ: «إِنَّهَا لَنْ تَتِمَّ صَلَاةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسْبِغَ الْوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ يُكَبِّرَ اللّٰهَ تَعَالٰى، وَيَحْمَدَهُ، وَيُثْنِي عَلَيْهِ» وَفِيهَا: «فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ، وَإِلَّا فَاحْمَدِ اللّٰهَ، وَكَبِّرْهُ، وَهَلِّلْهُ». وَلِأَبِي دَاوُدَ «ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، وَبِمَا شَاءَ اللّٰهُ» وَلِابْنِ حِبَّانَ: «ثُمَّ بِمَا شِئْتَ».

نسائی اور ابوداود میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہو سکتی حتی کہ وہ (اسی طرح) وضو کامل کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے، پھر تکبیر کہے اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے۔'' اور اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے: ''اگر تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو تو اسے پڑھ بصورت دیگر الحمدللّٰہ، اللہ أکبر اور لا إلہ إلا اللہ پڑھا کر۔'' ابوداود میں ہے: ''پھر سورۂ فاتحہ پڑھ اور مزید جو اللہ چاہے۔'' اور ابن حبان میں ہے: ''پھر جو تم چاہو (پڑھو۔'')

لغوی تشریح: [فَأَسْبِغِ الْوُضُوءَ] أَسْبِغْ امر کا صیغہ ہے۔ مبالغہ کرو، پوری طرح کرو۔ [تَعْتَدِلَ] اعتدال پر آ جائیں، برابر اپنی جگہ پر آ جائیں۔ [قَائِمًا] سیدھے کھڑے ہونا جس میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد کچھ بھی جھکاؤ نہ ہو۔ [فَأَقِمْ صُلْبَكَ] رکوع سے جب سر اٹھائے تو اپنی پشت اس طرح سیدھی کر کہ اس میں کسی قسم کا ٹیڑھ اور جھکاؤ نہ ہو۔ [الْعِظَامُ] ہڈیاں۔ پشت کی ہڈیاں اور اس کے جوڑ مراد ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی ہو سکتی ہے۔ [يُثْنِي عَلَيْهِ] باب افعال سے ہے اور ''یا'' پر ضمہ ہے۔ اس کی حمد و بزرگی بیان کرے اور تعریف بھی مبالغے کی حد تک کرے۔ [وَهَلِّلْهُ] تہلیل سے امر کا صیغہ ہے، مطلب ہے کہ لا إلہ إلا اللہ کہو۔ یہ حدیث حدیث مُسِيءُ الصلاة کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں نبی ﷺ نے نمازی کو ارکان نماز پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے لہٰذا ہر رکن نماز کے اندر اور دو ارکان کے درمیانی وقفے میں اطمینان و اعتدال واجب ہے۔ ② حدیث کے الفاظ: [ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ] سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراءت قرآن واجب ہے۔ ایک دوسری روایت میں ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مَا تَيَسَّرَ اور بِأُمِّ الْقُرْآنِ دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں اور وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ ③ اس حدیث میں نمازی کی ترتیب اور اعتدال ارکان کی تعلیم دی گئی ہے۔ ④ امام، مقتدی اور منفرد سب کو سوچنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اعتدال کو ملحوظ رکھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو نبی اکرم ﷺ نے ایسے شخص کو بدترین چور اور ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت رفاعہ بن رافع بن مالک رضی اللہ عنہ] ابومعاذ ان کی کنیت ہے۔ زرقی انصاری مدنی مشہور ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ان کے والد انصار میں سب سے پہلے اسلام

قبول کرنے والے ہیں۔ رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ بدر واُحد اور باقی سب غزوات میں بھی شریک رہے ہیں۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں میں شامل تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں ۴۱ ہجری میں وفات پائی۔

(۲۱۱) وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ أَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ اسْتَوٰى، حَتّٰى يَعُودَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى، وَنَصَبَ الْيُمْنٰى، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الْأَخِيرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى، وَنَصَبَ الْأُخْرٰى، وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهِ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

[211] حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر (اولیٰ) کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر تک اٹھاتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے' پھر اپنی پشت مبارک جھکا لیتے' پھر جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ہر جوڑ اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔ پھر (اس کے بعد) جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ (زمین پر) اس طرح رکھتے کہ (بازو) زمین پر بچھے ہوتے نہ (پہلوؤں کی طرف) سمٹے ہوتے۔ اور آپ (حالت سجدہ میں) اپنے دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ کرتے۔ اور جب آپ دو رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں پاؤں کے اوپر بیٹھتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے۔ اور جب آخری رکعت میں بیٹھتے تو اپنا بایاں پاؤں (دائیں ران کے نیچے سے) آگے بڑھا دیتے اور دایاں کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ﴾ اَلحذو کی ''حا'' پر فتحہ اور ''ذال'' ساکن ہے۔ مقابل' برابر۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے مقابل (برابر) اٹھاتے۔ ﴿اَلْمَنْكِب﴾ ''میم'' پر فتحہ' ''نون'' ساکن اور ''کاف'' کے نیچے کسرہ ہے۔ کندھے اور بازو کی ہڈی کے ملنے کی جگہ۔ ﴿أَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ﴾ اَلرُّكْبَة پنڈلی اور ران کی ہڈی کے ملنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ إِمْكَان بمعنی تمکین ہے' مضبوطی سے پکڑنا' یعنی دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ﴿هَصَرَ ظَهْرَهُ﴾ اپنی کمر جھکائی' پشت نیچے کی۔ ﴿فَقَار﴾ ''فا'' پر فتحہ اور ''قاف'' مخفف ہے۔ پشت کی وہ ہڈی جو اوپر سے نیچے والے جوڑوں کو باہم ملاتی ہے۔ ﴿غَيْرَ مُفْتَرِشٍ﴾ نہ بچھانے والے اپنے بازوؤں کو۔ ﴿وَلَا قَابِضِهِمَا﴾ اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں کی طرف سکیڑنے' سمٹنے والے۔ ﴿قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى﴾ قَدَّم، تقدیم سے ماخوذ ہے جس کے معنی: آگے

۲۱۱۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد، حديث: ۸۲۸.

بڑھانا، دراز کرنا ہیں یعنی دائیں ران کے نیچے سے بڑھا کر دوسری جانب نکالنا۔ [نَصَبَ] کھڑا رکھنا، قائم کرنا، یعنی آپ نے دایاں پاؤں کھڑا رکھا۔ [وَقَعَدَ عَلَى مَقْعَدَتِهِ] اور بائیں چوتڑ پر بیٹھ گئے۔ اس حالت کو تورُّک کہتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ آپ ارکان نماز کس طرح ادا فرماتے تھے، لہٰذا اہل ایمان کو اسی طرح نماز ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ ② آپ کا ارشاد گرامی ہے: [صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي] ''نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' (صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة....، حديث:٦٣١) ہر مسلمان کو اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ نماز اسی طرح آرام، سکون اور اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرے جس طرح آپ نے عملاً تعلیم دی ہے۔ جلدی جلدی ارکان نماز ادا کر کے نماز کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ تنگ وقت میں جلدی جلدی نماز پڑھنے والے کو کوے کی ٹھونگوں سے تشبیہ دے کر منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے۔ (سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث:٨٦٢) ③ نمازیوں کو بہت فکر کرنی چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نمازیں بھی پڑھیں اور حاصل بھی کچھ نہ ہو۔ ایسی نمازوں کا کیا فائدہ ہے؟

راویٔ حدیث: [حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ] ابوحمید (تصغیر کے ساتھ) ان کا نام عمرو تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام منذر بن سعد بن منذر تھا۔ بعض نے مالک انصاری خزرجی مدنی بھی نام بتایا ہے۔ خزرج کے باپ ساعدہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ساعدی کہلائے۔ اُحد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت کے آخر میں، یا یزید کے شروع دور ٦١ ہجری میں فوت ہوئے۔

(٢١٢) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، أَنَّهُ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: «**وَجَّهْتُ وَجْهِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ** - إِلَى قَوْلِهِ - **مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ**»، إِلَى آخِرِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: أَنَّ ذٰلِكَ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ.

[212] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو (پہلے) یہ دعا پڑھتے: [وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ] سے لے کر [مِنَ الْمُسْلِمِينَ] تک۔ (پھر یہ پڑھتے:) [اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَ أَنَا عَبْدُكَ] سے لے کر آخر تک۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ یہ رات کی نماز (تہجد) میں پڑھا کرتے تھے۔

لغوی تشریح: [إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ] ''جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے'' سے مراد ہے تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے افتتاح یا دعائے استفتاح کے طور پر پڑھتے۔ [وَجَّهْتُ] توجیہ سے ماخوذ ہے۔ میں نے چہرہ پھیر لیا۔ [فَطَرَ] خلق کے

٢١٢ـ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه، حديث:٧٧١.

معنی میں ہے' یعنی پیدا کیا۔ [مِنَ الْمُسْلِمِينَ] تک۔ اس بارے میں دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں: [أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ] ہے۔ ''میں پہلا مسلمان (مطیع فرمان بندہ) ہوں۔'' یہ آیت قرآنی میں مذکور لفظ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہے۔ اور دوسرا: [أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ] معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہے۔ مصنف نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ مکمل آیات اس طرح ہیں: پہلی آیت ہے: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الأنعام ٦:٧٩) اور دوسری آیت ہے: ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَمَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَ أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾ (الأنعام ٦:١٦٢، ١٦٣) ''میں نے اپنا رخ اس ذات اقدس کی جانب کر لیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے' یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز' میری ہر عبادت' میرا جینا اور میرا مرنا (سب کچھ) اسی اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک و پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں (ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں۔) اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مطیع فرمان بندوں میں سے ہوں۔'' ان آیات کو پڑھنے کے بعد آپ اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ الْمَلِكُ ...... الخ دعا پڑھتے۔ [إِلَى آخِرِهِ] یعنی اس معروف دعا کو آخر تک پڑھتے:

[اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْلِي ذُنُوبِي جَمِيعًا، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا، لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ، وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ] ''اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے' تیرے سوا کوئی آقا و مالک نہیں۔ تو ہی میرا آقا و پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ و غلام ہوں۔ میں نے (یقیناً) اپنی جان پر ظلم کیا اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا' لہٰذا میرے سارے گناہ بخش دے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تیرے سوا کوئی اور گناہ بخش نہیں سکتا۔ میری عمدہ اور اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی فرما' تیرے سوا بہترین اخلاق کی راہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔ مجھ سے میری بری خصلتیں ہٹا دے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تیرے سوا برے اخلاق کو کوئی بھی ہٹا نہیں سکتا۔ بار بار تیرے حضور حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں۔ بھلائی ساری کی ساری تیرے ہاتھوں میں ہے اور برائی تیری جانب منسوب نہیں کی جا سکتی۔ میں تیرے ساتھ (ہی قائم) ہوں اور تیری جانب (ہی لوٹنے والا) ہوں۔ تو ہی بہت برکت والا اور بہت بلندی و برتری والا ہے۔ بخشش و خطا بخشی کا تجھی سے طلبگار ہوں اور توبہ کی صورت میں تیری جناب میں رجوع کرتا ہوں۔''

مشہور محقق و محدث مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے ترمذی کی شرح (تحفة الأحوذي: ٢٠٢) میں اس حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم شریف کے باب صلاۃ اللیل میں دو طریق سے منقول ہے۔ ان دونوں طرق میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپ رات کی نماز میں پڑھتے تھے' نیز اس حدیث کو ترمذی نے ابواب الدعوات (حدیث: ٣٤٢١، ٣٤٢٢، ٣٤٢٣) میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ تینوں میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپ نماز شب میں پڑھتے تھے بلکہ اس کے برعکس جامع الترمذی ہی کی ایک روایت (٣٤٢٣) میں ہے کہ

جب آپ فرض نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوتے تو اس موقع پر یہ دعا پڑھتے۔ اور امام ابوداود رحمہ اللہ نے اپنی سنن (کی كتاب الصلاة، باب ما يستفتح به الصلاة من الدعاء، حديث: ٧٦٠، ٧٦١) میں بھی دو طریق سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپ رات کی نماز میں مانگتے تھے بلکہ ان میں سے ایک میں تو یہ ہے کہ آپ جب فرض نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوتے تو اس وقت یہ دعا مانگتے۔ اور سنن دارقطنی کی ایک روایت میں ہے: جب آپ فرض نماز کا آغاز فرماتے تو اس وقت [وجّهتُ وجهي ...... الخ] پڑھتے۔ (سنن الدارقطني: ١/ ٢٨٧ - ٢٩٦) امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح اس حدیث کی تخریج کی اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ جب آپ فرض نماز کے لیے کھڑے ہوتے' اس وقت یہ پڑھتے۔ اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے' انھوں نے بھی فرض نماز کی قید لگائی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ یہ قول کہ یہ دعا نفلی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور فرض نماز میں مشروع نہیں' باطل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (نيل الأوطار: ٢/ ٢١٥ - ٢١٧)

(٢١٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِلصَّلَاةِ سَكَتَ هُنَيْهَةً قَبْلَ أَنْ يَقْرَأَ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: أَقُولُ: «اَللّٰهُمَّ! بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللّٰهُمَّ! نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ، كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللّٰهُمَّ! اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[213] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہتے' پھر قراءت شروع کرتے۔ (ایک روز) میں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھ لیا (کہ اے اللہ کے رسول! وقفے کے دوران میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟) آپ نے فرمایا: ''میں [اَللّٰهُمَّ! بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ...... الخ] پڑھتا ہوں۔'' ''اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے مابین اتنا فاصلہ اور دوری فرما دے جتنا مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے اس طرح صاف فرما دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! مجھے میرے گناہوں سے پانی' برف اور اولوں کے ساتھ دھو ڈال۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [هُنَيْهَةً] ''ہا'' پر ضمہ' ''نون'' پر فتحہ' ''یا'' ساکن اور دوسری ''ہا'' پر فتحہ ہے۔ تھوڑا سا وقفہ۔ [نَقِّنِي] ''نون'' پر فتحہ' ''قاف'' پر تشدید اور کسرہ ہے۔ تنقية سے امر کا صیغہ ہے۔ پاک صاف کر دے۔ [يُنَقّٰى] صیغہ مجہول۔

٢١٣ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب ما يقول بعد التكبير، حديث: ٧٤٤، ومسلم، المساجد، باب ما يقال بين تكبيرة الإحرام والقراءة، حديث: ٥٩٨.

[اَلدَّنَس] ''دال'' اور ''نون'' پر فتحہ ہے' میل کچیل۔ [اَلثَّلْج] ''ثا'' پر فتحہ اور ''لام'' ساکن ہے' وہ بخارات جو فضا میں سردی کے درجۂ انجماد تک پہنچنے کی وجہ سے منجمد ہو جاتے ہیں اور دھنی ہوئی روئی کی طرح ہو کر زمین پر گرتے ہیں (جسے برف کہتے ہیں۔) [وَالْبَرَدِ] ''با'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ ہے۔ بادلوں کا پانی جو سرد ہوا میں جم کر اولوں کی صورت میں زمین پر گرتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قراءت سے پہلے قدرے وقفہ ہے اور اس میں یہ دعا پڑھنا مسنون ہے۔ ② اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعائے افتتاح بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھنی چاہیے۔ ③ گناہوں میں سخت تمازت و حرارت ہوتی ہے جسے مومن دنیا ہی میں جبکہ فاسق آخرت میں محسوس کرے گا اور اس کی تمازت و حرارت کو ختم کرنے کے لیے ٹھنڈا پانی اور برف زیادہ کارآمد ہے' اس لیے دعا میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔

(٢١٤) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: «**سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالدَّارَقُطْنِيُّ مَوْصُولًا، وَهُوَ مَوْقُوفٌ.

[214] حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وقفے کے دوران میں) پڑھتے تھے: [سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ......الخ] ''اے اللہ! تو پاک ہے (ہر عیب اور ہر نقص سے۔) سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ بابرکت ہے تیرا نام اور بلند ہے تیری شان۔ اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔'' (اسے مسلم نے منقطع اور دارقطنی نے موصول روایت کیا ہے اور یہ موقوف ہے۔)

وَنَحْوُهُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ مَرْفُوعًا عِنْدَ الْخَمْسَةِ، وَفِيهِ: وَكَانَ يَقُولُ بَعْدَ التَّكْبِيرِ: «**أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ، وَنَفْخِهِ، وَنَفْثِهِ**».

اور پانچوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تعوذ (أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ) پڑھتے تھے۔ ''میں اللہ سمیع و علیم کی پناہ لیتا ہوں شیطان مردود سے' اس کے وسوسوں سے' اس کے پھونکنے سے' یعنی کبر و نخوت سے اور اس کے اشعار اور جادو سے۔''

لغوی تشریح: [وَبِحَمْدِكَ] تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح بیان کرتا ہوں۔ [وَتَعَالٰى جَدُّكَ] تیری عظمت و کبریائی بلند و بالا ہے۔ [مَوْصُولًا] یعنی یہ حدیث متصل سند کے ساتھ مروی ہے' اس میں کسی قسم کا انقطاع نہیں ہے۔ [وَهُوَ

٢١٤۔ [صحيح] أخرجه مسلم، الصلاة، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، حديث: ٣٩٩، والدارقطني: ١/ ٢٩٩، وحديث أبي سعيد أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٧٧٥، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٤٢، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ٨٠٧، والنسائي، الافتتاح، حديث: ٩٠٠، ٩٠١، وأحمد: ١/ ٤٠٣، ٤٠٤ و ٣/ ٥٠ و ٤/ ٨٠، ٥/ ١٥٦.

مَوْقُوفٌ یعنی سنن دارقطنی کی یہ حدیث بھی مسلم کی حدیث کی طرح موقوف ہے مرفوع نہیں۔ نَحْوَهُ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح۔ وَفِيهِ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں۔ الرَّجِيمِ مردود ذلیل دھتکارا ہوا۔ مِنْ هَمْزِهِ اس کے جنون سے یعنی اس سے اللہ کی پناہ کہ وہ مجنون بنا دے۔ اس سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد لینا زیادہ قرین قیاس ہے۔ وَنَفْخِهِ اس کے تکبر سے یعنی اس تکبر ونخوت سے اللہ کی پناہ جو وہ لوگوں کے دماغوں میں بھر دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں برتر اور بڑا سمجھنے لگتے ہیں گویا ان کے دماغوں میں کبر وغرور کی ہوا بھر دیتا ہے۔ وَنَفْثِهِ اس کے شعر سے یعنی اس کے اشعار سے اللہ کی پناہ۔ اس سے وہ مذموم اشعار مراد ہیں جن کو وہ لوگوں کے دماغوں میں ڈالتا ہے اور جادو بھی اس سے مراد لیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں کلمات کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہے۔

فوائد و مسائل: ① تکبیر تحریمہ کے بعد سورۂ فاتحہ سے پہلے نبی ﷺ سے [اَللّٰهُمَّ! بَاعِدْ...... الخ] والی دعا ثابت ہے۔ ② بعض روایات کے مطابق [إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ...... الخ] والی دعا اور [سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ ...... الخ] دونوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ [سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ] والی دعا مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح ثابت ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ دعا موقوفاً مروی ہے جبکہ سیدنا ابوسعید خدری، سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا انس اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً بھی ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دعا مرفوع اور موقوف دونوں طرح صحیح ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اپنی مفصل أصل صفة صلاة النبي ﷺ میں تمام احادیث پر سیر حاصل بحث کی ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے موقوف اثر کے بارے میں لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی تعلیم کے لیے اس دعا کو آواز بلند پڑھا کرتے تھے تاکہ سننے والے لوگ اسے سیکھ لیں اور یاد کر لیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس دعا کو تعلیم کے لیے آواز بلند پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سنت نبوی ہے۔ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ممکن نہیں کہ استفتاح کی اس قدر دعائیں ہونے کے باوجود اپنی طرف سے کوئی دعا پڑھیں۔ اور پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا خاموش رہنا بھی اس کا مؤید ہے۔ واللہ أعلم. تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (أصل صفة صلاة النبي ﷺ: ۱/ ۲۵۷، والقول المقبول، ص: ۳۴۶-۳۵۰) ہمارے فاضل محقق زبیر علیزئی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی شواہد کی وجہ سے اسے قابل عمل قرار دیا ہے، لہٰذا اس دعائے استفتاح کا پڑھنا بھی صحیح ہے، گو درجات حدیث میں اس کا تیسرا نمبر ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ ③ سورۂ فاتحہ کے شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی موافقت کرتے ہوئے [أَعُوذُ بِاللّٰهِ ...... الخ] کے پڑھنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے، اس لیے مذکورہ تعوذ پڑھنا ضروری ہے۔

(۲۱۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيرِ، وَالْقِرَاءَةَ بِـ «الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»، وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهُ

[215] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز اللہ اکبر سے کرتے اور قراءت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورۂ فاتحہ) سے شروع کرتے تھے۔ اور جب رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک نہ اونچا رکھتے اور نہ

۲۱۵۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب ما يجمع صفة الصلاة وما يفتتح به...، حديث: ٤٩٨، والعلة مردودة هاهنا.

وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ، وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَائِمًا، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ جَالِسًا، وَكَانَ يَقُولُ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ، وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى، وَيَنْصِبُ الْيُمْنٰى، وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ، وَيَنْهٰى أَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ السَّبُعِ، وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ بِالتَّسْلِيمِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

زیادہ نیچے جھکاتے بلکہ اس کے درمیان میں رکھتے۔ اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس وقت تک سجدہ نہ کرتے جب تک کہ بالکل سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے۔ اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو دوسرا سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب تک کہ درست انداز میں بیٹھ نہ جاتے۔ اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے اور اپنے بائیں پاؤں کو زمین پر بچھا لیتے اور دائیں کو کھڑا رکھتے۔ اور آپ شیطان کی چوکڑی اور درندوں کی طرح بازو بچھا کر بیٹھنے سے منع فرماتے۔ اور نماز کو سلام کے ساتھ ختم کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اس کی سند معلول ہے۔)

لغوی تشریح: [يَسْتَفْتِحُ] آغاز فرماتے' شروع کرتے۔ [وَالْقِرَاءَةَ] منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آپ قراءت شروع فرماتے' یعنی يَفْتَتِحُ فعل محذوف کا مفعول ہے' یا اَلصَّلَاةَ پر عطف ہے اور يَسْتَفْتِحُ کا مفعول ہے۔ [لَمْ يُشْخِصْ] إِشْخَاص سے ماخوذ ہے۔ (باب افعال۔) اونچا نہ اٹھاتے۔ [وَلَمْ يُصَوِّبْهُ] تصویب سے ماخوذ ہے' یعنی بہت زیادہ نیچے نہ جھکاتے [بَيْنَ ذٰلِكَ] ان دونوں کیفیتوں (اونچ' نیچ) کے مابین رکھتے۔ [فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ] دونوں رکعتوں کے بعد۔ [اَلتَّحِيَّةَ] يقول کا مفعول واقع ہو رہا ہے' یعنی تشہد [اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ......الخ] پڑھتے تھے۔ [وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى] اور اپنا بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے' یعنی اس پر بیٹھ جاتے۔ یہ کیفیت دو سجدوں کے مابین اور پہلے تشہد کے موقع پر بناتے جیسا کہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں اس کی وضاحت ہے۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب من ذكر التورك في الرابعة' حديث: ٩٦٣) [عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ] عقبہ کی ''عین'' پر ضمہ اور ''قاف'' ساکن ہے (شیطان کی چوکڑی۔) اسے إِقْعَاءُ الْكَلْبِ بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی سرین کو زمین پر رکھے' گھٹنے اور پنڈلیاں کھڑی کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ لے۔ یاد رکھیے کہ اقعاء کی ایک اور تفسیر بھی ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کھڑے رکھے اور ایڑیوں پر بیٹھ جائے۔ یہ (دوسری صورت) ممنوع نہیں ہے بلکہ عبادلہ اربعہ (عبداللہ بن عمرو' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم) کے نزدیک آخری تشہد کے علاوہ یہی کیفیت مختار ہے۔ [افْتِرَاشَ السَّبُعِ] سبع کے ''سین'' پر فتحہ اور ''با'' پر ضمہ ہے۔ ''با'' کو مفتوح اور ساکن پڑھنا بھی جائز ہے۔ چیر پھاڑ کرنے والے جانور' یعنی درندے کو کہتے ہیں۔ درندے کی طرح بیٹھنے کی صورت یہ ہے کہ سجدے کی حالت میں اپنے بازوؤں کو کہنی تک لمبا بچھا لے جیسے کہ درندے بیٹھتے ہیں' یہ ناجائز ہے۔ [وَلَهُ عِلَّةٌ] علت اس روایت میں یہ ہے کہ اسے ابوالجوزاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور ابوالجوزاء کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے فاضل محقق حفظہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ علت مردود ہے۔

(٢١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ، وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[216] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں کے برابر تک اٹھاتے اور جب رکوع کے لیے اللہ اکبر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے (تب بھی اسی طرح رفع الیدین کرتے تھے)۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي حَدِيثِ أَبِي حُمَيْدٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ.

اور ابوداود میں حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے حتی کہ وہ آپ کے کندھوں کے برابر آ جاتے' پھر اللہ اکبر کہتے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ نَحْوُ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ، لٰكِنْ قَالَ: حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوعَ أُذُنَيْهِ.

اور مسلم میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کی طرح مروی ہے لیکن اس میں ہے کہ اپنے کانوں کے اوپر والے حصے تک اٹھاتے۔

لغوی تشریح: [يُحَاذِيَ] يُقَابِلَ کے معنی میں ہے' یعنی بالمقابل یا برابر۔ [ثُمَّ يُكَبِّرُ] افتتاح صلاۃ کے وقت پہلے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے' پھر اللہ اکبر کہتے۔ اس کے برعکس پہلے تکبیر' پھر رفع الیدین اور تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کا ذکر بھی حدیث میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل میں وسعت ہے۔ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور مصنف نے اسی پر انحصار کیا ہے' اس میں رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی رفع الیدین کا ذکر ہے۔ [نَحْوَ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ] یعنی جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں تین مواقع پر رفع الیدین ثابت ہے اسی طرح اس میں ہے۔ [فُرُوعَ أُذُنَيْهِ] کانوں کے اطراف' یعنی اوپر والے کنارے۔ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس میں رفع الیدین کندھوں تک کرنے کا ذکر ہے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق و موافقت اس طرح ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں تو کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے مقابل تک اٹھائے جائیں۔ یہ تطبیق اچھی ہے۔ اور اس سے بہتر یہ ہے کہ اسے بھی توسع پر محمول کیا جائے کہ کبھی کانوں کے برابر اور کبھی کندھوں کے برابر اٹھاتے۔

فوائد و مسائل: ① تین جگہوں پر رفع الیدین کی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ جس کی مساوات و برابری نہیں کی جا سکتی اور اس قدر صحت کے ساتھ ثابت ہیں کہ رد نہیں کی جا سکتیں۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت' رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین مسنون ہے۔ ② بعض احادیث سے دو رکعتوں کے بعد تیسری

٢١٦- أخرجه البخاري، الأذان، باب رفع اليدين في التكبيرة الأولى مع الافتتاح سواء، حديث: ٧٣٥، ومسلم، الصلاة، باب استحباب رفع اليدين حذو المنكبين مع تكبيرة الإحرام والركوع، حديث: ٣٩٠، وحديث أبي حميد أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٧٣٠.

رکعت کی ابتدا میں بھی رفع الیدین ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (صحیح البخاري' الأذان' باب رفع اليدين إذا قام من الركعتين' حديث: ۷۳۹' ومسند أحمد: ۲/ ۱۴۵' وسنن أبي داود' الصلاة' باب من ذكر أنه يرفع يديه إذا قام من الثنتين' حديث: ۷۴۳'۷۴۴) اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اسی پر عمل ہے۔ امام شافعی' احمد' ابوثور' ابن مبارک' اسحق بن راہویہ اور صحیح روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی منقول ہے' بلکہ زاد المعاد اور التلخيص الحبير وغیرہ میں مروی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم زیست رفع الیدین کرتے رہے۔ خلفائے راشدین بلکہ باقی عشرۂ مبشرہ سے بھی رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ اس کے برعکس رفع الیدین نہ کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ جس کی تفصیل فتح الباری' التلخيص الحبير اور جلاء العينين في تخريج روايات البخاري في جزء رفع اليدين وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی شہادت اس مسئلے میں اس بات کی دلیل ہے کہ رفع الیدین پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ عمل رہا۔

چنانچہ منقول ہے کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے بعد ۹ ہجری میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ (البداية والنهاية: ۵/ ۷۵' وشرح العيني على صحيح البخاري: ۹/ ۴۳) اور پھر واپس اپنے ملک چلے گئے۔ آئندہ سال جب دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو وہ سخت سردی کا موسم تھا۔ انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کپڑوں کے نیچے سے رفع الیدین کرتے دیکھا۔ یہ ۱۰ ہجری کے آخری مہینے تھے۔ اس کے بعد ۱۱ ہجری میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ زندگی کے آخری حصے تک رفع الیدین کرتے رہے۔ یہ عمل منسوخ ہوا نہ اس پر عمل متروک ہوا۔ اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ کوفے کے علاوہ باقی تمام بلاد اسلامیہ میں اس پر عمل رہا۔ فقہائے اسلام کی اکثریت نے اس کو پسند کیا ہے۔ بخاری و مسلم کے علاوہ سنن ابی داود' جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ' سنن دارمی' موطأ امام مالک' مصنف عبدالرزاق' مصنف ابن ابی شیبہ' مسند احمد' صحیح ابن خزیمہ' صحیح ابن حبان' مسند ابی عوانہ' سنن دارقطنی اور سنن کبری بیہقی وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

(۲۱۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى عَلٰى صَدْرِه. أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[217] حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی' آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔'' (اسے ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے دو مسئلوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑا ہونا مسنون ہے اور ہاتھ کھلے چھوڑنا غیر مسنون۔ شوافع' احناف اور حنابلہ سب اس پر متفق ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ہی سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف کوئی بھی عمل

۲۱۷۔ [صحيح] أخرجه ابن خزيمة: ۱/ ۲۴۳، حديث: ۴۷۹، وسنده ضعيف من أجل عنعنة الثوري، وللحديث شواهد كثيرة عند أحمد: ۵/ ۲۲۶ وغيره.

ثابت نہیں۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا بھی یہی قول ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے سوا دوسرا کوئی قول نقل نہیں کیا بلکہ موطأ امام مالک میں بھی ہاتھ باندھنے کی روایت موجود ہے تو پھر روایت پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ سے جو ہاتھ چھوڑنے کا ذکر ہے وہ شاذ ہے، صحیح نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (التمھید: ۲۰/ ۷۰-۸۰)

③ اب رہا یہ مسئلہ کہ ہاتھ باندھے کہاں جائیں، سینے پر یا زیر ناف؟ بعض حضرات زیر ناف باندھنے کے قائل و فاعل ہیں، مگر زیر ناف ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے، صحیح نہیں۔ مذکورہ بالا حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں درج کیا ہے جس کی تائید مسند احمد میں حضرت ہلب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے تھے۔ (مسند احمد: ۵/ ۲۲۶) اور ایک روایت میں فوق السرۃ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ تحت السرۃ کے مقابلے میں فوق السرۃ والی روایت سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور قوی ہے۔ اور اہل حدیث علمائے کرام کے نزدیک قوی دلائل کی روشنی میں سینے پر ہاتھ باندھنا ہی راجح ہے اور تحت السرۃ، یعنی زیر ناف والی حدیث ضعیف ہے، قابل اعتبار نہیں۔ دیکھیے: (سنن أبي داود، الصلاۃ، باب وضع الیمنی علی الیسری في الصلاۃ، حدیث: ۷۵۲-۷۵۸)

راوی حدیث: [حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوہنیدہ یا ابوہندہ ہے۔ حجر کی ''حا'' پر ضمہ اور ''جیم'' ساکن ہے۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے والد حضر موت کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب یہ نبی ﷺ کی خدمت میں اپنے وفد کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپ نے (ان کے اعزاز میں) ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضر موت کے قبائل پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔

(۲۱۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[218] حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے (نماز میں) ام القرآن نہ پڑھی۔'' (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ: «لَا تُجْزِىءُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ».

ابن حبان اور دارقطنی میں روایت ہے: ''جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ نماز کافی نہیں ہوتی۔''

وَفِي أُخْرَى لِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ وَابْنِ حِبَّانَ: «لَعَلَّكُمْ تَقْرَؤُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟» قُلْنَا: نَعَمْ، قَالَ: «لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ

احمد، ابوداود، ترمذی اور ابن حبان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''شاید تم لوگ امام کے پیچھے (کچھ) پڑھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا: جی ہاں، (پڑھتے ہیں۔) آپ نے فرمایا:

۲۱۸ــ أخرجه البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، حديث: ۷۵٦، ومسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث: ۳۹٤، وابن حبان (الإحسان): ۳/ ۱۳۹، حديث: ۱۷۸٦، والدارقطني: ۱/ ۳۲۲، وهو حديث صحيح، وحديث "لعلكم تقرؤون خلف إمامكم" أخرجه أحمد: ۵/ ٦۰، وأبوداود، الصلاة، حديث: ۸۲۳، والترمذي، الصلاة، حديث: ۲٤۷، وهو حديث صحيح.

الْكِتَابِ، فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا». ''ایسا نہ کیا کرو سوائے سورۂ فاتحہ کے اس لیے کہ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی (تو) نماز ہی نہیں۔''

لغوی تشریح: [بِأُمِّ الْقُرْآنِ] ام القرآن سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ حدیث سورۂ فاتحہ کے (نماز میں) پڑھنے کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ ''لا'' نافیہ جس پر آتا ہے اس سے ذات کی نفی مراد ہوتی ہے اور یہ اس کے حقیقی معنی ہیں۔ یہ صفات کی نفی کے لیے اس وقت آتا ہے جب ذات کی نفی مشکل اور دشوار ہو۔ اور اس حدیث میں ذات کی نفی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ نماز کے شرعاً معنی تو یہ ہیں کہ وہ اقوال اور افعال کا مجموعہ ہے لہٰذا بعض یا کل کی نفی سے اس کی نفی ہوگی۔ اگر بالفرض ذات کی نفی میں دشواری پیش آئے تو پھر حقیقت سے قریب والی صفت پر محمول کیا جائے گا، مثلاً: اس کی صحت کی نفی اور اس کے کافی ہونے کی نفی۔ اس معنی کی تائید ابن حبان اور دارقطنی کی حدیث میں وارد الفاظ [لَا تُجْزِیءُ صَلَاةٌ] سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ نماز کافی ہوگی نہ صحیح، چنانچہ جب اس حدیث سے بغیر فاتحہ کے نماز کی نفی اور اس کا صحیح نہ ہونا معلوم ہو گیا تو پھر ثابت ہوا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور اس میں سب شامل ہیں، خواہ امام ہو یا مقتدی یا اکیلا نماز پڑھنے والا۔ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا واجب ہے، اس پر امام احمد اور ابوداود سے کی روایت جسے مصنف نے بیان کیا ہے نہایت صریح اور واضح دلیل ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر کسی کی بھی نماز نہیں ہوتی، خواہ امام ہو یا مقتدی یا کوئی اکیلا شخص۔ صحیح ترین مرفوع احادیث کی روشنی میں یہی مذہب حق اور مبنی برصداقت ہے۔ شوافع، اہل حدیث اور اہل ظاہر اسی طرف گئے ہیں کہ ہر نمازی کے لیے ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ہر ایک کے لیے اس کا پڑھنا واجب ہے۔ اس میں امام اور مقتدی کا کوئی فرق نہیں اور نہ جہری اور سری نماز ہی کا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازمی اور لابدی امر ہے۔ (صحیح مسلم، الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ......، حدیث:۳۹۵، ۳۹۶) ابوداود، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: ''کیا تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟'' انھوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''سورۂ فاتحہ کے سوا اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔'' اور دوسری احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز قطعاً نہیں ہوتی۔ ② مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے ''امام الکلام'' اور ''التعليق الممجد'' میں لکھا ہے: ''کسی بھی صحیح حدیث سے فاتحہ خلف الامام کی ممانعت ثابت نہیں اور اس سلسلے میں جو نقل کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سری نمازوں میں اور جہری کے سکتات میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ محدثین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔'' ان کے علاوہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کی ایک جماعت دلائل کی بنا پر فاتحہ خلف الامام کی قائل رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ اس کے قائل تھے حتی کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی سری نمازوں کے علاوہ جہری کے سکتات میں فاتحہ خلف الامام کو جائز قرار دیا ہے جس کی باحوالہ تفصیل مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کی کتاب ''توضیح الکلام'' کی جلد اول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ] عبادہ کی "عین" پر ضمہ اور "با" مخفف ہے۔ انصار کے قبیلۂ خزرج کے فرد تھے۔ سرداران انصار میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ غزوۂ بدر کے ساتھ دوسرے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کی طرف قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ پہلے حمص میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں فلسطین کی طرف منتقل ہو گئے اور وہیں "رملہ" کے مقام پر وفات پائی اور بقول بعض ۳۴ ہجری میں ۷۲ برس کی عمر پا کر بیت المقدس میں فوت ہوئے۔

(٢١٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ بِـ«الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

۲۱۹- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ' ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سب نماز کا آغاز [اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ] سے کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

زَادَ مُسْلِمٌ: لَا يَذْكُرُونَ «بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ» فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِي آخِرِهَا.

مسلم نے یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے: قراءت کے شروع اور آخر دونوں موقعوں پر [بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ] نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ خُزَيْمَةَ: لَا يَجْهَرُونَ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ.

مسند احمد' نسائی اور ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے: [بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ] کو جہری طور پر (اونچی آواز سے) نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِي أُخْرَى لِابْنِ خُزَيْمَةَ: «كَانُوا يُسِرُّونَ». وَعَلَى هٰذَا يُحْمَلُ النَّفْيُ فِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ، خِلَافًا لِمَنْ أَعَلَّهَا.

ابن خزیمہ کی ایک دوسری روایت میں ہے: وہ بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ اور اسی پر صحیح مسلم کی روایت کی نفی کو محمول کیا جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جنھوں نے اسے معلول کہا ہے۔

لغوی تشریح: [لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللّٰهِ] بسم اللہ ذکر نہیں کرتے تھے۔ یہ فقرہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مطلقاً بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ کو جہری (با آواز بلند) نہیں پڑھتے تھے۔ [يُسِرُّونَ] إسرار سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بسم اللہ بغیر آواز نکالے آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ [وَعَلَى هٰذَا] بسم اللہ کو بے آواز یعنی سراً پڑھنے پر۔ [يُحْمَلُ] صیغۂ مجہول۔ محمول کیا جائے گا۔ [النَّفْيُ] بسم اللہ کی نفی کو۔ [فِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ] مسلم کی وہ روایت جو ابھی بیان کی گئی ہے۔ [خِلَافًا لِمَنْ أَعَلَّهَا] یعنی جو شخص یہ کہتا ہے کہ

٢١٩- أخرجه البخاري، الأذان، باب ما يقول بعد التكبير، حديث: ٧٤٣، ومسلم، الصلاة، باب حجة من قال: لايجهر بالبسملة، حديث: ٣٩٩، والنسائي، الافتتاح، حديث: ٩٠٨، وابن خزيمة: ١/ ٢٥٠، حديث: ٤٩٧، ٤٩٨، وهو حديث صحيح.

صحیح مسلم میں بسم اللہ کی نفی کا جو اضافہ ہے یہ معلول ہے‘ وہ اس (سرا بسم اللہ پڑھنے والی) توجیہ کی مخالفت کرتا ہے‘ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نفی کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کیا جائے گا، تاہم یہ روایت معلول ہوگی۔ لیکن اس بات کے ذریعے سے اس حدیث کے معلول ہونے کی دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ علت دراصل یہ ہے کہ امام اوزاعی نے یہ اضافہ قتادہ کے واسطے سے مکاتبتاً نقل کیا ہے، حالانکہ یہ علت درست نہیں کیونکہ اوزاعی اس کے روایت کرنے میں تنہا نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی اس کو روایت کرنے والے ہیں جن کی روایت صحیح ہے‘ لہٰذا نفی کی وہ تاویل صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ (تحفة الأحوذي: ١/ ٢٠٤)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سورۂ فاتحہ سے قراءت کا آغاز کرتے اور بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ ② بعض روایات میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کا بھی ثبوت ہے‘ اس لیے بسم اللہ کو آہستہ اور اونچی آواز سے پڑھنا دونوں طرح جائز ہے‘ تاہم اکثر اور زیادہ صحیح روایات کی رو سے آہستہ پڑھنا ہی ثابت ہے۔

(٢٢٠) وَعَنْ نُعَيْمٍ الْمُجْمِرِ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، فَقَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، حَتّٰى إِذَا بَلَغَ «وَلَا الضَّالِّيْنَ» قَالَ: آمِينَ. وَيَقُولُ كُلَّمَا سَجَدَ، وَإِذَا قَامَ مِنَ الْجُلُوسِ: اَللّٰهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ يَقُولُ إِذَا سَلَّمَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي لَأَشْبَهُكُمْ صَلَاةً بِرَسُولِ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

[220] حضرت نعیم مجمر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز پڑھی تو انھوں نے پہلے بسم اللہ تلاوت فرمائی‘ پھر بعد ازاں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) پڑھی حتی کہ جب آپ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پر پہنچ گئے تو آمین کہی۔ اور جب بھی سجدہ کرتے اور جب بھی بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے‘ پھر سلام پھیر کر فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً میں نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تم سب سے زیادہ مشابہ ہوں۔ (میری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بہت مشابہ ہے۔) (اسے نسائی اور ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث بسم اللہ اور آمین بالجہر کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے‘ اس لیے کہ جو آدمی (امام سے متصل صف سے) پچھلی صف میں ہوگا اسے امام کی قراءت اور آمین اسی صورت میں سنائی دے گی جب کہ امام بلند آواز سے پڑھے (ورنہ اسے سنائی نہیں دے گی۔) ② بسم اللہ اور آمین کے بلند آواز سے کہنے میں اختلاف ہے‘ باعتبار دلیل قابل ترجیح بات یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ اور آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ ③ سورۂ فاتحہ کے اختتام واتمام پر آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے‘ خواہ امام ہو یا مقتدی یا تنہا۔ ④ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آمین کہنا واجب ہے

٢٢٠ـ [إسناده صحيح] أخرجه النسائي، الافتتاح، باب قراءة بسم الله الرحمن الرحيم، حديث: ٩٠٦، وابن خزيمة: ١/ ٢٥١، حديث: ٤٩٩.

اور اسے چھوڑنے والا گناہ گار ہے۔ ⑤ آمین کے معنی ہیں: اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔

راوی حدیث: [نعیم مجمر رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ نُعَیم، نعیم کی تصغیر ہے۔ مجمر میں ''میم'' پر ضمہ ''جیم'' ساکن اور دوسرے ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر جمعہ کو دوپہر کے بعد مسجد نبوی میں خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے اسی وجہ سے ان کا نام مجمر (خوشبو کی دھونی دینے والا) مشہور ہو گیا۔ مشہور تابعی تھے۔ ابوحاتم، ابن معین، ابن سعد اور نسائی رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(٢٢١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَرَأْتُمُ الْفَاتِحَةَ فَاقْرَءُوا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، فَإِنَّهَا إِحْدٰى آيَاتِهَا». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَوَّبَ وَقْفَهُ.

[221] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم سورۂ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی (ساتھ ہی) پڑھا کرو اس لیے کہ وہ بھی سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے۔'' (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے موقوف ہونے کو درست قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [صَوَّبَ] تصویب سے ماخوذ ہے۔ درست بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ یہ حدیث، بسم اللہ جہراً پڑھنے پر دلالت کرتی ہے نہ سراً، یہ تو صرف اس کی مطلق قراءت پر دلالت کرتی ہے۔

(٢٢٢) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ، رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَالَ: «آمِينَ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ ابْنِ حُجْرٍ نَحْوُهُ.

[222] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی قراءت سے فارغ ہوتے تو آمین بلند آواز سے کہتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ اور اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے، نیز ابوداود اور ترمذی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قراءت کے اختتام پر آپ با آواز بلند آمین کہتے تھے۔ آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اگر اختلاف ہے تو وہ بلند آواز یا آہستہ آواز سے کہنے میں ہے۔ احناف آمین آہستہ کہنے کے قائل ہیں جبکہ ائمۂ ثلاثہ، محدثین اور اہل حدیث بلند آواز سے آمین کہنے کے قائل ہیں۔ بہت سی صحیح احادیث سے آمین بالجہر کی تائید و توثیق ہوتی ہے، چنانچہ ترمذی میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو دراز کیا۔ ابوداود اور سنن دارمی (حدیث: ١٢٤٩) کے الفاظ ہیں کہ آپ نے آمین بلند آواز

٢٢١ـ [صحيح] أخرجه الدارقطني: ١/ ٣١٢، وللحديث شواهد معنوية.

٢٢٢ـ [صحيح] أخرجه الدارقطني: ١/ ٣٣٥، وصححه الحاكم على شرط الشيخين: ١/ ٢٢٣، ووافقه الذهبي، وسنده حسن، وللحديث شواهد، وحديث وائل أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٩٣٢، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٤٨ وسنده صحيح.

سے کہی۔ اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر ؒ نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ ② حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے پہلے سب گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (صحیح البخاري' الأذان' باب جهر الإمام بالتأمين' حديث:۷۸۰' و صحيح مسلم' الصلاة' باب التسبيح والتحميد والتأمين' حديث: ۴۱۰) ③ امام ابن خزیمہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ امام اونچی آواز سے آمین کہے کیونکہ نبی ﷺ مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم اسی صورت میں دے سکتے ہیں جب مقتدی کو معلوم ہو کہ امام آمین کہہ رہا ہے۔ کوئی عالم تصور نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ ﷺ مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم دیں جب کہ وہ اپنے امام کی آمین کو سن نہ سکے۔ (صحيح ابن خزيمة: ۱/ ۲۸۶) ④ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ امام بخاری نے اسے تعلیقاً لیکن صیغۂ جزم کے ساتھ ذکر کیا ہے جو اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھیے: (صحيح البخاري' الأذان' باب جهر الإمام بالتأمين' قبل حديث:۷۸۰) ⑤ حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس قدر یہود بلند آواز سے آمین کہنے سے چڑتے ہیں اتنا کسی اور چیز سے نہیں' لہٰذا تم کثرت سے آمین کہا کرو۔'' (سنن ابن ماجه' إقامة الصلوات' باب الجهر بآمين' حديث:۸۵۷) حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہودی تم سے کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا سلام اور آمین پر تم سے حسد کرتے ہیں۔'' (سنن ابن ماجه' اقامة الصلوات' باب الجهر بآمين' حديث: ۸۵۶' والأدب المفرد' حديث: ۹۸۸' ومجمع الزوائد: ۲/ ۱۱۳) ⑥ حضرت علی ؓ سے روایت ہے' انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جب آپ نے [وَلَا الضَّآلِّين] کہا تو فرمایا: ''آمین۔'' (سنن ابن ماجه' إقامة الصلوات' باب الجهر بآمين' حديث: ۸۵۴) ⑦ حضرت معاذ بن جبل ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود مسلمانوں سے تین باتوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں: سلام جواب پر' صفوں کی درستی پر' اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر۔'' امام طبرانی نے اسے الأوسط میں بیان کیا ہے اور علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد' الصلاة:۲/ ۱۱۳) ⑧ حضرت عکرمہ ؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ امام جب [وَلَا الضَّآلِّين] کہتا تو لوگوں کے آمین کہنے کی وجہ سے مسجد گونج جاتی۔ (مصنف ابن أبي شيبة: ۲/ ۱۸۷) ⑨ عطاء بن ابی رباح ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دو سو صحابۂ کرام ؓ کو دیکھا کہ بیت اللہ میں جب امام [وَلَا الضَّآلِّين] کہتا تو سب بلند آواز سے آمین کہتے۔ (السنن الكبرى للبيهقي:۲/ ۵۹' وكتاب الثقات لابن حبان:۶/ ۲۶۵) یہ اور اسی نوعیت کی دیگر احادیث کی بنا پر امام شافعی اور امام احمد ؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نماز میں جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرے تو امام و مقتدی کو بلند آواز سے آمین کہنی چاہیے۔ اور علمائے احناف کے مقتدر علماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ ⑩ امام ابن ہمام حنفی ؒ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں متوسط درجے کی آواز سے آمین کہنے کو پسند فرمایا ہے۔ مدارج النبوة اور أشعة اللمعات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جہری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہتے اور مقتدی بھی آپ کی موافقت کرتے۔ اور جہراً آمین کہنے کی احادیث تعداد کے

لحاظ سے زیادہ ہیں اور سند کے لحاظ سے بہت صحیح ہیں۔ ⑪ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تنویر العینین میں کہا ہے کہ جہراً آمین کہنے کی احادیث اکثر اور واضح ہیں۔ اور التعلیق الممجد میں مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ آمین زور سے کہنا دلیل کی روشنی میں قوی ہے۔ اور یہی بات انھوں نے السعایة میں فرمائی ہے بلکہ وہاں تو صاف طور پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ''آہستہ آمین کہنے والی روایات ضعیف ہیں جو جہراً آمین کہنے والی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔'' اس اظہار حقیقت کے بعد ہم مزید کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(٢٢٣) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْئًا، فَعَلِّمْنِي مَا يُجْزِئُنِي مِنْهُ، فَقَالَ: «قُلْ: سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ» اَلْحَدِيثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ.

[223] حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھ سکتا' لہٰذا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو (میری نماز کے لیے) اس کی جگہ کافی ہو جائے۔ آپ نے فرمایا: ''تم [سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ] ''اللہ پاک ہے' اسی کی تعریف ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' اور اللہ سب سے بڑا ہے' برائیوں سے بچنا اور نیکی کی توفیق' اللہ کے سوا کسی سے ممکن نہیں۔'' پڑھا کرو۔'' لمبی حدیث ہے۔ (اسے احمد' ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان' دارقطنی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَعَلِّمْنِي] تعلیم سے امر کا صیغہ ہے۔ [مَا يُجْزِئُنِي] ''زا'' کے بعد ہمزہ ہے' معنی یہ ہیں کہ جو میرے لیے کافی ہو جائے۔ [مِنْهُ] قرآن کے بدلے میں۔ [حَوْل] قدرت اور حیلہ۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو مجبوری کی صورت میں یہ کلمات پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں شارح مصابیح نے اشارہ کیا ہے کہ اس سائل کا سوال یہ تھا کہ میں فوری طور پر کچھ یاد نہیں کر سکتا جبکہ نماز فرض ہو چکی ہے' تب نبی ﷺ نے اسے یہ کلمات تعلیم فرمائے۔ (عون المعبود) ② اس روایت سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں فرض نہیں ہے تو یہ سینہ زوری ہے ورنہ کہاں مجبوری کی حالت اور کہاں غیر مجبوری۔ یہ آدمی تو معذور تھا اس لیے معذوری کے دور ہونے تک اسے متبادل راستہ بتلایا گیا ہے۔

۲۲۳۔ [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب ما يجزئ الأمي والأعجمي من القراءة، حديث: ٨٣٢، والنسائي، الافتتاح، حديث: ٩٢٥، وأحمد: ٤/ ٣٥٣، ٣٥٦، ٣٨٢، وابن حبان (الإحسان): ٣/ ١٤٨، حديث: ١٨٠٧، والحاكم: ١/ ٢٤١، وصححه على شرط البخاري، ووافقه الذهبي.

معذور کے لیے شریعت مطہرہ نے بہرصورت رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ عارضی رعایت سے احکام میں تغیر وتبدل نہیں ہو جاتا۔ ایک معذور آدمی اگر یہ کہے کہ میں وضو نہیں کر سکتا اور کہا جائے کہ بھئی پھر تم تیمم کر لو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اب وضو فرض ہی نہیں رہا۔ کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ عدم استطاعت وضو کی صورت میں تیمم کا مشورہ وضو کی فرضیت ساقط کر دے گا' اس لیے مجبوری کی صورت میں اگر ان کلمات کے پڑھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے فاتحہ کی فرضیت کیسے ساقط ہوگئی؟

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابومحمد یا ابومعاویہ ہے۔ ان کے والد کا نام علقمہ بن حارث اسلمی ہے۔ خود بھی شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے اور باپ بھی۔ (باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔) صلح حدیبیہ اور خیبر میں شریک ہوئے اور بعد والے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کوفہ منتقل ہوگئے۔ ۸۷ ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں وفات پانے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں۔ ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

(٢٢٤) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي بِنا فَيَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ، وَيُسْمِعُنَا الْآيَةَ أَحْيَانًا، وَيُطَوِّلُ الرَّكْعَةَ الْأُولٰى، وَيَقْرَأُ فِي الْأُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[224] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھاتے تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے۔ آپ پہلی رکعت لمبی کرتے تھے اور آخری دونوں رکعتوں میں صرف فاتحة الکتاب پڑھتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ] یعنی سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھتے تھے۔ [وَ سُورَتَيْنِ] ہر ایک رکعت میں ایک سورت پڑھتے۔ [يُسْمِعُنَا] إسماع سے ماخوذ ہے' یعنی ہمیں سناتے تھے۔ [أَحْيَانًا] حين کی جمع ہے' بسا اوقات' بعض اوقات۔ [يُطَوِّلُ] تطويل سے ماخوذ ہے۔ طول دینا' لمبا کرنا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قراءت بالاتفاق سری (خاموشی سے) ہے۔ ② جب قراءت جہری نہیں تو پھر بعض اوقات کوئی آیت سنانے کی کیا حکمت اور وجہ ہے؟ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نمازیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ اس وقت قرآن مجید ہی کا کوئی حصہ تلاوت فرما رہے ہیں دوسرا کوئی ذکر یا دعا نہیں پڑھ رہے۔ دوسری یہ کہ اس کا بھی نمازیوں کو علم ہو جائے کہ اس نماز میں فلاں سورت پڑھی جا رہی ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی رکعت میں قراءت نسبتاً لمبی اور دوسری میں چھوٹی ہونی چاہیے۔ ائمۂ ثلاثہ: امام احمد' امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کے ساتھ ساتھ امام محمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے' البتہ امام ابوحنیفہ اور ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قراءت مساوی ہونی چاہیے۔ ③ ظہر' عصر اور فجر میں تو پہلی رکعت کا لمبا ہونا نص سے ثابت

٢٢٤ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب: يقرأ في الأخريين بفاتحة الكتاب، حديث: ٧٧٦، ومسلم، الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر، حديث: ٤٥١.

ہے، باقی دو کو انھی پر قیاس کر لیا ہے۔ ایسا آپ کیوں کرتے تھے؟ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو جائیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ کے سوا اور کچھ نہ پڑھے لیکن بعض احادیث سے پچھلی رکعتوں میں قراءت کرنا بھی ثابت ہے' اس لیے آخری دو رکعتوں میں فاتحہ سے زائد قراءت نہ بھی کی جائے تب بھی درست ہے اور قراءت کر لی جائے تو بھی یہ ناجائز نہیں۔ (صحیح مسلم' الصلاة' باب القراءة في الظهر والعصر' حديث: ٤٥٢) ④ ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں کسی آیت کو بلند آواز سے پڑھنے سے سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا فعل آپ سے ایک مرتبہ ہی عمل میں نہیں آیا بلکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے۔

(٢٢٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، فَحَزَرْنَا قِيَامَهُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ قَدْرَ ﴿الٓمٓ تَنزِيلُ﴾ السَّجْدَةِ وَفِي الْأُخْرَيَيْنِ قَدْرَ النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ وَفِي الْأُولَيَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ، عَلٰى قَدْرِ الْأُخْرَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، وَالْأُخْرَيَيْنِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[225] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز ظہر اور عصر میں رسول اللہ ﷺ کے قیام کا اندازہ لگایا کرتے تھے' چنانچہ ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں میں اتنا قیام فرماتے جتنی دیر میں سورۂ الٓمٓ السجدة کی تلاوت کی جا سکے' اور آخری دونوں رکعتوں میں پہلی دونوں کے نصف کے برابر۔ اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں ظہر کی آخری دونوں رکعتوں کے برابر' اور عصر کی آخری دونوں میں عصر کی پہلی دو رکعتوں سے نصف۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [نَحْزُرُ] باب نَصَرَ يَنْصُرُ، تخمینہ لگاتے' قیاس کرتے' اندازہ لگاتے تھے۔ [قَدْرَ الٓمٓ تَنزِيلُ السجدة] یعنی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد ہر رکعت میں اس سورت کی مقدار کے برابر قراءت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظہر کی پہلی اور دوسری رکعت میں قراءت برابر ہوتی تھی۔ یہ بات پچھلی حدیث کے خلاف ہے۔ اسے اوقات کے مختلف ہونے پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی برابر پڑھتے اور کبھی پہلی رکعت بڑی اور دوسری چھوٹی ہوتی تھی' یا پھر یہ کہا جائے گا کہ پہلی رکعت میں چونکہ دعائے استفتاح اور تعوذ زائد پڑھے جاتے ہیں' اس لیے وہ لمبی بن جاتی ہے' قراءت دونوں رکعتوں میں ایک ہی جتنی ہے۔ اس طرح دونوں احادیث میں مطابقت پیدا ہو جائے گی اور اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ [وَفِي الْأُخْرَيَيْنِ قَدْرَ النِّصْفِ] یعنی نصف مقدار۔ [مِنْ ذٰلِكَ] یعنی پہلی دو رکعتوں کی طوالت سے نصف۔

فائدہ: اس حدیث سے ظہر و عصر کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی مقدار قراءت کا اندازہ ہوتا ہے' نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری آیت پڑھنا مسنون ہے۔ اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ عصر کی پہلی دو رکعتیں اور ظہر کی آخری دو برابر ہوتی تھیں۔ اور یہ پکی بات ہے کہ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ

٢٢٥ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر، حديث: ٤٥٢.

بھی قراءت ہوتی تھی' لہٰذا ظہر میں بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ اور کبھی نہ پڑھنا بھی ثابت ہے' لہٰذا نمازی اگر آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ دوسری آیات بھی پڑھ لے تو اس کی اجازت ہے اور نہ پڑھے تب بھی گنجائش ہے۔

(٢٢٦) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: كَانَ فُلَانٌ يُطِيلُ الْأُولَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ، وَفِي الْعِشَاءِ بِوَسَطِهِ، وَفِي الصُّبْحِ بِطِوَالِهِ. فَقَالَ أَبُوهُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشْبَهَ صَلَاةً بِرَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ هٰذَا. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

[226] حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ فلاں صاحب ظہر کی پہلی دو رکعتیں لمبی کرتے ہیں' نماز عصر میں تخفیف کرتے ہیں' نماز مغرب میں قصار مفصل (چھوٹی سورتیں) عشاء میں اوساط مفصل اور صبح کی نماز میں طوال مفصل پڑھتے ہیں۔ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے کسی کی امامت میں اس سے زیادہ نبی ﷺ کی نماز کے مشابہ نماز نہیں پڑھی۔ (اسے نسائی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كَانَ فُلَانٌ] بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد امیر مدینہ عمرو بن سلمہ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں' اس لیے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تو ولادت ہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی ہے۔ [يُخَفِّفُ الْعَصْرَ] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخفیف ظہر کے اعتبار سے عصر کی سب رکعتوں میں ہے۔ [بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ] قِصَار میں ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے۔ قصیرۃ کی جمع ہے۔ اور مفصل: جس کے درمیان میں فواصل آیات زیادہ ہوں۔ یاد رہے کہ قرآن کا آخری حصہ جن چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے کیونکہ اس حصے کی سورتیں چھوٹی ہیں اور ہر سورت کی نوعیت ایسی ہے کہ جیسے الگ اور مستقل گفتگو ہو۔ اس میں اختلاف ہے کہ مفصل حصہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ مشہور تو یہی ہے کہ اس کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی رائے ہے کہ دوسری کسی سورت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی انتہا آخر قرآن تک ہے۔ پھر مفصل کی تین اقسام ہیں: طوال مفصل' اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ چنانچہ مشہور قول کے مطابق طوال مفصل' سورۂ حجرات سے شروع ہو کر سورۂ بروج تک اور اوساط مفصل' سورۂ بروج سے شروع ہو کر سورۂ بینہ تک اور سورۂ بینہ سے لے کر قرآن پاک کے اختتام تک قصار مفصل ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حجرات سے لے کر اختتام قرآن مجید تک تمام سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ ② مفصلات کی تین اقسام ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ③ صبح کی نماز میں طوال مفصل' نماز عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔

راویٔ حدیث: [سلیمان بن یسار رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابوایوب ہے۔ یسار کی ''یا'' پر فتحہ ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد اور فقیہ تھے۔ بہت بڑے مرتبے کے عالم تھے۔ بہت سی احادیث

٢٢٦۔ [إسناده صحيح] أخرجه النسائي، الافتتاح، باب القراءة في المغرب بقصار المفصل، حديث: ٩٨٢.

ان سے مروی ہیں۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۰۷ ہجری میں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۲۲۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[227] حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے سنا ہے۔ (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل: ① نبی ﷺ کا عام معمول تو یہی تھا کہ مغرب میں قصار مفصل پڑھتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، مگر بعض اوقات لمبی سورت بھی پڑھ لیتے تھے جیسا کہ اس حدیث میں سورۂ طور پڑھنا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں المرسلات' أعراف اور أنعام کا نماز مغرب میں پڑھنا بھی ثابت ہے۔ (صحيح البخاري' الأذان' حديث: ۷۶۳' و سنن أبي داود' الصلاة' حديث: ۸۱۲) ② آپ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سفر کے دوران میں صبح کی فرض نماز میں صرف معوذتین کی تلاوت کی۔ (سنن أبي داود' الوتر' باب في المعوذتين' حديث: ۱۴۶۲) نیز حضرت معاذ بن عبداللہ جہنی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نماز فجر کی دونوں رکعتوں میں [اِذَا زُلْزِلَتِ] تلاوت فرمائی۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب الرجل يعيد سورة واحدة في الركعتين' حديث: ۸۱۶) بہرحال عام معمول وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا' البتہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی جائز ہے۔

(۲۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: ﴿الٓمٓ تَنزِيلُ﴾ السَّجْدَةَ، وَ﴿هَلْ أَتَىٰ عَلَى ٱلْإِنسَٰنِ﴾. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِلطَّبَرَانِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: يُدِيمُ ذٰلِكَ.

[228] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں الٓمّٓ تَنْزِيل (سورۂ سجدہ) اور دوسری میں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَان (سورۂ دہر) پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم) اور طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ آپ ہمیشہ ایسا کرتے تھے۔

لغوی تشریح: يُدِيمُ ذٰلِكَ إِدَامَةٌ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں ان سورتوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔

فوائد ومسائل: ① ان سورتوں کا التزام کیوں کرتے تھے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت و حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم اور روز قیامت بندوں کا محشر میں جمع ہونا مذکور ہے۔ اور احادیث

۲۲۷ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب الجهر في المغرب، حديث: ۷٦٥، ومسلم، الصلاة، باب القراءة في الصبح، حديث: ٤٦٣.

۲۲۸ـ أخرجه البخاري، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الفجر يوم الجمعة، حديث: ۸۹۱، ومسلم، الجمعة، باب ما يقرأ في يوم الجمعة، حديث: ۸۸۰، وحديث ابن مسعود أخرجه الطبراني في الصغير: ۲/ ٤٤ وسنده ضعيف، وفيه من لم أعرفه، وقال الهيثمي: رجاله موثقون.

میں ہے کہ قیامت بھی جمعہ کے روز قائم ہوگی' غالباً اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نبی ﷺ جمعہ کے روز ان کا التزام فرماتے تھے' اس لیے جمعہ کے روز صبح کی فرض نماز میں ان دونوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ ④ جن سورتوں کو نبی اکرم ﷺ نے کسی نماز میں بالالتزام پڑھا ہو' ہمارے لیے امتثال امر کرتے ہوئے ان سورتوں کو انھی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جا سکتی' مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انھی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی ہیں۔ اور آج بحمد اللہ علمائے اہلحدیث اس کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۲۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا مَرَّتْ بِهِ آيَةُ رَحْمَةٍ إِلَّا وَقَفَ عِنْدَهَا يَسْأَلُ، وَلَا آيَةُ عَذَابٍ إِلَّا تَعَوَّذَ مِنْهَا. أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

[229] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی' جب ایسی آیت گزرتی جس میں رحمت الٰہی کا ذکر ہوتا تو آپ وہاں رک کر رحمت طلب فرماتے اور جب آیت عذاب گزرتی تو وہاں رک کر اس سے ضرور پناہ مانگتے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿وَقَفَ﴾ رک جاتے' قراءت سے وقفہ فرماتے۔ ﴿يَسْأَلُ﴾ اللہ سے اس کی رحمت طلب فرماتے۔

فائدہ: یہ عمل غالباً آپ کا نماز تہجد میں ہوتا تھا جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں اس بات کی وضاحت ہے۔ (صحیح مسلم' صلاة المسافرين' باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل' حديث:۷۷۲) چنانچہ مسند احمد' ابوداود اور ابن ماجہ میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ایسا نفل نماز میں کرتے تھے۔ (مسند أحمد:۴/ ۳۴۷' وسنن أبي داود' الصلاة' باب الدعاء في الصلاة' حديث:۸۸۱' وسنن ابن ماجه' إقامة الصلوات' باب ماجاء في القراءة في صلاة الليل' حديث: ۱۳۵۲) اسی طرح مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (مسند أحمد:۶/ ۹۲) اور ابوداود اور نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تہجد کی نماز میں تھا۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب مايقول الرجل في ركوعه و سجوده' حديث: ۸۷۳' وسنن النسائي' الصلاة' باب الدعاء في السجود' حديث: ۱۱۳۳) اور اگر کوئی یہ عمل فرض نماز میں بھی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جبکہ وہ اکیلا فرض نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کسی کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ (سبل السلام)

(۲۳۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَلَا وَإِنِّي

[230] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(لوگو!) سن لو کہ مجھے رکوع اور سجدے

۲۲۹۔ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب وضع اليدين على الركبتين، حديث:۸۷۱، والترمذي، الصلاة، حديث:۲۶۲، والنسائي، قيام الليل، حديث:۱۶۶۵، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث:۸۸۱، وأحمد:۶/ ۲۴، وأخرجه مسلم، صلاة المسافرين، حديث:۷۷۲ مطولاً.

۲۳۰۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب النهي عن قراءة القرآن في الركوع والسجود، حديث:۴۷۹.

نُهِيتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا أَوْ سَاجِدًا، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے' لہٰذا رکوع میں اپنے مالک و پروردگار کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں کثرت سے دعا کیا کرو' یہ اس لائق ہے کہ تمھاری دعا قبول کر لی جائے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ‌‌| فَقَمِنٌ | اس میں ''فا'' جزائیہ ہے۔ قَمِنٌ میں ''قاف'' پر فتحہ اور ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی اس بات کا مستحق ہے' اس لائق ہے۔

فوائد و مسائل: ① نماز کے مختلف ارکان ہیں' ان میں سے ہر ایک کی ہیئت الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے حسب حال اذکار مقرر ہیں اور سنت سے ثابت ہیں۔ ② نبی اکرم ﷺ نے رکوع و سجود میں تلاوت قرآن ممنوع قرار دی ہے۔ اس کی جگہ آپ نے رکوع میں عظمت رب' یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ اور سجدے میں دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ③ بعض محدثین اور امام احمد ؒ کے نزدیک رکوع میں تعظیم رب اور سجدے میں دعا کرنا واجب ہے' البتہ جمہور علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ ④ سجدہ قبولیت دعا کا ایک اہم ترین مقام ہے' اسی لیے آپ نے اس میں دعا کی ترغیب دی ہے۔ خود بھی سجدے میں مختلف دعائیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دعا آیندہ حدیث میں آرہی ہے۔

(٢٣١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ! رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[231] حضرت عائشہ ؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں | سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْلِي | ''تو پاک ہے اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! اپنی حمد و ثنا کے ساتھ۔ اے اللہ! مجھے بخش دے۔'' پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: | وَ بِحَمْدِكَ | اس میں ''واؤ'' عاطفہ ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری حمد و توصیف میں محو ہوتا ہوں۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ ''واؤ'' حالیہ ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں اس حال میں کہ میں تیری حمد و ثنا میں محو ہونے والا ہوں۔ رکوع و سجود کے لیے متعدد اذکار اور دعائیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ نمازی ان میں سے جسے چاہے منتخب کر سکتا ہے۔

فائدہ: یہ حدیث اس کی بات دلیل ہے کہ رکوع میں | سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ | اور سجدے میں | سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى | کے علاوہ مذکورہ بالا دعا بھی پڑھی جا سکتی ہے بلکہ حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ نازل ہونے کے بعد آپ ہمیشہ رکوع و سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ (صحيح البخاري' التفسير' حديث:٤٩٦٧' ومسند أحمد:٦ /٢٣٠) نمازی ان مسنون دعاؤں میں سے وقتاً فوقتاً جسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔

٢٣١ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب التسبيح والدعاء في السجود، حديث:٨١٧، ومسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود، حديث:٤٨٤.

(٢٣٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْكَعُ، ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِينَ يَرْفَعُ صُلْبَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، ثُمَّ يَقُولُ وَهُوَ قَائِمٌ: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَهْوِي سَاجِدًا، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَسْجُدُ. ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ، ثُمَّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا، وَيُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ مِنَ اثْنَتَيْنِ بَعْدَ الْجُلُوسِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[232] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو کھڑے ہوتے وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب رکوع کے لیے جاتے تو اس وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر رکوع سے اپنی پشت کو اٹھاتے وقت [سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ] کہتے اور پھر جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہوتے تو [رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ] کہتے۔ پھر تکبیر کہتے ہوئے سجدے کے لیے جھکتے۔ پھر سجدے سے اپنا سر اٹھاتے وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر سجدے میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے' پھر سجدے سے اٹھتے ہوئے اللہ اکبر کہتے۔ پھر ساری نماز میں اسی طرح کرتے۔ پھر جب دوسری رکعت کے بعد (تشہد پڑھ کر) اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ] بعض روایات میں [رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ] بھی مروی ہے' یعنی لَكَ سے پہلے ''واؤ'' بعض روایات میں ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ دونوں طرح ثابت ہے۔ ''واؤ'' کو جب ثابت رکھیں گے تو اس صورت میں محذوف پر عطف ہوگا' یعنی أَطَعْنَاكَ وَ حَمِدْنَاكَ ''ہم نے تیری اطاعت اور حمد و ستائش کی۔'' یا ''واؤ'' کو حالیہ تسلیم کیا جائے گا' یا پھر اسے زائدہ قرار دیا جائے گا۔ ساری صورتیں ممکن ہیں۔ بعض روایات میں [اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ] بھی آیا ہے۔ [يَهْوِي] باب ضَرَبَ يَضْرِبُ سے ماخوذ ہے' یعنی جھکنا' مائل ہو جانا' گر جانا۔

فوائد و مسائل: ① نماز میں جو تکبیریں کہی جاتی ہیں ان میں سے پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ' تکبیر افتتاح یا تکبیر اولیٰ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اب نماز میں داخلے کے بعد وہ سارے کام اور چیزیں حرام ہوگئیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے حلال تھیں۔ باقی تکبیرات کو تکبیرات انتقال کہتے ہیں' یعنی ایک رکن نماز سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کی تکبیریں۔ ② پہلی تکبیر (تکبیر تحریمہ) فرض ہے اور باقی تکبیریں بعض کے نزدیک واجب ہیں مگر اکثر کے نزدیک مسنون ہیں۔ ③ بنوامیہ کے دور میں بعض امرائے بنوامیہ نے ان تکبیروں کو اہمیت نہ دی اور معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر اس دور کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کو ان کے مسنون ہونے کی تعلیم و یاد دہانی کراتے رہتے تھے تاکہ لوگ سنت نبوی پر عمل پیرا رہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ ④ ہر دور میں علمائے حق کا فریضہ ہے کہ وہ نادان اور جاہل لوگوں کو سنت رسول ﷺ کی اہمیت و فضیلت سے آگاہ رکھیں اور انکار سنت کے فتنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں۔

٢٣٢ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب يهوي بالتكبير حين يسجد، حديث: ٨٠٣، ومسلم، الصلاة، باب إثبات التكبير في كل خفض ورفع في الصلاة، حديث: ٣٩٢.

(٢٣٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: «**اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ - وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ - اَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[233] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَكَ...... الخ کہتے تھے۔ ''اے اللہ! اے ہمارے رب! تعریف صرف تیرے لیے ہے، اتنی تعریف جس سے آسمان و زمین بھر جائیں اور اس کے بعد ہر وہ چیز بھر جائے جسے تو چاہے۔ اے تعریف اور بزرگی کے مالک! بہترین بات جو کسی بندے نے کہی ...... (بندے کے اقوال وکلمات میں سے رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ والا قول سب سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسے کہا جائے۔) اور ہم سبھی تیرے بندے ہیں ...... اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو ہی نہ دے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی بخت اور نصیب والے کو اس کی بزرگی اور بخت تیرے عذاب کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِلْءَ السَّمٰوَاتِ] مِلْء کا ہمزہ منصوب پڑھیں تو یہ مصدر، یعنی مفعول مطلق ہوگا اور مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ [مِنْ شَيْءٍ] مَا شِئْتَ کا بیان ہے، یعنی جو کچھ بھی تو چاہے۔ [بَعْدُ] مبني على الضم ہے کیونکہ اس کے بعد مضاف الیہ محذوف ہے، البتہ نیت میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین بھری حمد وثنا کے بعد۔ [أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ] اگر أهل کے ''لام'' پر ضمہ پڑھیں تو اس صورت میں یہ أنت مبتدا محذوف کی خبر بنے گا، یعنی تو بزرگی اور تعریف کا مالک ہے۔ اور حرف ندا کے محذوف ماننے کی صورت میں اسے منصوب بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ''ثناء'' کے معنی زبان سے کسی کی تعریف کرنا ہیں جب کہ المجد عظمت و بزرگی کے معنی میں ہے۔ [أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ] أَحَقُّ رفعی حالت میں ہے اور ما موصولہ کی طرف مضاف ہے اور مبتدا محذوف کی خبر واقع ہو رہا ہے اور وہ ہے رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کا قول۔ بندے کے اقوال وکلمات میں سے رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ والا قول سب سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسے کہا جائے۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ مبتدا ہو اور [اَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ] خبر ہو۔ اور اس کا یہ قول کہ ''ہم سب تیرے بندے ہیں'' مبتدا اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ آیا ہو۔ لیکن پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ [ذَا الْجَدِّ] صاحب بزرگی۔ جد کی ''جیم'' پر فتحہ ہے اور اس کے معنی ہیں: وافر حصہ، استغنا اور عظمت و غلبہ۔ [مِنْكَ] تیرے مؤاخذے اور گرفت سے، یا یہ معنی ہیں کہ تیرے ہاں جو پکڑ اور مؤاخذہ ہے۔ [اَلْجَدُّ] یہ مرفوع

٢٣٣ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب ما يقول إذا رفع رأسه من الركوع، حديث: ٤٧٧.

ہے اور [لَا یَنْفَعُ] کا فاعل ہے' یعنی کسی بڑے مالدار آدمی کو اس کی مالداری اور تونگری تیری پکڑ اور گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ بس عمل صالح ہی وہاں نفع دے گا۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات پر دلیل اور حجت ہے کہ قومہ کی حالت میں یہ دعا پڑھنا مسنون و مشروع ہے۔ جن حضرات نے اس دعا کو نفل نماز کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اپنے ذہن کی بات ہے۔ صحیح مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں اس کا پڑھنا ثابت ہے۔ (صحیح مسلم' الصلاۃ' باب اعتدال أرکان الصلاۃ..... حدیث:۴۷۱) اس دعا کے اس جملے [وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ] سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے مالک و خالق کے پاس محض دنیوی جاہ و جلال اور عظمت و بزرگی کچھ بھی کام نہ دے گی اور نہ کسی حسب و نسب کا امتیاز کچھ فائدہ مند ثابت ہوگا۔ وہاں تو عمل صالح کی قدر و قیمت ہوگی اور بس۔ کسی کا عالی نسب ہونا' بزرگوں کی اولاد ہونا اور کسی معروف و مشہور خاندان سے تعلق ہونا عذاب الٰہی سے نہیں چھڑا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور آخر الزماں نبی ﷺ کا حقیقی چچا ابوطالب' عتاب الٰہی اور عذاب الٰہی کا شکار نہ ہوتے۔ نبی ﷺ نے تو اپنے خاندان والوں کو بلا کر صاف طور پر کہہ دیا کہ عمل صالح کرو ورنہ اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل ہے۔ اور اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف فرما دیا تھا کہ "بیٹی! میں تجھے عذاب الٰہی سے ہرگز نہیں بچا سکتا' اس خوش فہمی میں نہ رہ جانا کہ میں نبی آخر الزماں ﷺ کی لخت جگر ہوں۔ محض میری بیٹی ہونا تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت اور پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ اعمال صالحہ کر جو تجھے عذاب الٰہی سے بچا سکیں۔" (صحیح البخاري' الوصایا' باب هل یدخل النساء والولد في الأقارب' حدیث:۲۷۵۳) اولوالعزم پیغمبر اور خاص کر رسول آخر الزمان ﷺ جب اپنی اولاد سے یہ فرمادیں تو اور کون ہے جو غرور نسب میں مبتلا ہو کر بھی کامیاب و کامران ہو جائے؟ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قومہ میں صرف سیدھا کھڑا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسنون دعاؤں میں سے کوئی دعا (مثلاً یہی دعا) پڑھنی چاہیے۔

(۲۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أُمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَةِ أَعْظُمٍ: عَلَی الْجَبْهَةِ - وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلٰی أَنْفِهِ - وَالْيَدَيْنِ، وَالرُّكْبَتَيْنِ وَأَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[234] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے: پیشانی پر۔۔۔ اور اپنے دست مبارک سے اپنے ناک کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ اور دونوں ہاتھوں' دونوں گھٹنوں اور دونوں قدموں کے کناروں پر۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أُمِرْتُ] صیغۂ مجہول ہے۔ حکم صادر فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ [أَعْظُمٍ] "ظا" پر ضمہ ہے' عَظْمٌ کی جمع ہے۔ اور ناک کی جانب اشارہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیشانی اصل ہے اور ناک اس کے تابع ہے۔ حدیث مذکور اس

۲۳۴۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب السجود علی الأنف، حدیث: ۸۱۲، ومسلم، الصلاة، باب أعضاء السجود .....، حدیث: ۴۹۰.

پر دلالت کرتی ہے کہ مذکورہ بالا سات اعضاء پر اکٹھے سجدہ کرنا واجب ہے' اس لیے کہ امر وجوب کے لیے آتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں مل کر ایک عضو ہے۔ اگر انھیں الگ الگ عضو شمار کیا جائے تو یہ آٹھ اعضاء بن جاتے ہیں' اس لیے ان دونوں کو ایک ہی عضو شمار کیا جانا چاہیے۔ امام مالک' امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمہم اللہ تینوں امام اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشید: امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بھی اس کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف پیشانی یا صرف ناک زمین پر رکھ کر سجدہ کرے تو یہ سجدہ ناتمام متصور ہوگا بلکہ اسے سجدہ ہی شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عضو ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عضو اگر زمین پر رکھا گیا تو سجدہ ہو جائے گا اور کسی قسم کا کوئی نقص نہیں رہے گا۔ لیکن ایک تو یہ اکثریت کے خلاف ہے کیونکہ تین امام اور دو مزید حنفی امام ایک طرف اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تنہا ایک طرف۔ پھر یہ مذکورہ بالا حدیث کے بھی خلاف ہے' اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کمزور ہے۔ ② مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے نمازی کے پاس سے ہوا جس کی ناک زمین پر نہیں لگ رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''جس کسی کی پیشانی اور ناک زمین پر نہ لگے اس کی تو نماز ہی نہیں ہوتی۔'' (المصنف لابن أبي شيبة:١/ ٢٣٥' رقم: ٢٦٩٥) یعنی ناک اور پیشانی دونوں کا حالت سجدہ میں زمین پر لگنا ضروری ہے۔ خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ سجدہ ساتوں اعضاء پر کیا جانا چاہیے ورنہ سجدہ صحیح نہیں ہوگا۔

(٢٣٥) وَعَنِ ابْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلّٰى وَسَجَدَ، فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَبْدُوَ بَيَاضُ إِبْطَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[235] حضرت ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز ادا فرماتے اور سجدہ کرتے تو (اس حالت میں) اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے' یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [فَرَّجَ] تفریج (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: دونوں پہلوؤں کے درمیان دوری' کشادگی اور فراخی پیدا کرنا۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنے بازوؤں کو اپنی رانوں سے اتنا الگ رکھے کہ بغلوں کا اندرون بھی نمایاں ہو جائے۔ اس حدیث کی بنا پر امام طبری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بغلیں جسم اطہر کے دوسرے اعضاء کی طرح سفید تھیں سیاہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی دیگر خصوصیات و امتیازات کی طرح ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کی تصریح طبری نے کتاب الاحکام کے باب الاستسقاء میں کی ہے کہ آپ کی بغلیں دوسروں کی طرح سیاہ نہ تھیں بلکہ سفید تھیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابن بحینہ رضی اللہ عنہ] ان کا پورا نام عبداللہ بن مالک بن قشب (''قاف'' کے نیچے کسرہ اور ''شین'' ساکن) اَزدی ہے۔ اور بُحینہ (تصغیر کے ساتھ) ان کی والدہ کا نام ہے۔ والدہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں

٢٣٥- أخرجه البخاري، الأذان، باب يبدي ضبعيه ويجافي في السجود، حديث: ٣٩٠، ومسلم، الصلاة، باب الاعتدال في السجود ووضع الكفين على الأرض .....، حديث: ٤٩٥.

ورنہ والد کا نام مالک ہے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ بڑے زاہد شب زندہ دار اور صائم النہار تھے۔ دنیا سے بڑے بے رغبت تھے۔ مدینے سے تیس میل کے فاصلے پر واقع وادی ریم میں ۵۴ اور ۵۸ ہجری کے درمیان وفات پائی۔

(۲۳۶) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدْتَّ فَضَعْ كَفَّيْكَ، وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[236] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو سجدہ کرے تو (اس وقت) اپنی ہتھیلیوں کو (زمین پر) ٹکا دے اور اپنی کہنیوں کو اوپر اٹھا لے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: فَضَعْ اس میں ''فا'' جزائیہ ہے اور ضَعْ وَضع سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی اس کے یہ ہوئے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا دو۔ رکھ دو۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں سجدہ کرتے وقت ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے اور کہنیوں کو اوپر اٹھانے کا حکم ہے البتہ ابوداود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے لمبا سجدہ کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکوہ کیا تو آپ نے انھیں کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر ذرا آرام لینے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ (سنن أبي داود، الصلاة، باب الرخصة في ذلك للضرورة، حديث: ۹۰۲) مگر یہ روایت سنداً صحیح نہیں۔ بصورت دیگر یہ عذر پر محمول ہے۔ ② اکثر و بیشتر روایات میں یہی مذکور ہے کہ سجدے میں آپ کی کہنیاں نہ تو زمین پر لگتیں اور نہ رانوں وغیرہ سے جس کی وجہ سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ آپ کا یہ عمل امت کے ہر فرد کے لیے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ ③ آپ کا حکم بھی یہ ہے کہ صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي ''تم اسی طرح نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' (صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة.....، حديث: ۶۳۱) کسی بھی صحیح و مرفوع روایت میں عورت کے لیے اس کے برعکس حکم ثابت نہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما] ابوعمارہ ان کی کنیت ہے۔ براء کی ''با'' پر فتحہ اور ''را'' مخفف ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: براء بن عازب بن حارث بن عدی۔ انصار کے قبیلۂ اوس کے فرد تھے اس لیے انصاری اور اوسی کہلائے۔ باپ اور بیٹا دونوں شرف صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر کم عمری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ پہلا معرکہ جس میں انھوں نے شرکت کی وہ احد یا خندق (دونوں میں سے کوئی ایک) ہے۔ الری کو فتح کیا۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور معرکۂ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے تھے۔ کوفہ میں ۷۲ ہجری میں فوت ہوئے۔

(۲۳۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَكَعَ فَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَإِذَا سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ. رَوَاهُ

[237] حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں کھلی رکھتے اور سجدے میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں باہم

۲۳۶۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب الاعتدال في السجود.....، حديث: ۴۹۴.

۲۳۷۔ [إسناده ضعيف] أخرجه الحاكم في المستدرك: ۱/ ۲۲۴، ۲۲۷ وصححه على شرط مسلم * هشيم مدلس وعنعن.

الْحَاكِمُ.

ملا لیا کرتے تھے۔ (اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [ضَمَّ أَصَابِعَهُ] اپنی انگلیاں باہم ملا لیتے، یعنی اس طرح اپنی انگلیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے سے ملاتے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو جاتا۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر کتب احادیث میں اس کے شواہد موجود ہیں جو کہ صحیح ہیں، مثلاً: سنن ابی داود میں حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنی ہتھیلیوں سے اپنے گھٹنوں کو پکڑ لیتے اور اپنی انگلیوں کو کھول لیتے۔ دیکھیے: (سنن أبي داود، الصلاة، حديث:٧٣١) اسی طرح سنن کبریٰ بیہقی میں بھی اس مسئلے کی تائید میں ایک روایت صحیح سند سے مروی ہے۔ دیکھیے: (٢/٨٤، ٨٥) اور اسی طرح سجدے کی حالت میں انگلیوں کو باہم ملانے اور انھیں قبلہ رو کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دیکھیے: (المستدرك للحاكم: ١/ ٢٢٧، والسنن الكبرى للبيهقي: ٢/ ١١٢) لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل حجت ہے۔ بنابریں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رکوع کی حالت میں انگلیوں کو کھلا رکھنا ہی مسنون ہے، نیز حالت سجدہ میں انگلیوں کا باہم ملانا اس لیے ہے کہ انگلیوں کا رخ قبلے کی طرف ہو جائے۔

(٢٣٨) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي مُتَرَبِّعًا. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[238] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ چار زانو بیٹھ کر نماز ادا فرما رہے تھے۔ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُتَرَبِّعًا] تَرَبُّع سے ماخوذ ہے۔ تربع یہ ہے کہ دائیں پاؤں کے نچلے حصے کو اپنی بائیں ران کے نیچے کر لینا اور بائیں قدم کا باطنی حصہ دائیں ران کے نیچے کر لینا، پھر پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھنا کہ انگلیاں کھلی ہوئی ہوں، جس طرح حالت رکوع میں کھلی ہوتی ہیں۔ (سبل السلام)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ صحیح ابن خزیمہ کی تحقیق میں اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ دیکھیے: (صحيح ابن خزيمة: ٢/ ٨٩) بنابریں عذر اور بیماری کی حالت میں اس طرح بیٹھ کر نماز ادا کرنا صحیح ہے جیسا کہ بعض علماء مذکورہ حدیث کی بابت لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ گھوڑے سے گر پڑے تھے، اس وجہ سے آپ نے اس طرح بیٹھ کر نماز ادا کی، لہٰذا مذکورہ روایت سے معلوم ہوا کہ عذر اور بیماری کی حالت میں اس طرح بیٹھ کر نماز ادا کرنا جائز اور مباح ہے۔ واللّٰه أعلم.

(٢٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[239] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

٢٣٨ـ [إسناده ضعيف] أخرجه النسائي، قيام الليل، باب كيف صلاة القاعد، حديث: ١٦٦٢، وابن خزيمة: ٢/ ٨٩ * حفص ابن غياث عنعن، وحديث البخاري، الأذان، حديث: ٨٢٧ يخالفه ولو صح لكان محمولاً على العذر.

٢٣٩ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الدعاء بين السجدتين، حديث: ٨٥٠، والترمذي، الصلاة، ◂◂

عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي، وَارْحَمْنِي، وَاهْدِنِي، وَعَافِنِي، وَارْزُقْنِي. رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظُ لِأَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

نبی ﷺ دو سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے: [اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي، وَارْحَمْنِي، وَاهْدِنِي، وَعَافِنِي، وَارْزُقْنِي] ''یا اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے راہ ہدایت پر چلا، مجھے عافیت عطا فرما اور مجھے رزق (حلال) عطا فرما۔'' (اسے نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابوداود کے ہیں۔ اور اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَافِنِي] معافات سے ماخوذ ہے۔ یہ دعائیہ صیغہ ہے، یعنی امر دعا کے لیے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ مجھے سلامتی اور عافیت سے نواز۔

فوائد و مسائل: ① نماز میں مختلف مواقع پر نبی ﷺ سے مختلف دعائیں منقول ہیں۔ اسی طرح دو سجدوں کے مابین جلسے کے موقع پر مذکورہ بالا دعا پڑھنا بھی منقول ہے۔ بعض روایات میں [وَارْفَعْنِي] اور بعض میں [وَاجْبُرْنِي] کا اضافہ بھی منقول ہے۔ (جامع الترمذي، الصلاة، حديث: ۲۸۴ و سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ۸۹۸) اور بعض میں مختصراً [رَبِّ اغْفِرْلِي، رَبِّ اغْفِرْلِي] کے الفاظ پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ (سنن أبي داود، الصلاة، حديث: ۸۷۴) اس لیے حسب حال جو دعا پڑھ لی جائے درست ہے۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے دعا کے الفاظ ذکر کرنے میں سہو ہوا ہے، دعا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس دعا کے الفاظ ابوداود کے ہیں جبکہ ابوداود میں [وَارْحَمْنِي] کے بعد [وَاهْدِنِي] کے بجائے [عَافِنِي] کا لفظ مذکور ہے۔ اور اسی طرح درست ہے۔ ③ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ مذکورہ دعا مکحول رحمہ اللہ سے مقطوع روایت، یعنی ان کا اپنا قول صحیح سند سے منقول ہے۔ دیکھیے تحقیق، تخریج حدیث ہذا۔ علاوہ ازیں دیگر محققین نے اسے صحیح اور حسن قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ۵/ ۳۰۴ و صفة الصلاة للألباني) بنابریں مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود قابل عمل اور قابل حجت ہے۔

(۲۴۰) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، فَإِذَا كَانَ فِي وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهِ لَمْ يَنْهَضْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَاعِدًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[240] حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو نماز ادا فرماتے دیکھا، جب آپ نماز کی طاق رکعت (پہلی اور تیسری) میں ہوتے تو سیدھے بیٹھنے سے پہلے کھڑے نہ ہوتے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي وِتْرٍ مِّنْ صَلَاتِهِ] جب آپ طاق رکعت، یعنی پہلی یا تیسری رکعت مکمل فرما لیتے اور دوسری یا

◀ حديث: ۲۸۴، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ۸۹۸، والحاكم: ۱/ ۲۶۲-۲۷۱ ٭ حبيب مدلس وعنعن وتسع بنحوه عن مكحول رحمه الله من قوله، رواه ابن المقرىء في معجمه (۱۳۵۷) وسنده صحيح.

۲۴۰ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب من استوى قاعدا في وتر من صلاته ثم نهض، حديث: ۸۲۳.

چوتھی کے لیے کھڑا ہونا چاہتے۔ [ثُمَّ يَنْهَضُ] نہ کھڑے ہوتے۔ [حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَاعِدًا] حتی کہ پہلے سیدھے ہو کر مکمل طور پر بیٹھ جاتے۔ اسے جلسۂ استراحت کہتے ہیں اور یہ مسنون و مشروع ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے جلسۂ استراحت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں مگر امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ اس کے قائل نہیں۔ وہ اسے بڑھاپے پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن یہ تاویل درست نہیں۔ نبی ﷺ نے مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء سے فرمایا تھا: [صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي] ''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' (صحيح البخاري، الصلاة، حديث: ٦٣١) اور وہی بیان کرتے ہیں کہ آپ جلسۂ استراحت کرتے تھے۔ خود راویٔ حدیث نے جب اسے بڑھاپے پر محمول نہیں کیا تو پھر یہ محمول تحکم محض ہے۔

(٢٤١) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَنَتَ شَهْرًا بَعْدَ الرُّكُوعِ، يَدْعُو عَلٰى أَحْيَاءٍ مِنْ أَحْيَاءِ الْعَرَبِ، ثُمَّ تَرَكَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[241] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے پورا مہینہ رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھی۔ اس میں آپ عرب کے قبیلوں میں سے بعض قبیلوں کے لیے بددعا فرماتے' پھر اسے چھوڑ دیا۔ (بخاری و مسلم)

وَلِأَحْمَدَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ نَحْوُهُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ. وَزَادَ: فَأَمَّا فِي الصُّبْحِ فَلَمْ يَزَلْ يَقْنُتُ حَتّٰى فَارَقَ الدُّنْيَا.

احمد اور دار قطنی نے ایک اور طریق سے اسے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ صبح کی نماز میں دعائے قنوت تادم زیست کرتے رہے۔

لغوی تشریح: [قَنَتَ] قنوت سے ماخوذ ہے۔ اس کے متعدد معانی ہیں۔ یہاں مراد ہے قیام کی حالت میں دوران نماز میں دعا کرنا۔ یہ دعا بعد از رکوع ہے۔ [عَلٰى أَحْيَاءٍ] عَلٰى اس جگہ نقصان و ضرر کے لیے استعمال ہوا ہے' یعنی جب کسی کے لیے بددعا کی جائے تو اس موقع پر دَعَا عَلَيْهِ بولا جاتا ہے' یعنی فلاں نے فلاں کے لیے بددعا کی۔ اور [أَحْيَاءٍ] جمع ہے حَيّ کی جس کے معنی قبیلہ کے ہیں۔ اور یہ قبائل (عہد شکن) رعل' ذکوان' عصیہ اور بنولحیان تھے۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بددعا کی' اس لیے کہ آپ نے ان کی درخواست پر پروردگار کے احکامات پہنچانے اور تبلیغ اسلام کے لیے ان قبائل نجد کی طرف اپنے ستر قاری اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا تھا۔ جب یہ قافلۂ مبلغین' بئر معونہ پر پہنچا...... اور یہ کنواں یا چشمہ بنی عامر کے علاقہ اور حرہ بنی سلیم کے درمیان واقع تھا بلکہ یہ حرہ بنی سلیم کے زیادہ قریب تھا...... تو بنوسلیم کے قبائل کے جھرمٹ میں سے عامر بن طفیل ان کی طرف نکلا...... اور یہ قبائل رعل' ذکوان اور عصیہ تھے۔ (جہاں یہ قراء حضرات ٹھہرے ہوئے تھے) وہیں ان قبائل کے لوگوں نے انھیں گھیرے میں لے لیا۔ ان قاریوں نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور مدمقابل دشمنوں سے خوب لڑے حتی کہ سب کے سب جام شہادت نوش کر

٢٤١ـ أخرجه البخاري، الوتر، باب القنوت قبل الركوع وبعده، حديث: ١٠٠٣، ومسلم، المساجد، باب استحباب القنوت في جميع الصلوات، حديث: ٦٧٧، وحديث "حتى فارق الدنيا" أخرجه أحمد: ٣/ ١٦٢، والدارقطني: ٢/ ٣٩، حديث: ١٦٧٧، وسنده ضعيف * أبوجعفر الرازي ضعيف فيما يرويه عن الربيع بن أنس، وهذا منه.

گئے۔صرف کعب بن زید رضی اللہ عنہ زندہ بچے۔کفار نے انھیں اس حالت میں چھوڑا تھا کہ زندگی کی رمق ابھی ان کے اندر باقی تھی مگر انھوں نے اپنے گمان کے مطابق انھیں مار دیا تھا۔اللہ نے انھیں زندگی عطا کی اور بالآخر غزوۂ خندق میں جام شہادت نوش فرمایا۔یہ المناک اور دردناک واقعہ غزوۂ احد کے چار ماہ بعد ۴ ہجری ماہ صفر میں پیش آیا۔بنولحیان کے حق میں بددعا کی وجہ یہ تھی کہ عضل وقارہ کے قبائل نے نبی اکرم ﷺ سے ایسے (عالم) آدمیوں کا مطالبہ کیا تھا جو انھیں اسلام کی دعوت دے سکیں اور انھیں احکام شریعت کی تعلیم دے سکیں' چنانچہ آپ نے دس عظیم حضرات ان کی جانب بھیجے۔جب یہ حضرات رجیع تک پہنچے...... یہ جگہ رابغ اور جدہ کے درمیان واقع ہے......تو ان قبائل کے لوگوں نے ان دس آدمیوں کے ساتھ دھوکا کیا اور بنولحیان کو بھی اشارہ کیا (شہہ دی۔) یہ ہذیل کے قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔یہ سب لوگ ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ان کو گھیرے میں لے لیا' چنانچہ ان لوگوں نے دو صحابۂ کرام حضرت خبیب بن عدی اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا اور ان کے علاوہ باقی تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو انھوں نے تہ تیغ کر دیا۔اور یہ واقعہ بھی ماہ صفر میں پیش آیا۔نبی اکرم ﷺ کو ان دونوں المناک واقعات کی اطلاع ایک ہی شب میں ملی۔اس سے نبی ﷺ نہایت ہی افسردہ اور غمگین ہوئے کہ پورا ایک مہینہ ان کے لیے بددعا کرتے رہے۔اور پھر بددعا کرنا ترک کر دیا۔اس قسم کی دعائے قنوت کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔فرضی نماز میں اس کے علاوہ کوئی قنوت نہیں ہے۔یہ دعائے قنوت بڑے بڑے المناک اور دردناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے ورنہ نبی ﷺ دعائے قنوت نہیں پڑھتے تھے' الا یہ کہ مسلمانوں کے لیے دعا فرمائیں یا کفار میں سے بدعہد' عہد شکن قسم کے لوگوں کے لیے بددعا کریں۔رہا نماز فجر میں مسند احمد اور دارقطنی کے حوالے سے قنوت کے پڑھنے کا التزام ومواظبت کا اضافہ تو یہ قابل استدلال نہیں کیونکہ یہ اضافہ سنداً ضعیف ہے' نیز قنوت نازلہ کسی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسے تمام نمازوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔نماز فجر میں آپ سے دعائے قنوت نازلہ ثابت ہے۔عہد شکنی اور بدعہدی کی بنا پر مقتول صحابہ کی وجہ سے مہینہ بھر آپ بددعا کرتے رہے۔ظاہر ہے یہ فرض نماز ہی تھی۔اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد دعا فرماتے رہے۔② یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین تبلیغ ہے۔مبلغین کی جماعت تیار رہنی چاہیے' جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جماعتی شکل میں تبلیغ کے لیے جانا چاہیے۔③ نظم جماعت کی طرف بھی اس سے اشارہ ملتا ہے اور اطاعت امیر بھی اس سے ظاہر ہے۔④ ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ذاتی علم غیب نہیں رکھتے تھے۔اگر آپ کو علم غیب ہوتا تو اپنے تیار مبلغین کو قتل کے لیے کیوں بھیجتے۔نعوذ باللہ! جان بوجھ کر تو آپ نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی اس وقت تک آپ کو اپنے بھیجے ہوئے مبلغین کی صورت حال کی کچھ خبر نہیں تھی۔⑤ احناف اسی حدیث کی روشنی میں بوقت ضرورت قنوت نازلہ کے قائل ہیں جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نماز فجر میں ہمیشہ دعائے قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں۔⑥ قنوت نازلہ کا طریقہ یہ ہے کہ امام رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

(٢٤٢) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَقْنُتُ إِلَّا إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ أَوْ دَعَا عَلَى قَوْمٍ. صَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[242] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب کسی قوم کے حق میں دعا یا کسی کے لیے بددعا کرتے تو صرف اسی وقت قنوت پڑھتے تھے (ورنہ نہیں پڑھتے تھے)۔ (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كَانَ لَا يَقْنُتُ] یعنی فرضی نماز میں قنوت نازلہ نہیں پڑھتے تھے۔ [إِلَّا إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ] مگر جب کسی قوم کے نفع کے لیے یا مصیبت سے نجات و چھٹکارے کے لیے دعا کرتے۔ [دَعَا عَلَى قَوْمٍ] کسی قوم پر بددعا کرتے۔

(٢٤٣) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ طَارِقٍ الْأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي: يَاأَبَتِ! إِنَّكَ قَدْ صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ، أَفَكَانُوا يَقْنُتُونَ فِي الْفَجْرِ؟ قَالَ: أَيْ بُنَيَّ مُحْدَثٌ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا أَبَا دَاوُدَ.

[243] حضرت سعد بن طارق اشجعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد سے استفسار کیا: ابا جان! آپ نے رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ کیا یہ سب نماز فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ بیٹا! یہ نئی بات ہے۔ (اسے ابوداود کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَيْ بُنَيَّ] أَيْ حرف ندا ہے اور بُنَيَّ کے "با" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید ہے۔ "ابن" کی تصغیر ہے اور یائے متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اور اس کے معنی ہیں: اے میرے بیٹے! [مُحْدَثٌ] إحداث سے اسم مفعول ہے، یعنی گھڑی ہوئی، خود ساختہ (بدعت) جو دور رسالت میں موجود نہیں تھی، چنانچہ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قنوت نازلہ بسا اوقات پڑھنا ثابت ہے، اس پر دوام اور ہمیشگی ثابت نہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کی روشنی میں یہ استدلال کرنا کہ نماز میں قنوت پڑھنا بدعت ہے درست نہیں۔ ② حضرت طارق رضی اللہ عنہ نے مطلقاً قنوت کو بدعت نہیں کہا بلکہ فجر کی نماز میں قنوت ہمیشہ پڑھنے کو بدعت کہا۔ ③ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایک کام اصل میں سنت ہوتا ہے لیکن اسے غلط طریقے سے انجام دینے یا اسے اس کی اصل حیثیت سے گھٹا بڑھا دینے کی وجہ سے وہ بدعت بن جاتا ہے، یعنی اس عمل کی وہ خاص کیفیت بدعت ہوتی ہے اگرچہ اصل عمل بدعت نہ ہو۔

راوئ حدیث: [حضرت سعد رحمہ اللہ] پورا نام سعد بن طارق بن اَشْیم (احمر کے وزن پر) بن مسعود اشجعی کوفی ہے۔ ان کی کنیت ابومالک تھی۔ ثقہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۴۰ ہجری کے آخر میں فوت ہوئے۔

٢٤٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن خزيمة: ١/ ٣١٤، حديث: ٦٢٠ * سعيد بن أبي عروبة وقتادة عنعنا.

٢٤٣ـ [إسناده صحيح] أخرجه الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في ترك القنوت، حديث: ٤٠٢، وقال: "هذا حديث حسن صحيح"، والنسائي، التطبيق، حديث: ١٠٨٠، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٢٤١، وأحمد: ٣/ ٤٧٢ و٦/ ٣٩٤.

[حضرت طارق اشجعی رضی اللہ عنہ] طارق بن اشیم بن مسعود اشجعی کوفی۔ مشہور صحابی ہیں۔ قلیل الحدیث ہیں۔ ان سے صرف چودہ احادیث نقل کی گئی ہیں۔ اور ان کے بیٹے سعد کے علاوہ ان سے کسی نے روایت نہیں کی۔ کوفیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

(٢٤٤) وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّهُ قَالَ: عَلَّمَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي قُنُوتِ الْوِتْرِ: «اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ: «وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ». زَادَ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ فِي آخِرِهِ: «وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ».

[244] حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے چند کلمات سکھائے کہ میں انھیں وتر کی قنوت میں پڑھا کروں۔ (اور وہ یہ ہیں:) [اَللّٰهُمَّ! اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ.....الخ] ''اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں میں شامل فرما جنھیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے۔ اور مجھے عافیت دے کر ان میں شامل فرما دے جنھیں تو نے عافیت بخشی ہے۔ اور جن کو تو نے اپنا دوست قرار دیا ہے ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لیے برکت ڈال دے اور جس چیز کا تو نے فیصلہ فرما دیا ہے اس کے شر و برائی سے مجھے محفوظ رکھ اور بچا لے۔ یقینا فیصلہ تو ہی صادر فرماتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس کا تو والی بنا وہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے پروردگار! تو ہی برکت والا اور بلند و بالا ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔) طبرانی اور بیہقی نے [وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ] کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ یعنی اور جس سے تو نے دشمنی کی وہ عزت نہیں پا سکتا' نیز نسائی نے ایک دوسرے طریق سے اس دعا کے آخر میں [وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ] کا اضافہ بھی روایت کیا ہے' یعنی اور اللہ' نبی ﷺ پر رحمت نازل فرمائے۔

٢٤٤۔ [صحیح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب القنوت في الوتر، حديث: ١٤٢٥، والترمذي، الوتر، حديث: ٤٦٤، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٧٤٦، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٧٨، وأحمد: ١/ ١٩٩، قوله: "ولا يعز من عاديت" أخرجه البيهقي: ٢/ ٢٠٩، والطبراني في الكبير: ٣/ ٧٣، حديث: ٢٧٠١، وأبوداود، الوتر، حديث: ١٤٢٥، وقوله: "وصلى الله على النبي" أخرجه النسائي، قيام الليل، حديث: ١٧٤٧ وزاد "محمد" وسنده ضعيف، وثبت موقوفًا عن أبي بن كعب عند ابن خزيمة: ٢/ ١٥٥، حديث: ١١٠٠، وحديث ابن عباس أخرجه البيهقي: ٢/ ٢١٠ وسنده ضعيف، ابن جريج عنعن.

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا دُعَاءً نَدْعُو بِهِ فِي الْقُنُوتِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ. وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

اور بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں دعا سکھاتے تھے جسے ہم صبح کی نماز میں دعائے قنوت کی صورت میں مانگتے تھے۔ (اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: [تَوَلَّنِي] یعنی میرے کام کا والی بن جا اور اس کی اصلاح کر دے یا مجھے دوست بنا لے۔ [فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ] یعنی ان لوگوں کے کاموں کی طرح جن کی تو نے اصلاح کی ہے یا ان لوگوں کی طرح جن کو تو نے دوست بنایا۔ [وَقِنِي] میری حفاظت فرما۔ [شَرَّ مَا قَضَيْتَ] یعنی ہر اس شر سے جو تو نے تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ [فَإِنَّكَ تَقْضِي] یعنی تو مقدر کرتا ہے اور حکم فرماتا ہے جس کا بھی تو ارادہ کرتا ہے۔ [وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ] مجہول کا صیغہ ہے، یعنی تجھ پر کسی قسم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ [إِنَّهُ] شان یہ ہے کہ۔ یہ ضمیر شان ہے۔ [لَا يَذِلُّ] "یا" پر فتحہ اور "ذال" کے نیچے کسرہ ہے، یعنی وہ ذلیل نہیں ہوتا، رسوا نہیں ہوتا۔ [مَنْ وَّالَيْتَ] یہ مُوَالَاۃ سے ماخوذ ہے اور مُعَادَاۃ کی ضد ہے، یعنی جس کا تو والی بن جاتا ہے۔ [وَلَا يَعِزُّ] "یا" پر فتحہ اور "عین" کے نیچے کسرہ ہے، یعنی وہ صاحب عزت و شرف نہیں ہو سکتا۔ [مَنْ عَادَيْتَ] یعنی جس کا تو دشمن ہو جائے۔ اس دعا کے ساتھ صبح کی نماز میں قنوت کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ [يُعَلِّمُنَا] تعلیم سے ماخوذ ہے، یعنی وہ ہمیں سکھاتے تھے۔ [دعاء] گزشتہ دعا، یعنی [اَللّٰهُمَّ! اهْدِنِي] والی دعا۔ اور یہ بات کہ وہ ہمیں صبح کی نماز کے لیے یہ سکھاتے تھے، ضعیف ہے۔ جس طرح مصنف نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اس میں عبدالرحمٰن بن ہرمز ضعیف راوی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز وتر میں یہ دعا پڑھنی چاہیے۔ ② دعائے قنوت وتر کی بابت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعائے قنوت وتر رکوع سے قبل پڑھتے تھے۔ (سنن النسائي، قیام اللیل، حدیث: ۱۷۰۰، و سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، حدیث: ۱۱۸۲) نیز حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل مذکور ہے کہ وہ بھی قنوت وتر رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔ (مصنف ابن أبي شیبة: ۲/ ۹۷) بنابریں مسنون طریقہ یہی ہے کہ وتروں میں دعائے قنوت قبل از رکوع ہو، البتہ قنوت نازلہ بالخصوص رکوع کے بعد ہی ثابت ہے، تاہم بعض علماء دعائے قنوت وتر رکوع کے بعد پڑھنے کے قائل ہیں، وہ بھی جائز ہے لیکن علمائے محققین حافظ ابن حجر، شیخ البانی، صاحب مرعاۃ مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ اور ہمارے فاضل محقق، نیز دیگر علماء نے قنوت وتر قبل از رکوع والی روایات کو زیادہ صحیح کہا ہے اور بعد از رکوع والی روایات پر انھیں ترجیح دی ہے جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ افضل اور اولیٰ یہی بات ہے کہ قنوت وتر قبل از رکوع پڑھی جائے۔ واللہ اعلم۔ ③ اس دعا کے آخر میں جو صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ کے الفاظ ہیں، بعض حضرات نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، تاہم ان الفاظ کو دعا کے آخر میں پڑھ لینے میں کچھ قباحت نہیں کیونکہ حضرت ابوحلیمہ معاذ بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ وہ قنوت وتر میں نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام پڑھا کرتے تھے۔ (فضل الصلاۃ علی النبي ﷺ للإمام إسماعیل القاضي، رقم: ۱۰۷) اور یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کا ہے۔ اس اثر کو حافظ ابن حجر اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (صفة صلاة النبي، ص: ۱۸۰) نیز حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

کے بارے میں ہے کہ وہ بھی قنوت وتر میں نبی اکرم ﷺ پر درود وصلاۃ پڑھا کرتے تھے۔ اس اثر کی سند بھی صحیح ہے' امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ دیکھیے: (صفة صلاة النبي' ص: ١٨٠) ④ نماز وتر کی حیثیت کیا ہے اور اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور یہی بات راجح ہے۔ رہا تعداد کا معاملہ تو اس کی تعداد احادیث سے ایک سے لے کر گیارہ تک معلوم ہوتی ہے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم' صلاة المسافرين' حديث: ٧٣٦-٧٣٩' وسنن أبي داود' الوتر' حديث: ١٤٢١-١٤٢٢' وسنن النسائي' قيام الليل' حديث: ١٦٩٧' ١٦٩٨' ١٧٠٥' ١٧٠٦' ١٧١٠' وسنن ابن ماجه' إقامة الصلوات' حديث: ١١٩٠' ١١٩٢) احناف تین کے قائل ہیں۔ تین وتر پڑھنے کی نوعیت مختلف ہے۔ تین وتر ایک ہی تشہد سے یا دو رکعت کے بعد تشہد' درود شریف' دعا اور سلام اور پھر ایک وتر علیحدہ پڑھا جائے۔ دیکھیے: (سنن ابن ماجه' حديث: ١١٧٧' وسنن الدارقطني: ٢/ ٢٥' ٢٧' وصحيح ابن حبان' حديث: ٦٨٠) پانچ وتر میں صرف آخر میں ایک تشہد ہے' سات وتر میں دو طریقے جائز ہیں: چھٹی رکعت میں تشہد پڑھ کر بغیر سلام کے کھڑا ہوا جائے اور آخری رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے' یا پھر صرف آخری رکعت میں تشہد پڑھا جائے۔ اگر نو وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو آٹھویں میں تشہد' درود شریف و دعا کے بعد بغیر سلام کے نویں رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیا جائے' یا ہر دو دو رکعت پر سلام اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے' یا پھر چھٹی رکعت میں تشہد اور درود شریف پڑھ کر کھڑا ہوا جائے اور ساتویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرے اور پھر بعد میں دو رکعتیں پڑھے۔ مگر احناف صرف تین وتر کے قائل ہیں اور اس میں نماز مغرب کی طرح دو تشہد پڑھتے ہیں جو کہ صحیح روایات کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز وتر تین رکعت پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے لیکن ان میں نماز مغرب کی مشابہت سے منع کیا ہے اور وہ مشابہت اسی طرح بنتی ہے کہ تینوں رکعتیں دو تشہد اور ایک سلام سے پڑھی جائیں۔ ہاں' اگر نماز وتر کی تینوں رکعتیں ایک تشہد اور سلام ہی سے پڑھی جائیں یا پھر دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور ایک رکعت الگ پڑھی جائے تو یہ درست اور مسنون ہے جس طرح کہ خود رسول اللہ ﷺ کا اپنا معمول بھی یہی تھا کہ آپ نماز تہجد دو دو رکعت کر کے پڑھتے رہتے اور پھر سب سے آخر میں ایک رکعت وتر پڑھ لیتے۔ واللہ أعلم. (صحيح البخاري' الوتر' حديث: ٩٩٥' وصحيح مسلم' صلاة المسافرين' حديث: ٧٤٩ بعد الحديث: ٧٥٣) ⑤ دعائے قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کے بارے میں کوئی مرفوع روایت نہیں ہے' تاہم ابن ابی شیبہ میں کچھ آثار ملتے ہیں جن میں ہاتھ اٹھانے کا تذکرہ ہے۔ دیکھیے: (مصنف ابن أبي شيبة: ٢/ ١٠١) ⑥ بعض علماء کے نزدیک ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ اٹھائے بغیر' دونوں طریقوں سے قنوت وتر پڑھنا صحیح ہے' البتہ ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھنا اس لیے راجح ہے کہ ایک تو قنوت نازلہ میں نبی ﷺ سے ہاتھ اٹھانا ثابت ہے' لہٰذا اس پر قیاس کرتے ہوئے قنوت وتر میں بھی ہاتھ اٹھانے صحیح ہوں گے۔ اور دوسرے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے۔ ⑦ عام دعا کے اختتام پر ہاتھوں کو منہ پر پھیرنا گو کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر بعض صحابہ' مثلاً: حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے یہ عمل ثابت ہے۔ دیکھیے: (الأدب المفرد' حديث: ٦٠٩) اس لیے اس کا جواز ہے' تاہم اگر کوئی شخص دعائے قنوت کے بعد ہاتھ منہ پر نہیں پھیرتا تو اس کا یہ عمل صحیح ہے کیونکہ اس کا ثبوت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی نہیں ملتا۔

 راویٔ حدیث: [حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما] رسول اللہ ﷺ کے نواسے' آپ کے دل کا سرور اور دنیا میں آپ کے

لیے خوشبو تھے۔ جنت کے نوجوانوں کے سرداروں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت حسن ؓ رمضان ۳ ہجری کو پیدا ہوئے اور انھیں ان کے والد گرامی حضرت علی ؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا لیکن اپنی خلافت کے سات ماہ بعد جمادی الاولی ۴۱ ہجری کو حضرت امیر معاویہ ؓ کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا تاکہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان خون نہ بہے۔ ۴۹ ہجری کو فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(۲٤٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ**». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ.

[245] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور چاہیے کہ گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔'' (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔)

وَهُوَ أَقْوَى مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ. أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ. فَإِنَّ لِلْأَوَّلِ شَاهِدًا مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، صَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ مُعَلَّقًا مَوْقُوفًا.

اور یہ مذکورہ حدیث حضرت وائل بن حجر ؓ سے مروی حدیث سے قوی تر ہے جس میں یہ ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو سجدے میں جاتے دیکھا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث کا شاہد حضرت ابن عمر ؓ کی حدیث ہے جسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً موقوف بیان کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ] یعنی جب سجدہ کرنے کے لیے جھکے۔ [فَلَا يَبْرُكْ] باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے نہی کا صیغہ ہے، یعنی نہ بیٹھے۔ [كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ] جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سجدہ کرنے کے لیے جھکتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنے چاہئیں اور بعد میں گھٹنے۔ [وَهُوَ] سے مراد یہاں حضرت ابوہریرہ ؓ کی یہی حدیث ہے۔ [أَقْوَى] سند کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ [مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ] وائل بن حجر سے مروی حدیث سے زیادہ قوی ہے جس میں گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھنے کا ذکر ہے۔ [فَإِنَّ لِلْأَوَّلِ] سے مراد حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی مذکورہ بالا حدیث ہے۔ [شَاهِدًا] جو اس کی حدیث کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ جسے ''دراوردی'' نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے مرفوع روایت کیا ہے۔ [وَذَكَرَهُ] یعنی وہ شاہد ذکر کیا ہے۔ [الْبُخَارِيُّ مَوْقُوفًا] یعنی نافع ؒ کا قول ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ اسے بخاری نے

۲٤٥۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه، حديث: ٨٤٠، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٦٩، والنسائي، التطبيق، حديث: ١٠٩٢، وحديث وائل: "وضع ركبتيه قبل يديه" أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٨٣١، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٦٨، والنسائي، التطبيق، حديث: ١٠٩٠، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ٨٨٢، وسنده ضعيف، شريك القاضي عنعن، وحديث ابن عمر ذكره البخاري معلقا موقوفا، الأذان، قبل حديث: ٨٠٣، وابن خزيمة: ١/ ٣١٨، ٣١٩، حديث: ٦٢٧.

موقوفاً نقل کیا ہے۔ اور ان کا اس قول کو اپنی ''صحیح'' میں صیغۂ جزم کے ساتھ نقل کرنا اس کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

 **فوائد و مسائل:** ① حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرنے میں راوی حدیث شریک' عاصم بن کلیب سے بیان کرنے میں تنہا ہے۔ اور وہ جب تنہا کوئی روایت بیان کرے تو اس کی روایت میں محدثین نے کلام کیا ہے۔ اور حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید گو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جو مجہول ہے' لہٰذا ثابت ہوا کہ باعتبار سند حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث راجح ہے۔ اور بحیثیت معنی تو یہ حقیقت معلوم ہے کہ حیوان کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں' یعنی اس کی اگلی ٹانگوں میں گھٹنے ہوتے ہیں اور یہ مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ اونٹ جب نیچے بیٹھنے کے لیے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیکتا ہے' پھر بیٹھتا ہے۔ جس کی تفصیل تحفة الأحوذي میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ② سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں یا گھٹنے؟ اس سلسلے میں دو روایتیں منقول ہیں: ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے' جس میں ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کا ثبوت ہے اور دوسری حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں پہلے گھٹنے رکھنے کا ذکر ہے۔ مصنف' یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو راجح قرار دیا ہے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عام محدثین اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں مگر احناف اور شوافع حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے جائیں جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(٢٤٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ لِلتَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى رُكْبَتِهِ الْيُسْرٰى، وَالْيُمْنٰى عَلَى الْيُمْنٰى، وَعَقَدَ ثَلَاثًا وَّخَمْسِينَ، وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[246] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپین (۵۳) کی گرہ دیتے اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُ: وَقَبَضَ أَصَابِعَهُ كُلَّهَا، وَأَشَارَ بِالَّتِي تَلِي الْإِبْهَامَ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ اپنی تمام انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے۔

لغوی تشریح: عَقَدَ ثَلَاثًا وَّ خَمْسِينَ اپنی انگلیوں کو گرہ دے کر ترپین کے عدد کی شکل بنا لیتے۔ اس کی صورت اس طرح ہوئی کہ اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو سبابہ (انگشت شہادت) کے نیچے کر لیتے۔ سَبَّابَة "با" پر تشدید ہے۔ انگوٹھے کے ساتھ متصل انگشت کو کہتے ہیں۔ اس انگشت کا نام سبابہ' یعنی گالی دینے والی کیوں پڑ گیا؟ اس لیے کہ دور جاہلیت میں گالی گلوچ کے موقع پر لوگ اس انگلی سے اشارہ کرتے تھے بلکہ ہمارے مہذب زمانے میں بھی آج کل لوگ

٢٤٦_ أخرجه مسلم، المساجد، باب صفة الجلوس في الصلاة، حديث: ٥٨٠.

اس طرح اشارہ کرنے سے کوئی مراد لیتے ہیں۔ احادیث میں تشہد کی حالت میں بیٹھتے وقت دائیں ہاتھ کو گرہ دینے کی صورت میں تین حالتیں یا صورتیں وارد ہوئی ہیں: پہلی تو یہی ترپن کی شکل جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری اس طرح کہ انگشت شہادت کو چھوڑ کر باقی ساری انگلیوں کو ہتھیلی کے ساتھ ملا دینا' اور یہ وہی ہیئت ہے جس کا [وَ قَبَضَ أَصَابِعَهُ كُلَّهَا] کے ذریعے سے اشارہ کیا گیا ہے اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ انگشت وسطی اور انگوٹھے کا حلقہ بنایا جائے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ اس موقع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ ذہن نشین رہے کہ حساب کا شمار کرنے کے لیے اہل عرب بھی ایک معروف طریقہ استعمال کرتے رہے ہیں جسے صاحب سبل السلام نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک کے عدد کے لیے خنصر (چھوٹی انگلی) کو ہتھیلی کے باطن (اندرونی طرف) کے قریب گرہ کی شکل میں موڑ دینا۔ اور دو کے عدد کے لیے خنصر اور بنصر (چھوٹی کے ساتھ والی) دونوں کو ہتھیلی کے اندرونی طرف موڑ دینا۔ اور تین کے لیے انگشت وسطی (بڑی' درمیانی) کو بھی خنصر اور بنصر کے ساتھ بند کر دینا۔ اور چار کے عدد کے لیے خنصر کو کھول دینا۔ اور پانچ کے لیے بنصر کو خنصر کے ساتھ کھول دینا اور وسطی کو بدستور بند رکھنا۔ اور چھ کے عدد کے لیے تنہا بنصر کو بند کر دینا اور باقی انگلیوں کو کھلا رکھنا۔ اور سات کے عدد کے لیے خنصر کو ہتھیلی سے ملے ہوئے انگوٹھے کے حصے کی طرف دراز کر دینا۔ اور آٹھ کے عدد کے لیے بنصر کو اس کے اوپر پھیلا دینا۔ اور نو کے عدد کے لیے ان پر انگشت وسطی کو پھیلا دینا۔ یہ طریقہ تو تھا اکائی کی گنتی کے لیے۔ اب دہائی کو لے لیں۔ دس کے عدد کو نمایاں کرنے کے لیے انگوٹھے کے سر کو انگشت شہادت کے سرے کی طرف گرہ کی صورت میں موڑ دیا جائے۔ اور بیس کے عدد کے لیے انگشت شہادت اور وسطی کے درمیان میں انگوٹھے کو داخل کرنا۔ اور تیس کے عدد کے لیے انگشت سبابہ کے سر کو انگوٹھے کے سر پر گرہ کی شکل دے دیں' یعنی دس کے عدد کے اظہار کے لیے جو صورت بنتی ہے یہ اس کے برعکس ہے۔ اور چالیس کے لیے انگوٹھے کو انگشت سبابہ کے درمیان جہاں گرہ پڑتی ہو' پر سوار کر دینا اور انگوٹھے کو اس کی جڑ کی طرف موڑ دینا۔ اور پچاس کے لیے انگوٹھا سبابہ کی جڑ کی طرف موڑ دینا' یعنی انگوٹھے کے اندرونی حصے کو اس خط پر رکھنا جو سبابہ اور انگوٹھے کے درمیان ہے۔ اور ساٹھ کے عدد کے لیے سبابہ کو انگوٹھے کی پشت پر سوار کر دینا' یعنی چالیس کی جو صورت بنتی ہے اس کے برعکس۔ اور ستر کے عدد کے لیے انگوٹھے کے سر کو سبابہ کی وسطی گرہ (باطنی حصہ) پر ڈال دینا اور سبابہ کے سرے کو انگوٹھے کی طرف لوٹا دینا۔ اور اسّی کے عدد کے لیے سبابہ کے کنارے کو اس کی جڑ کی طرف لوٹا دینا اور انگوٹھے کی جانب سے سبابہ کے پہلو پر انگوٹھے کو پھیلا دینا۔ اور نوے کے عدد کے لیے سبابہ کو انگوٹھے کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور انگوٹھے کے ساتھ ملا دینا۔ رہا سیکڑوں کی گنتی کا طریقہ تو وہ اکائیوں کی طرح ہے نو سو تک بائیں ہاتھ پر۔ اور ہزاروں کی گنتی کا طریقہ شمار دہائیوں کی طرح ہے وہ بھی بائیں ہاتھ پر۔ اب رہا تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ کرنا کہ یہ کب اور کس طرح کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشہد کے آغاز ہی سے لے کر اختتام تشہد تک انگلی کو ایک ہی ہیئت میں رکھے اور یہ صورت ترپن کے عدد کی سی بنتی ہے۔ یہ اشارہ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے مگر یہ روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں اس کی تردید کرتی ہے کیونکہ [وَ أَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ] کا عطف قول ماقبل پر ہے۔ اور عطف مغایرت کا متقاضی ہے۔ اور اشارہ ترپن کی گرہ سے پیدا شدہ ہیئت پر زائد چیز ہے۔ ابن خزیمہ اور بیہقی میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی

ہے جس میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی انگلی اوپر اٹھائی' پھر میں نے دیکھا کہ آپ اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے۔ (صحیح ابن خزیمة ، حدیث: ۷۱۴' والبیهقي: ۲/ ۱۳۲) ظاہر ہے کہ حرکت تو کسی چیز کو ایک ہی ہیئت پر برقرار رکھنے کے منافی ہے۔ اور جس روایت میں آیا ہے کہ آپ حرکت نہیں دیتے تھے حافظ ابن قیم ؒ نے زادالمعاد میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ اشارہ اس وقت کرتے جب لا إله إلا الله کہتے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تشہد کی حالت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے یا تو وہ کسی محسوس چیز کی طرف ہوگا یا کسی معنوی چیز کی طرف جو ذہن میں ہوگی۔ نماز تو بہرحال کسی حسی اشارے کا موقع محل نہیں اور نہ امام کے سامنے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرے' لہٰذا اشارے میں کوئی ایسی چیز ہی ہوسکتی ہے جس کا ذہن میں تصور ہو اور اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب کلمۂ توحید لا إله إلا الله ہے کیونکہ کسی چیز کی وحدانیت بیان کرنے کے لیے ایک انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا لوگوں کے ہاں متعارف اور مشہور ہے۔ یہ بات گو عقلاً قابل توجہ ہے مگر سنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آپ لا إله إلا الله پر یوں اشارہ کرتے کہ لا إله پر انگلی کو اوپر اٹھاتے اور إلا الله پر نیچے کر لیتے۔ شیخ البانی ؒ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں حتی کہ اس کے بارے میں کوئی من گھڑت روایت بھی نہیں۔ (صفة صلاة النبي ، ص: ۱۴۰) اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ اشارہ شیطان کے لیے بمنزلہ نیزے کے ہے۔ (مسند أحمد: ۲/ ۱۱۹) لیکن کلمۂ توحید پر یوں اشارے کی کیفیت بہرحال سنت سے ثابت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد طلب مغفرت اور گناہوں سے درگزر کی طرف اشارہ ہو۔ اور اس کی تائید حضرت وائل بن حجر ؓ کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا آپ اسے حرکت دے رہے تھے اور دعا کر رہے تھے۔ یقیناً دعا حقیقت میں تذلل و انکسار سے مانگنے کو کہتے ہیں۔ اور کلمۂ توحید مانگنے کا کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اقرار و اثبات اور شہادت و گواہی کا کلمہ ہے۔ اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشارہ ابتدا سے آخر تشہد تک ہونا چاہیے' کیونکہ آداب دعا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے جیسا کہ امام بیہقی ؒ وغیرہ نے فرمایا ہے۔ اور آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور پھر لا إله إلا الله فی الجملہ دعا بھی ہے کیونکہ دعا کی دو قسمیں ہیں: ایک دعائے ثنا اور دوسری دعائے طلب۔ اور پورا تشہد دعا کی ان دونوں قسموں پر مشتمل ہے' اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ اشارہ ابتدا سے اختتام دعا تک ہونا چاہیے اور اشارے کے ساتھ انگلی کو حرکت بھی دینی چاہیے۔ ایک قول یہ ہے کہ ابتدائے تشہد سے آخر نماز تک یا تیسری رکعت کے لیے اٹھنے تک حرکت جاری رہنی چاہیے۔ اس کا استدلال يَدْعُو بِهَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے کیونکہ نمازی جب تک تشہد میں ہوتا ہے اس وقت تک دعا میں مصروف ہوتا ہے' حالانکہ یہ نہایت ضعیف استنباط ہے اور کسی عاقل سے مخفی نہیں کیونکہ يدعو بها اس پر تو دلالت نہیں کرتا کہ انگلی کی حرکت' کی جانے والی دعا کے لیے اشارہ ہے۔ اور یہ کوئی لازمی نہیں کہ دعا نے انگلی کے ساتھ دعا کسی بھی کی جائے۔

 **فوائد و مسائل:** ① اس حدیث میں ہے: [عقد ثلاثًا و خمسين] تشہد میں بیٹھے ہوئے جب اشارہ فرماتے تو اپنے انگوٹھے کو پاس والی انگلی کی جڑ میں رکھتے اور باقی انگلیوں کو بند رکھتے۔ اسی طرح ہمیں کرنا چاہیے' تاکہ سنت پر عمل ہو جائے۔ ② تشہد میں انگشت شہادت سے اشارے پر سب ائمہ متفق ہیں۔ ملا علی قاری مشہور حنفی عالم نے رفع سبابہ پر دو مستقل رسالے لکھے ہیں جن میں صحیح احادیث لا کر ثابت کیا ہے کہ رفع سبابہ مسنون ہے اور خلاصہ کیدانی وغیرہ میں جو

اسے حرام لکھا گیا ہے اس کی بڑی سخت تردید کی ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتب درمختار، شامی اور شرح وقایہ وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔

(٢٤٧) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اِلْتَفَتَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ، فَيَدْعُو». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[247] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو تشہد میں یوں کہے: [اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ...... الخ] ”تمام قولی، فعلی اور مالی عبادتیں صرف اللہ کے لیے ہیں۔ اے نبی! سلام ہو آپ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“ پھر اسے اس دعا کا انتخاب کرنا چاہیے جو اسے سب سے اچھی لگے اور وہ مانگے۔“ (بخاری و مسلم- الفاظ بخاری کے ہیں۔)

وَلِلنَّسَائِيِّ: كُنَّا نَقُولُ قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ عَلَيْنَا التَّشَهُّدُ. وَلِأَحْمَدَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ التَّشَهُّدَ، وَأَمَرَهُ أَنْ يُعَلِّمَهُ النَّاسَ.

اور سنن نسائی میں ہے کہ ہم تشہد فرض ہونے سے پہلے (کچھ کلمات) کہا کرتے تھے۔ اور مسند احمد میں ہے کہ نبی ﷺ نے اسے تشہد سکھایا اور حکم دیا کہ اسے لوگوں کو سکھاؤ۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ: «اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ» إِلٰى آخِرِهِ.

اور مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں یوں تشہد سکھاتے تھے: [اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ ......الخ]

لغوی تشریح: [اَلتَّحِيَّاتُ] اَلتَّحِيَّةُ کی جمع ہے۔ اس کے معنی عظمت و بزرگی اور دوام و ہمیشگی کے ہیں، یا پھر اس سے مراد قولی و زبانی عبادات ہیں۔ [اَلصَّلَوَاتُ] نماز پنجگانہ یا پھر مطلق عبادات یا عبادات فعلیہ۔ [اَلطَّيِّبَاتُ] عمدہ کلام مثلاً: اللہ کی حمد و ثنا اور ذکر الٰہی اور اقوال صالحہ مراد ہیں، یا پھر ان سے عام اعمال صالحہ مراد ہیں، یا مالی عبادات بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ اور ان کے طیب ہونے سے مراد ان کا ہر قسم کے عیوب سے پاک ہونا اور ان سے اللہ کی خوشنودی کا طلب کرنا

٢٤٧- أخرجه البخاري، الأذان، باب التشهد في الآخرة، حديث: ٨٣١، ومسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة، حديث: ٤٠٢، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٨٩، والنسائي، السهو، حديث: ١٢٧٨، وأحمد: ١/ ٣٧٦، وحديث ابن عباس أخرجه مسلم، الصلاة، حديث: ٤٠٣.

ہے۔ [أُعْجَبُهُ] جو اسے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہو۔ [كُنَّا نَقُولُ] مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کیا کہتے تھے بلکہ تمام حدیث کو حذف کر دیا ہے' اس لیے ذکر نہیں کیا کہ مصنف کا مقصود یہ تنبیہ کرنا تھا کہ [قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ] کا جملہ فرضیت تشہد پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد مسند احمد کی وہ روایت بیان کی ہے جو اس کی تائید کرتی ہے' کیونکہ تشہد کی تعلیم کا حکم فرمانا اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور مصنف کا مقصد تشہد کے فرض ہونے سے پہلے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کیا کہتے تھے کو بیان کرنا نہیں ہے' اس لیے اسے حذف کر دیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ کہا کرتے تھے: [اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَى جِبْرَئِيلَ وَ مِيكَائِيلَ] اس پر رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا کہ اس طرح نہ کہا کرو بلکہ اس طرح کہا کرو: [اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ...... الخ]

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تشہد کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے۔ دعا کون سی مانگی جائے؟ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے جتنی چاہے مانگ سکتا ہے' تاہم نبی ﷺ کی فرمودہ دعائیں افضل ہیں۔ قرآنی دعائیں بھی مانگ سکتا ہے اور اپنی ضروریات کے لیے دیگر دعائیں بھی۔ ② اس حدیث سے تشہد کا واجب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ③ حضرت عمر' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ دوسرے اہل علم کے نزدیک فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے جو الفاظ مروی ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر علماء نے انھیں پسند کیا ہے کیونکہ یہ تشہد کے باب میں صحیح ترین روایت ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد کو اختیار کیا ہے۔

(٢٤٨) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا يَدْعُو فِي صَلَاتِهِ، وَلَمْ يَحْمَدِ اللّٰهَ، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: **«عَجِلَ هٰذَا»** ثُمَّ دَعَاهُ، فَقَالَ: **«إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ رَبِّهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ يَدْعُو بِمَا شَاءَ»**. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[248] حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اپنی نماز میں دعا کرتے سنا۔ اس نے اللہ کی حمد بیان کی نہ نبی ﷺ پر درود بھیجا۔ آپ نے فرمایا: "اس نے جلدی کی ہے۔" پھر آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا: "تم میں سے جب کوئی دعا مانگنے لگے تو پہلے اسے اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کرنی چاہیے' پھر نبی ﷺ پر درود بھیجنا چاہیے' پھر اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔" (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَجِلَ] باب سَمِعَ يَسْمَعُ سے ہے۔ دعا میں جلدی کی' بایں صورت کہ حمد اور درود کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ [ثُمَّ دَعَاهُ] پھر اسے اپنے پاس بلایا تاکہ اسے آداب دعا سکھائیں۔

٢٤٨ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الدعاء، حديث: ١٤٨١، والترمذي، الدعوات، حديث: ٣٤٧٦-٣٤٧٧، والنسائي، السهو، حديث: ١٢٨٥، وأحمد: ٦/ ١٨، وابن حبان (الإحسان): ٣/ ٢٠٨، حديث: ١٩٥١، والحاكم: ١/ ٢٣٠.

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا جلدی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ دعا تو نام ہی عجز و انکسار اور اظہار تذلل کا ہے' اس لیے جب دعا کی جائے تو پورے اہتمام و اطمینان سے کی جائے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے' پھر رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے' پھر دعا کی جائے۔ ② یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تشہد کے عین مطابق ہے کہ تشہد میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا ہے۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ حدیث تشہد کے بعد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کا محل تشہد ہے۔ ④ تشہد میں پہلے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ اور پھر اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِينَ کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ہی کی بدولت ہمیں نماز کا طریقہ و سلیقہ حاصل ہوا۔ اس میں خطاب کا لفظ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ حکائی ہے جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے شرح مشکاۃ میں کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی یہ کلمات یوں ہی پڑھتے تھے' نیز آپ کے انتقال کے بعد بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ کے الفاظ پڑھنے لگے تھے۔ (صحیح البخاري' الاستئذان' باب الأخذ باليدين' حديث: ٦٢٦٥) خطاب کبھی حاضر فی الذہن کے لیے بھی ہوتا ہے۔ بہرنوع تشہد میں اس خطاب سے اہل خرافات کا وجودی و حسی حاضر و ناظر مراد لینا غلط اور بے بنیاد ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ] ''فا'' پر فتحہ اور ''ض'' مخفف ہے۔ اور عبید' عبد سے تصغیر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: فضالہ بن عبید بن نافذ بن قیس۔ ان کی کنیت ابومحمد تھی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ پہلا معرکہ جس میں یہ شریک ہوئے معرکۂ احد تھا۔ اس کے بعد سب غزوات میں شریک رہے۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ شام کی طرف نقل مکانی کر گئے تھے اور دمشق میں سکونت پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صفین کی جنگ کے لیے نکلے اس وقت یہ وہاں کے قاضی (جج) تھے۔ ٥٣ ہجری میں انھوں نے وفات پائی۔

(٢٤٩) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ بَشِيرُ بْنُ سَعْدٍ: يَارَسُولَ اللهِ! أَمَرَنَا اللّٰهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ، فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ، ثُمَّ قَالَ: «قُولُوا: اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ فِي الْعَالَمِينَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ

[249] حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر درود بھیجنے کا حکم فرمایا ہے' تو ہم کس طرح آپ پر درود بھیجیں؟ آپ (تھوڑی دیر) خاموش رہے' پھر فرمایا: ''اس طرح کہا کرو: [اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ ......الخ]'' اے اللہ! محمد اور آل محمد پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم (علیہ السلام) پر رحمت نازل فرمائی۔ اور برکت نازل فرما محمد اور آل محمد پر جس طرح تو نے برکت نازل

٢٤٩۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب الصلاة على النبي ﷺ بعد التشهد، حديث: ٤٠٥، وابن خزيمة: ١/ ٣٥١، حديث: ٧١١.

مَّجِيدٌ. وَالسَّلَامُ كَمَا عَلِمْتُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَزَادَ ابْنُ خُزَيْمَةَ فِيهِ: فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِي صَلَاتِنَا؟

فرمائی ابراہیم (علیہ السلام) پر جہانوں میں۔ یقیناً تو ستودہ صفات ہے اور بزرگ ہے۔'' اور رہا سلام' تو وہ اس طرح ہے جس طرح کہ تم جانتے ہو۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور ابن خزیمہ نے اس میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے (صحابہ نے عرض کیا) کہ جب ہم نماز پڑھ رہے ہوں تو اس وقت آپ پر درود کس طرح پڑھیں؟

لغوی تشریح: [أَمَرَنَا اللّٰهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ] اللہ کا حکم ﴿صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ میں ہے۔ [وَالسَّلَامُ كَمَا عُلِّمْتُمْ] تعلیم سے صیغۂ مجہول ہے' یعنی جس طرح تمھیں سکھایا گیا ہے' تعلیم دی گئی ہے۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ یہ عِلْم سے ماخوذ صیغۂ معروف ہو' معنی یہ ہوگا: جو تم نے (میرے سکھانے سے) جان لیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے [اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ......الخ] کی صورت میں تمھیں سکھایا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے نبی ﷺ پر نماز میں درود و سلام بھیجنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سمیت بہت سے ائمہ رحمہم اللہ اسے واجب ہی قرار دیتے ہیں۔ ② درود شریف کے مختلف الفاظ احادیث میں مروی ہیں جس کی تفصیل جلاء الأفهام اور القول البديع میں موجود ہے۔ اور صحیح ترین روایت جو نماز میں درود شریف پڑھنے کی ہے وہ یہی ہے۔ ③ آل میں لغوی اعتبار سے گو آپ پر ایمان لانے والے تمام مومن و متقی بھی مراد ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہاں اس سے آپ کے وہ رشتے دار مراد ہیں جن پر صدقہ و زکاۃ حرام ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ] ان کا نام عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ ہے اور ابومسعود ان کی کنیت ہے۔ انصار مدینہ میں سے ہونے کی بنا پر انصاری کہلائے۔ بدر میں شامل ہوئے۔ جلیل القدر اور بزرگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تو تھے مگر کم سن تھے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ ہجری کے بعد انھوں نے مدینہ میں وفات پائی۔

[حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ] ابونعمان کنیت ہے۔ بشیر (یہ تصغیر نہیں ہے بلکہ فعیل کا وزن ہے۔) بن سعد بن ثعلبہ بن جُلاس (''جیم'' کے ضمہ کے ساتھ) یا خلاس (''خا'' کے فتحہ اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ۔) انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری اور قبیلۂ خزرج میں سے ہونے کی وجہ سے خزرجی کہلائے۔ بدر اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابی تھے۔ احد و خندق اور بعد کے معرکوں میں شامل رہے۔ عین تمر میں ۱۲ ہجری کو شہید ہوئے۔

(۲۵۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا تَشَهَّدَ

[250] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص تشہد پڑھ چکے

۲۵۰ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر، حديث: ۱۳۷۷، ومسلم، المساجد، باب ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث: ۵۸۸.

أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ مِنْ أَرْبَعٍ، يَقُولُ: اللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «إِذَا فَرَغَ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْأَخِيرِ».

تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور کہے: اے اللہ! میں عذاب جہنم سے، عذاب قبر سے، موت و حیات کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں: ''جب تم میں سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو (تو اس وقت ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے)۔''

لغوی تشریح: [فِتْنَةِ الْمَحْيَا] محیا سے زندگی مراد ہے اور اس کے فتنے سے مراد وہ آزمائشیں ہیں جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں، یا خواہشات و شہوات یا نادانی و جہالت کی وجہ سے جن دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یا وہ بلائیں جو صبر و تحمل نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں، سب ہی مراد ہیں۔ [الْمَمَاتِ] ممات سے مراد موت ہے، اور موت کے فتنے سے مراد برا خاتمہ ہے اور قبر میں سوال و جواب کا کٹھن مرحلہ بھی مراد ہے۔

فوائد و مسائل: ① تشہد میں درود و سلام کے بعد اس استعاذہ کو ابن حزم نے واجب قرار دیا ہے۔ تابعین میں امام طاؤس رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف تھا بلکہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ تو دونوں تشہدوں میں استعاذہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی علماء اسے آخری تشہد میں درود کے بعد پڑھنے کو مستحب ہی کہتے ہیں۔ ② اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ③ اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کا انکار نص قرآن اور حدیث صحیح کا انکار ہے۔

(٢٥١) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: عَلِّمْنِي دُعَاءً أَدْعُو بِهِ فِي صَلَاتِي! قَالَ: «قُلْ: اللّٰهُمَّ! إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[251] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایسی دعا سکھائیں جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ پڑھا کرو: [اَللّٰهُمَّ! إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي......الخ] ''اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ہی ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں، لہٰذا تو مجھے اپنی جناب سے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما۔ بے شک تو ہی بہت بخشنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس حدیث سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے کیونکہ انسان سے ہر وقت لغزش اور غلطی و خطا کا امکان رہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا انسان بھی اپنے آپ کو

٢٥١۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب الدعاء قبل السلام، حديث: ٨٣٤، ومسلم، الذكر والدعاء، باب استحباب خفض الصوت بالذكر، حديث: ٢٧٠٥.

اس سے مستغنی نہیں سمجھتا' حالانکہ ان کو جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صدیق کا خطاب عطا ہوا تھا۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ] ابوبکر کنیت اور صدیق لقب ہے۔ عبداللہ بن عثمان نام ہے۔ ان کے والد عثمان' ابوقحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ تیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پہلے خلیفۂ راشد تھے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں میں سے افضل انسان ہیں۔ ہجرت مدینہ کے سفر کے دوران میں غار ثور میں آپ کے ساتھی تھے۔ اسی بنا پر ان کو یارِ غار کہا جاتا ہے۔ گورے چٹے' نرم مزاج اور دبلے پتلے جسم کے انسان تھے۔ تعریف سے مستغنی ہیں۔ بڑے عزم و استقلال اور صمیم الارادہ تھے۔ احباب و رفقاء کے لیے رحیم و رقیق اور اعدائے اسلام اور دشمنان دین کے لیے ناقابل تسخیر چٹان تھے۔ ۱۳ ہجری میں جمادی الاخریٰ میں وفات پائی۔

(٢٥٢) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَكَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِينِهِ: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ»، وَعَنْ شِمَالِهِ: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

[252] حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی' آپ اپنی دائیں جانب سلام پھیرتے تو: [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ] کہتے اور اپنی بائیں طرف [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ] کہتے۔ (اسے ابوداود نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَبَرَكَاتُهُ] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اسے ابوداود نے روایت کیا ہے' جبکہ سنن ابی داود میں پہلی مرتبہ سلام کے ساتھ وَبَرَكَاتُهُ کے الفاظ کا اضافہ تو موجود ہے لیکن دوسری مرتبہ سلام کے ساتھ یہ اضافہ منقول نہیں ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو وہم ہوا ہے۔ لیکن ان کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ سنن ابی داود کے بعض معتمد اور صحیح نسخوں میں دونوں مرتبہ سلام کے ساتھ وَبَرَكَاتُهُ کا اضافہ ثابت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نتائج الأفکار میں اس کی وضاحت کی ہے' لہٰذا جو دونوں طرف سلام کے وقت وَبَرَكَاتُهُ کا اضافہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے سلام میں وَبَرَكَاتُهُ کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ یہ اضافہ گو اس موضوع کی اکثر روایات میں نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے علاوہ بعض دیگر روایات سے بھی اس کی صحت ثابت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نتائج الأفکار میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے' اس لیے السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاته کہنا بھی درست ہے۔ ② امام شافعی رحمہ اللہ بلکہ کبار صحابہ و تابعین کے نزدیک السلام علیکم کہہ کر نماز سے فارغ ہونا فرض ہے مگر احناف اسے صرف سنت قرار دیتے ہیں اور کسی بھی ایسے عمل کو نماز سے فارغ ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہیں جو نماز کے منافی ہو۔ لیکن یہ صریح احادیث کے خلاف ہے اور سنت قولی و عملی کے بھی منافی ہے۔

٢٥٢۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في السلام، حديث: ٩٩٧.

(٢٥٣) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[253] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہر فرض نماز کے اختتام پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے: [لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ...... الخ] ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک وساجھی نہیں، فرمانروائی اسی کی ہے اور حمد وثنا اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں۔ اور کسی عزت وشرف والے کو تیرے ہاں کوئی بزرگی فائدہ نہیں دے سکتی۔'' (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں منقول دعا اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں کہ جس کی طرف حاجات اور ضروریات کی تکمیل کے لیے رجوع کیا جا سکے۔ دنیا و مافیہا اور آسمانوں کی ہر ایک چیز اس کی مخلوق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ہر وقت محتاج ہے۔ وہ قادر مطلق ہے، کسی کو کچھ دینے اور نہ دینے کے جملہ اختیارات بلا شرکت غیرے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اس کی سرکار میں دنیوی جاہ وحشمت اور عزت وسلطنت اس کے فضل اور رحمت کے سوا ذرہ بھر بھی کارگر اور منافع بخش ثابت نہیں ہوسکتیں۔ ② یہ دعا فرض نماز سے فارغ ہوکر پڑھنی مستحب ہے۔ اور تشہد پڑھنے کے بعد، سلام پھیرنے سے پہلے، یعنی نماز کے اندر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٢٥٤) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ: «اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[254] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے آخر میں (یا نماز کے بعد) یہ تعوذ پڑھا کرتے تھے: [اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ...... الخ] ''اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں بخل سے، اور بزدلی سے بھی تیری پناہ لیتا ہوں، اور تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میں رذیل ترین عمر (بہت زیادہ بڑھاپے) کی طرف لوٹایا جاؤں، اور میں دنیا کے فتنے اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِهِنَّ] ان سے مراد وہ کلمات ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ [دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ] نماز کے اختتام پر

٢٥٣ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، حديث: ٨٤٤، ومسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة، حديث: ٥٩٣.

٢٥٤ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر، حديث: ١٣٧٧.

سلام سے پہلے یا سلام پھیرنے کے بعد۔ [اَلْجُبْنِ] ''جیم'' پر ضمہ اور ''با'' ساکن ہے۔ کمزوری اور ضعف' یا پھر دشمن سے نبرد آزمائی کا خوف و اندیشہ۔ [مِنْ أَنْ أُرَدَّ] [أُرَدَّ صیغۂ مجہول واحد متکلم ہے' یعنی میں لوٹایا جاؤں' یا اس طرف پھیرا جاؤں۔ [إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ] یعنی خسیس اور ذلت آمیز عمر کی طرف۔ وہ اس وقت ہوتی ہے جب بڑھاپا شدت اختیار کر جائے اور کبر سنی انسان کو بچوں سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور حیوان سے زیادہ رذیل بنا دیتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بول و براز بھی کپڑوں میں نکل جاتا ہے اور کھانا پینا اور خور و نوش بھی بستر پر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی رسوا کن اور رذیل ترین ناکارہ عمر سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔

فوائد و مسائل: ① حدیث کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعوذ اختتام نماز' یعنی سلام پھیرنے سے پہلے بھی پڑھا جاسکتا ہے اور سلام پھیرنے کے بعد بھی۔ ② نہایت پر مغز دعا ہے۔ اس کا التزام کرنا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ] ابواسحٰق ان کی کنیت ہے۔ باپ کا نام مالک ہے۔ قبیلۂ قریش سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرشی کہلائے۔ اور ان کی نسبت زہری بھی ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں نمبر ہے یا ساتواں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ (جنھیں نبی ﷺ نے زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری و بشارت دے دی تھی۔) اللہ کی راہ میں تیر اندازی کرنے والے یہ پہلے شخص ہیں' یعنی سب سے پہلے اللہ کی راہ میں انھوں نے تیر چلایا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ فاتح عراق ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ پست قد مگر گٹھا ہوا بدن' گندمی رنگ' گھنے اور لمبے بالوں والے تھے۔ ۵۵ ہجری میں مدینہ سے دس میل دور واقع مقام عقیق میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت کندھوں پر اٹھا کر مدینہ طیبہ لائی گئی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

(٢٥٥) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهِ اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ ثَلَاثًا، وَقَالَ: «اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[255] حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ [أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ] کہتے اور پھر پڑھتے۔ [اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ] ''اے اللہ! میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں۔ اے اللہ! تو سلام ہے' یعنی تو ہی سلامتی والا ہے۔ اور سلامتی تجھ ہی سے ہے۔ اے بزرگی و عزت کے مالک! تو بڑی برکت والا ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے نماز کے اذکار کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کا استغفار بطور شکر اور تعلیم کے تھا اور اہل ایمان کا استغفار نماز میں کمی بیشی کے ازالے کے لیے ہے' نیز یہ استغفار وسواس اور خیالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ ② بہ تقاضائے بشریت جو کمی و زیادتی اور خیالات کی بنا پر نماز میں نقص واقع ہو گیا' ہم اس کی مغفرت اور درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی عبدیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے معبود سے معافی کا طلب گار رہے۔

٢٥٥۔ أخرجه مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة.....، حديث: ٥٩١.

③ نبی ﷺ استغفار کس طرح کرتے تھے؟ امام نووی ؒ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے استفسار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار کون سا تھا؟ تو انھوں نے بتایا کہ نبی ﷺ [أَسْتَغْفِرُ اللّٰه ' أَسْتَغْفِرُ اللّٰه ' أَسْتَغْفِرُ اللّٰه] پڑھا کرتے تھے۔ ④ اس حدیث میں دعا کے جتنے فقرات مذکور ہیں وہی پڑھنے مسنون ہیں۔ بعض لوگوں نے اس پر صبر نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے اضافہ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا' مثلاً: اسی دعا میں اس طرح اضافہ کر دیا: اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ وَ إِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ حَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ وغیرہ۔ ⑤ حدیث میں یہ اضافہ کہیں بھی منقول نہیں بلکہ یہ اپنی طرف سے ''ریشم میں ٹاٹ کا پیوند'' کا مصداق ہے۔

(٢٥٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ، وَحَمِدَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ وَكَبَّرَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ، فَتِلْكَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ الْمِائَةِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرٰى: أَنَّ التَّكْبِيرَ أَرْبَعٌ وَّثَلَاثُونَ.

[256] حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد ۳۳ مرتبہ [سُبْحَانَ اللّٰه] ۳۳ مرتبہ [اَلْحَمْدُ لِلّٰه] اور ۳۳ مرتبہ [اَللّٰهُ أَكْبَرُ] پڑھا' یہ مجموعی طور پر ۹۹' یعنی ایک کم سو ہوئے اور سو مکمل کرنے کے لیے [لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ] کہا تو اس کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں' خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور ایک دوسری روایت میں ہے: اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ کہے۔

لغوی تشریح: [سَبَّحَ] تسبیح بیان کی' یعنی سُبْحَانَ اللّٰه کہا۔ [زَبَدِ الْبَحْرِ] ''زا'' اور ''با'' دونوں پر فتحہ ہے۔ جھاگ۔ جب پانی موجزن ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ آ جاتا ہے۔ اس قسم کی عبارت بیان کرنے سے مقصود کسی شے کی کثرت بیان کرنا ہوتا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن گناہوں اور خطاؤں کے معاف کیے جانے کا ذکر ہے ان سے مراد ہر قسم کے گناہ ہیں' خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ' تاہم اہل علم کا اس کی بابت اختلاف ہے۔ جمہور صرف صغیرہ گناہوں کی معافی کے قائل ہیں لیکن حدیث سے ان کے موقف کی تائید نہیں ہوتی۔ واللّٰه أعلم.

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہر نماز کے اختتام پر' خواہ وہ نفل نماز ہو یا فرض' یہ کلمات پڑھنے مسنون بھی ہیں اور بکثرت گناہوں کے بخشے جانے کی نوید بھی' اگرچہ بعض علماء نے ان کلمات کا فرائض کے بعد پڑھنا مشروع قرار دیا ہے۔ ② اس دعا کا پس منظر جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک روز فقراء مہاجرین نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مالدار اور صاحب ثروت لوگ بڑے بڑے درجے اور دائمی عیش لے گئے۔ وہ لوگ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس مال و دولت کی بہتات ہے جس سے وہ حج وعمرہ اور جہاد کرتے ہیں' غلام آزاد کرتے ہیں اور صدقہ خیرات بھی

٢٥٦۔ أخرجه مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة .....، حديث: ٥٩٧.

دیتے ہیں (ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں ہے۔) آپ نے (انھیں تسلی دیتے ہوئے) فرمایا: ''میں تمھیں ایسا عمل نہ بتلاؤں جس پر عمل کر کے تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کا ثواب بھی حاصل کر لو اور تمھارے بعد تمھیں کوئی نہ پا سکے اور تم جن لوگوں میں ہو ان سے بہتر ہو جاؤ گے الا یہ کہ کوئی وہی عمل کرے جو تم کرو'' ؟ اس موقع پر آپ نے ہر نماز کے بعد مذکورہ کلمات کہنے کا حکم فرمایا۔ (صحیح البخاري، الأذان، باب الذکر بعد الصلاۃ، حدیث:۸۴۳، وصحیح مسلم، المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ و بیان صفته، حدیث:۵۹۵) ③ ان کلمات کو پڑھنے کی دو صورتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ ۳۳ مرتبہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ۳۳ مرتبہ اور اَللّٰہُ أَکْبَرُ ۳۴ مرتبہ۔ دوسری یہ کہ ۳۳، ۳۳ مرتبہ تینوں کلمات اور ایک مرتبہ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہُ لَا شَرِیكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِیرٌ پڑھ کر سو کی تعداد پوری کرے۔ اگر تینوں کلمات بالترتیب ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ پڑھے جائیں تو پھر لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ...... الخ نہیں پڑھنا چاہیے، یہ سنت سے ثابت نہیں۔

(۲۵۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لَهُ: «أُوصِيكَ يَامُعَاذُ! لَا تَدَعَنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ أَنْ تَقُولَ: اَللّٰهُمَّ! أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ.

[257] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے اختتام کے بعد ان کلمات کو کبھی فراموش نہ کرنا [اَللّٰهُمَّ! أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ...... الخ] ''اے اللہ! مجھے اپنا ذکر، اپنا شکر اور اپنی بہترین عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما۔'' (اسے احمد، ابوداود اور نسائی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا تَدَعَنَّ] ''تا، دال اور عین'' تینوں پر فتحہ ہے۔ معنی ہیں: ہرگز نہ چھوڑ۔ وَدَعَ يَدَعُ سے نہی کا صیغہ ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی چیز کو چھوڑ دے، نظر انداز کر دے۔ [أَعِنِّي] ''ہمزہ'' پر فتحہ، ''عین'' کے نیچے کسرہ اور ''نون'' پر تشدید ہے۔ الإعانة سے امر کا صیغہ ہے جو دعا کے لیے آیا ہے۔ نفس کلمے کے نون کو نون وقایہ میں مدغم کر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ مشدد ہے۔ معنی یہ ہوئے: میری نصرت فرما اور مجھے توفیق سے نواز۔

فوائد و مسائل: ① [لَا تَدَعَنَّ] اس پر مدلول ہے کہ اس دعا کو فرض نماز کے بعد نظر انداز کرنا اور ترک کر دینا مناسب نہیں، اس لیے کہ نہی اصل تو تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ ② اس دعا کے علاوہ کتب احادیث، مثلاً: مسلم، ابوداود، نسائی، احمد اور ترمذی وغیرہ میں اور بھی بہت سی دعائیں آپ سے ثابت ہیں۔ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ سنت پر عمل بھی ہو اور اس کی اشاعت و ترویج بھی۔

(۲۵۸) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی

[258] حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ

۲۵۷۔ [إسنادہ صحیح] أخرجه أبوداود، الصلاۃ، باب في الاستغفار، حدیث: ۱۵۲۲، والنسائي، السهو، حدیث: ۱۳۰۴، وأحمد: ۵/ ۲۴۵.

۲۵۸۔ [صحیح] أخرجه النسائي في الکبرٰی، حدیث: ۹۹۲۸ [وعمل الیوم واللیلة، حدیث: ۱۰۰ وھذا جزء من الکبرٰی]، وابن حبان في کتاب الصلاۃ، کما في الترغیب والترهیب للمنذري، حدیث: ۲۳۷۳ وسندہ حسن.

عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا الْمَوْتُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَزَادَ فِيهِ الطَّبَرَانِيُّ: «وَقُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ».

ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ہر فرض نماز کے ادا کرنے کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کو جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا اور کوئی چیز روکنے والی نہیں۔'' (مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے گا بشرطیکہ عقیدہ صحیح ہو۔) (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور طبرانی نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے: [قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ] بھی پڑھے۔)

فوائد و مسائل: ① آیت الکرسی کی فضیلت کے بارے میں نبی ﷺ کے اور بھی ارشادات کتب حدیث میں منقول ہیں۔ اس کی اتنی فضیلت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں توحید الٰہی کو صاف طور پر نکھار کر بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت اس کی قدرت اور اس کا علم ماکان و مایکون اور کائنات کی حفاظت وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اور سورۂ اخلاص تو تہائی قرآن کے برابر ثواب رکھتی ہے اس لیے کہ اصل میں بنیادی عقائد تین ہیں: توحید رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اور اس میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی صمدیت کا ذکر ہے اس لیے یہ سورت بھی اللہ کو بہت ہی محبوب ہے لہٰذا جو آدمی اہتمام کے ساتھ ان کو نماز فرض کے بعد پڑھے گا اسے مرتے ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ إن شاء الله. ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا منکر دنیا میں آج تک نہیں پایا گیا نیز اس سے جنت کا وجود بھی معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت بھی مخلوق ہے یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ] ابوامامہ کنیت اور ایاس بن ثعلبہ بلوی نام ہے۔ انصار کے قبیلہ بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ والدہ کی تیمارداری میں مشغولیت کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔

(۲۵۹) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[259] حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز اسی طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا ہے۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث کے مخاطب براہ راست تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں لیکن عمومی حکم میں امت مسلمہ کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ امیر یمانی نے کہا: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں آپ نے جو افعال جس طرح ادا فرمائے بعینہ اسی طرح ادا کرنا واجب ہیں البتہ جس کا کسی دوسری دلیل سے غیر واجب ہونا ثابت ہو جائے تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔ (سبل السلام)

(۲۶۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «صَلِّ قَائِمًا،

[260] حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''نماز کھڑے ہو کر پڑھو

۲۵۹۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة، حديث: ٦٣١.
۲۶۰۔ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب إذا لم يطق قاعدا صلى على جنب، حديث: ١١١٧.

فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ، وَإِلَّا فَأَوْمِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو۔ اور بیٹھ کر پڑھنے کی استطاعت بھی نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ ہو سکے تو پھر اشارے ہی سے پڑھ لو۔‘‘ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَعَلٰى جَنْبٍ] اپنی دائیں جانب لیٹ کر۔ اس صورت میں پاؤں کا رخ قبلہ کی طرف نہیں ہونا چاہیے بلکہ استقبال قبلہ کے وقت جو بائیں جانب بنتی ہے ادھر ہونا چاہیے۔ [فَأَوْمِ] إیماء سے امر کا صیغہ ہے۔ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کسی صورت بھی معاف نہیں بجز مدہوشی کی حالت کے‘ نیز ثابت ہوا کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنی چاہیے۔ بامر مجبوری یا بیماری کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر ایسا کرنا بھی دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ اگر ان حالتوں میں سے کسی پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اشاروں سے ادا کرے۔ گویا نماز کسی صورت بھی ترک نہ کرے۔

(٢٦١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِمَرِيضٍ - صَلّٰى عَلٰى وِسَادَةٍ، فَرَمٰى بِهَا، - وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الْأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَأَوْمِ إِيمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ، وَلٰكِنْ صَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقْفَهُ.

[261] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مریض کا‘ جس نے تکیے پر نماز پڑھی تھی‘ تکیہ پھینک دیا اور فرمایا: ’’اگر طاقت ہو تو زمین پر نماز پڑھو ورنہ پھر اشارے سے پڑھو‘ اور اپنے سجدے کو رکوع سے ذرا نیچے کرو۔‘‘ (اسے بیہقی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن ابوحاتم نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وِسَادَةٍ] میں ’’واؤ‘‘ پر تینوں اعراب آ سکتے ہیں وَسَادَة، وِسَادَة، وُسَادَة‘ یعنی تکیہ‘ جسے سونے والا اپنے سرہانے رکھتا ہے۔ [فَرَمٰى بِهَا] اس آدمی سے اسے دور ہٹا دیا۔ [فَأَوْمِ إِيمَاءً] یعنی اشارے سے نماز پڑھو۔ [أَخْفَضَ] اسے اسفل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: اس سے نیچا۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے‘ تاہم معناً صحیح ہے۔ بنابریں اگر کسی امر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر نمازی کو اشارے پر ہی قناعت کرنی چاہیے‘ البتہ سجدے اور رکوع کے اشارے میں فرق کیا جائے۔ سجدے کا اشارہ ذرا نیچے ہونا چاہیے بہ نسبت رکوع کے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا تعلق اس کے خالق و مالک سے کسی صورت اور کسی لمحہ بھی منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ ہر آن اس کی یاد دل و دماغ میں رچی بسی رہنی چاہیے۔ یہی مقام عبدیت ہے۔

٢٦١ـ [إسناده ضعيف] أخرجه البيهقي: ٢/ ٣٠٦، وسبلي، حديث: ٣٥٢ * سفيان الثوري وأبو الزبير عنعنا.

٨ - بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ وَغَيْرِهِ

باب:8-سجود سہو وغیرہ کا بیان

(٢٦٢) عَنْ عَبْدِاللهِ ابْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلَاةَ، وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَهٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يُكَبِّرُ فِي كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ النَّاسُ مَعَهُ، مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوسِ.

[262] حضرت عبداللہ ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو نماز ظہر پڑھائی تو دو رکعتیں ادا کر کے تشہد میں نہ بیٹھے اور سیدھے کھڑے ہو گئے اور لوگ (مقتدی) بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے حتی کہ جب آپ نے نماز پوری ادا کر لی اور لوگ سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے' آپ نے بیٹھے بیٹھے ہی اللہ اکبر کہا اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کیے پھر سلام پھیرا۔ (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے۔ اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ہر سجدے کے لیے بیٹھے ہوئے اللہ اکبر کہتے تھے اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا (تشہد میں) بیٹھنا بھول جانے کے بدلے میں۔ (دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھنا بھول گئے تھے اس کی تلافی کے لیے دو سجدے کیے۔)

لغوی تشریح: [اَلسَّهْوِ] سہو بھول کر کمی بیشی کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں نماز میں بھول مراد ہے۔ [فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ] یعنی دو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے۔ [وَلَمْ يَجْلِسْ] پہلے تشہد کے لیے نہ بیٹھے۔ [قَضَى الصَّلَاةَ] سلام کے علاوہ باقی ارکان نماز پورے کر لیے۔

فوائد و مسائل: ① عربی میں بھول کے لیے دو الفاظ مستعمل ہیں: ایک سہو اور دوسرا نسیان۔ پہلے کا اطلاق عموماً افعال کے لیے ہوتا ہے اور دوسرے کا معلومات کے لیے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی بھی آ جاتے ہیں۔ علماء میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی اکرم ﷺ کے لیے نسیان کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کو کبھی بھی ابلاغ احکام الٰہی اور شریعت کے پہنچانے میں نسیان لاحق نہیں ہوا اور لاحق ہونے کا امکان بھی نہیں' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ﴾ (الأعلىٰ ٨٧:٦) باقی جہاں تک سہو کا معاملہ ہے' اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ آپ سے سہو کا امکان ہے اور عملاً ہوا بھی ہے۔ متعدد صحیح احادیث اس بارے میں کتب احادیث میں موجود ہیں اور بہت سے واقعات عملی طور پر اس کا ثبوت ہیں۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی سہو کو نبی اکرم ﷺ کے لیے ثابت سمجھتے ہیں۔

٢٦٢ـ أخرجه البخاري، السهو، باب ما جاء في السهو إذا قام من ركعتي الفريضة، حديث: ١٢٢٤، ومسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة والسجود له، حديث: ٥٧٠، وأبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٣٤، والترمذي، الصلاة، حديث: ٣٩١، والنسائي، السهو، حديث: ١٢٢٣، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٢٠٦، ١٢٠٧، وأحمد: ٥/ ٣٤٥، ٣٤٦.

غالباً آج تک کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اس میں تو بہت سی حکمتیں ہیں جنھیں صاحب علم و بصیرت لوگ ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ② دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی نمازی کو تشہد اول بھول جائے تو اس نقصان کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہے۔ سجدۂ سہو قبل از سلام کیا جائے یا بعد از سلام؟ احادیث سے آپ کا عمل دونوں طرح ثابت ہے۔ زندگی بھر ایک لگے بندھے طریقے پر آپ ﷺ کا عمل ثابت نہیں ہوتا کہ بس فلاں طریقے پر ساری عمر عمل فرماتے رہے' البتہ جب ائمہ ؒ کا دور آیا اور تقلید شخصی پر عمل شروع ہوا تو ائمۂ کرام کے مقلدین نے اپنے اپنے دائرے میں صورتیں معین کر لیں۔ ③ ایک رائے یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نے جس جس مقام پر جو طرز عمل اختیار فرمایا وہاں اسی طرح عمل کیا جائے۔ مگر باقی مواقع پر جس طرح تحقیق سے ثابت ہوا ہو اس پر عمل کرے۔ ④ امام شوکانی ؒ نے نیل الاوطار (۳/ ۱۲۲۔ ۱۲۸) میں اس طرز عمل کو بہتر قرار دیا ہے کہ نماز میں کمی واقع ہو جانے کی صورت میں سجدۂ سہو سلام پھیر نے سے پہلے کیا جانا چاہیے اور اگر زیادتی واقع ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے' البتہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ کرنا' پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرنا' صحیح احادیث کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں۔

(٢٦٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ إِحْدٰى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ قَامَ إِلٰى خَشَبَةٍ فِي مُقَدَّمِ الْمَسْجِدِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهَا، وَفِي الْقَوْمِ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ، فَهَابَا أَنْ يُكَلِّمَاهُ، وَخَرَجَ سَرْعَانُ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقُصِرَتِ الصَّلَاةُ؟ وَرَجُلٌ يَدْعُوهُ النَّبِيُّ ﷺ ذَا الْيَدَيْنِ، فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! أَنَسِيتَ أَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: «**لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ**». قَالَ: بَلٰى قَدْ نَسِيتَ، فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[263] حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے پچھلے پہر کی دو نمازوں (ظہر اور عصر) میں سے ایک میں دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا اور مسجد کے سامنے (کی طرف گاڑی ہوئی) ایک لکڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور اپنا ہاتھ اس پر رکھ لیا۔ لوگوں (نمازیوں) میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ؓ بھی موجود تھے' یہ دونوں آپ سے (اس بارے میں) بات کرنے سے ڈر گئے۔ اور جلد باز لوگ مسجد سے نکل گئے تو لوگوں نے (آپس میں سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے) پوچھنا شروع کیا کہ کیا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ ایک آدمی تھا جسے نبی ﷺ (اس کے لمبے ہاتھوں کی وجہ سے) ذوالیدین کہہ کر بلاتے تھے' اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ (آج) بھول گئے ہیں یا نماز کم کر دی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے۔'' اس شخص نے پھر عرض

٢٦٣- أخرجه البخاري، الصلاة، باب تشبيك الأصابع في المسجد وغيره، حديث: ٤٨٢، والسهو، باب يكبر في سجدتي السهو، حديث: ١٢٢٩، ومسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة، حديث: ٥٧٣، وأبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٠٨، وهو حديث صحيح، وحديث: "ولم يسجد حتى يقنه الله تعالى ذلك" أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٠١٢ وسنده ضعيف، فيه محمد بن كثير الصنعاني وهو ضعيف، ضعفه الجمهور من جهة سوء حفظه واختلاط أيضًا.

کیا: کیوں نہیں' بلکہ آپ یقیناً بھول گئے ہیں۔ پھر آپ نے دو رکعتیں (جو چھوٹ گئی تھیں) پڑھیں اور سلام پھیرا' پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنے (معمول کے) سجدوں کی طرح سجدہ کیا یا ان سے بھی لمبا۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اوپر اٹھایا' پھر اللہ اکبر کہہ کر سر مبارک زمین پر رکھا اور اپنے (معمول کے) سجدے کی طرح یا اس سے کچھ طویل سجدہ کیا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنا سر اٹھایا۔ (بخاری ومسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: صَلَاةَ الْعَصْرِ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: فَقَالَ: «أَصَدَقَ ذُوالْيَدَيْنِ؟» فَأَوْمَئُوا أَيْ نَعَمْ. وَهِيَ فِي الصَّحِيحَيْنِ، لٰكِنْ بِلَفْظِ: فَقَالُوا. وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُ: وَلَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَقَّنَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى ذٰلِكَ.

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی۔ اور ابوداود کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا ذوالیدین نے ٹھیک کہا ہے؟'' تو لوگوں نے سر ہلا کر اشاروں سے کہا: ہاں۔ یہ اضافہ صحیحین میں بھی ہے لیکن ان میں [فَقَالُوا] کے لفظ کے ساتھ مروی ہے۔ (زبان سے انھوں نے کہا۔) اور ابوداود ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کو جب تک اللہ کی جانب سے یقین نہ ہوا اس وقت تک سجدۂ سہو نہیں کیا۔ (جو کہ سنداً ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْعَشِيّ] ''عین'' پر فتحہ' ''شین'' کے نیچے کسرہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ عَشِيّ زوال آفتاب سے لے کر غروب شمس تک کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے نماز ظہر کا تعین ثابت ہوتا ہے اور بعض سے نماز عصر کا' مگر شک بدستور باقی رہا' رفع نہیں ہوا۔ [فِي مُقَدَّمِ الْمَسْجِدِ] تقدیم سے اسم مفعول کے وزن پر ہے' یعنی مسجد کے سامنے' آگے' دروازے پر۔ [هَابَا] دونوں خوفزدہ ہو گئے۔ [سَرَعَانُ النَّاسِ] نمازیوں میں سے وہ جو جلدی میں تھے۔ [سَرَعَان] میں ''سین'' پر فتحہ اور ''را'' ساکن ہے اور ''را'' پر فتحہ بھی جائز ہے۔ اور ایک قراءت کے مطابق سرعان کے ''سین'' پر ضمہ ہے اور ''را'' ساکن ہے۔ [أَقُصِرَتْ] ہمزہ یہاں استفہام (سوال) کے لیے ہے۔ اس واقعہ میں صحابۂ کرام ﷺ کے تقویٰ و ورع کی دلیل ہے کہ وہ کسی معاملے کے بارے میں بغیر علم کے پختہ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ سے اس بارے میں پوچھنے سے ڈر گئے۔ بہرحال انھوں نے بعد میں دریافت کرنے کا طرز عمل اس لیے اختیار کیا کہ وہ نسخ کا زمانہ تھا کیونکہ نبی ﷺ کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود تھی۔ ایک فعل (عمل) کی جگہ دوسرے فعل کا حکم آ سکتا تھا۔ قُصِرَتْ ''قاف'' پر ضمہ اور ''صاد'' کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ صیغۂ مجہول ہے۔ اور ایک قراءت کی رو سے ''قاف'' پر فتحہ اور ''صاد'' پر ضمہ ہے جو کہ باب کَرُمَ یَکْرُمُ کے وزن پر صیغۂ معروف ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ نماز مختصر اور چھوٹی ہو گئی ہے۔ [وَرَجُلٌ يَدْعُوهُ] اسے پکارتے تھے۔ [ذَاالْيَدَيْنِ] ذوالیدین اس کو اس لیے کہتے کہ اس کے ہاتھ نسبتاً لمبے تھے اور اس کا نام خرباق بن عمرو تھا۔ [أَنَسِيتَ؟] اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے اور صیغہ خطاب کا ہے۔ [أَمْ قَصُرَتْ؟] قَصُرَتْ صیغۂ

واحد مؤنث غائب ہے' صیغۂ معروف بھی ہو سکتا ہے اور صیغۂ مجہول بھی۔ [لَمْ أَنْسَ] أَنْسَ میں ''ہمزہ'' اور ''سین'' دونوں پر فتحہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: میں نہیں بھولا۔ مضارع پر لَمْ داخل ہو کر اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہ حدیث سجود سہو کے علاوہ اور مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب نمازی کو گمان غالب ہو کہ اس نے نماز مکمل پڑھ لی ہے' پھر سلام بھی پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی' نیز سلام کے بعد نماز میں کمی بیشی کی اطلاع دینے کی صورت میں عمداً گفتگو کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ [فَأَوْمَئُوا] تو انھوں نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ [لٰکِنْ بِلَفْظِ: فَقَالُوا] یعنی بخاری میں مروی روایت میں فَأَوْمَئُوا کی جگہ فَقَالُوا کا لفظ ہے' یعنی انھوں نے سر کے اشارے سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ [یَقَّنَهُ اللّٰهُ] یہ باب تفعیل ہے۔ دل میں اللہ نے اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

فَقَالُوا] یعنی بخاری میں مروی روایت میں فَأَوْمَئُوا کی جگہ فَقَالُوا کا لفظ ہے' یعنی انھوں نے سر کے اشارے سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ [یَقَّنَهُ اللّٰهُ] یہ باب تفعیل ہے۔ دل میں اللہ نے اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سہو سرزد ہوا ہے اور یہ نبوت کے منافی نہیں۔ ② اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ بھی انسان تھے۔ سہو وغیرہ ایک انسان سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے فرمایا: [إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي] (صحيح مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة والسجود له، حديث: ٥٧٢) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب نہ تھے اور نہ آپ نے کبھی عالم ما کان و ما یکون ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر آپ کو علم غیب ہوتا تو سہو نہ ہوتا اور پھر تصدیق کے لیے لوگوں سے دریافت نہ فرماتے کہ کیا ذوالیدین نے ٹھیک اور سچ کہا ہے؟ سہو کی تصدیق ہونے پر اسے تسلیم کر لیا۔ ③ اگر غلطی سرزد ہو جانے پر کوئی اصلاح کرے تو اسے ثابت ہو جانے پر مان لینا چاہیے۔ ④ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کرتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا چاہیے۔ ⑤ اس حدیث سے سجدۂ سہو سلام سے پہلے ثابت ہے۔ ⑥ یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا تشہد بھول جائے تو اس کی تلافی سہو کے دو سجدوں سے ہو جاتی ہے۔ ⑦ اس حدیث میں تو صرف [صَلَّى النَّبِيُّ] ہے' مگر بعض روایات میں [صَلّٰى بِنَا] کے الفاظ منقول ہیں' یعنی ہمیں نماز پڑھائی۔ (صحيح البخاري، الصلاة، حديث: ٤٨٢) اس صورت میں راویٔ حدیث بھی ان نمازیوں میں شریک تھے' لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت: ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ سے منسوخ نہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول سے چار پانچ سال بعد اسلام لائے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ گفتگو سہواً نہیں قصداً ہوئی ہے' لہٰذا سلام کے بعد اصلاح نماز کے لیے اتنی سی بات نماز کو باطل نہیں کرتی۔ ⑧ مذکورہ حدیث کے آخری ٹکڑے [وَلَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَقَّنَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى ذٰلِكَ] کی بابت علمائے محققین لکھتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔

وضاحت: [حضرت خرباق بن عمرو سلمی رضی اللہ عنہ] بنو سلیم سے ہونے کی وجہ سے سلمی کہلائے۔ سہیلی نے الروض الأنف میں لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ اور ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مقام ذی خشب پر وفات پائی۔ اور بعض روایات میں ذوالیدین کی بجائے ذوالشمالین بھی وارد ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں سے ایک ہی شخص مراد ہے جبکہ یہ وہم ہے۔ صحیح بات یہی ہے

کہ یہ دو شخص تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ذوالشمالین بدر میں شہید ہوئے ہیں اور یہ واقعہ بیان کرنے والے حضرت ابوہریرہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ دونوں غزوۂ خیبر کے سال اسلام لائے ہیں۔ اور انھوں نے ذوالیدین کا اس واقعہ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہی ہوسکتا ہے جب ذوالیدین کو اس وقت زندہ مانا جائے اور اسے ذوالشمالین سے الگ سمجھا جائے۔

(٢٦٤) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِهِمْ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ تَشَهَّدَ، ثُمَّ سَلَّمَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ.

[264] حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں نماز پڑھائی تو آپ بھول گئے' چنانچہ آپ نے دو سجدے کیے' پھر تشہد پڑھا اور پھر سلام پھیرا۔ (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① نماز میں بھول لاحق ہونے والا واقعہ وہی ہے جس میں ذوالیدین نے دریافت کیا تھا کہ کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ ② ذوالیدین والا واقعہ صحیحین اور سنن کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ ③ کسی کتاب میں مروی حدیث میں سجود سہو کے بعد تشہد کا کہیں ذکر نہیں بلکہ صحیح مسلم میں خود حضرت عمران کی اسی روایت میں تشہد کا ذکر نہیں ہے' اس لیے صحیح یہ ہے کہ ترمذی کی اس روایت میں تشہد کا لفظ شاذ ہے جیسا کہ امام بیہقی اور شیخ البانی رحمہما اللہ وغیرہ نے کہا۔ دیکھیے: (صحیح مسلم' المساجد' حدیث:۵۷۴)

(٢٦٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَدْرِكَمْ صَلّٰى أَثَلَاثًا أَمْ أَرْبَعًا؟ فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ، وَلْيَبْنِ عَلٰى مَا اسْتَيْقَنَ، ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، فَإِنْ كَانَ صَلّٰى خَمْسًا شَفَعْنَ لَهُ صَلَاتَهُ، وَإِنْ كَانَ صَلّٰى تَمَامًا كَانَتَا تَرْغِيمًا لِلشَّيْطَانِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[265] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک لاحق ہو جائے اور یہ معلوم نہ رہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں' تین یا چار؟ تو ایسی صورت میں شک کو چھوڑ دے اور جس پر یقین ہو اس پر نماز کی بنا رکھے' پھر سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کر لے۔ پس اگر اس نے پانچ رکعتیں پڑھی ہوں گی تو یہ دو سجدے اس کی نماز کو جفت بنا دیں گے (ایک رکعت کے قائم مقام ہوکر اس کی نماز کو چھ رکعت بنا دیں گے) اور اگر وہ پہلے ہی پوری نماز پڑھ چکا ہے تو یہ دو سجدے شیطان کے لیے باعث ذلت واہانت (اس کی ناک رگڑائی) ہوں گے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

٢٦٥ـ أخرجه مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة، حديث: ٥٧١.

٢٦٤ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب ما جاء في التشهد في سجدتي السهو، حديث: ١٠٣٩، والترمذي، الصلاة، حديث: ٣٩٥، والحاكم: ١/ ٣٢٣، وأعل بما لا يقدح، والله أعلم.

لغوی تشریح: [فَلَمْ یَدْرِ] ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ دِرَایَة سے ماخوذ ہے۔ فعل مضارع پر لَمْ داخل ہونے کی وجہ سے حرف علت حذف ہو گیا ہے' یعنی اسے علم نہ ہو' پتہ نہ چل سکے۔ [فَلْیَطْرَحِ] چھوڑ دے' دور پھینک دے۔ [وَلْیَبْنِ] بناء سے ماخوذ ہے۔ [عَلٰی مَا اسْتَیْقَنَ] جس پر یقین ہو' مثلاً: جب اسے شک ہو کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار تو اس صورت میں ان کو تین شمار کرے اور چوتھی کو پورا کرنے کے لیے کھڑا ہو کر ایک رکعت مزید پڑھ لے۔ [فَإِنْ کَانَ صَلّٰی خَمْسًا] یہ اس صورت میں ہو گا جب کہ نمازی چار رکعت والی نماز پڑھے گا۔ [شَفَعْنَ لَهُ صَلَاتَهُ] تو دو سجدے اس کے لیے اس کی نماز کو جفت بنا دیں گے اور یہ سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہوں گے۔ شفع' وتر کے مقابلے میں ہے' وتر کے معنی طاق کے ہیں' جو جوڑا نہ بن سکے۔ اور شفع کے معنی جفت کے ہیں' جو جوڑا بن سکے۔ [تَمَامًا] سے مراد چار رکعت ہیں جو نمازی کو مطلوب ہیں۔ [تَرْغِیمًا] تَذْلِیلًا اور إِهَانَةً کے معنی میں ہے۔ ترغیم دراصل ناک کو مٹی کے ساتھ رگڑنے' خاک آلود کرنے کو کہتے ہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نمازی کو رکعات کی تعداد میں شک پڑ جائے تو اسے کم پر بنیاد رکھنی چاہیے۔ اس میں یقین کا امکان ہے۔ امام مالک' امام شافعی' امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے' البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نماز میں شک واقع ہونے کی صورت میں اسے تحری کرنی چاہیے' یعنی یاد کرنے کی انتہائی کوشش کرے' اگر گمان غالب کسی طرف ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور اگر تحری کے باوجود دونوں اطراف مساوی نظر آئیں تو پھر کم پر بنیاد رکھے۔

(٢٦٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَارَسُولَ اللهِ! أَحَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَثَنٰى رِجْلَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: «**إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[266]۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے نماز پڑھائی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا نماز میں کوئی نئی چیز رونما ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ کیا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: آپ نے تو اتنی اتنی نماز ادا فرمائی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ نے اپنے دونوں پاؤں موڑے اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کیے' پھر سلام پھیرا' پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر فرمایا: ''اگر نماز میں کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہوتی تو میں خود تمھیں اس سے باخبر کرتا لیکن میں بھی تمھاری طرح انسان ہوں' اسی طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم لوگ بھول جاتے ہو' لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کرا دیا کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک واقع ہو جائے

٢٦٦ـ أخرجه البخاري، الصلاة، باب التوجه نحو القبلة حيث كان، حديث: ٤٠١ وغيره، ومسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة، حديث: ٥٧٢، وحديث عبدالله بن جعفر أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٣٣، والنسائي، السهو، حديث: ١٢٥٠، وأحمد: ١/ ٢٠٥، ٢٠٦، وسنده حسن، وابن خزيمة: ٢/ ١١٦، حديث: ١٠٣٣.

تو صحیح صورت حال یاد کرنے کی کوشش کرے پھر اپنی نماز اسی بنیاد پر مکمل کر لے اور پھر دو سجدے کر لے۔'' (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «فَلْيُتِمَّ، ثُمَّ يُسَلِّمْ، ثُمَّ يَسْجُدْ». وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ بَعْدَ السَّلَامِ وَالْكَلَامِ.

اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے: (آپ نے فرمایا:''پہلے) نماز مکمل کرے' پھر سلام پھیرے اور پھر سجدے کرے۔'' اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے سجدۂ سہو سلام و کلام کے بعد کیا تھا۔

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِاللهِ بْنِ جَعْفَرٍ مَرْفُوعًا: «مَنْ شَكَّ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمْ». وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

مسند احمد' ابوداود اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے:''جس شخص کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرنے چاہییں۔'' (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے [أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ] کے الفاظ اپنے لیے فرمائے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی اصلاح کرنی چاہیے جو بشریت رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں اور قرآنی نصوص صریحہ کی عجیب تاویل کرتے ہیں جو سراسر باطل اور لغو ہے کہ قرآن مجید میں تو منکروں کو خاموش کرانے کے لیے بشر کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت تو وہ بشر نہیں تھے' بشریت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ لیکن ان عقلمندوں سے ذرا کوئی پوچھے کہ اس حدیث میں جن لوگوں کو [أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ] کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں کیا وہ مسلمان نہ تھے کہ انھیں خاموش کرانا مقصود تھا' یا وہ اہل ایمان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کی صداقت ایمانی پر قرآن خود شاہد ہے۔ ② اس حدیث میں تَحَرِّي إِلَى الصَّوَابِ کا حکم ہے۔ تحری دراصل وہ ہے جسے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ نمازی کو اگر ایک اور دو میں شبہ ہو تو ایک کو یقین سمجھے اور دو اور تین میں شک لاحق ہو تو دو رکعت کو درست قرار دے اور تین اور چار میں اگر شک پڑ جائے تو تین کو یقینی تصور کرے اور نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کر لے' نیز یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کی اتباع کرنی چاہیے' خواہ امام بھول ہی کیوں نہ جائے' البتہ بھولنے کی صورت میں مقتدی امام کو سبحان اللہ کہہ کر متنبہ کرنے کی کوشش ضرور کریں جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما] ابوجعفر ان کی کنیت ہے۔ عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب نام ہے۔ ان کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہے۔ ہجرت حبشہ کے دوران میں حبشہ کے مقام پر اسلام میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے تھے۔ ۷ ہجری کے اوائل میں اپنے والد کے ہمراہ مدینہ واپس آئے۔ بڑے سخی' بہادر' پاک دامن اور خوش مزاج تھے۔ کثرت سے سخاوت کرنے کی وجہ سے بحرالجود (سخاوت کا سمندر) کہلاتے تھے۔ اسلام میں ان سے بڑھ کر کوئی سخی نہ تھا۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۸۰ ہجری میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔

(٢٦٧) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللهُ

[267] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول

٢٦٧_ [سنده ضعيف جدًا] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب من نسي أن يتشهد وهو جالس، حديث: ١٠٣٦، وابن ماجه،

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، قَالَ: «**إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ، فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ، فَاسْتَتَمَّ قَائِمًا، فَلْيَمْضِ، وَلَا يَعُودُ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَتِمَّ قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ، وَلَا سَهْوَ عَلَيْهِ**». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو شک لاحق ہو جائے اور وہ دو رکعتوں کے بعد کھڑا ہو جائے حتی کہ بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے تو اگلی رکعت کو جاری رکھے اور واپس نہ لوٹے اور بعد میں سہو کے دو سجدے کر لے۔ اور اگر بالکل سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے۔ اور اس صورت میں اس پر سجدۂ سہو نہیں۔'' (اسے ابوداود، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ] یعنی پہلے تشہد میں نہ بیٹھے۔ [فَاسْتَتَمَّ قَائِمًا] پوری طرح سیدھا کھڑا ہو جائے۔ ضعیف اس لیے ہے کہ اس روایت کے تمام طرق کا دارومدار جابر جعفی پر ہے اور وہ سخت ضعیف ہے۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق ﷾ نے سنداً سخت ضعیف قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ اس حدیث کا شاہد ہے جسے امام طحاوی نے معانی الآثار میں ذکر کیا ہے جو سنداً حسن ہے، نیز انھوں نے لکھا ہے کہ سنن ابی داود کی حدیث (۱۰۳۷) اس سے کفایت کرتی ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر نمازی درمیانے تشہد میں بیٹھنا بھول جائے تو اگر تو وہ ابھی سیدھا کھڑا نہیں ہوا بلکہ بیٹھنے کی حالت کے زیادہ قریب ہے تو اسے چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے اور تشہد پڑھے، یہی حق ہے اور اگر سیدھا کھڑا ہو جائے تو کھڑا رہے اور آخر میں سلام سے پہلے دو سجدے کرے۔

(٢٦٨) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**لَيْسَ عَلَى مَنْ خَلْفَ الْإِمَامِ سَهْوٌ، فَإِنْ سَهَا الْإِمَامُ فَعَلَيْهِ وَعَلَى مَنْ خَلْفَهُ**». رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

[268] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''کسی مقتدی پر سجدۂ سہو نہیں ہے۔ ہاں، اگر امام بھول جائے تو پھر امام اور مقتدی دونوں پر سجدۂ سہو ہے۔'' (اسے بزار اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

(٢٦٩) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «**لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ**». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

[269] حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہر سہو کے لیے دو سجدے ہیں جو سلام پھیرنے کے بعد ہیں۔'' (اسے ابوداود اور ابن ماجہ دونوں نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

«إقامة الصلوات، حديث: ١٢٠٨، والدارقطني: ١/ ٣٧٩. وللحديث شاهد بمتن آخر عند الطحاوي في معاني الآثار (١/ ٤٤٠)، وسنده حسن، وانظر نيل المقصود: ١٠٣٧ فهو يغني عنه.

٢٦٨_ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه البيهقي: ٢/ ٣٥٢، والبزار: لم أجده * فيه خارجة بن مصعب متهم متروك، وأبوالحسين المديني مجهول.

٢٦٩_ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب من نسي أن يتشهد وهو جالس، حديث: ١٠٣٨، وابن ماجه،»

لغوی تشریح: [لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ] اس سے دو مسئلے مستنبط ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ نماز میں جتنی بار بھول ہوئی ہے' ہر ایک کے عوض دو سجدے کیے جائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کا موقع ومحل سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ سجدۂ سہو کے محل وقوع میں احادیث مختلف ہیں۔ اس مسئلے کی دو احادیث جو حضرت عبداللہ ابن بحینہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں' ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے مسنون ہے۔ اور ذوالیدین' حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم کی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو کا محل اور موقع سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر ائمۂ کرام رحمہم اللہ کی آراء میں بھی اختلاف ہے' چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ہر قسم ونوع کا سجدۂ سہو صرف سلام پھیرنے سے پہلے ہے' اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے سلام سے پہلے سجدہ کر لے' چاہے سلام پھیرنے کے بعد کر لے' نیز ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر سجدہ نماز میں کسی اضافے کی وجہ سے کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے کے بعد ہے اور اگر نماز میں کسی کمی واقع ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ حدیث میں جس موقع پر جس طرح سجدہ کرنا ثابت ہے اسی طرح کرنا چاہیے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے۔ مزید برآں اگر سہو کی ایسی کوئی صورت پیش آ جائے جس کا احادیث میں ذکر نہیں ہے تو اس موقع پر احادیث میں مذکور صورتوں میں سے قریب ترین صورت پر عمل کر لیا جائے۔ واللّٰہ أعلم. جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق صاحب سبل السلام کہتے ہیں کہ اس میں نظر ہے کیونکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو اسماعیل بن عیاش کی وجہ سے ضعیف کہا ہے' حالانکہ جب یہ شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور یہ روایت بھی شامیوں سے ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے فاضل محقق نے بھی مذکورہ روایت کو سنداً حسن قرار دیا ہے۔

(٢٧٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَجَدْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ﴾ وَ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[270] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے سورۂ ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ﴾ اور سورۂ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدۂ تلاوت کیا ہے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے سجدۂ تلاوت کا مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مشروعیت پر سب علماء کا اتفاق ہے مگر اس کے وجوب میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت مسنون ہے' واجب نہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ ② سجود قرآن کی تعداد کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورۂ ص اور مفصل کی سورتوں میں سجدۂ تلاوت نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے' تاہم امام شافعی رحمہ اللہ جدید قول کے مطابق چودہ سجدوں کے قائل ہیں۔ (نیل الأوطار: ۱۰۹/۳) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفصل سمیت چودہ سجدے ہیں۔ وہ سورۂ حج کے دوسرے سجدے

◄ إقامة الصلوات، حديث: ١٢١٩ * إسماعيل بن عياش رواه عن أهل بلده وصرح بالسماع فلا وجه لتضعيف السند.

٢٧٠ـ أخرجه مسلم، المساجد، باب سجود التلاوة، حديث: ٥٧٨.

کے قائل نہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک سورۂ حج کے دونوں سجدوں سمیت کل پندرہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک ہی زیادہ وزنی اور قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ (سبل)

(٢٧١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: ﴿صٓ﴾ لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَسْجُدُ فِيهَا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[271] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۂ صٓ کا سجدہ ان میں سے نہیں ہے جن کا ذکر عزیمت اور تاکید کے ساتھ کیا گیا ہے' البتہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [صٓ] اس سے مراد سورۂ صٓ کا سجدۂ تلاوت ہے۔ [لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ] یعنی یہ ان سجدوں میں سے نہیں ہے جن کے کرنے کی تاکید کی گئی ہے' بلکہ حضرت داود علیہ السلام کے متعلق اس میں صرف خبر و اطلاع دی گئی ہے کہ انھوں نے سجدہ کیا اور نبیٔ اکرم ﷺ نے ان کی اقتدا کے طور پر سجدہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ (الأنعام٦:٩٠) ''ان کی راہ راست کی اقتدا کر'' کی تعمیل کی۔ اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ مسنون اعمال میں بعض کی زیادہ تاکید ہے اور بعض کی کم۔ (سبل السلام)

فوائد و مسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ صٓ میں نبی ﷺ نے سجدہ کیا ہے' البتہ آپ نے اس کا حکم نہیں فرمایا اور اس کی تاکید نہیں کی۔ ② اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال اگرچہ مسنون ہیں مگر ان کے بارے میں تاکید نہیں۔ وہ بھی سنت خیر الانام کے زمرے میں آتے ہیں۔

(٢٧٢) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ بِالنَّجْمِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[272] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدۂ تلاوت کیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ نجم کا سجدہ مشروع ہے۔ جو مفصل سورتوں میں سجدۂ تلاوت کے قائل نہیں' انھیں غور کرنا چاہیے۔

(٢٧٣) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَرَأْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اَلنَّجْمَ، فَلَمْ يَسْجُدْ فِيهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[273] حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے روبرو سورۂ نجم کی قراءت کی تو آپ نے اس میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① نبیٔ اکرم ﷺ کا سورۂ نجم میں سجدہ نہ کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس سورت کا سجدہ مشروع

٢٧١۔ أخرجه البخاري، سجود القرآن، باب سجدة ص، حديث: ١٠٦٩.

٢٧٢۔ أخرجه البخاري، سجود القرآن، باب سجود المسلمين مع المشركين، حديث: ١٠٧١.

٢٧٣۔ أخرجه البخاري، سجود القرآن، باب من قرأ السجدة ولم يسجد، حديث: ١٠٧٢، ومسلم، المساجد، باب سجود التلاوة، حديث: ٥٧٧.

نہیں۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اس میں کبھی تو آپ نے سجدہ کیا جیسے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث گزر چکی ہے اور کبھی آپ نے چھوڑ دیا۔ ② یہ حدیث سجود تلاوت کے سنت ہونے کی دلیل ہے' اگر یہ واجب ہوتے تو پھر آپ کبھی نہ چھوڑتے۔ کبھی کر لینا اور کبھی نہ کرنا ہی اس کے سنت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ جمہور کا مسلک ہی صحیح ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ] ابوسعید یا ابوخارجہ ان کی کنیت ہے۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ وحی کی سب سے زیادہ کتابت یہی کیا کرتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے فرائض، یعنی علم میراث کے بڑے ماہر تھے۔ خندق کا معرکہ وہ پہلا معرکہ ہے جس میں یہ شریک ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کی خدمت انھی نے انجام دی تھی اور عہد خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کی نقول بھی آپ ہی نے تیار کی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں یہود کا رسم الخط صرف پندرہ دن میں سیکھ لیا تھا اور آپ کے خطوط تحریر کرتے اور اس کے بعد آپ کو پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ ۴۵ ہجری میں مدینہ میں وفات پائی۔ کچھ اور بھی اقوال ہیں۔

(٢٧٤) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ: فُضِّلَتْ سُورَةُ الْحَجِّ بِسَجْدَتَيْنِ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيلِ. وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ مَوْصُولًا مِنْ حَدِيثِ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، وَزَادَ: «فَمَنْ لَّمْ يَسْجُدْهُمَا فَلَا يَقْرَأْهَا». وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

[274] حضرت خالد بن معدان رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سورۂ حج کو دو سجدۂ تلاوت کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔ (اسے ابوداود نے مراسیل میں ذکر کیا ہے۔) اور اسے احمد اور ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے: ''جو یہ دونوں سجدے نہ کرنا چاہے وہ اس (سورت) کی تلاوت ہی نہ کرے۔'' (اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [فُضِّلَتْ] باب تفعیل سے واحد مؤنث غائب' ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور تفضیل سے ماخوذ ہے۔ [فِي الْمَرَاسِيلِ] سے مراد کتاب المراسیل ہے۔ اور سنن کی کتب میں موصول بیان ہوئی ہے۔ [وَ مَنْ لَّمْ يَسْجُدْ هُمَا] سورۂ حج کے دونوں سجدے جس نے نہ کیے۔ [فَلَا يَقْرَأْهَا] تو پھر وہ سورۂ حج نہ پڑھے۔ اور اصل کتابوں میں تثنیہ کے ساتھ ہے' یعنی [فَلَا يَقْرَأْهُمَا] یعنی دونوں آیات سجدہ نہ پڑھے۔ [وَ سَنَدُهُ ضَعِيفٌ] اس کی سند میں ابن لہیعہ نامی راوی ہے' اس لیے یہ ضعیف ہے لیکن اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ شیخ عبیداللہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجۂ حسن سے کم نہیں ہے۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو۔ (مرعاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح: ۲/ ۱۴۸۔ طبع اول) نیز مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے بھی حسن قرار دیا ہے' لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی وجہ سے قابل عمل اور قابل حجت ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حج کے دونوں سجدے کرنے چاہییں۔ نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ اسے نہ پڑھے۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے اور سجدۂ

٢٧٤ـ [حسن] أخرجه أبوداود في المراسيل، حديث: ٧٠ وسنده ضعيف لإرساله، وأحمد: ٤/ ١٥١، والترمذي، الجمعة، حديث: ٥٧٨ من حديث عقبة بن عامر، وسنده حسن لذاته.

تلاوت کرنا مسنون ہے۔ ترک سنت سے بہتر ہے کہ مستحب عمل ہی نہ کرے یعنی اس کی تلاوت ہی نہ کرے تا کہ ترک سنت کا مرتکب نہ ہو۔ ② حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوموسیٰ، حضرت ابودرداء، حضرت عمار بن یاسر اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سورۂ حج میں دونوں سجدے کرتے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (نیل الأوطار: ۳/ ۱۱۰) اس لیے اس روایت کو ناقابل عمل کہنا غلط ہے۔

راویٔ حدیث: [خالد بن معدان رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ کلاعی (کاف پر فتحہ) ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے۔ فقہاء تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ یا ۱۰۴ یا ۱۰۸ ہجری میں ہوئی۔ معدان کے میم پر فتحہ اور عین ساکن ہے۔

(۲۷۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: يَاأَيُّهَاالنَّاسُ! إِنَّا نَمُرُّ بِالسُّجُودِ، فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ أَصَابَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْجُدْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[275] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: لوگو! ہم (تلاوت کے) سجدوں کے پاس سے گزرتے (ان کی آیات تلاوت کرتے) ہیں، چنانچہ جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

وَفِيهِ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمْ يَفْرِضِ السُّجُودَ إِلَّا أَنْ نَّشَاءَ. وَهُوَ فِي الْمُوَطَّإِ.

اور موطا میں یہ الفاظ ہیں: اللہ تعالیٰ نے سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا مگر ہم چاہیں تو سجدہ کریں۔

لغوی تشریح: [لَمْ يَفْرِضِ السُّجُودَ] فَرَضَ يَفْرِضُ باب ضَرَبَ يَضْرِبُ سے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اسے فرض نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس کی دلیل ہے کہ سجود تلاوت واجب نہیں۔

فوائد و مسائل: ① بعض نسخوں میں أَنْ نَّشَاءَ جمع کے صیغے کی جگہ أَنْ يَّشَاءَ سے بھی منقول ہے۔ یعنی قاری کو اختیار ہے۔ اور فرض و واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ ② حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا۔ سامعین صحابہ سب خاموش رہے۔ اس سے اجماع سکوتی کا ثبوت ملتا ہے، نیز لَمْ يَفْرِضْ اور أَنْ يَّشَاءَ بھی اس کی تائید مزید ہے۔ ائمۂ اربعہ میں سے امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے، نیز علمائے اہلحدیث بھی سجود تلاوت کو مسنون ہی قرار دیتے ہیں مگر احناف اسے واجب کہتے ہیں۔

(۲۷٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ،

[276] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے، چنانچہ جب

۲۷۵۔ أخرجه البخاري، سجود القرآن، باب من رأى أن الله لم يوجب السجود، حديث: ۱۰۷۷، ومالك في الموطأ: ۱/ ۲۰۶.

۲۷٦۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في الرجل يسمع السجدة وهو راكب، حديث: ۱۴۱۳. * عبدالله بن عمر العمري ضعيف لكنه حسن الحديث عن نافع.

فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ، وَسَجَدْنَا مَعَهُ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ لِينٌ.

آپ سجدے کی آیت سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جاتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہی سجدہ کرتے۔ (اسے ابوداود نے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِيهِ لِينٌ] ''لام'' کے نیچے کسرہ اور ''یاء'' ساکن ہے' معنی ہیں: ضعف اور کمزوری' یعنی یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس روایت کی سند میں عبداللہ عمری ضعیف ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام حاکم نے اس روایت کو عبیداللہ عمری کے حوالے سے نقل کیا ہے جسے انھوں نے ثقہ کہا ہے' اور اس حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے۔ اور ابوداود کی روایت جسے متن میں بیان کیا گیا ہے عبداللہ اکبر کی ہے' وہ ضعیف راوی ہے۔ مستدرک حاکم کی روایت جسے امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے اس میں تکبیر کا ذکر نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے علامہ البانی رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت کی بابت لکھا ہے کہ اس میں تکبیر کا ذکر منکر ہے۔ تکبیر کے بغیر مذکورہ روایت صحیح ہے جیسا کہ امام حاکم نے بھی تکبیر کے بغیر والی روایت ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ ② سجدۂ تلاوت بھی سجدۂ نماز ہی کی طرح ہے' لہٰذا افضل یہ ہے کہ آدمی سیدھا کھڑا ہو کر پھر سجدے کے لیے جھکے اور سات اعضاء پر سجدہ کرے۔ اور اگر اٹھ کر سیدھا کھڑے ہوئے بغیر' بیٹھے بیٹھے ہی سجدہ کر دے تو بھی جائز ہے۔ سجدے کو جاتے اور سجدے سے سر اٹھاتے وقت اللہ اکبر کہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نماز میں ہر دفع نیچے جھکتے اور اوپر اٹھتے وقت اللہ اکبر کہتے تھے' جب سجدے سے سر اٹھاتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (سنن النسائي' التطبيق' حدیث:۱۱۵۰' ۱۱۵۱) حضرت ابوہریرہ اور کئی دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ سجدۂ تلاوت بھی نماز کی طرح ہے اور دلائل سے یہی ظاہر ہوتا ہے' لہٰذا اس کے لیے بھی اللہ اکبر کہا جائے لیکن نماز سے باہر سجدہ کرنے کی صورت میں صرف سجدے کے آغاز میں اللہ اکبر کہنا مروی ہے اور یہی طریقہ معروف ہے جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے۔ نماز کے علاوہ سجدے سے سر اٹھاتے وقت اللہ اکبر اور بعد میں سلام پھیرنا مروی نہیں۔ ③ بعض اہل علم کا موقف ہے کہ سجدے کو جاتے ہوئے اللہ اکبر کہے اور فارغ ہو کر سلام پھیرے۔ لیکن اس موقف کے حاملین کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے' اس لیے سجدہ کو جاتے ہوئے اللہ اکبر اور فراغت کے بعد سلام کہنا ضروری نہیں' ہاں اگر کوئی دیگر عمومات سے استدلال کرتے ہوئے صرف جواز کو اپناتا ہے اور تکبیر وغیرہ کہہ لیتا ہے تو شرعاً کوئی حرج نہیں۔ واللّٰہ أعلم. سجدۂ تلاوت قاری اور سامع (پڑھنے اور سننے والے) کے لیے سنت ہے۔ اگر قاری سجدہ کرے تو سامع کو بھی قاری کی اتباع میں سجدہ کرنا چاہیے۔ ④ افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ سجدۂ تلاوت باوضو اور قبلہ رو ہو کر کیا جائے۔ ⑤ سجدۂ تلاوت کی معروف دعا [سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَ صَوَّرَهُ وَ شَقَّ سَمْعَهُ وَ بَصَرَهُ' تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ] (صحيح مسلم' صلاة المسافرين' حديث:۷۷۱) کا سجدۂ نماز میں پڑھنا تو صحیح ثابت ہے مگر سجدۂ قرآن میں اس کا

پڑھنا صحیح سند سے ثابت نہیں۔ تاہم ایک دوسری دعا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے' وہ یہ ہے: [اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِي بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا، وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِي عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ] (جامع الترمذي، الجمعة، باب ماجاء مايقول في سجود القرآن، حديث:٥٧٩، وسنن ابن ماجه، حديث: ١٠٥٣، وصحيح ابن خزيمة، حديث:٥٦٢، ٥٦٣) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ (فتوحات ربانيه: ٢/ ٢٧٦) نیز امام ابن خزیمہ' حاکم' ابن حبان' شیخ احمد شاکر اور شیخ البانی رحمہم اللہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا اس دعا کو سجدۂ تلاوت میں پڑھنا چاہیے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سنن ابوداود (اُردو) مطبوعہ دارالسلام) جلد دوم' حدیث:١٤١٤ کے فوائد۔

(٢٧٧) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ يَسُرُّهُ خَرَّ سَاجِدًا لِلّٰهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

[277] حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی خوشخبری ملتی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر جاتے۔ (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَسُرُّهُ] ایسا کام جو آپ کی خوشی' فرحت و سرور اور بشارت کا باعث ہوتا۔ [خَرَّ] گر پڑتے۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی نعمت کے حصول اور ناپسندیدہ کام سے بچنے کے موقع پر بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو جانا مستحب ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے سجدوں کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کے لیے وضو شرط نہیں' تاہم افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ باوضو ہو کر سجدہ کیا جائے۔

فوائد و مسائل: ① کسی نئی نعمت کے حاصل ہونے پر' کسی مصیبت سے بچ نکلنے پر اور کسی خوشی و مسرت کے موقع پر سجدۂ شکر بجا لانا شریعت سے ثابت ہے۔ ② حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی تو انھوں نے سجدۂ شکر کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل بھی یہی تھا جیسا کہ درج ذیل روایت میں مروی ہے۔

(٢٧٨) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَطَالَ السُّجُودَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَقَالَ: **إِنَّ جِبْرِيلَ أَتَانِي، فَبَشَّرَنِي، فَسَجَدْتُ لِلّٰهِ شُكْرًا**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[278] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا' پھر سجدے سے سر اٹھا کر فرمایا: ''ابھی جبریل ایک خوشخبری لے کر میرے پاس آئے تو وہ مژدہ سن کر میں نے اللہ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت متعدد اسانید سے مروی ہے اور ان میں سے ایک روایت میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ بشارت اور

٢٧٧ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجهاد، باب في سجود الشكر، حديث:٢٧٧٤، والترمذي، السير، حديث:١٥٧٨، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث:١٣٩٤، وأحمد:٥/ ٤٥.

٢٧٨ـ [إسناده حسن] أخرجه أحمد:١/ ١٩١، والحاكم:١/ ٥٥٠، وصححه، ووافقه الذهبي.

خوشخبری یہ تھی کہ جو شخص نبی ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ اور اس کے دس گناہ معاف فرما دے گا۔ (المصنف لابن أبي شيبة: ۲/ ۵۰۲) یہ خوش کن اطلاع پا کر آپ ﷺ سجدے میں گر پڑے اور شکر بجا ادا کیا لہٰذا جب کسی کو نعمت و مسرت کے حصول اور مصیبت سے بچ نکلنے کا موقع پیش آ جائے تو اسے بھی سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابومحمد ہے۔ قریش کے زہرہ قبیلے سے تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک ہوئے۔ بدر و احد وغیرہ سب غزوات میں شامل رہے۔ ان کا شمار ان دس خوش قسمت انسانوں میں ہوتا ہے جنھیں رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ ان چھ افراد میں سے ایک تھے جنھیں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے نامزد فرمایا تھا۔ عہد نبوی میں انھوں نے ایک مرتبہ چار ہزار اور پھر چالیس ہزار دینار صدقہ و خیرات کیے' پھر انھوں نے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جہاد کے لیے پیش کیے۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لیے اپنے ایک باغیچے کے متعلق وصیت کی کہ ان کی نذر کر دیا جائے' اس کی بعد میں قیمت لگوائی گئی تو وہ چار لاکھ دینار تھی۔ ۳۲ ہجری میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

(۲۷۹) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ عَلِيًّا إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ. قَالَ: فَكَتَبَ عَلِيٌّ بِإِسْلَامِهِمْ، فَلَمَّا قَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْكِتَابَ خَرَّ سَاجِدًا، شُكْرًا لِلّٰهِ تَعَالَى عَلَى ذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

[279] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا۔ راوی نے حدیث بیان کی جس میں اس نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کے اسلام قبول کرنے کی روداد آپ ﷺ کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وہ مکتوب پڑھا تو آپ اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے۔)

فوائد و مسائل: ① آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں اہل یمن کے اسلام قبول کرنے کی خبر پڑھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ باعث خوشی اور مقام مسرت ہے اور یہ بھی ایک عظیم نعمت الٰہی ہے' اس لیے بطور شکر کے سجدۂ شکر بجا لانا مشروع ہے۔ ② ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی کثرت تعداد باعث مسرت اور موجب انبساط ہوا کرتی تھی اور اب یہ دور ہے کہ مسلمان بچوں کی پیدائش روکنے کی شب و روز سکیمیں اور عملی تدبیریں بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں' اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زور و شور سے اس مہم کو چلایا جا رہا ہے اور کروڑہا روپیہ اسے کامیاب بنانے پر صرف کیا جا رہا ہے۔

۲۷۹۔ [صحيح] أخرجه البيهقي: ۲/ ۳٦۹، وأخرج البخاري صدر الحديث، المغازي، حديث: ٤۳٤۹.

٩ - بَابُ صَلَاةِ التَّطَوُّعِ

باب:9-نفل نماز کا بیان

(٢٨٠) عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ كَعْبٍ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ: «سَلْ»، فَقُلْتُ: أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ. فَقَالَ: «أَوَ غَيْرَ ذٰلِكَ؟» فَقُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: «فَأَعِنِّي عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ».

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[280] حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ نے مجھے (مخاطب کر کے) فرمایا: ''مانگ لے (جو کچھ مانگنا ہے)۔'' میں نے عرض کیا: میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟'' میں نے عرض کیا: بس یہی مطلوب ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تو پھر اپنے مطلب کے حصول کے لیے کثرت سجود سے میری مدد کر۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ التَّطَوُّعِ] یعنی نفلی نماز۔ اور نفلی عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے ہی کوئی عبادت کرے جو کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے فرض نہیں کی گئی۔ [سَلْ] سُؤَال سے صیغۂ امر ہے۔ معنی ہیں کہ طلب کرو، مانگو۔ [مُرَافَقَتَكَ] رفاقت اور مصاحبت۔ [فَأَعِنِّي] یہ إِعَانَة سے امر کا صیغہ ہے اور اس میں متکلم کی ''یا'' ہے۔ [عَلٰى نَفْسِكَ] یعنی اپنے جی کی خواہش و مراد کے حصول کے لیے۔ [بِكَثْرَةِ السُّجُودِ] سجود سے یہاں نفل نماز مراد ہے، یعنی نوافل کثرت سے پڑھا کر کیونکہ سجدے کی کثرت تو کثرت نماز کی صورت ہی میں ممکن ہے، اور کثرت یا قلت نفل نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔ فرائض میں تو کمی بیشی ناممکن ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تیری مطلوب چیز (جنت) تجھے عطا کر دے، تم بھی اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے دعا کرو لیکن یاد رکھو یہ بڑی عظیم طلب و چاہت ہے، لہٰذا نفل نماز کثرت سے پڑھا کرو تا کہ میری دعا اپنے مقام پر پہنچ کر قبول ہو جائے۔ اور اسے اعانت کہا گیا ہے۔ ② اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سجدے سے مراد نفل نماز لی ہے۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجدے کو سارے ارکان نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ سجدہ تقرب الٰہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرب الٰہی اور نبی اکرم ﷺ کی رفاقت کے لیے کثرت سے نوافل ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو اتباع سنت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر نوافل سے اتنی رغبت نہیں جتنی تاکید ان کے بارے میں معلوم ہوتی ہے، اور کچھ لوگ تو زبانی عاشق رسول ہونے کے دعویدار ہیں مگر نوافل تو کجا فرائض بھی نہیں پڑھتے، رہتے پھر بھی وہ عاشق رسول ہی ہیں بلکہ نادان اور بے علم و جاہل لوگوں نے ان کو رتبۂ ولایت پر بٹھا رکھا ہے جنھوں نے کبھی نماز پڑھ کر نہیں دیکھی۔

٢٨٠ـ أخرجه مسلم، الصلاة، باب فضل السجود والحث عليه، حديث: ٤٨٩.

راویٔ حدیث: [حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ] ابوفراس ان کی کنیت ہے۔ اسلم قبیلہ سے تھے' اس لیے اسلمی کہلائے۔ اصحاب صفہ میں سے تھے اور مدینہ کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضر وسفر میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ ہجری میں وفات پائی۔

(٢٨١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكَعَاتٍ: رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الصُّبْحِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا: وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ فِي بَيْتِهِ.

[281] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی ﷺ کی دس رکعتیں یاد ہیں: دو رکعتیں ظہر کی نماز سے پہلے اور دو بعد میں۔ اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر پر۔ دو رکعتیں عشاء کی فرض نماز کے بعد گھر پر۔ اور دو رکعتیں صبح سے پہلے۔ (بخاری ومسلم) اور (بخاری ومسلم) دونوں کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دو رکعتیں نماز جمعہ کے بعد گھر پر (پڑھتے تھے۔)

وَلِمُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ لَا يُصَلِّي إِلَّا رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

اور مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ صبح صادق کے بعد صرف ہلکی سی دو رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے ظہر کی صرف دو رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور دو رکعتیں بعد کی ثابت ہوتی ہیں اور دوسری حدیث سے چار پہلے اور دو بعد میں پڑھنے کا ثبوت بھی موجود ہے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم' صلاة المسافرین' حدیث: ۷۲۸۔۷۳۰) ② سنن نسائی اور بعض دوسری کتب حدیث میں نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث بھی موجود ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص نماز ظہر سے پہلے اور نماز ظہر کے بعد چار چار رکعتیں پڑھے' اللہ عزوجل نے جہنم کی آگ پر اس شخص کا گوشت حرام فرما دیا ہے۔'' (سنن النسائي' قيام الليل' حديث: ۱۸۱۳)

(٢٨٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَدَعُ أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْغَدَاةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[282] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا يَدَعُ] نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ جملہ ہمیشگی اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال اس سے مراد یہ ہے کہ ان رکعات کو بکثرت ادا فرمایا کرتے تھے۔ [أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ] ظہر سے قبل چار رکعتیں۔ یہ روایت اس سے پہلے

٢٨١ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب التطوع بعد المكتوبة، حديث: ١١٧٢، ومسلم، صلاة المسافرين، باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض وبعدهن، حديث: ٧٢٩، وحديث "كان إذا طلع الفجر لا يصلي إلا ركعتين خفيفتين" حديث: ٧٢٣.

٢٨٢ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب الركعتين قبل الظهر، حديث: ١١٨٢.

آنے والی ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے خلاف ہے۔ (اس میں دو رکعتوں کا ذکر ہے اور اس میں چار کا۔) دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ آپ نے کبھی ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو۔ ان دونوں راویوں نے صرف ایک ایک صورت کے متعلق خبر دی ہے کہ آپ کا طرز عمل اس طرح تھا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنن رواتب میں سے نہیں بلکہ یہ تو زوال کا سایہ ڈھلنے کے وقت کی نماز تھی اور یہ ایسی گھڑی تھی جس میں آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف نظر رحمت سے دیکھتا ہے جیسا کہ بزار نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے۔ لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (مجمع الزوائد: ۲/ ۲۱۹ والسلسلة الضعيفة، رقم: ۹۸۴) اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب آپ یہ نماز گھر پر ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب اسے مسجد میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ راوی نے جو کچھ جس شکل میں ملاحظہ کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے تاہم پہلی صورت بہتر اور عمدہ ہے۔ [قَبْلَ الْغَدَاةِ] نماز فجر سے پہلے۔

فوائد و مسائل: ① شب و روز میں نبی اکرم ﷺ فرائض کے علاوہ کچھ نوافل بھی ادا فرمایا کرتے تھے۔ جن کا زیادہ اہتمام فرمایا اور ترغیب دی ان کو سنت مؤکدہ اور جن پر دوام اور ہیشگی نہیں فرمائی ان کو سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا نام دے دیا گیا۔ ہیں یہ سب نوافل۔ ② اس حدیث میں ظہر کے فرائض سے پہلے چار رکعت کا ذکر ہے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے (جو پہلے گزر چکی ہے) دو رکعتیں پہلے اور دو بعد میں ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں میں تطبیق کی صورت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر سے قبل دو رکعتیں پڑھنا قابل ترجیح ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چار رکعات قابل ترجیح ہیں۔ اس سلسلے کی ساری روایات سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عمل دونوں طرح تھا۔ اس کے باوجود چار پڑھنا دو کے مقابلے میں زیادہ ثواب اور فضیلت کا باعث ہے۔

(۲۸۳) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُدًا مِّنْهُ عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[283] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نوافل میں سے فجر کی دو سنتوں کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

وَلِمُسْلِمٍ: «رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا».

اور مسلم میں ہے کہ نماز فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔

لغوی تشریح: [عَلٰى شَيْءٍ] کسی چیز کی حفاظت پر۔ [أَشَدَّ] اشد کے معنی میں ہے یعنی بہت زیادہ کثرت کے ساتھ۔ گرامر کے لحاظ سے یہ لَمْ يَكُنْ کی خبر واقع ہو رہا ہے یا حال یا پھر مصدر یعنی مفعول مطلق ہے اور اس صورت میں

۲۸۳ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب تعاهد ركعتي الفجر، حديث: ۱۱۶۹، ومسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر، حديث: ۷۲٤، وحديث "ركعتا الفجر خير من الدنيا وما فيها" أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، حديث: ۷۲٥.

عَلٰى شَيْءٍ لَمْ يَكُنْ کی خبر ہوئی۔ [تَعَاهُدًا] تحفظ کرنے اور اہتمام کرنے کے معنی میں ہے۔ [مِنْهُ] اسم تفضیل مِنْ کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور "ہ" ضمیر سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی [مِنْ تَعَاهُدِهِ] یعنی نبی ﷺ کا فجر کی دو سنتوں پر التزام و دھیان دوسری سنتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا تھا۔

فوائد و مسائل: ① اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں کہ نبی ﷺ نے سنن رواتب میں سے فجر کی دو سنتوں کا جتنا التزام فرمایا اتنا دوسری سنتوں کا اہتمام نہیں کیا حتی کہ سفر وحضر میں بھی انھیں کبھی نہیں چھوڑا۔ ان دو سنتوں کی اتنی تاکید کے پیش نظر احناف نے تو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود ان کو فرضوں سے پہلے پڑھنا لازمی قرار دے رکھا ہے' حالانکہ یہ صراحتاً حدیث کے خلاف ہے کیونکہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے دوسری کوئی نماز پڑھنا درست نہیں' چنانچہ آپ کا فرمان ہے: [إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ] ''جب (نماز کے لیے) اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' (صحیح مسلم' صلاة المسافرين' باب كراهة الشروع في نافلة.....' حدیث:۷۱۰) ② بیہقی کی وہ روایت کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو کوئی نماز نہیں سوائے فرض نماز کے الا یہ کہ صبح کی سنتیں ہوں' بالکل بے اصل اور ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (عون المعبود)

(٢٨٤) وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ صَلَّى اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً فِي يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ بُنِيَ لَهُ بِهِنَّ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ: «تَطَوُّعًا».

[284] ام المومنین حضرت ام حبیبہ ؓ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''جو شخص شب و روز میں بارہ رکعت نوافل پڑھے اس کے لیے ان کے بدلے میں جنت میں ایک گھر تعمیر کر دیا جاتا ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور ایک روایت میں تَطَوُّعًا کے الفاظ بھی ہیں' یعنی نفل کے طور پر پڑھے۔

وَلِلتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ وَزَادَ: «أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ».

اور ترمذی کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ (صراحت) زیادہ ہے: ''چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت بعد میں اور دو رکعت نماز مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت صبح کی نماز سے پہلے۔

وَلِلْخَمْسَةِ عَنْهَا: «مَنْ حَافَظَ عَلٰى أَرْبَعٍ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا، حَرَّمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَى

اور پانچوں نے حضرت ام حبیبہ ؓ ہی سے روایت کیا ہے: ''جس شخص نے ظہر کی پہلی چار رکعتوں اور اس کے بعد

٢٨٤- أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل السنن الراتبة، قبل الفرائض وبعدهن، حديث:٧٢٨، وحديث: "أربعا قبل الظهر" أخرجه الترمذي، الصلاة، حديث: ٤١٥ وهو حديث صحيح، وحديث "من حافظ على أربع قبل الظهر" أخرجه أبوداود، التطوع، حديث: ١٢٦٩، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤٢٧، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٨١٧، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٦٠، وأحمد: ٦/ ٣٢٦ وهو حديث صحيح.

النَّارِ». | کی چار رکعتوں کی حفاظت کی تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے۔"

لغوی تشریح: | وَلِلْخَمْسَةِ عَنْهَا | عَنْهَا کی ضمیر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف راجع ہے، یعنی پانچوں نے ان کے حوالے سے روایت نقل کی ہے۔ | وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا | اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ دو سنتیں پڑھنے کے بعد چار مزید مراد ہوں، یعنی ظہر کے بعد چار رکعات۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ دو پہلے جو عام طور پر پڑھی جاتی ہیں اور دو مزید ان میں شامل کر لی جائیں تو یہ چار بن جائیں گی۔ | حَرَّمَهُ اللّٰهُ | تحریم سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کی آگ میں داخل ہونے سے محفوظ کر دیا اور بچا لیا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب و روز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان پر التزام کرنا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ نے ان کا اہتمام فرمایا ہے۔ ② ظہر کی فرض نماز کے بعد دو کی بھی گنجائش ہے اور چار کی بھی۔ چار کی فضیلت بڑی بیان ہوئی ہے۔ اور اگر کوئی چھ پڑھ لیتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔

راویٔ حدیث: [ام سلمہ رضی اللہ عنہا] ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔ قدیم الاسلام تھیں اور ہجرت حبشہ کرنے والوں میں شامل تھیں۔ ان کا شوہر عبیداللہ بن جحش بھی ان کے ساتھ تھا مگر وہ وہاں جا کر عیسائی ہو گیا اور وہیں مر گیا۔ اس کے بعد ۷ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ نکاح کے وقت وہیں حبشہ ہی میں تھیں، پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں۔ ۴۲ یا ۴۴ یا ۵۰ ہجری میں فوت ہوئیں۔

(٢٨٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً صَلّٰى أَرْبَعًا قَبْلَ الْعَصْرِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَصَحَّحَهُ.

[285] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے نماز عصر سے پہلے چار رکعات پڑھیں۔" (اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے، نیز اسے ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔)

فائدہ: نماز عصر سے پہلے یہ چار رکعتیں سنن رواتب (مؤکدہ سنتیں) تو نہیں لیکن ہیں بہت زیادہ فضیلت کی حامل۔ ان چار رکعتوں کا اہتمام کرنے والے شخص کے لیے رسول اللہ ﷺ کے دعائیہ کلمات رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً ہی ان رکعتوں کی بہت زیادہ فضیلت پر دلالت کرتے ہیں، یعنی جو شخص یہ چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

(٢٨٦) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ الْمُزَنِيِّ

[286] حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ

٢٨٥ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الصلاة قبل العصر، حديث: ١٢٧١، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤٣٠، وأحمد: ٢/ ١١٧، وابن خزيمة: ٢/ ٢٠٦، حديث: ١١٩٣.

٢٨٦ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب الصلاة قبل المغرب، حديث: ١١٨٣، وابن حبان (موارد الظمآن): ٦١٧، وحديث ◄◄

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ، صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ»، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «لِمَنْ شَاءَ» كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔'' پھر تیسری مرتبہ کہتے ہوئے فرمایا: ''یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو پڑھنا چاہے۔'' آپ نے یہ اس اندیشے کے پیش نظر فرمایا کہ لوگ اسے سنت نہ بنا لیں۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ حِبَّانَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى قَبْلَ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ.

ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعت ادا فرمائیں۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرَانَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا، وَلَمْ يَنْهَنَا.

اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم غروب آفتاب کے بعد (فرض نماز سے پہلے) دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور نبی ﷺ ہمیں دیکھ رہے ہوتے تھے' نہ تو آپ نے ہمیں ان کا حکم دیا اور نہ منع فرمایا۔

لغوی تشریح: [لِمَنْ شَاءَ] یعنی یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو پڑھنا چاہے۔ [كَرَاهِيَةَ] مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ نے لِمَنْ شَاءَ اس لیے فرمایا کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ [أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ] لوگ اسے بنا لیں۔ [سُنَّةً] ہمیشہ کے لیے مسنون طریقہ اور اسے چھوڑنا ناپسند کریں گے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ نے اس کے استحباب کو ناپسند کیا ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو کام مستحب بھی نہ ہو آپ ﷺ اس کی ترغیب اور حکم دیں اور اس کے کرنے کا شوق دلائیں۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب ہے۔ اور یہ حدیث قولی ہے۔ اور جس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے وہ فعلی حدیث ہے۔ اور جو روایت امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ تقریری ہے' چنانچہ مغرب سے پہلے نفل پڑھنا سنت کی تینوں قسموں (قولی' فعلی اور تقریری) سے ثابت ہے۔ اور صحیح مسلم کے حوالے سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فَلَمْ يَأْمُرْنَا آپ نے ہمیں حکم نہیں دیا تو یہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایات کے منافی ہے۔ جن میں ان کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ روایت نہ ملی ہو یا ان کی مراد یہ ہو کہ آپ نے تاکیدی حکم نہیں دیا۔

فائدہ: مغرب کے فرضوں سے پہلے دوگانہ پڑھنا سنن زائدہ میں شمار ہوتا ہے' سنن مؤکدہ میں نہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب ہے' اس لیے یہ پڑھنی چاہییں۔

راویٔ حدیث: [عبداللہ بن مغفل مزنی] مزینہ قبیلے سے تعلق رکھنے کی بنا پر مزنی (میم پر ضمہ اور زا پر فتحہ ہے) کہلائے۔ مغفل میں ''میم'' پر ضمہ ''غین'' پر فتحہ اور ''فا'' پر فتحہ اور تشدید ہے۔ یہ اصحاب شجرہ میں سے ہیں۔ پہلے مدینہ میں رہائش رکھی' بعدازاں مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ان دس اصحاب میں شامل تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ

◄◄ أنس أخرجه مسلم، حديث: ٨٣٦.

کو تعلیم دینے کے لیے بھیجا۔ ۶۰ ہجری میں وفات پائی۔

(۲۸۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُخَفِّفُ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ، حَتّٰى إِنِّي أَقُولُ: أَقَرَأَ بِأُمِّ الْكِتَابِ؟ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[287] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں اتنی ہلکی پڑھتے تھے کہ میں خیال کرتی کہ کیا آپ نے ام الکتاب (فاتحہ) بھی پڑھی ہے (یا نہیں)؟ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أَقَرَأَ] اس میں ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور یہاں شک و تردد کے لیے استعمال ہوا ہے، یعنی کیا آپ نے ام القرآن، یعنی سورۂ فاتحہ بھی پڑھی ہے یا نہیں؟ اور یہ شک اس لیے واقع ہوا کہ اس میں آپ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ اور کسی چھوٹی سی سورت کو جلدی جلدی پڑھا کرتے تھے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صبح کی دو سنتیں مختصر اور ہلکی پڑھتے تھے۔ امام شافعی اور جمہور علماء رحمہم اللہ نے اسی بنا پر کہا ہے کہ ان دو رکعتوں میں مختصر قیام افضل ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان میں بھی لمبا قیام افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے دونوں شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد رحمہ اللہ نے بھی ان کی مخالفت کی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ آپ چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے۔

(۲۸۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ فِي رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ ﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ﴾ وَ﴿قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ﴾. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[288] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کی دو رکعتوں میں (سے پہلی میں) ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور (دوسری میں) ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھی۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: ان دو رکعتوں میں ان سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ اتباع سنت کے جذبے کے تحت ان کو پڑھنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری کوئی سورت پڑھنا ممنوع ہے بلکہ مذکورہ سورتوں کا پڑھنا مستحب اور مسنون ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی صبح کی سنتوں میں ان دونوں سورتوں کے علاوہ کوئی اور حصہ تلاوت فرما لیا کرتے تھے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، حدیث:۷۲۷)

(۲۸۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ

[289] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز فجر کی دو سنتیں پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنے دائیں پہلو

۲۸۷۔ أخرجه البخاري، التهجد، باب ما يقرأ في ركعتي الفجر، حديث: ۱۱۷۱، ومسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر، حديث: ۷۲٤.

۲۸۸۔ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر، حديث: ۷۲٦.

۲۸۹۔ أخرجه البخاري، التهجد، باب الضجعة على الشق الأيمن بعد ركعتي الفجر، حديث: ۱۱٦۰.

اِضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

کے بل لیٹ جاتے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَلٰى شِقِّهِ] پہلو کے بل۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کو ادا کر کے آپ اپنے دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں آپ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کے متعلق آراء مختلف ہیں مگر صحیح موقف کے مطابق یہ مسنون اور مستحب ہے۔

(٢٩٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمُ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلٰى جَنْبِهِ الْأَيْمَنِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

[290] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھ چکے تو اسے اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جانا چاہیے۔'' (اس حدیث کو احمد' ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے شواہد کی بنا پر مذکورہ مسئلے کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ گزشتہ حدیث بخاری سے بھی اس مسئلے کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ١٥/ ٢١٨' حديث: ٩٣٦٨) لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کی باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل عمل ہے۔ ② دو احادیث سے فجر کی سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت کرنا مسنون ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے نبی ﷺ کا عمل اور دوسری سے آپ کا حکم ثابت ہے' چنانچہ اس بنا پر اہل ظواہر کے نزدیک یہ لیٹنا واجب ہے اور جو نمازی اس پر جان بوجھ کر عمل نہیں کرتا اس کی نماز فجر نہیں ہوتی' تاہم امام نووی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ بعض نے اسے مکروہ سمجھا ہے مگر صحیح حدیث کے مقابلے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں۔ ③ شارح سنن ابوداود مولانا شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ نے إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر میں اس مسئلے کی بابت بڑی تفصیل سے قابل قدر بحث کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنا سنت ہے' خواہ کسی نے تہجد پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔

(٢٩١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[291] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے'

٢٩٠ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الاضطجاع بعدها، حديث: ١٢٦١، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤٢٠، وأحمد: ٢/ ٤١٥. * سليمان بن مهران الأعمش مدلس وقد عنعن، وعنعنة المدلس ضعيفة على الراجح إلا إذا صرح بالسماع في طريق آخر أو توبع من مقبول الحديث.

٢٩١ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب كيف صلاة النبي ﷺ .....، حديث: ١١٣٧، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنى مثنى، حديث: ٧٤٩، وحديث "صلاة الليل والنهار مثنى مثنى" أخرجه أبوداود، التطوع، حديث: ١٢٩٥، والترمذي، الجمعة، حديث: ٥٩٧، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٣٢٢، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٦٦٧، ◄◄

عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰى رَكْعَةً وَاحِدَةً، تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلّٰى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْخَمْسَةِ - وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ -بِلَفْظِ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنٰى مَثْنٰى». وَقَالَ النَّسَائِيُّ: هٰذَا خَطَأٌ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رات کی نماز دو دو رکعتیں ہے اور جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع ہونے کا خدشہ لاحق ہونے لگے تو (آخر میں) ایک رکعت پڑھ لے۔ یہ پہلے پڑھی ہوئی ایک رکعت اس کی ساری نماز کو وتر (طاق) بنا دے گی۔'' (بخاری و مسلم) اور پانچوں کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''دن اور رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔'' اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے' البتہ امام نسائی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے۔

لغوی تشریح: [مَثْنٰى مَثْنٰى] دو دو رکعتیں' یعنی ہر دو رکعتوں کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا جائے۔ [تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلّٰى] اس کی ادا شدہ نماز کو وتر (طاق) بنا دے گی۔ [هٰذَا خَطَأٌ] یعنی روایت میں ''دن'' کا ذکر خطا ہے۔ کسی راوی کا وہم ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اوقات میں پڑھی جانے والی نماز کو دو دو رکعتوں کی صورت میں پڑھنا چاہیے اور دو کے بعد سلام پھیرنا چاہیے۔ امت کی غالب اکثریت نے اسی کو تسلیم کیا ہے۔ ② دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک بھی ثابت ہے بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک ہی ہے۔ لیکن احادیث سے تین' پانچ' سات' نو اور گیارہ تک کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ③ جہاں تک امام نسائی رحمہ اللہ کے لفظ اَلنَّهَار کو خطا کہنے کا تعلق ہے' ان کی یہ رائے محل نظر ہے' اس لیے کہ امام بخاری' امام ابن حبان اور امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی سلسلة الأحاديث الصحيحة میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دن ہو یا رات نوافل دو دو کی تعداد میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ دو دو رکعتوں کے پڑھنے کی صورت میں درود اور بعد از درود دعائیں زیادہ مرتبہ پڑھی جائیں گی' اس لیے ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ویسے دن کو دو دو کر کے پڑھے یا چار چار دونوں طرح جائز ہے کیونکہ نبی ﷺ سے دن کو چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا بھی ثابت ہے۔ (سنن أبي داود' التطوع' حديث: ۱۲۷۰' شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔) ④ ایک رکعت وتر پڑھنے کی صورت میں تو تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا' اگر تین یا اس سے زائد پڑھے تو کیا صورت ہوگی؟ احمد' نسائی' بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں تو صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ جب تین وتر پڑھتے تھے تو صرف آخری رکعت ہی میں تشہد پڑھا کرتے تھے' اس لیے صحیح یہ ہے کہ تین رکعت وتر پڑھے جائیں تو درمیان میں تشہد نہ پڑھا جائے۔ مگر احناف رات کے وتروں کو مغرب کی تین رکعات پر قیاس کر کے دو مرتبہ تشہد پڑھنے کے قائل ہیں' حالانکہ وتروں کو مغرب کی نماز کی طرح پڑھنے کی ممانعت حدیث میں صراحتاً وارد ہے۔ دیکھیے: (سنن الدارقطني: ۲/

◀◀ وأحمد: ۲/ ۲٦، ۵۱، وابن حبان (الإحسان): ٤/ ۸٦، حديث: ۲٤۷۳ وهو حديث حسن.

٢٥_٢٧، وابن حبان، حديث:٦٨٠)

(٢٩٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ، صَلَاةُ اللَّيْلِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[292] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے نماز تہجد کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی فضیلت پر خود قرآن مجید شاہد ہے۔ ② کتب احادیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''رات کے آخری حصے کی نماز۔'' (صحیح مسلم، الصیام، باب فضل صوم المحرم، حدیث:۱۱۶۳) ③ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو اپنے پروردگار سے تمام اوقات سے زیادہ تقرب رات کے آخری حصے میں حاصل ہوتا ہے۔ (مسند أحمد:۴/۱۱۴، وسنن ابن ماجہ، إقامة الصلوات، باب ماجاء في الساعات التي تكره فيها الصلاة، حدیث:۱۲۵۱) اس لیے بندگان الٰہی کو چاہیے کہ خواص کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے شب بیداری کو اپنا معمول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بارگاہ رب العزت میں حاضری اور سرگوشی و مناجات کا سب سے اچھا موقع ہوتا ہے۔

(٢٩٣) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ، مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ الْأَرْبَعَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ وَقْفَهُ.

[293] حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وتر ہر مسلمان پر حق ہے (اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔) جسے پانچ وتر پڑھنا پسند ہوں تو وہ ایسا کر لے اور جسے تین وتر پسند ہوں تو وہ اس طرح کر لے اور جسے ایک وتر پڑھنا پسند ہو تو وہ ایسا کر لے۔'' (اسے ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے، البتہ نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْوِتْرُ حَقٌّ] وتر ثابت ہے، یعنی شریعت میں اس کا ثبوت ہے۔ امام مجد بن تیمیہ رحمہ اللہ نے المنتقی میں بیان کیا ہے کہ ابن منذر نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کیے ہیں: [اَلْوِتْرُ حَقٌّ وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ] ''وتر برحق ہے مگر واجب نہیں۔'' اور یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس حدیث میں لفظ حق وتر کی مشروعیت پر دال ہے وجوب پر نہیں، لہٰذا جس نے لفظ ''حق'' کی بنیاد پر وتر کو واجب قرار دیا ہے اس کا یہ استدلال باطل ہے۔

٢٩٢_ أخرجه مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم، حديث: ١١٦٣.

٢٩٣_ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب كم الوتر؟، حديث: ١٤٢٢، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٧١١، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٩٠، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٦٧٠. * المرفوع والموقوف، صحيحان كلاهما، ولم أر لمضعفه حجة.

فوائد و مسائل: ① وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے واجب کہتے ہیں مگر جمہور علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ ''وتر کا پڑھنا حق ہے'' کے الفاظ وجوب پر تو دلالت نہیں کرتے' البتہ اس کی اہمیت پر ضرور دال ہیں۔ ② ایک دوسری حدیث میں بھی ہے: [اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ یُوتِرْ فَلَیْسَ مِنَّا] ''وتر برحق ہے' جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (سنن أبي داود' الوتر' باب فيمن لم يوتر' حديث:١٤١٩' و مسند أحمد:٥/ ٣٥٧) اس حدیث کو بعض محققین نے شواہد کی بنا پر حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد:٣٨/ ١٢٧' ١٢٨) اس حدیث میں بھی وتر پڑھنے کی تاکید بیان کی گئی ہے مگر وجوب کا بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے سفر و حضر میں وتر پڑھے ہیں اور سواری پر بھی۔ دیکھیے: (صحيح البخاري' الوتر' باب الوتر على الدابة' وباب الوتر في السفر' حديث:٩٩٩' ١٠٠٠) اور سواری پر ادا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وتر ایک' تین' پانچ سب درست ہیں۔ احناف کا صرف تین وتر پر اکتفا کرنا صحیح اور صریح روایات کی بنا پر درست نہیں۔

(٢٩٤) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الْوِتْرُ بِحَتْمٍ كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلٰكِنْ سُنَّةٌ سَنَّهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

[294] حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وتر فرضوں کی طرح حتمی اور لازمی نہیں ہے بلکہ سنت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے' نیز اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَيْسَ بِحَتْمٍ] کے معنی واجب اور ضروری کے ہیں۔ [كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ] فرض نماز کی طرح لازمی نہیں۔

فوائد و مسائل: یہ حدیث جمہور علماء کی دلیل ہے جو وتر کے وجوب کے قائل نہیں۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عاصم بن ضمرہ کوفی متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اعدل الاقوال ذکر کیا ہے کہ وہ صدوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انھوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ اور حاکم رحمہ اللہ کی تحسین و تصحیح نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا۔ البتہ ہمارے فاضل محقق نے اسے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے' نیز مسند احمد میں بھی اس کے شواہد ہیں جنھیں الموسوعۃ الحدیثیہ والوں نے قوی قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد:٢/ ٨١) لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود قابل عمل اور قابل حجت ہے۔

(٢٩٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ

[295] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ

٢٩٤ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء أن الوتر ليس بحتم، حديث: ٤٥٣، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٦٧٦، والحاكم: ١/ ٣٠٠، ووافقه الذهبي، أبو إسحاق مدلس وعنعن.

٢٩٥ـ [حسن] أخرجه ابن حبان (الإحسان): ٤/ ٦٢-٦٤، حديث: ٢٤٠١-٢٤٠٦. ✽ عيسى بن جارية حسن الحديث على ◀◀

رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، ثُمَّ انْتَظَرُوهُ مِنَ الْقَابِلَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ، وَقَالَ: إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الْوِتْرُ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ.

ﷺ نے ماہ رمضان میں قیام فرمایا' پھر اگلی رات صحابہ آپ کا انتظار کرتے رہے اور آپ (حجرے سے) باہر تشریف نہ لائے۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں یہ وتر کی نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔'' (اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْقَابِلَةِ] آئندہ آنے والی رات۔ [أَنْ يُّكْتَبَ] فرض قرار دے دی جائے۔ یکتب یہاں مجہول واقع ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے' وہ یہ کہ شب معراج میں جب اللہ نے پانچ نمازیں فرض قرار دے کر ثواب پچاس کے برابر رکھا اور فرما دیا کہ میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاتی تو خوف اور اندیشہ کس بات کا لاحق ہوا؟ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس کے تین جواب دیے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے: آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ رات کی نفلی عبادت کے صحیح ہونے کے لیے کہیں یہ شرط نہ مقرر کر دی جائے کہ نماز تہجد کو مسجد میں باجماعت ادا کرو' یا یہ خوف لاحق ہوا کہ قیام اللیل کو فرض عین کی طرح نہ سہی بہر حال فرض کفایہ کے طور پر لازمی قرار دے دیا جائے جیسا کہ نماز عید کے سلسلے میں لوگوں نے کہا ہے' یا پھر یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ قیام رمضان کو خصوصی طور پر فرض نہ کر دیا جائے۔ اور اس صورت میں یہ پانچ نمازوں پر ایک زائد نماز نہ ہوئی کیونکہ سال بھر میں قیام رمضان ہر روز تو بار بار نہیں کیا جاتا' پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری دانست میں تینوں جوابات میں سے پہلا جواب ہی قوی ہے۔ اور یہ حدیث نماز تراویح باجماعت پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اندیشۂ مذکور کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتح الباري' كتاب التهجد: ٣/ ١٨' ١٩' حديث: ١١٢٩) مصنف نے اس حدیث کو یہاں یہ بتانے کے لیے بیان کیا ہے کہ وتر واجب نہیں۔ ضمناً یہ مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ علم غیب نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ کو علم غیب ہوتا تو اندیشہ اور خوف لاحق ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ نیز اس حدیث کی رو سے آپ نے نماز تراویح صرف ایک ہی روز پڑھائی ہے مگر دوسری احادیث میں تین رات تک کا ذکر ملتا ہے بلکہ صحیح ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ جن تین راتوں میں آپ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں تراویح کی تعداد آٹھ رکعت تھی۔ (صحيح ابن حبان' الوتر' حديث: ٢٤٠١)

(٢٩٦) وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ رَضِيَ اللّٰهُ

[296] حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے'

◄◄ الراجح كما حققته في نور المصابيح، والحمد لله.

٢٩٦ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب استحباب الوتر، حديث: ١٤١٨، والترمذي، الصلاة، حديث: ٤٥٢، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٦٨، والحاكم: ١/ ٣٠٦ وصححه، وأحمد كما في أطراف المسند لابن حجر وجامع المسانيد والسنن لابن كثير، وسقط مسند خارجة بن حذافة من المسند المطبوع، وقال ابن حبان: «إسناده منقطع ومتنه باطل»، وروى أحمد: ٦/ ٧، حديث: ٢٤٣٥٧، بسند صحيح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «إن الله زادكم صلاة وهي الوتر، فصلوها فيما بين العشاء إلى صلاة الفجر»، وحديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أخرجه أحمد: ◄◄

تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللّٰهَ أَمَدَّكُمْ بِصَلَاةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ»، قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «اَلْوِتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلٰى طُلُوعِ الْفَجْرِ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمھاری مدد فرمائی ہے جو تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔'' ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی نماز ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وتر کی نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان ہے۔'' (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَرَوٰى أَحْمَدُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ نَحْوَهُ.

احمد نے عمرو بن شعیب سے انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے اپنے دادے سے اس کے مانند روایت نقل کی ہے۔

لغوی تشریح: [أَمَدَّكُمْ] إِمْدَاد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تمھاری مدد فرمائی اور تمھیں بڑھا دیا ہے۔ [بِصَلَاةٍ] ایک نماز سے یعنی تمھارے لیے ایک اور نماز کا اضافہ تمھارے عملوں میں کر دیا ہے۔ یہی اس کی دلیل ہے کہ وہ نماز لازم نہیں۔ اگر یہ واجب ہوتی تو عبارت بھی وجوب و التزام والی ہوتی۔ [حُمْرِ النَّعَمِ] ''حا'' پر ضمہ اور ''میم'' ساکن ہے۔ أَحْمَر کی جمع ہے۔ اور "نَعَم" کے ''نون'' اور ''عین'' پر فتحہ ہے یعنی چوپایہ جانور۔ یہاں اس سے مراد اونٹ ہیں۔ اور اہل عرب کے نزدیک اونٹ ان کے اموال میں سے عزیز ترین اور معزز مال شمار ہوتا تھا۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے' تاہم دیگر محققین نے [وَهِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ] کے علاوہ باقی روایت کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح سنن ابی داود میں اس طرف اشارہ کیا ہے' نیز مسند احمد میں بھی حضرت عمرو بن عاص سے اسی مفہوم کی ایک روایت مروی ہے' اس میں بھی اس جملے کا ذکر نہیں اور اسے محققین نے صحیح بھی قرار دیا ہے' نیز ہمارے فاضل محقق نے بھی تحقیق و تخریج میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا مذکورہ روایت اس جملے کے علاوہ دیگر شواہد کی بنا پر قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ٣٩/ ٢٧١) ② دوسری حدیث جسے مصنف نے مسند احمد کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ایسی ہی روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے بھی مروی ہے' تو مسند احمد میں مذکورہ روایت بعینہٖ انھی الفاظ کے ساتھ موجود نہیں بلکہ اس کے الفاظ اس طرح ہیں: [إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ زَادَكُمْ صَلَاةً، وَهِيَ الْوِتْرُ] اور محققین نے اسے بھی حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ١١/ ٢٩٢، ٢٩٣، ٢٩٤)

راویٔ حدیث: [حضرت خارجہ بن حذافہ] خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ قرشی اور عدوی ہیں۔ (حذافہ میں ''حا'' پر ضمہ اور ''ذال'' پر تخفیف ہے۔) یہ اتنے شجاع تھے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تین ہزار شہ سواروں کی مدد طلب کی تو انھوں نے اس کے جواب میں تین بہادر و شجاع آدمی بھیج دیے جن میں ایک

٢/ ١٨١، ٢٠٦، ٢٠٨ وسنده ضعيف.

حضرت زبیر بن عوام‘ دوسرے حضرت مقداد بن اسود اور تیسرے حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر مصر کے قاضی بنے۔ ۴۰ ہجری میں رمضان المبارک میں شہید ہوئے۔ انھیں ایک خارجی نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سمجھ کر شہید کیا تھا کیونکہ خوارج نے حضرت علی‘ حضرت امیر معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو بیک وقت قتل کرنے کی سازش کی تھی۔

[عمرو بن شُعَیب] ابو ابراہیم ان کی کنیت ہے۔ نام عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عاص سہمی قرشی مدنی ہے۔ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ امام نسائی وغیرہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ۱۱۸ ہجری میں وفات پائی۔

[شعیب] ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جن کا نام محمد تھا‘ ان کے زمانۂ صغرسنی میں وفات پا گئے تھے‘ چنانچہ ان کی کفالت ان کے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے کی۔ اپنے دادا سے ان کا سماع صحیح ہے‘ لہٰذا یہ اسناد نہ تو مرسل ہے اور نہ منقطع بلکہ متصل ہے اور حسن کے درجے سے کم نہیں ہے۔ ان کے دادا کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲۹۷) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «اَلْوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَّمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ بِسَنَدٍ لَيِّنٍ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ.

[297] حضرت عبداللہ رحمہ اللہ اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وتر برحق ہے۔ جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔“ (اسے ابوداود نے کمزور سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد میں اس کا ایک شاہد بھی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر وہ ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْوِتْرُ حَقٌّ] حق کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں کہ یہ لفظ وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ [فَمَنْ لَّمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا] جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہماری سنت اور طریقے پر نہیں ہے۔ یہ فرمان وتر کے سنت مؤکدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے‘ اس لیے کہ اس کی سند میں ابومنیب عبیداللہ بن عبداللہ عتکی متکلم فیہ راوی ہے۔ امام بخاری اور امام نسائی رحمہما اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے‘ یعنی یہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے‘ مرفوع حدیث نہیں۔ اور حدیث کا شاہد بھی ضعیف ہے جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کیونکہ وہ‘ خلیل بن مرہ عن معاویہ بن قرہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور معاویہ بن قرہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس نے تو ان سے کچھ بھی نہیں سنا‘ اس لیے یہ منقطع روایت ہے۔ اور خلیل بن مرہ بذات خود منکر الحدیث ہے‘ لہٰذا یہ حدیث اور اس کی شاہد حدیث‘ دونوں ہی احتجاج کے لائق نہیں اور ان احادیث صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو وتر کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابھی ایک حدیث کے تحت اَلْوِتْرُ حَقٌّ کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد وتر کی

۲۹۷۔ [ضعیف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب فيمن لم يوتر، حديث: ۱٤۱۹، والحاكم: ۱/ ۳۰۵. * أبوالمنيب حسن الحديث في غير ما أنكر عليه وهذا الحديث مما أنكر عليه، وحديث أبي هريرة أخرجه أحمد: ۲/ ٤٤۳، وسنده ضعيف جدًا، فيه خليل بن مرة وهو منكر الحديث كما قال البخاري.

اہمیت ہے اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

فائدہ: ہمارے فاضل محقق اور حضرت شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ضعیف ہی قرار دیا ہے لیکن الموسوعۃ الحدیثیہ کے محققین نے اسے دیگر شواہد کی بنا پر حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ١٥/ ٤٤٧، و ٣٨/ ١٢٧، ١٢٨) بہرحال مذکورہ حدیث قابل حجت اور حسن ہونے کے باوجود وتروں کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی بلکہ اس حدیث میں مذکور الفاظ سے وتروں کی اہمیت اور تاکید ہی ثابت ہوتی ہے' لہٰذا راجح موقف یہی ہے کہ اس حدیث کو تاکید پر محمول کر لیا جائے اور جمہور کے موقف کو اختیار کیا جائے کہ وتر سنت ہیں واجب نہیں جیسا کہ تفصیل حدیث: ۲۹۳ میں گزر چکی ہے۔

راویٔ حدیث: [عبداللہ بن بریدہ] ان کی کنیت ابوسہل ہے۔ مرو میں منصب قضاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اور ثقہ تابعین میں شمار کیے گئے۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر میں سے تھے۔ ۱۱۵ ہجری میں مرو ہی میں فوت ہوئے۔ ان کے باپ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے حالات پیچھے گزر چکے ہیں۔

(٢٩٨) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلٰى إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثًا. قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوتِرَ؟ قَالَ: «يَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ، وَلَا يَنَامُ قَلْبِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[298] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زائد نہیں پڑھتے تھے۔ (پہلے) چار رکعتیں اس طرح ادا فرماتے تھے کہ ان کے حسن اور ان کی لمبائی کے بارے میں مت پوچھ' پھر چار رکعات ادا فرماتے بس ان کے حسن اور ان کی طوالت کے بارے میں مت پوچھ۔ پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ وتر ادا کرنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''عائشہ! میری دو آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا۔'' (بخاری ومسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا عَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا: كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ عَشْرَ رَكَعَاتٍ، وَيُوتِرُ بِسَجْدَةٍ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ، فَتِلْكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ.

اور بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ رات کو دس رکعتیں پڑھتے تھے اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے۔ اور اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں پڑھتے۔ یہ (سب ملا کر کل) تیرہ رکعتیں ہوئیں۔

لغوی تشریح: [مَا كَانَ يَزِيدُ...... الخ] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی

٢٩٨ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب قيام النبي ﷺ بالليل في رمضان وغيره، حديث: ١١٤٧، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل، حديث: ٧٣٨.

مسنون ہے اور بس۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تہجد اور تراویح ایک ہی چیز ہیں۔ [يُصَلِّي أَرْبَعًا] بظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چاروں رکعتوں کو مسلسل ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ دو دو رکعت پڑھتے ہوں۔ چار کے بعد کچھ توقف کرتے، پہلی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد توقف نہ کرتے بلکہ اگلی دو شروع کر دیتے، جب چار ہو جاتیں تو کچھ زیادہ توقف کرتے اور ٹھہرے رہتے۔ پہلی چار اور اگلی چار کے درمیان کافی فاصلہ کرتے۔ اور اگلی چار بھی اسی طرح ادا کرتے جس طرح کہ پہلی چار۔ والله أعلم. اس لیے انھیں چار چار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔'' اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ [فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ] دریافت کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہاں نہی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود نماز کی تعریف کرنا ہے کہ اس کی خوبصورتی بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اور یہ انتہائی عمدہ و بہترین کنایہ ہے۔ [أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوتِرَ] اس میں ہمزہ استفہام کے لیے ہے۔ گویا آپ آٹھ رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے، پھر کھڑے ہو کر تین وتر ادا فرماتے، سونے کے بعد اٹھنے کے وقت وضو کیے بغیر وتر ادا کرتے۔ حضرت عائشہ ؓ کا خیال یہ تھا کہ نیند تو نواقض وضو میں سے ہے، اس لیے انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا، جس کا جواب آپ نے ان کو [إِنَّ عَيْنَيَّ] کے فقرے میں دیا۔ [عَيْنَيَّ] میں ''نون'' پر فتحہ اور ''یا'' پر فتحہ اور تشدید ہے۔ عین کا تثنیہ ہے اور یائے متکلم کی طرف مضاف ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اگر حدث واقع ہو تو مجھے پتہ چل جاتا ہے کیونکہ میرا دل بیدار رہتا ہے، سوتا نہیں۔ اور مجرد نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ تو ہوا کے خارج ہونے کے احتمال کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا گمان ہے۔

فوائد و مسائل: اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوتے ہیں: ① نبی ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا، صرف آنکھیں سوتی تھیں۔ اور یہ آپ کی خصوصیت تھی بلکہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے: ''تمام انبیاء کے دل جاگتے اور آنکھیں سوتی ہیں۔'' (صحيح البخاري، المناقب، باب كان النبي ﷺ تنام عينه ولاينام قلبه، حديث: ۳۵۷۰) ② گہری نیند جس میں دل غافل ہو جائے، ناقض وضو ہے۔ ③ نماز تہجد عمدہ طریقے سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہیے۔ ④ ثابت ہوا کہ نبی ﷺ نے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی پڑھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ ؓ کی روایت قابل ترجیح ہے، اس لیے کہ آپ یہ نماز گھر ہی میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے وہ اعمال جو آپ عموماً گھر میں سرانجام دیتے تھے بالخصوص رات کے اعمال، ان کی صحیح خبر اہل خانہ ہی کو ہو سکتی ہے۔ بیس رکعت تراویح کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور طبرانی نے ابو شیبہ، ابراهيم بن عثمان، عن الحكم، عن مقسم، عن ابن عباس کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھی، وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ ابو شیبہ ؒ کے بارے میں امام احمد، ابن معین، امام بخاری، امام مسلم، ابوداود، ترمذی اور نسائی ؒ سبھی کی یہ رائے ہے کہ یہ شخص ضعیف ہے۔ امام شعبہ ؒ نے تو اسے کذاب قرار دیا ہے۔ اس کے مقابل صحیح مرفوع روایات میں آٹھ رکعت تراویح کا ذکر ہے، اس لیے تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔ علامہ ابن ہمام ؒ نے ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں یہی کہا ہے کہ تراویح کی مسنون تعداد آٹھ رکعات ہے اور اس سے زائد مستحب اور نفل ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد انور شاہ کاشمیری ؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ''عرف الشذی'' میں کہا ہے کہ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت ہی پڑھی ہے اور کسی روایت

سے یہ بھی ثابت نہیں کہ آپ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ ⑤ اس حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز تہجد کی دس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور آخر میں ایک وتر پڑھا۔ یوں یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ ⑥ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے کبھی تیرہ رکعت بھی پڑھیں ہیں۔ جس میں آٹھ نفل اور پانچ وتر ہوتے یا پھر فجر کی دو سنتیں ملا کر ۱۳ رکعتیں ہوتیں۔

(۲۹۹) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُوتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ، لَا يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ إِلَّا فِي آخِرِهَا.

[299] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے۔ ان میں پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وتروں میں تشہد کے لیے صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔

لغوی تشریح: [لَا يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ] کہ پانچ وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت کے بعد نہ بیٹھتے، یعنی پانچوں رکعت متصل پڑھتے تھے، درمیان میں تشہد نہیں پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے احناف کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو صرف تین رکعات کے تعین پر ہی اصرار کرتے اور درمیان میں تشہد بھی پڑھتے ہیں۔

(۳۰۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، فَانْتَهٰى وِتْرُهُ إِلَى السَّحَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِمَا.

[300] حضرت عائشہ ؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کے ہر حصے میں وتر پڑھا کرتے تھے اور آپ کا وتر پڑھنا سحر تک بھی پہنچا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [السَّحَرِ] سحر سے مراد صبح کاذب ہے۔ یہ وہ سفیدی ہے جو مشرقی افق میں طلوع فجر سے پہلے سیدھے ستون کی مانند نظر آتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نبی ﷺ نے وتر رات کے شروع، درمیان اور آخری حصے میں بھی پڑھے ہیں۔ ② وتروں کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر طلوع فجر تک رہتا ہے۔ جو لوگ نماز تہجد کے عادی ہوں انھیں وتر رات کے آخری حصے میں پڑھنے چاہئیں اور جو سحری کے وقت اٹھ نہ سکتے ہوں وہ نماز عشاء کے بعد پڑھیں۔ ③ کسی مجبوری اور عذر کی وجہ سے اگر وقت پر وتر نہ پڑھے جا سکیں تو فجر کی جماعت کھڑی ہونے تک انھیں پڑھ لے۔ ہاں! اگر سو جائے یا اسے یاد ہی نہ رہے تو جس وقت بیدار ہو یا جس وقت یاد آئے، پڑھ لے کیونکہ مکروہ اوقات میں قضا شدہ نماز کی قضا ادا کرنا جائز ہے۔ ایک دوسری رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر وتر اپنے وقت پر نہ پڑھے جا سکیں تو پھر انھیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس موقف کی تائید میں بھی بعض روایات آتی ہیں لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو عمداً وتر چھوڑ دیں۔ دیکھیے: (حاشیہ ترمذی، أحمد محمد شاکر: ۲/ ۳۳۳) نیز بعض روایات

۲۹۹۔ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل، حديث: ۷۳۷.

۳۰۰۔ أخرجه البخاري، الوتر، باب ساعات الوتر، حديث: ۹۹۶، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل، حديث: ۷۴۵.

میں نبی ﷺ کا یہ عمل بھی بیان ہوا ہے کہ اگر کبھی نیند یا بیماری کی وجہ سے آپ کا قیام اللیل رہ جاتا تو آپ سورج نکلنے کے بعد بارہ (۱۲) رکعت پڑھتے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم' صلاة المسافرین' حدیث:۷۴۶) اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جس کے وتر رہ جائیں تو وہ اس کی قضا جفت شکل میں دے یعنی ایک وتر کی جگہ دو رکعت اور تین وتر کی جگہ چار رکعات پڑھے۔ لیکن ہمارے خیال میں ایسا اس شخص کے لیے ضروری ہوگا جو نماز تہجد کا عادی ہو' عام شخص کے لیے وتروں کی قضا ادا کرنا' وتر ہی کی صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

(۳۰۱) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَاعَبْدَ اللهِ! لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[301] حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے عبداللہ! تم فلاں آدمی کی طرح نہ ہو جانا' وہ قیام اللیل کرتا تھا' پھر بعد میں اس نے اسے ترک کر دیا۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں مندوب ہے۔ اور عمل خیر پر مداومت اور ہمیشگی پسندیدہ اور بہترین عمل ہے۔ ② یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب کسی مستحب و مندوب عمل کی عادت بنا لے تو پھر اس میں غفلت' تساہل اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ③ نبی اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی عمل شروع فرما لیتے تو اس پر دوام کرتے' خواہ عمل معمولی سا ہوتا۔ ④ اس حدیث سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کی کوئی ناپسندیدہ عادت کسی دوسرے کے سامنے بیان کرنی ہو تو اس شخص کا نام نہ لیا جائے۔ نبی ﷺ نے [لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ] فرمایا' اس شخص کا نام نہیں لیا۔ اس آدمی کا نام ظاہر نہ کر کے پردہ پوشی فرمائی ہے۔

(۳۰۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَوْتِرُوا يَاأَهْلَ الْقُرْآنِ! فَإِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ، يُحِبُّ الْوِتْرَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[302] حضرت علی بن ابی طالب ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے قرآن والو! وتر پڑھا کرو۔ اللہ خود بھی وتر (یکتا) ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوْتِرُوا] یعنی وتر پڑھو۔ یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ ترغیب کے لیے ہے۔ [يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ] سے مراد مومن ہیں کیونکہ انھوں نے قرآن کی تصدیق کی۔ یا حفاظ قرآن اور قراء مراد ہیں۔ اور یہ قرینہ ہے کہ وتر واجب نہیں'

۳۰۱ـ أخرجه البخاري، التهجد، باب ما يكره من ترك قيام الليل لمن كان يقومه، حديث: ۱۱۵۲، ومسلم، الصيام، باب النهي عن صوم الدهر لمن تضرر به ....، حديث: ۱۱۵۹.

۳۰۲ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب استحباب الوتر، حديث: ۱٤۱٦، والترمذي، الوتر، حديث: ٤٥۳، والنسائي، قيام الليل، حديث: ۱٦۷٦، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ۱۱٦۹، وأحمد: ۱/ ۱٤۸، وابن خزيمة: ۲/ ۱۳۷، حديث: ۱۰٦۷، أبو إسحاق عنعن.

ورنہ محض اہل القرآن کو بالخصوص اس کے پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ وتر سے مراد یہاں قیام اللیل ہے اور وتر بول کر اطلاق قیام اللیل پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ پوری نماز کے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔ اور وتر باقی ساری نماز کو بھی وتر (طاق) بنا دیتا ہے۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی بنا پر صحیح اور حسن قرار دیا ہے، لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود شواہد کی بنا پر قابل حجت اور قابل عمل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ۲/۴۱۳، وصحيح أبو داود (مفصل) للألباني، حديث: ۱۲۷۴) بنا بریں اس حدیث سے حفاظ قرآن کو ترغیب ہے کہ وہ قیام اللیل کا اہتمام کریں کیونکہ اس سے قرآن یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۳۰۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**اِجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[303] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''وتر کو اپنی رات کی آخری نماز بناؤ۔'' (بخاری اور مسلم)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں رات کی آخری نماز کو وتر بنانے کا امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے، یعنی اگر کسی نے رات کے اول حصے میں وتر پڑھ لیا ہے، پھر رات کے درمیان یا آخری حصے میں جاگ اٹھا تو دو دو رکعت کر کے جتنے چاہے نوافل پڑھ لے، وتر کو جوڑا بنا کر وتر کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ② کوئی شخص وتر ادا کرنے کے بعد دو رکعت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، حديث: ۷۳۸ (ب)۔

(۳۰٤) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: «**لَا وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[304] حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں۔'' (اسے احمد نے اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک رات میں دو بار وتر نہیں پڑھنے چاہییں۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ اگر اول رات میں وتر پڑھے ہوں، پھر رات کے آخری حصے میں بیدار ہو تو پہلے ایک رکعت پڑھ کر جفت (جوڑا) بنا لے، پھر نفل پڑھ کر آخر میں وتر پڑھ لے، صحیح نہیں ہے۔ یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے امام مروزی رحمہ اللہ کی ''قیام اللیل'' ملاحظہ ہو۔

۳۰۳۔ أخرجه البخاري، الوتر، باب ليجعل آخر صلاته وترًا، حديث: ۹۹۸، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنى مثنى، حديث: ۷۵۱.

۳۰٤۔ **[إسناده صحيح]** أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في نقض الوتر، حديث: ۱٤۳۹، والترمذي، الوتر، حديث: ٤۷۰، والنسائي، قيام الليل، حديث: ۱٦۸۰، وأحمد: ٤/ ۲۳، وابن حبان (الإحسان): ٤/ ۷۵، حديث: ۲٤٤۰.

(٣٠٥) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُوتِرُ بِـ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ وَ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ وَ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ: وَلَا يُسَلِّمُ إِلَّا فِي آخِرِهِنَّ.

[305] حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (تین رکعات) وتر میں بالترتیب ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ﴾، ﴿ قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتے تھے۔ (اسے احمد، ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔) اور نسائی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے: سلام آخری رکعت ہی میں پھیرتے تھے۔

وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، وَفِيهِ: كُلُّ سُورَةٍ فِي رَكْعَةٍ، وَفِي الْأَخِيرَةِ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ وَ الْمُعَوِّذَتَيْنِ.

ابوداود اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے اور اس روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورت تلاوت فرماتے تھے اور آخری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ اور مُعَوِّذَتَین پڑھتے تھے۔

لغوی تشریح: [كُلُّ سُورَةٍ] ہر رکعت میں ایک سورت، یعنی ایک رکعت میں ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ﴾ اور دوسری میں ﴿ قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ مکمل سورت پڑھتے۔ [فِي رَكْعَةٍ] یعنی پہلی اور دوسری رکعت میں۔ [اَلْمُعَوِّذَتَيْنِ] تعویذ سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ اور ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ ہے۔ معوذتین کا اضافہ پہلی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ ان صورتوں کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی صرف سورۂ اخلاص پڑھ لیتے اور کبھی معوذتین بھی شامل فرما لیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیف جزری ضعیف راوی ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ امام احمد اور یحییٰ بن معین نے معوذتین کی زیادتی کو منکر کہا ہے۔ ہمارے فاضل محقق نے یہاں پر اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے جبکہ سنن ابی داود میں اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ البتہ اس کے شواہد کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان میں بھی و المعوذتین کے الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح الموسوعۃ الحدیثیہ کے محققین نے بھی اسے معوذتین کے ذکر کے علاوہ صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ٤٣/ ٨٠، ٧٩) الحاصل مذکورہ روایت معوذتین کے الفاظ کے علاوہ قابل عمل اور قابل حجت ہے کیونکہ باقی تین سورتیں پڑھنے والی روایات بالاجماع صحیح ہیں۔ واللہ أعلم.

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر ادا فرمایا کرتے تھے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین وتر دو تشہد سے پڑھتے تھے۔ اگر احناف نے ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال درست نہیں ہے۔

٣٠٥ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب ما يقرأ في الوتر، حديث: ١٤٢٣، والنسائي، قيام الليل، حديث: ١٧٠٠، وأحمد: ٣/ ٤٠٦، ٤٠٧، و٥/ ١٢٣. وحديث عائشة أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٤٢٤، والترمذي، الوتر، حديث: ٤٦٣ وهو حديث حسن.

راویٔ حدیث: [حضرت ابی بن کعب] ابومنذر ان کی کنیت ہے۔ انصار کے قبیلۂ خزرج کی شاخ نجار سے ہونے کی وجہ سے انصاری، نجاری اور خزرجی کہلائے۔ قراء کے سربراہ تھے اسی وجہ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کاتبین وحی میں سے تھے اور ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنھوں نے جمع قرآن کا شرف پایا۔ رسول اللہ کے عہد زریں میں فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے۔ بدر اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۱۹، ۲۰، ۲۲ یا ۳۰، ۳۲، ۳۳ ہجری میں سے کسی سال میں وفات پائی۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

(٣٠٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوْتِرُوا قَبْلَ أَنْ تُصْبِحُوا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[306] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''وتر صبح ہونے سے پہلے پڑھ لیا کرو۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلِابْنِ حِبَّانَ: «مَنْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ وَلَمْ يُوتِرْ، فَلَا وِتْرَ لَهُ».

اور ابن حبان میں ہے: ''جو کوئی صبح کو پالے اور اس نے وتر نہ پڑھا تو اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔''

فائدہ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وتر کا وقت صبح کے طلوع ہونے سے پہلے تک ہے۔ جب فجر طلوع ہوگئی تو ادائیگیٔ وتر کا وقت نکل گیا۔ [لَا وِتْرَ لَهُ] کے معنی ہیں کہ اس کے وتر کی ادائیگی کا وقت ختم ہوگیا۔ یہ اس وقت ہے جب جان بوجھ کر چھوڑے ورنہ اگر بھول کر رہ جائے یا سو جائے تو پھر جب جاگے یا یاد آئے تو اسی وقت پڑھ لے یہی اس کا وقت ہے۔ اس پر آئندہ آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ہمارے فاضل محقق نے ابن حبان کی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے جبکہ موارد الظمآن کے محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس صورت میں [فَلَا وِتْرَ لَهُ] کا مفہوم وہی ہوگا جو اوپر بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان بتحقيق حسين سليم أسد الداراني: ۲/ ۴۲۰، ۴۲۱)

(٣٠٧) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ نَامَ عَنِ الْوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

[307] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو وتر پڑھنے سے سویا رہا (آنکھ نہ کھلی) یا اسے یاد نہ رہا تو اسے چاہیے کہ صبح کے وقت پڑھ لے یا پھر جب اسے یاد آئے۔'' (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وتر کسی طرح پڑھنے سے رہ جائیں تو انھیں بہر صورت پڑھنا چاہیے۔ اس

٣٠٦ـ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل مثنى مثنى، حديث: ٧٥٤. وحديث "من أدرك الصبح ولم يوتر فلا وتر له" أخرجه ابن حبان (الموارد)، حديث: ٦٧٤ وهو حديث ضعيف، فيه قتادة وهو مدلس وقد عنعن.

٣٠٧ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في الدعاء بعد الوتر، حديث: ١٤٣١، والترمذي، الوتر، حديث: ٤٦٥، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٨٨، وأحمد: ٣/ ٣١.

سے نماز وتر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ وتروں کی قضا سے متعلق دیکھیے، حدیث: ۳۰۰۔

(۳۰۸) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ خَافَ أَنْ لَّا يَقُومَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ أَوَّلَهُ، وَمَنْ طَمِعَ أَنْ يَقُومَ آخِرَهُ فَلْيُوتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ، فَإِنَّ صَلَاةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُودَةٌ، وَذٰلِكَ أَفْضَلُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[308] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں بیدار نہیں ہو سکے گا تو اسے چاہیے کہ رات کے پہلے حصے ہی میں وتر پڑھ لے۔ اور جسے یہ توقع اور امید ہو کہ وہ بیدار ہو جائے گا تو اسے رات کے آخری حصے میں وتر پڑھنے چاہییں کیونکہ رات کے آخری حصے کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ بہت بہتر ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَشْهُودَةٌ] یعنی رات کی نماز کے وقت رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی مخلوق ہیں، وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں اور ان کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وتر رات کے آخری حصے میں پڑھنے افضل ہیں بشرطیکہ شب بیداری کی عادت ہو ورنہ رات کے پہلے حصے ہی میں پڑھ کر سونا چاہیے۔

(۳۰۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ، فَقَدْ ذَهَبَ وَقْتُ كُلِّ صَلَاةِ اللَّيْلِ، وَالْوِتْرِ، فَأَوْتِرُوا قَبْلَ طُلُوعِ الْفَجْرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

[309] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب فجر طلوع ہو جائے تو پھر رات کو پڑھی جانے والی ہر نماز اور وتروں کا وقت چلا جاتا ہے (ختم ہو جاتا ہے) لہٰذا تم طلوع فجر سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كُلِّ صَلَاةِ اللَّيْلِ] رات کی ہر نماز سے مراد وہ نوافل ہیں جو مشروع ہیں، یعنی جن نوافل کو ادا کرنا شریعت محمدیہ سے ثابت ہے۔ [وَالْوِتْرِ] یہ جری حالت میں ہے اور اس کا عطف كُلِّ پر ہوگا، یعنی رات کی ہر نماز اور وتر بھی۔ یہاں وتر کے مزید مقام و مرتبہ اور اہمیت کی بنا پر خاص کا عام پر عطف ہے۔

فائدہ: یہ روایت جامع ترمذی میں ہے، دیکھیے: (جامع الترمذي، الوتر، باب ماجاء في مبادرة الصبح بالوتر، حديث:۴۶۹) ترمذی کی اصل روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: [عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ فَقَدْ ذَهَبَ كُلُّ صَلَاةِ اللَّيْلِ وَالْوِتْرُ...... الخ] روایت بالمعنی کی وجہ سے بلوغ المرام کے الفاظ مذکورہ بالا الفاظ سے کچھ

۳۰۸ـ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب من خاف أن لا يقوم من آخر الليل، حديث: ۷۵۵.

۳۰۹ـ [إسناده صحيح] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في مبادرة الصبح بالوتر، حديث: ۴۶۹.

مختلف ہیں' اور وہ اس طرح ہیں: [عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ...... ذَهَبَ وَقْتُ كُلِّ ......الخ] جامع ترمذی میں وارد الفاظ کی صورت میں لفظ کل اور الوتر دونوں مرفوع ہیں۔ لفظ کل تو مرفوع ہے ذَهَبَ کا فاعل ہونے کی وجہ سے اور الوتر کا عطف لفظ کل پر ہے' لہٰذا یہ بھی مرفوع ہوگا۔

(۳۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحٰى أَرْبَعًا، وَيَزِيدُ مَاشَاءَ اللّٰهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[310] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ (چاشت کی نماز) چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور جتنی اللہ چاہتا زیادہ بھی کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّهَا سُئِلَتْ: هَلْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحٰى؟ قَالَتْ: لَا إِلَّا أَنْ يَجِيءَ مِنْ مَغِيبِهِ.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ ؓ ہی سے مروی ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ پڑھا کرتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ نہیں' الا یہ کہ جب سفر سے واپس تشریف لاتے۔

وَلَهُ عَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا: مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي سُبْحَةَ الضُّحٰى قَطُّ، وَإِنِّي لَأُسَبِّحُهَا.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ ؓ ہی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز ضحیٰ پڑھتے کبھی نہیں دیکھا جبکہ میں یہ نوافل پڑھتی ہوں۔

لغوی تشریح: [كَانَ يُصَلِّي الضُّحٰى] اس مقام پر كَانَ استمرار کے معنی نہیں دے رہا کہ آپ نماز ضحی بلا ناغہ ادا فرماتے تھے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب نماز ضحیٰ کے نوافل پڑھتے تو ان کی تعداد چار ہوتی۔ جہاں تک نماز ضحیٰ کا تعلق ہے تو یہ نفل نماز ہے' مستحب ہے' جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے بارے میں نبی ﷺ سے آٹھ رکعتوں سے زیادہ کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ دیکھیے: (صحیح البخاري' التقصير' حديث:۱۱۰۳' وصحيح مسلم' صلاة المسافرين' حديث:۳۳۶ بعد حديث:۷۱۹) [مَغِيبِهِ] اپنے سفر سے واپسی۔ [سُبْحَةَ الضُّحٰى] "سین" پر ضمہ اور "با" ساکن ہے' یعنی نماز ضحی کے نوافل۔ [وَإِنِّي لَأُسَبِّحُهَا] تسبیح سے ماخوذ ہے' یعنی میں صلاۃ ضحیٰ پڑھتی ہوں۔ حضرت عائشہ ؓ کا یہ عمل' باوجودیکہ انھوں نے نبی ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا' اس کا سبب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہ ؓ کو نبی ﷺ کے ارشاد گرامی سے اس نماز کی فضیلت معلوم ہوگئی ہوگی' یا پھر انھیں یہ بات پہنچی ہوگی کہ آپ نے یہ نماز پڑھی ہے۔ عدم رؤیت اس کو تو مستلزم نہیں ہے کہ آپ نے اس کو مطلقاً پڑھا ہی نہیں۔ یوں یہ حدیث پہلی احادیث کے معارض نہیں رہتی اور روایات کے درمیان جمع و توفیق ہو جاتی ہے۔ ظاہر میں تو یہ

۳۱۰۔ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة الضحى، حديث: ۷۱۹، وحديث: "لا إلا أن يجيء من مغيبه" أخرجه مسلم، حديث: ۷۱۷، وحديث: "ما رأيت رسول الله ﷺ يصلي سبحة الضحى قط" أخرجه مسلم، حديث: ۷۱۸.

تینوں روایات باہم متعارض ہیں کیونکہ پہلی حدیث مطلقاً اثبات پر دلالت کرتی ہے (آپ نے یہ نماز پڑھی ہے۔) اور تیسری مطلقاً نفی پر دلالت کرتی ہے (آپ نے یہ عمل کیا ہی نہیں۔) اور دوسری حدیث سفر سے واپسی کی قید سے مشروط ہے (سفر سے واپسی کے وقت پڑھی ہے۔) تطبیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ تیسری حدیث میں بلا سبب صلاۃ الضحیٰ پڑھنے کی نفی ہے اور پہلی حدیث سبب کے ساتھ مقید ہے اور وہ ہے سفر سے واپسی' جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے جمع کی یہ صورت پہلی سے بہتر اور اولیٰ ہے۔ اس باب کی آخری حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① نماز اشراق' صلاۃ ضحیٰ اور صلاۃ اوابین تین الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کا تین الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے' اس میں آراء مختلف ہیں۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے' اس میں ایک ہی چیز بہت سے الفاظ سے تعبیر کی جاسکتی ہے' چنانچہ طبرانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی چچازاد بہن ام ہانی ؓ کے گھر میں نماز پڑھی اور ام ہانی ؓ کو بلا کر بتایا کہ یہ اشراق کی نماز ہے۔ ② اور حضرت انس ؓ کی ایک روایت سے اس کا نام صلاۃ ضحیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نماز طلوع آفتاب سے لے کر دن کے چوتھائی حصے تک پڑھی گئی ہے۔ اور اوابین کی نماز کا وقت وہ ہے جب آفتاب کی تمازت سے زمین اتنی گرم ہو جائے کہ اونٹنی کا بچہ گرمی محسوس کرنے لگے جیسا کہ اس روایت کے بعد والی روایت میں مذکور ہے۔ اونٹ کا بچہ معمولی حرارت کی پروا نہیں کرتا بلکہ ذرا تپش زیادہ ہو تو وہ گرمی محسوس کرتا ہے۔ گویا اس نماز کا وقت سورج کے کافی اوپر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس طرح بعض کے نزدیک تینوں نمازیں دراصل ایک ہی ہیں اور نام مختلف ہیں۔ ③ اور ایک رائے یہ ہے کہ اشراق اور ضحیٰ ایک ہی نماز کے دو نام ہیں' البتہ صلاۃ اوابین ان سے الگ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نماز ضحیٰ کی رکعات کتنی ہیں؟ تو اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات کا صحیح حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

(٣١١) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

[311] حضرت زید بن ارقم ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اوابین (اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں) کی نماز کا وقت وہ ہے جب اونٹنیوں کے بچے تپش و حرارت کی وجہ سے جلن محسوس کرنے لگیں۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْأَوَّابِينَ] أَوَّاب کی جمع ہے۔ اس میں ''واو'' پر تشدید ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو نیکی اور بھلائی کے کاموں اور شرک و منکرات کو چھوڑ کر کثرت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ [حِينَ] وقت کے معنی میں ہے۔ یہ جب جملے کی طرف مضاف ہو تو اکثر و بیشتر مبنی برفتحہ ہوتا ہے۔ [تَرْمَضُ] سَمِعَ يَسْمَعُ باب سے ''میم'' مفتوح کے ساتھ ہے' یعنی گرمی اور تمازت کی وجہ سے جلن محسوس کرے۔ اور یہ کیفیت اس وقت ہوتی

٣١١ـ [صحيح] أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الأوابين حين ترمض الفصال، حديث: ٧٤٨، ولم أجده في جامع الترمذي، والله أعلم.

ہے جب سورج کی گرم شعاعیں ریت وغیرہ پر پڑتی ہیں۔ اور یہ وہی وقت ہے جب سورج کافی اونچا ہو اور نصف النہار کے قریب پہنچ چکا ہو۔ [اَلْفِصَال] ''فا'' کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ فصیل کی جمع ہے۔ اونٹنی کے بچے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے' یعنی صلاۃ اوابین کا وقت وہ ہے جب اونٹنی کے چھوٹے بچوں کے پاؤں دن کی حرارت و تمازت سے جلن اور تپش محسوس کریں۔ اس وقت پڑھی جانے والی نماز کا نام صلاۃ الاوابین اس لیے ہے کہ اس وقت طبیعت انسانی آرام و استراحت اور سکون کی جانب مائل ہوتی ہے مگر یہ نماز پڑھنے والا نفس کی مراد پوری کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ حدیث' اس قول کے مطابق جس میں صلاۃ ضحیٰ' اشراق اور اوابین ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں' صلاۃ ضحیٰ کو تاخیر سے پڑھنے' یعنی نصف النہار سے کچھ دیر قبل تک پڑھنے کی دلیل ہے۔

(۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً، بَنَى اللّٰهُ لَهُ قَصْرًا فِي الْجَنَّةِ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ.

[312] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے صلاۃ الضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھیں' اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں محل تعمیر کرے گا۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور غریب قرار دیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے ضعیف قرار دیا ہے' لہٰذا صلاۃ الضحیٰ کی رکعات کی تعداد زیادہ سے زیادہ آٹھ ہے جو کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث سے ثابت ہے' جس کا تذکرہ گزشتہ احادیث میں تفصیل سے گزر چکا ہے' بہرحال صلاۃ الضحیٰ کی فضیلت اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے۔ واللہ أعلم.

(۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْتِي، فَصَلَّى الضُّحٰى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي صَحِيحِهِ.

[313] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف لائے اور نماز ضحیٰ کی آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں۔ (اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں آٹھ رکعت نماز ضحیٰ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے' ممکن ہے اس نماز سے مراد سفر سے واپسی پر پڑھی گئی نماز ہو۔ ② نماز ضحیٰ کا بڑا فائدہ صحیح مسلم کی روایت میں منقول ہے کہ انسان پر اس کے ہر جوڑ کی طرف سے روزانہ ایک حق واجب ہوتا ہے' انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم' صلاۃ المسافرین' حدیث:۷۲۰) اس نماز کی دو رکعتیں ادا کرنے سے وہ حقوق ادا ہو جاتے ہیں جو ان تمام جوڑوں پر واجب ہوتے ہیں۔

۳۱۲۔ **[إسناده ضعيف]** أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في صلاة الضحى، حديث: ٤٧٣ وقال: حديث غريب، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٣٨٠. * موسى بن فلان، مجهول (تقريب التهذيب).

۳۱۳۔ **[صحيح]** أخرجه ابن حبان (الموارد)، حديث: ٦٣٠، وللحديث شاهد عنده (٦٣١) وسنده حسن.

١٠ - بَابُ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ وَالْإِمَامَةِ

باب:10-نماز باجماعت اور امامت کے مسائل کا بیان

(٣١٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: **صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِينَ دَرَجَةً**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[314] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باجماعت نماز اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔'' (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: «**بِخَمْسٍ وَّعِشْرِينَ جُزْءًا**»

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''پچیس درجے زیادہ ثواب ملتا ہے۔''

وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، وَقَالَ: «**دَرَجَةً**».

اور اسی طرح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے لیکن اس میں جُزْءًا کی جگہ ''دَرَجَةً'' کا لفظ ہے۔

لغوی تشریح: [بَاب صلاۃ ......الخ] اَلْإِمَامَةِ کا عطف صَلَاۃ پر ہے۔ اَلْجَمَاعَةِ کے لفظ پر نہیں ہے۔ [مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ] ''فا'' پر فتحہ اور ''ذال'' معجمہ پر تشدید ہے۔ ''فَذ'' کے معنی تنہا' اکیلے اور منفرد کے ہیں۔ [جُزْءًا] یہ منصوب ہے۔ دَرَجَةً کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر درجہ اور جز سے مراد نماز ہے۔ [وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ] یعنی بخاری کی روایت میں بھی پچیس گنا ہے۔ [وَقَالَ دَرَجَةً] جُزْءًا کی جگہ دَرَجَةً کا لفظ ہے۔ رہا یہ عددوں کا اختلاف' تو اس بارے میں کہا گیا ہے کہ ان دونوں کے مابین کوئی منافات نہیں۔ یہاں عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے' چنانچہ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپ نے پچیس گنا ثواب کا ذکر کیا ہو بعد میں ستائیس گنا کا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرق مسجد کے قریب و بعید ہونے کی وجہ سے ہے' یعنی اگر مسجد دور ہوگی تو اجر زیادہ اور قریب ہونے کی صورت میں کم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے خشوع کی قلت و کثرت مراد ہے۔ اگر نماز میں خشوع زیادہ ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر خشوع کم ہوگا تو اجر کم ملے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرق جماعت کی تعداد کی کثرت و قلت کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پوری نماز میں شمولیت ہوگی تو زیادہ ثواب ملے گا اور اگر تھوڑی نماز میں شمولیت ہوگی تو اجر کم ملے گا۔ واللہ أعلم.

فائدہ: نماز باجماعت پڑھنا فرض اور واجب ہے یا سنت مؤکدہ؟ اس میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے بظاہر ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھنا فرض اور واجب نہیں کیونکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر نماز ادا

٣١٤- أخرجه البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث: ٦٤٥، ومسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة، حديث: ٦٥٠، وحديث أبي هريرة أخرجه البخاري، الأذان، حديث: ٦٤٧، ومسلم، المساجد، حديث: ٦٥١، وحديث أبي سعيد الخدري أخرجه البخاري، الأذان، حديث: ٦٤٦.

کرنے میں مختلف اسباب کی وجہ سے درجات میں کمی وبیشی ہوتی ہے تو گویا منفرد کی بھی نماز ہو گئی' خواہ مراتب اور درجات کم ہی ہوں۔ اگر باجماعت نماز واجب ہوتی تو پھر منفرد کی نماز جائز ہی نہ ہوتی' حالانکہ ایسا نہیں ہے' لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ نماز باجماعت کی فرضیت اور اس کے وجوب کے قائلین کے نقطۂ نظر کے مطابق مذکورہ بالا استدلال کئی وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کی افضلیت کے ذکر سے اس چیز کی فرضیت اور وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ساری زندگی اس پر مواظبت اور ہمیشگی کی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نماز باجماعت میں سستی کرنے والوں کی بابت احادیث میں سخت وعیدیں مذکور ہیں حتی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو ان کے گھروں کے اندر ہی زندہ جلا دینے کا ارادہ فرمایا ہے' نیز بعض روایات میں تو بغیر کسی شرعی عذر کے اکیلے پڑھی گئی نماز کو فَلَا صَلَاةَ لَهُ کہا گیا ہے۔ بنا بریں راجح بات یہی لگتی ہے کہ نماز کی باجماعت ادائیگی ضروری ہے۔ ہاں' اگر کوئی معقول شرعی عذر ہو تو پھر بغیر جماعت کے اکیلے نماز پڑھنے والا بھی ماجور ہوگا۔ اور اس کے ذمہ سے یہ فرض ادا ہو جائے گا۔ لیکن بلاعذر جماعت چھوڑنے پر گناہ گار ہوگا۔ واللہ أعلم.

(٣١٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَيَؤُمَّ النَّاسَ، ثُمَّ أُخَالِفَ إِلٰى رِجَالٍ لَايَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْ يَعْلَمُ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَرْقًا سَمِينًا، أَوْ مِرْمَاتَيْنِ حَسَنَتَيْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[315] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات گرامی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیوں کا حکم دوں' چنانچہ انھیں جمع کیا جائے' پھر نماز کا حکم دوں تو اس کے لیے اذان کہی جائے' پھر کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کی امامت کرائے' پھر میں خود ان لوگوں کے پیچھے جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے' پھر (ان کے گھروں میں موجود ہونے کی صورت میں) ان کے گھروں کو ان پر آگ لگا کر جلا دوں۔ اس ذات گرامی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ان میں سے کسی کو یہ علم ہو جائے کہ اس کو گوشت سے بھرپور موٹی ہڈی مل جائے گی یا دو خوبصورت پائے مل جائیں گے تو وہ نماز عشاء میں ضرور حاضر ہو۔'' (بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [هَمَمْتُ] میں نے ارادہ کیا' قصد کیا۔ [بِحَطَبٍ] ''حا'' اور ''طا'' دونوں پر فتحہ ہے' یعنی وہ خشک لکڑی جو جلانے کے کام آسکے۔ [فَيُحْتَطَبَ] لکڑیاں جمع کی جائیں۔ صیغۂ مجہول ہے۔ منصوب اس لیے ہے کہ یہ اپنے سے

٣١٥۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، حديث: ٦٤٤، ومسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة، حديث: ٦٥١.

پہلے واقع فعل منصوب کا جواب ہے اور اس پر اس کا عطف ہے۔ [فَيُؤَذَّنَ] تَأْذِين سے ماخوذ ہے۔ اذان دی جائے۔ [فَيَؤُمَّ النَّاسَ] یعنی لوگوں کا امام بن کر نماز با جماعت پڑھائے۔ [ثُمَّ أُخَالِفَ إِلٰى رِجَالٍ] پھر میں ان کے پیچھے سے آؤں یا محض یہ معنی ہیں کہ میں ان کی طرف چلا جاؤں۔ [فَأُحَرِّقَ] تَحْرِيق سے ماخوذ ہے یعنی میں آگ لگا کر جلا ڈالوں۔ یہاں مضارع کے تمام صیغے منصوب واقع ہوئے ہیں سوائے صیغۂ جمع مذکر کے۔ [عَرْقًا] ''عین'' پر فتحہ اور ''را'' ساکن ہے۔ وہ ہڈی جس پر کچھ گوشت باقی ہو اور اس کا زیادہ حصہ اخذ کر لیا گیا ہو۔ اور اصمعی کا قول ہے کہ عَرْق گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں لیکن اس جگہ پہلے معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس معنی میں ان کے کمینے پن کا زیادہ اظہار ہے۔ [سَمِينًا] سِمَانَة سے ماخوذ ہے۔ موٹا تازہ۔ اور یہ لاغر کی ضد ہے [مِرْمَاتَيْنِ] مِرْمَاة کا تثنیہ ہے۔ ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے اور کبھی فتحہ سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بکری کا کھر یا وہ گوشت جو کھروں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب اور فرض عین ہے کیونکہ اس قسم کی سخت اور شدید وعید تو صرف واجب کے ترک پر ہوتی ہے۔ اور جو عدم وجوب کے قائل ہیں' انھوں نے اس وعید کو زجر و توبیخ پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی اصل حقیقت مراد نہیں ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض عین ہے' فرض کفایہ یا سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ فرض عین نہ ہوتی تو تارکین جماعت کے لیے اتنی سخت اور شدید وعید اور دھمکی نہ دی جاتی۔ ظاہریہ' عطاء' اوزاعی' امام احمد' ابوثور' ابن خزیمہ' ابن منذر اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرض کفایہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اگر جماعت کے ساتھ ادا کر لیں تو باقی لوگوں سے با جماعت عدم ادائیگی کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ متقدمین شافعیہ' بعض احناف اور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے' البتہ صاحبین اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ فرض کفایہ اس لیے نہیں ہے کہ جب کچھ لوگ جماعت میں شامل ہو گئے پھر شامل نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کفایہ تو چند لوگوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔

(٣١٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: **أَثْقَلُ الصَّلَاةِ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا».** مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[316] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافقین پر سب سے ثقیل و بوجھل' نماز عشاء اور نماز فجر ہیں اور اگر ان کو اس (عظیم اجر و ثواب) کا علم ہو جائے جو ان دونوں میں (حاضر ہونے سے ملتا) ہے تو یہ لازماً ان میں شامل ہوں' خواہ ان کو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔'' (بخاری و مسلم)

٣١٦ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب فضل العشاء في الجماعة، حديث: ٦٥٧، ومسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة، حديث: ٦٥١.

لغوی تشریح: [لَأَتَوْهُمَا] اس میں لام تاکید کے لیے ہے، یعنی ضرور آتے۔ إِتْيَان سے ماخوذ ہے۔ [وَلَوْ حَبْوًا] حبو کی ''حا'' پر فتحہ اور ''با'' ساکن ہے۔ بچے کا اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹنا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنے سرین پر گھسٹ کر آگے بڑھنا۔

فائدہ: ان نمازوں کو نہایت بوجھل اور بھاری کہا گیا ہے۔ عشاء تو اس لیے ثقیل ہے کہ اس وقت تھکے ماندے لوگ سو جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اکیلے ہی نماز ادا کر کے سو جاتے ہیں، جماعت کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے اور فجر اس لیے گراں ہوتی ہے کہ شیطان نیند کے مارے ہوئے لوگوں کو اٹھنے ہی نہیں دیتا۔

(٣١٧) وَعَنْهُ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ أَعْمٰى فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّهُ لَيْسَ لِي قَائِدٌ يَقُودُنِي إِلَى الْمَسْجِدِ، فَرَخَّصَ لَهُ، فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ فَقَالَ: «**هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ؟**» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «**فَأَجِبْ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[317] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ آپ نے اسے رخصت عنایت فرما دی (کہ وہ گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کرے۔) چنانچہ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اسے بلا کر پوچھا: ''کیا تم نماز کی پکار (اذان) سنتے ہو؟'' اس نے عرض کیا: جی ہاں، تو آپ نے فرمایا: ''تو پھر اذان کا جواب دو (مسجد میں جماعت سے نماز پڑھو)۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رَجُلٌ أَعْمٰى] نابینے آدمی سے یہاں مراد عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ غالبًا اس ارشاد کے بعد مسجد میں اتنی باقاعدگی سے حاضری دی کہ بالآخر مسجد کے منصب اذان پر مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ [قَائِدٌ] وہ آدمی جو نابینے شخص کا ہاتھ تھام کر جہاں وہ جانا چاہے اسے وہاں لے جائے۔ [وَلّٰى] تَوْلِيَة سے ماخوذ ہے۔ واپس ہوا۔ واپس جانے کے لیے اپنا رخ پھیرا۔ [اَلنِّدَآء] اذان۔ [فَأَجِبْ] إِجَابَة سے امر کا صیغہ ہے، یعنی اذان کا جواب دے۔ اس سے مراد بالفعل جواب دینا، یعنی نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل کر آنا ہے۔ (کیونکہ اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے ساتھ یہی دعوت دی جاتی ہے۔) بعض کا قول ہے کہ پہلے عام رخصت تھی، پھر بعد میں اس رخصت کو اذان نہ سننے کے ساتھ مقید کر دیا گیا کہ اگر اذان سنائی نہ دے تو پھر مسجد میں نہ آنے کی رخصت ہے اور اگر سن لے تو پھر کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ بعض نے کہا کہ یہ حکم ندب و استحباب کے لیے ہے، شروع میں مطلق رخصت دے دی گئی، پھر بعد میں جماعت میں حاضر ہونے کی فضیلت کے حصول کے لیے ترغیب دیتے ہوئے حکم فرمایا جس کا مقصد صرف رغبت دلانا تھا نہ کہ وجوب ثابت کرنا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اذان کی آواز سننے کے بعد معذور آدمی کو بھی مسجد میں آنا چاہیے۔

٣١٧۔ أخرجه مسلم، المساجد، باب يجب إتيان المسجد على من سمع النداء، حديث: ٦٥٣.

معذور کی نماز گھر پر پڑھنے سے ادا تو ہو جائے گی مگر جماعت کا ثواب نہیں ملے گا' نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان کی آواز نہ سننا قابل قبول عذر ہے۔ سننے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ ② بارش' سخت آندھی' یخ ٹھنڈی ہوا' شدید بھوک' قضائے حاجت' بیماری اور دشمن کا خوف وغیرہ ایسے عذر ہیں جنھیں جماعت میں عدم شمولیت کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔ ③ اس حدیث سے جماعت میں شمولیت کو فرض عین کہنے والوں نے فرضیت عین پر استدلال کیا ہے اور سنت مؤکدہ کہنے والوں نے اس حدیث کو تاکید مزید پر محمول کیا ہے۔ دونوں کے لیے اپنے اپنے نظریے کی رو سے گنجائش موجود ہے۔

(٣١٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ فَلَاصَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ، وَإِسْنَادُهُ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ، لٰكِنْ رَجَّحَ بَعْضُهُمْ وَقْفَهُ.

[318] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اذان سنے' پھر نماز باجماعت میں شامل نہ ہو' اس کی کوئی نماز نہیں' الا یہ کہ کوئی عذر ہو۔'' (اسے ابن ماجہ' دارقطنی' ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے بھی نماز باجماعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ابوداود میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ عذر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''خوف اور بیماری۔'' نیز اس میں | لَا صَلَاةَ ...... |کی بجائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرتا' مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ (سنن أبي داود' الصلاة' باب التشديد في ترك الجماعة' حديث:٥٥١) نیز باد و باراں' یخ ٹھنڈی ہوا اور خوف وغیرہ بھی عذر میں شامل ہیں۔

(٣١٩) وَعَنْ يَزِيدَ بْنِ الْأَسْوَدِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ صَلّٰى مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا صَلّٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، إِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ لَمْ يُصَلِّيَا، فَدَعَا بِهِمَا، فَجِيءَ بِهِمَا، تُرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فَقَالَ لَهُمَا: «مَا مَنَعَكُمَا أَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا»؟ قَالَا: قَدْ صَلَّيْنَا فِي رِحَالِنَا، قَالَ: «فَلَا تَفْعَلَا، إِذَا صَلَّيْتُمَا فِي رِحَالِكُمَا ثُمَّ

[319] حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو دو ایسے آدمیوں پر نظر پڑی جنھوں نے نماز (آپ کے ساتھ) نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر کیے گئے تو (خوف کے مارے) ان کے شانے کانپ رہے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا: ''تمھیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے

٣١٨ـ [صحيح] أخرجه ابن ماجه، المساجد، باب التغليظ في التخلف عن الجماعة، حديث: ٧٩٣، والدارقطني: ١/ ٤٢٠، وابن حبان (الإحسان): ٣/ ٢٥٣، حديث: ٢٠٦١، والحاكم: ١/ ٢٤٥، وتاريخ واسط لبحشل ص: ٢٠٢، وهيشم صرح بالسماع عنده.

٣١٩ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب فيمن صلى في منزله ثم أدرك...، حديث: ٥٧٥، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢١٩، والنسائي، الإمامة، حديث: ٨٥٩، وابن حبان (الإحسان): ٣/ ٥٠، حديث: ١٥٦٣.

أَدْرَكْتُمَا الْإِمَامَ وَلَمْ يُصَلِّ فَصَلِّيَا مَعَهُ، فَإِنَّهَا لَكُمَا نَافِلَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

سے کس چیز نے روکا؟'' انھوں نے عرض کیا: ہم اپنے گھروں میں نماز پڑھ چکے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''ایسا مت کیا کرو۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو، پھر تم امام کو پاؤ کہ اس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے تو تم اس کے ساتھ نماز پڑھو' یہ تمھارے لیے نفل ہو جائے گی۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ اور حدیث کے الفاظ بھی اسی کے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے تینوں نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِذَا هُوَ] هُوَ سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ [بِرَجُلَيْنِ] یعنی آپ نے دو آدمیوں کو دیکھا جو لوگوں کے آخر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ [فَجِيءَ] اس میں ''فا'' تعقیب کے لیے ہے اور جِيءَ، مَجِيئَةٌ سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ان دونوں کو لایا گیا۔ [تُرْعَدُ] صیغۂ مجہول ہے۔ معنی ہیں: مضطرب ہونا' کانپنا' خوف اور ڈر کی وجہ سے لرزہ براندام ہونا۔ [فَرَائِصُهُمَا] فَرِيصَةٌ کی جمع ہے۔ فریصہ اس گوشت کو کہتے ہیں جو پہلو اور کندھے کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے لرزہ براندام ہونے اور کانپنے کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت و ہیبت تھی' حالانکہ آپ کی طبیعت میں تواضع' نرمی اور شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ [رِحَالِنَا] رَحْل کی جمع ہے جس کی ''را'' پر فتحہ اور ''حا'' ساکن ہے' یعنی جائے سکونت' گھر۔ [فَلَا تَفْعَلَا] یعنی ابھی جو مسجد میں حاضر ہونے کے باوجود تم نے ترک جماعت کا عمل کیا ہے آئندہ ایسا نہ کرنا۔ [فَإِنَّهَا لَكُمَا نَافِلَةٌ] اس سے وہ دوسری نماز مراد ہے جو وہ امام کے ساتھ ادا کریں گے' اس لیے کہ فرض نماز تو پہلی نماز کی صورت میں ادا ہو گئی' اب فرض نماز تو کوئی باقی رہی نہیں جو ادا کی جاتی' لہٰذا دوسری نماز جو امام کے ساتھ ادا کی ہوگی وہ نفل نماز قرار پائے گی۔ ابوداود اور دارقطنی میں ہے کہ امام کے ساتھ جو نماز پڑھی وہ فرض ہوگی اور جو پہلے اکیلے پڑھی وہ نفل ہوگی' مگر یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ دیکھیے: (سنن أبي داود (اردو) بتحقيق زبير عليزئي ؒ (مطبوع دارالسلام' لاهور)' حديث: ۵۷۷' وسنن الدارقطني بتحقيق الشيخ عادل أحمد عبدالموجود' والشيخ علي محمد معوض: ۵۹۸/۱) اور یزید بن اسود کی اس صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص پہلے نماز پڑھ چکا ہو اور پھر جماعت کے ساتھ شامل ہونے کا موقع بھی میسر آ جائے تو اسے جماعت کے ساتھ شامل ہونا چاہیے' خواہ کوئی نماز ہو۔ امام شافعی ؒ کا یہی قول ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک صرف ظہر اور عشاء دو نمازوں میں ایسا کر سکتا ہے باقی میں نہیں' لیکن جب دوبارہ نماز پڑھنے کی دلیل یہی حدیث ہے تو پھر باقی نمازیں دوبارہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ اس لیے امام شافعی ؒ کا موقف ہی درست ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت یزید بن اسود ؓ] ان کی کنیت ابوجابر ہے۔ سوائی عامری ہیں۔ ان کے قبیلے کے قریش سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں فروکش ہوئے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ اسے

ان کے بیٹے جابر رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے۔

(۳۲۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلَا تُكَبِّرُوا حَتّٰى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلَا تَرْكَعُوا حَتّٰى يَرْكَعَ، وَإِذَا قَالَ: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» فَقُولُوا: «اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ» وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَلَاتَسْجُدُوا حَتّٰى يَسْجُدَ، وَإِذَا صَلّٰى قَائِمًا فَصَلُّوا قِيَامًا، وَإِذَا صَلّٰى قَاعِدًا فَصَلُّوا قُعُودًا أَجْمَعِينَ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

[320] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امام کو اسی لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے' لہٰذا جب وہ اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہے تو تم بھی اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہو اور تم اَللّٰهُ أَكْبَرُ نہ کہا کرو حتی کہ امام اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہے۔ اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ اور تم رکوع اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ امام رکوع نہ کرے۔ اور جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہے تو تم اَللّٰهُمَّ! رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہو۔ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ تم سجدہ نہ کرو حتی کہ امام سجدہ کرے۔ اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ بھی اسی کے ہیں۔ اور اس کی اصل صحیحین میں ہے۔)

لغوی تشریح: [لِيُؤْتَمَّ] تاکہ اس کی اتباع و پیروی اور اقتدا کی جائے۔ [حَتّٰى يَرْكَعَ] اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع میں جھک جائے' یہ معنی نہیں کہ رکوع پورا کرے تو پھر تم رکوع کرو۔ [وَ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ ......الخ] بعض علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ امام صرف سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہے اور مقتدی صرف حمد و ثنا کرے' لیکن یہ حدیث اس بارے میں واضح نہیں ہے' بلکہ صحیح بخاری' کتاب المغازی' حدیث: ۴۰۶۹ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کے بعد رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ بھی کہتے تھے۔ اسی طرح مقتدی کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا کہ اس کا سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہنا بھی درست ہے کیونکہ یہ وظیفۂ انتقال ہے۔ اس حدیث میں دراصل مقتدی کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی اقتدا کس طرح کرے۔ راویٔ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی مقتدی کے لیے تسمیع و تحمید پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ الحاوی میں مطبوع ہے۔ [فَصَلُّوا قُعُودًا] تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کے مرض کے دوران میں پڑھی جانے والی نماز سے منسوخ ہو چکا ہے' اس لیے کہ آپ نے اس وقت امام کی حیثیت سے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی تھی اور باقی سب نمازیوں نے کھڑے ہو کر' لیکن امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے' منسوخ نہیں۔

۳۲۰۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الإمام يصلي من قعود، حديث: ٦٠٣، ٦٠٤، وأصله في الصحيحين: البخاري، الأذان، حديث: ٧٢٢، ومسلم، الصلاة، حديث: ٤١٤.

جب امام کے عذر کے دور ہونے کی توقع ہو تو اس وقت مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہیے بشرطیکہ قبیلے کا امام مستقل ہو اور نماز کی ابتدا بیٹھ کر کرتا ہو۔ ورنہ مقتدیوں کے لیے قیام ہی متعین ہے۔ امر دراصل وجوب کے لیے ہے۔ اگر کھڑے ہونے کے حکم کو وجوب پر محمول کریں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے آخری عمل سے یہ منسوخ ہے۔ اور رہا اس کا مندوب ہونے پر محمول کرنا اور مذکورہ شرائط کی قید لگانا تو پھر حدیث سے ایسی کوئی دلیل نہیں نکلتی جس سے ثابت ہو کہ نبی ﷺ نے جب اس کا حکم فرمایا' اس وقت خود ان شرائط کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد: [وَ إِذَا صَلَّى قَاعِدًا فَصَلُّوا قُعُودًا أَجْمَعِينَ] مطلق حکم کا مقتضی ہے اور شرائط مذکورہ کی بھی کوئی قید نہیں' لہٰذا اب ایک ہی طریقہ ہے کہ اس حکم کو منسوخ کہا جائے اور مقتدیوں کے لیے قیام کو متعین کیا جائے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کی پیروی و اتباع کرنی چاہیے۔ کسی چیز میں امام سے آگے نہ بڑھیں۔ تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک امام کے پیچھے پیچھے رہنے کی کوشش کریں۔ صحابۂ کرام ؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ سجدہ میں سر مبارک رکھ لیتے تو پھر ہم سجدے کے لیے جھکتے تھے۔ (صحيح البخاري' الأذان' باب متى يسجد من خلف الإمام؟ حديث: ۶۹۰)

(۳۲۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ رَأَى فِي أَصْحَابِهِ تَأَخُّرًا، فَقَالَ: «**تَقَدَّمُوا، فَائْتَمُّوا بِي، وَلْيَأْتَمَّ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[321] حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو پیچھے ہٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''آگے آجاؤ اور میری پیروی کرو اور تمھارے پیچھے والے تمھاری پیروی کریں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [تَأَخُّرًا] نماز کی صفوں میں پیچھے رہ جانا' دور رہ جانا' یعنی وہ آپ کے قریب نہیں بلکہ پیچھے دور ہو کر کھڑے تھے۔ [فَأْتَمُّوا بِي] میری اقتدا کرو۔ یہ اِئْتِمَام سے امر کا صیغہ ہے۔ اقتدا' پیروی اور اتباع کے معنی میں ہے۔ [وَلْيَأْتَمَّ] میں لام امر کا ہے۔ یہ گرامر کے اعتبار سے ساکن بھی ہو سکتا ہے اور مکسور بھی۔ [مَنْ بَعْدَكُمْ] تمھارے پیچھے والے' یعنی تم پہلی صف والے مقتدی امام کے افعال' حرکات و سکنات اور احکام نماز پہلے مجھ سے حاصل کر لو' پھر یہی افعال و احکام اور آداب و صفات نماز تم سے بعد والے' یعنی پچھلی صف میں شریک ہونے والے نمازی سیکھ لیں۔ اور اسی طرح ان سے پچھلی صف میں شامل لوگ اپنے سے اگلی صف میں شریک نمازیوں سے ان آداب و صفات کی تعلیم حاصل کر لیں۔ و على هذا القياس.

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نماز باجماعت میں پہلی صف کا درجہ اور مرتبہ دوسری صفوں سے زیادہ اور افضل ہے' اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صف والوں کو امام کی اقتدا کرنی چاہیے۔ اس ضرورت کے لیے امام کو دیکھنا جائز ہے' اور دوسری صف والوں کو پہلی صف کے مقتدیوں کی اسی طرح اقتدا کرنی چاہیے۔ ② اس حدیث

۳۲۱۔ أخرجه مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها ....، حديث: ۴۳۸.

سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نمازی براہ راست امام کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ اس کی آواز سن سکتا ہو تو وہ دوسرے مقتدی کی پیروی کرے۔ ③ اس سے اشارتاً یہ بھی مسئلہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس براہ راست کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے دوسرے صاحب علم سے معلوم کر لینا چاہیے۔

(٣٢٢) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اِحْتَجَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ حُجْرَةً مُخَصَّفَةً، فَصَلّٰى فِيهَا، فَتَتَبَّعَ إِلَيْهِ رِجَالٌ، وَجَاءُوا يُصَلُّونَ بِصَلَاتِهِ، اَلْحَدِيثَ. وَفِيهِ: «أَفْضَلُ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ، إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[322] حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چٹائی سے ایک چھوٹا (خیمہ نما) حجرہ بنایا اور اس میں نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں نے بھی جستجو کر کے معلوم کر لیا اور وہ آئے اور آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گئے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ (آپ نے فرمایا:) ''فرض نماز کے علاوہ مرد کی افضل نماز وہ ہے جو وہ گھر میں ادا کرے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [اِحْتَجَرَ] حجرے کی طرح کا ایک خیمہ سا بنایا۔ [مُخَصَّفَةً] تَخْصِيف سے اسم مفعول ہے۔ چٹائی سے بنایا ہوا۔ [فَتَتَبَّعَ إِلَيْهِ رِجَالٌ] لوگ تلاش' جستجو اور کاوش کر کے اس جگہ پہنچ گئے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز کی جماعت کرانا مشروع ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ ماہ رمضان کا موقع تھا کہ آپ نے اپنے لیے مسجد میں الگ ایک مختصر سی مخصوص جگہ بنالی۔ ② یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ایسا کرنا مقتدیوں اور نمازیوں کے لیے باعث ضرر اور تکلیف نہ ہو تو مسجد میں مخصوص جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ ③ مکمل روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اکیلے رات کی نماز پڑھتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو علم ہوا تو انھوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ آپ ﷺ ایک رات دیر سے اس حجرے سے باہر نکلے اور فرمایا: ''میں نے تمھارا حال دیکھ لیا ہے' اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض نماز کے علاوہ مردوں کی نماز گھر میں افضل ہے۔''

(٣٢٣) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى مُعَاذٌ بِأَصْحَابِهِ الْعِشَاءَ، فَطَوَّلَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَتُرِيدُ أَنْ تَكُونَ يَامُعَاذُ! فَتَّانًا؟ إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَاقْرَأْ بِـ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا﴾ وَ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ وَ

[323] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے مقتدیوں کو عشاء کی نماز پڑھائی۔ انھوں نے قراءت لمبی کر دی تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو نمازیوں کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہتا ہے؟ جب تو لوگوں کی امامت کرائے تو ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا﴾' ﴿سَبِّحِ

٣٢٢ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب صلاة الليل، حديث: ٧٣١، ومسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة في بيته، حديث: ٧٨١.

٣٢٣ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب إذا طول الإمام وكان للرجل حاجة فخرج فصلى، حديث: ٧٠١، ومسلم، الصلاة، باب القراءة في العشاء، حديث: ٤٦٥.

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ وَ ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَى﴾ . اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾، ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ اور ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَى﴾ پڑھا کرو۔'' (بخاری و مسلم۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

لغوی تشریح: [فَطَوَّلَ] تَطْوِيل (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ''فا'' برائے تعقیب ہے، یعنی قراءت لمبی کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ یا سورۂ نساء پڑھی۔ (صحیح البخاري' الأذان' باب من شكا إمامه إذا طول' حديث:٧٠٥) [أَتُرِيدُ] ہمزۂ استفہام انکار کے لیے ہے۔ [فَتَّانًا] ''فا'' پر فتحہ اور ''تا'' پر تشدید ہے، یعنی تو مشقت اور آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہے۔ [أَمَمْتَ] پہلی میم مخفف پر فتحہ اور دوسری میم ساکن ہے۔ باب نَصَرَ يَنْصُرُ ہے، معنی یہ ہوئے کہ جب تم لوگوں کی امامت کرا رہے ہو۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام کو قراءت اتنی لمبی اور طویل نہیں کرنی چاہیے کہ نمازی تنگ آ جائیں اور جماعت سے گریز کریں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قراءت اتنی کم ہو کہ مقصد قراءت ہی فوت ہو جائے بلکہ ادائیگی ارکان اور تلاوت کلام مجید میں اعتدال اور توازن ہونا چاہیے اور مسنون طریقے سے نماز پڑھانی چاہیے۔ ② طویل قراءت بھی جائز ہے جبکہ نمازی متحمل ہوں۔ ③ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نماز کا واقعہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور انھوں نے قراءت معمول سے زیادہ لمبی کر دی۔ ایک راہ چلتا مسافر جس کے پاس دو اونٹنیاں بھی تھیں، وہ اپنی اونٹنیاں باہر چھوڑ کر نماز میں شامل ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ قراءت بہت طویل ہے تو اس نے نماز توڑ کر الگ بغیر جماعت کے نماز پڑھی اور اپنی راہ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ منافق ہے۔ وہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے نصیحت فرمائی۔ (صحیح البخاري' الأدب' باب من لم یر إكفار من قال ذلك متأولا أو جاهلا' حديث:٦١٠٦) فتنے میں مبتلا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں: مثلاً بوڑھے، کمزور و ناتواں، ضرورت مند اور تھکے ماندے وغیرہ، تو ان سب کا لحاظ رکھنا امام کے لیے ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ لوگ اکتا کر نماز باجماعت سے گریز کرنے لگیں۔ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرض نماز پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھ کر پھر جا کر محلے کی مسجد میں نمازیوں کو فرض نماز پڑھاتے تھے۔ (صحیح البخاري' الأذان' باب إذا طوّل الإمام و كان للرجل حاجة...... حديث: ٧٠١) عبدالرزاق' شافعی اور طحاوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ (دوسری) نماز نفل ہوتی تھی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ١/ ٣٢٨-٣٣١' حديث: ٢٩٥) ④ ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ امام اور مقتدی کی نیت اگر مختلف ہو تب بھی دونوں کی نماز صحیح ہو گی' مثلاً: امام کی نیت نفل پڑھنے کی ہے اور مقتدی کی فرض کی' یا امام نماز ظہر اور مقتدی نماز عصر کی نیت کرے یا اس کے برعکس تو دونوں صورتوں میں دونوں کی نماز جائز ہو گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ⑤ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ مقتدی اگر امام کا کوئی فعل ناپسند کرتا ہے اور نماز توڑ کر الگ اسی جگہ اپنی نماز ادا کر لیتا ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور تنبیہ فرماتے کہ آئندہ ایسا مت کرنا اور نماز بھی دوبارہ پڑھو۔ چونکہ ایسا نہیں فرمایا' اس لیے یہ جائز ہے۔

(٣٢٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، فِي قِصَّةِ صَلَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَهُوَ مَرِيضٌ، قَالَتْ: فَجَاءَ حَتّٰى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ أَبِي بَكْرٍ، فَكَانَ يُصَلِّي بِالنَّاسِ جَالِسًا، وَأَبُوبَكْرٍ قَائِمًا، يَقْتَدِي أَبُوبَكْرٍ بِصَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ، وَيَقْتَدِي النَّاسُ بِصَلَاةِ أَبِي بَكْرٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[324] حضرت عائشہ ؓ رسول اللہ ﷺ کی اس نماز کے ضمن میں' جو آپ نے حالت بیماری میں لوگوں کو پڑھائی' فرماتی ہیں: آپ تشریف لائے اور حضرت ابوبکر ؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ پس آپ لوگوں کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابوبکر ؓ کھڑے ہو کر۔ حضرت ابوبکر ؓ نبی ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر ؓ کی پیروی میں نماز پڑھ رہے تھے۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [وَ هُوَ مَرِيضٌ] یہاں ''واؤ'' حالیہ ہے۔ ایسی حالت میں تشریف لائے جبکہ آپ بیمار تھے۔ اور یہ مرض الموت کا واقعہ ہے۔ اور غالب گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آخری نماز ہے جو آپ نے لوگوں کو باجماعت پڑھائی۔ اس کے بعد مرض کی شدت کی وجہ سے گھر سے باہر تشریف نہیں لا سکے۔ اور یہ نماز ظہر تھی۔ نبی ﷺ کا حضرت ابوبکر ؓ کی بائیں طرف بیٹھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ امام تھے کیونکہ امام کی جگہ بائیں جانب ہوتی ہے۔ اور یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتدا میں جائز ہے بلکہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدی کھڑا ہو کر ہی نماز پڑھے گا بشرطیکہ کوئی عذر نہ ہو' چاہے امام کھڑا ہو یا بیٹھا ہو۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے موقع پر نماز پڑھانے کے بارے میں ہے۔ واقعہ کی مختصر صورت یہ تھی کہ آپ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ اس اثنا میں آپ ہی کے ارشاد کے بموجب حضرت ابوبکر ؓ لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ ایک دن آپ کو قدرے افاقہ ہوا تو آپ ﷺ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر ؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ حضرت ابوبکر ؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھانا شروع کی۔ آپ امام تھے اس لیے بائیں طرف بیٹھے اور ابوبکر ؓ مقتدی تھے' اس لیے دائیں جانب رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزوری زیادہ ہو گئی تھی' اس لیے تکبیروں کے لیے آواز بلند نہیں نکلتی تھی۔ حضرت ابوبکر ؓ مکبر کا کام دے رہے تھے اور آپ کی تکبیروں کو بلند آواز سے لوگوں تک پہنچاتے تھے تو وہ ارکان نماز ادا کرتے تھے۔ ② اس حدیث سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ مقرر اور افضل امام کے آنے پر دوسرے امام کو اپنی جگہ دے دینی چاہیے۔ مگر ابن عبدالبر ؒ نے اسے نبی ﷺ ہی کا خاصہ قرار دیا ہے۔

(٣٢٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمُ النَّاسَ

[325] حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرائے تو

٣٢٤ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب الرجل يأتم بالإمام، حديث: ٧١٣، ومسلم، الصلاة، باب استخلاف الإمام إذا عرض له عذر ....، حديث: ٤١٨.

٣٢٥ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب إذا صلى لنفسه فليطول ما شاء، حديث: ٧٠٣، واللفظ مركب، ومسلم، الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، حديث: ٤٦٧.

فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الصَّغِيرَ وَالْكَبِيرَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ، فَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اسے قراءت میں تخفیف کرنی چاہیے' اس لیے کہ مقتدیوں میں بچے' بوڑھے' کمزور اور حاجت مند لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں' جب تنہا نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے پڑھے۔'' (بخاری ومسلم)

 فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب فریضۂ امامت ادا کر رہا ہو تو اس وقت نماز میں لمبی قراءت سے احتیاط کرنی چاہیے' اس لیے کہ جماعت میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ سب کی ضروریات و حاجات پیش نظر رکھنی چاہئیں' البتہ جب آدمی اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے اپنے اشغال' ضروریات اور حالات کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔ تو ایسا آدمی فرصت اور قوت کے مطابق جتنی چاہے لمبی قراءت کرے اسے اختیار ہے' مگر بیماری اور ضرورت کے وقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کسی صورت میں بھی درست اور جائز نہیں۔ شریعت نے نفس کا بھی حق رکھا ہے۔

(٣٢٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ سَلِمَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ أَبِي: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ حَقًّا، قَالَ: «فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ، وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْآنًا». قَالَ: فَنَظَرُوا، فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ مِنِّي قُرْآنًا فَقَدَّمُونِي، وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِينَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[326] حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے والد نے اپنی قوم سے کہا: میں تمھارے پاس نبیٔ برحق کے پاس سے آ رہا ہوں' ان کا ارشاد گرامی ہے: ''جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کہے' اور امامت ایسا شخص کرائے جو قرآن حمید کا زیادہ پڑھنے والا (حافظ) ہو۔'' عمرو نے کہا: میری قوم نے دیکھا مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا قرآن پڑھنے والا (حافظ) نہیں ہے تو انھوں نے مجھے آگے کر دیا۔ اس وقت میری عمر چھ یا سات برس تھی۔ (اسے بخاری' ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قَالَ أَبِي: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقًّا] حَقًّا منصوب ہے مفعول مطلق کی صفت ہونے کی وجہ سے۔ اصل میں تھا: نُبُوَّةً حَقًّا. یہ صاحب فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے آنے والے وفد میں نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے فتح مکہ کا اسی طرح انتظار کر رہے تھے جس طرح باقی ماندہ عرب منتظر تھے کہ اس معرکہ آرائی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے' چنانچہ جب فتح مکہ کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا (مکہ فتح ہو گیا) اور اہل عرب کو خوب معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں وہ مبنی برصداقت اور سراسر حق ہے تو یہ لوگ پے در پے اسلام لانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ [فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْآنًا مِنِّي] ان میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی قرآن پڑھنے والا (یاد رکھنے والا) نہیں تھا۔ اس کا سبب

٣٢٦ـ أخرجه البخاري، المغازي، باب(٥٤)، حديث: ٤٣٠٢، وأخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ٥٨٥ - ٥٨٧، والنسائي، الأذان، حديث: ٦٣٧.

انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہماری رہائش ایسے مقام پر تھی جہاں سے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے اور وہاں سے واپس جانے والے لوگ گزرتے تھے۔ پس وہ ہمیں بتاتے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا' یوں فرمایا۔ میں چونکہ اچھے حافظے والا بچہ تھا' اس لیے ان کی زبان سے سن سن کر قرآن مجید کا کافی حصہ ازبر کر چکا تھا' اس لیے جب میرے والد رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ہو کر آئے اور انھوں نے آ کر نماز کی بابت باتیں بتلائیں تو ان میں یہ بات بھی تھی کہ جس کو قرآن زیادہ یاد ہو اسے امام بنایا جائے' چنانچہ انھوں نے مجھے اپنا امام بنالیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نابالغ بچہ فرض نمازوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ جب فرض نماز کی امامت درست اور صحیح ہے تو نوافل کی جماعت بالاولیٰ کرا سکتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث نے امام کے لیے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو قرآن مجید کا زیادہ قاری ہو امامت کے منصب کے لیے اسی کا انتخاب کیا جائے جیسا کہ عمرو رضی اللہ عنہ کو اس کی قوم کے لوگوں نے منتخب کیا۔ ② اس حدیث سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ امامت کا منصب اذان کے منصب سے افضل ہے' اس لیے کہ مؤذن کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی' وہ صرف حسن صوت اور بلند آواز والا ہونا چاہیے۔ چھ سات سالہ بچے کو امام مقرر کرنا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اسے دوسروں کے مقابلے میں قرآن زیادہ یاد تھا۔ حسن بصری' امام شافعی' ابن راہویہ اور اہلحدیث اسی کے قائل ہیں کہ نابالغ لڑکے کی امامت میں بڑے بوڑھے لوگوں کی نماز درست ہے' مگر امام مالک اور امام ثوری رحمہما اللہ وغیرہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ سے دو قول منقول ہیں۔ دونوں میں سے مشہور قول یہ ہے کہ بچے (نابالغ) کی امامت میں نفل نماز درست ہے اور فرض نماز جائز نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام نہ تو آپ ﷺ کے فرمان کے تحت مقرر کیا گیا اور نہ آپ سے پوچھ کر اس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ اس کا تقرر و انتخاب اگر درست نہ ہوتا تو نبی ﷺ بذریعۂ وحی لازماً اسے آئندہ کے لیے روک دیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق اسلام کے بڑے اہم رکن نماز سے تھا' اس لیے اگر یہ درست نہ ہوتا تو اسے ضرور ممنوع قرار دے دیا جاتا' یا پھر نفلی اور فرضی امامت کی وضاحت کر دی جاتی کہ نفل میں اس کی گنجائش ہے' فرض میں نہیں۔ ایسا بھی کہیں نہیں' لہٰذا اقرین صواب یہی ہے کہ ضرورت کے وقت ایسا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ واللہ أعلم۔

راویٔ حدیث: [عمرو بن سَلِمَہ رضی اللہ عنہما] سلمہ کے "لام" کے نیچے کسرہ ہے۔ جرم قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے جرمی کہلائے۔ ابو یزید یا ابوبرید (تصغیر کے ساتھ) کنیت ہے۔ اپنے والد کی معیت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چھ' سات برس تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ عمرو بن سلمہ اور قبیلۂ بنو سلمہ کے علاوہ باقی تمام جگہ سلمہ کے "لام" پر فتحہ ہے اور ان دونوں میں لام کے نیچے کسرہ ہے۔

(٣٢٧) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «يَؤُمُّ الْقَوْمَ

[327] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لوگوں کا امام ایسا آدمی ہو جو قرآن حمید

٣٢٧- أخرجه مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة، حديث: ٦٧٣.

أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ تَعَالٰى، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْمًا - وَفِي رِوَايَةٍ «سِنًّا» - وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ، وَلَا يَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ، إِلَّا بِإِذْنِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

زیادہ پڑھنے والا' یعنی حافظ ہو۔ اگر اس وصف میں لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جسے سنت نبوی کا علم زیادہ ہو۔ اور اگر سنت کے علم میں بھی لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے ہجرت پہلے کی ہو۔ اگر اس وصف میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے پہلے اسلام قبول کیا ہو۔ اور ایک روایت میں سِلْماً (اسلام) کی بجائے سِنًّا (عمر) کا لفظ بھی ہے (یعنی اگر مذکورہ بالا اوصاف میں سبھی برابر ہوں تو پھر ان میں جس کی عمر زیادہ ہو اسے امام بنایا جائے۔) اور کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرۂ اقتدار میں امامت نہ کرائے اور نہ گھر میں اس کی مخصوص نشست پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ] اس جملے کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ایسا آدمی امام بنے جسے قرآن کا زیادہ حصہ حفظ ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن کو زیادہ جاننے والا ہے' یعنی احکام شریعت سے زیادہ واقف ہو لیکن [فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ] سے پہلے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ [سِلْمًا] ''سین'' کے نیچے کسرہ اور ''لام'' ساکن ہے' یعنی اسلام۔ [وَ فِي رِوَايَةٍ سِنًّا] ایک دوسری روایت میں سِلْمًا کی جگہ لفظ سِنًّا بھی منقول ہے۔ [وَلَا يَؤُمَّنَّ] امامت سے ماخوذ صیغۂ معلوم ہے اور نون تاکید (ثقیلہ) ہے۔ [الرَّجُلُ الرَّجُلَ] پہلا اَلرَّجُل فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ [فِي سُلْطَانِهِ] اس کے دائرۂ اقتدار میں۔ ''ھ'' کی ضمیر دوسرے آدمی کی طرف راجع ہے اور اسی طرح [فِي بَيْتِهِ] اور [فِي تَكْرِمَتِهِ] میں بھی ''ھ'' کی ضمیر دوسرے شخص کی طرف لوٹ رہی ہے۔ [اَلتَّكْرِمَة] ''تا'' پر فتحہ' ''کاف'' ساکن اور ''را'' مکسور ہے۔ ایسے بستر اور تکیے وغیرہ جو صاحب خانہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ [إِلَّا بِإِذْنِهِ] بظاہر یہ استثنا دونوں صورتوں کے لیے ہے' امامت اور بستر مخصوص پر بیٹھنا اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو جائز ہے۔

 فائدہ: اس حدیث کی رو سے امامت ایسے شخص کے سپرد کی جانی چاہیے جو قرآن کو زیادہ یاد رکھتا ہو' یا پھر سنت سے زیادہ باخبر ہو' یا دین کی خاطر ترک وطن کی سعادت میں قبول اسلام میں اولیت رکھتا ہو' یا پھر عمر رسیدہ ہو کیونکہ زیادہ امید ہے کہ جس کی عمر دراز ہوگی اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے۔

(۳۲۸) وَلِابْنِ مَاجَه مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ رَضِيَ

[328] سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی

۳۲۸۔ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب في فرض الجمعة، حديث: ۱۰۸۱. * العدوي متروك، رماه وكيع بالوضع، والوليد لين الحديث، وعلي بن زيد ضعيف.

اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: «وَلَا تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَجُلًا، وَلَا أَعْرَابِيٌّ مُهَاجِرًا، وَلَا فَاجِرٌ مُؤْمِنًا»، وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ.

ہے کہ ”کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی بدوی کسی مہاجر کی امامت کرائے اور نہ کوئی فاجر کسی مومن کا امام بنے۔“ (اس روایت کی سند کمزور ہے۔)

لغوی تشریح: اس روایت کی رو سے بدوی کا مہاجر کی امامت کرنا ممنوع ہے اور یہ ممانعت کراہت پر محمول ہے کیونکہ بدوی لوگ ابتدائے اسلام میں مہاجرین کے مقابلے میں قرآن کی تعلیم اور علم دین سے کم واقف تھے۔ [وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ] واہِ کے معنی ضعیف و کمزور کے ہیں' اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محمد عدوی ایسا ہے جسے وکیع نے وضع حدیث کے الزام سے متہم کیا ہے' اور عبداللہ بن محمد کا استاد علی بن زید بھی ضعیف ہے۔ یہ روایت اور سندوں سے بھی منقول ہے مگر ان میں ایک راوی عبدالملک بن حبیب ایسا ہے جسے احادیث کی چوری کرنے اور سندوں کو خلط ملط کرنے کے الزام سے متہم کیا گیا ہے۔

فائدہ: یہ روایت نہایت ہی کمزور سند سے منقول ہے' اس لیے اس سے مسائل کا استنباط کرنا درست نہیں۔

(٣٢٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «رُصُّوا صُفُوفَكُمْ، وَقَارِبُوا بَيْنَهَا، وَحَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[329] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ”اپنی صفوں کو مضبوطی سے ملاؤ اور ان کے درمیان فاصلہ نہ رکھو اور اپنی گردنوں کو آپس میں برابر رکھو۔“ (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رُصُّوا] ”را“ پر ضمہ اور ”صاد مہملہ“ پر تشدید ہے۔ رَصَّ الْجِدَارَ أَوِ الْبِنَاءَ سے صیغۂ امر ہے' یعنی دیوار یا عمارت کی ایک اینٹ کو دوسری کے ساتھ ملا کر یا جوڑ کر اس طرح مضبوط اور پختہ کیا جائے کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑی جائے' چنانچہ رَصُّ الصَّفِّ کا مطلب ہے کہ نمازی اپنی صفوں کو ایک دوسرے کے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے ملا کر اس طرح درست کریں کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ رہے۔ [وَقَارِبُوا بَيْنَهَا] اس طرح کہ دو صفوں کے درمیان ضرورت سے زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں۔ [وَحَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ] گردنوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھیں' بایں طور کہ سب نمازیوں کی گردنیں ایک ہی صف میں سیدھی معلوم ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نمازی کی گردن امام کی طرف نکلی ہوئی معلوم ہو اور کسی کی پیچھے نکلی ہوئی۔

فوائد و مسائل: اسلام میں صف بندی اور شیرازہ بندی کی بڑی تاکید اور اہمیت ہے۔ اس کی تربیت و ٹریننگ اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن' نماز میں صف بندی کے ذریعے سے دی گئی ہے۔ جہاد میں بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ کی جتنی ضرورت و اہمیت ہے اس کے بیان کرنے کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں' اشارہ ہی کافی ہے۔ صف بندی میں اگر رخنہ پڑ

٣٢٩ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب تسوية الصفوف، حديث: ٦٦٧، والنسائي، الإمامة، حديث: ٨١٥، وابن حبان(الإحسان): ٣/ ٢٩٨، حديث: ٢١٦٣، وابن خزيمة، حديث: ١٥٤٥.

جائے یا صفوں میں خلل واقع ہو جائے تو باہمی ربط وضبط اور محبت میں بھی خلل پڑ تا ہے۔ اسلام دلوں کو جوڑنا اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا' اسلامی برادری میں مساوات کے ذریعے سے ایک ہی صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرنا اور شیطانی دخل اندازی سے اسے بچانا اور محفوظ رکھنا چاہتا ہے' چنانچہ صحیحین میں روایت ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخ موڑ کر فرمایا: ''اپنی صفوں کو سیدھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں میں کجی و ٹیڑھ اور مخالفت ڈال دے گا۔'' راوی کا بیان ہے کہ پھر میں نے نمازیوں کو دیکھا کہ جماعت میں ایک آدمی اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے' اپنے ٹخنے کو اس کے ٹخنے کے ساتھ اور اپنے گھٹنے کو اس کے گھٹنے کے ساتھ ملا کر کھڑا ہوتا تھا۔ دیکھیے: (سنن أبي داود' الصلاة' باب تسوية الصفوف' حديث:٦٦٢) نبی ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: ''قسم ہے مجھے اس ذات اقدس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان بکری کے بچے کی صورت میں گھس جاتا ہے۔'' (سنن أبي داود' الصلاة' باب تسوية الصفوف'حديث:٦٦٧) یعنی وہ نمازیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے' خشوع وخضوع سے بیگانہ کر دیتا ہے اور توجہ الی اللہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستی کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔ الغرض نماز باجماعت کی صورت میں صف بندی کی بہت تاکید ہے۔ مل کر کھڑا ہونا چاہیے اور درمیان میں قطعاً جگہ نہیں چھوڑنی چاہیے۔

(٣٣٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[330] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مردوں کی بہترین (زیادہ خیر و بھلائی والی) صف' ان میں سے پہلی صف ہے اور بری (کم درجے والی) صف ان میں سے آخری ہے۔ اور خواتین کی بہترین صف ان میں سے آخری ہے اور بری صف ان میں سے پہلی ہے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوَّلُهَا] پہلی صف سے مراد وہ صف ہے جو امام سے متصل ہوتی ہے۔ اسے بہترین صف قرار دیا گیا ہے کیونکہ جو لوگ اس پہلی صف میں ہوتے ہیں وہ دوسرے نمازیوں کی بہ نسبت امام کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تلاوت قرآن وتکبیرات سنتے ہیں۔ خواتین سے دور رہنے کی وجہ سے خلل انداز ہونے والے وسوسوں اور برے خیالات سے بچے رہتے ہیں اور وہ نزول رحمت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کے بھی نزدیک ہوتے ہیں۔ [وَشَرُّهَا آخِرُهَا] جس میں خیر و بھلائی اور اجر وثواب کم ہوتا ہے' وہ صف ہے جو سب سے آخر میں ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو اس صف میں شامل ہوگا وہ گناہ گار ہوگا۔ آخری صف کو شر الصفوف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ پہلی صف میں شریک نمازی سے اس کا معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ اور خواتین کی آخری صف کو بہترین اور خیر و بھلائی والی صف قرار دیا گیا ہے برعکس مردوں کی صفوف کے کیونکہ خواتین کا آخری صف میں ہونا مردوں سے دور رہنے کا موجب ہے' نیز انھیں دیکھنے

٣٣٠_ أخرجه مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف، حديث: ٤٤٠.

اور ان کی گفتگو سننے سے دور رہتی ہیں۔

فائدہ: جماعت میں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں تفاوت اپنے اندر بھلائی اور بہتری کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلی صف میں شریک نمازی عموماً وہی ہوں گے جو مسجد میں پہلے آئے ہوں۔ مسجد میں پہلے آنا بھی باعث ثواب ہے' نیز پہلی صف میں شامل لوگ صاحب علم' بزرگ اور دینی فہم زیادہ رکھنے والے ہوں گے۔ مردوں کی سب سے پچھلی صف میں شریک نمازی ان سے محروم رہتے ہیں' اس لیے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ برائی اور بھلائی دونوں نسبتی معاملات ہیں۔ خواتین کی سب سے آخری صف اس لیے بہتر ہے کہ وہ عورتیں دیر سے مسجد میں آئیں گی۔ دوسرے مردوں سے دور ہوں گی کیونکہ مرد وزن کا اختلاط اچھے نتائج وثمرات برآمد نہیں کرتا۔ یہ حکم ایسی صورت کے لیے ہے جہاں مردوں اور عورتوں کی صفیں آگے پیچھے ہوں ورنہ اگر عورتیں الگ جگہ میں ہوں تو پھر ان کی بھی پہلی صف بہتر شمار ہوگی یا یہ صورت ہو کہ عورتوں کی جماعت الگ سے ہو اور ان کی امامت (پہلی صف کے درمیان میں کھڑے ہو کر) عورت ہی کر رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی خواتین کی پہلی صف بہترین اجر و ثواب کی مستحق ہوگی اور آخری کم ثواب کی۔

(٣٣١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ، فَأَخَذَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِرَأْسِي مِنْ وَّرَائِي، فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[331] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی۔ میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھنے والے دو ہی شخص ہوں تو مقتدی کو امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہیے اور اگر غلطی و نادانی سے مقتدی بائیں طرف کھڑا ہو جائے تو امام کھینچ کر (یا اشارے سے) اسے اپنے دائیں طرف کر لے۔ اتنے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ فعل بھی نماز ہی کے لیے کیا گیا ہے' نماز سے خارج کسی کام کے لیے نہیں۔ مقتدی کو بھی فوراً تعمیل کر کے بائیں سے دائیں جانب آ جانا چاہیے۔ ایسی تبدیلیٔ مکان سے نماز فاسد نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ نماز کی اصلاح و درستی کے لیے کی گئی ہو۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے۔ گویا دو کی تعداد جماعت کی تعریف میں آ جاتی ہے۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بھی جائز ہے۔

(٣٣٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَقُمْتُ أَنَا وَيَتِيمٌ

[332] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی تو میں اور ایک یتیم (لڑکا) دونوں

٣٣١ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب إذا قام الرجل عن يسار الإمام، حديث: ٦٩٨، ومسلم، صلاة المسافرين، باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه، حديث: ٧٦٣.

٣٣٢ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب المرأة وحدها تكون صفا، حديث: ٧٢٧، ومسلم، المساجد، باب جواز الجماعة في ◄◄

خَلْفَهُ، وَأُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ام سلیم رضی اللہ عنہا ہمارے پیچھے تنہا کھڑی ہوئیں۔ (بخاری و مسلم- الفاظ بخاری کے ہیں۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت جائز ہے' نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اگر اکیلی ہو تو وہ اکیلی ہی صف میں کھڑی ہوگی' مردوں یا بچوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی۔ مرد پہلے' بعد میں بچے اور آخر میں عورتوں کی صف ہونی چاہیے' البتہ ایک آدمی ہو تو بچے کو ساتھ کھڑا کر کے ایک ہی صف بنانی چاہیے۔ ② خیر و برکت کے حصول کے نقطۂ نظر سے گھر میں کسی نیک شخصیت کی امامت میں نماز نفل پڑھنا جائز ہے۔ ③ ام سلیم رضی اللہ عنہا راویٔ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ کی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ ④ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ عورت اپنے لخت جگر کے ساتھ بھی نماز ادا کرنے کے لیے ایک صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

(٣٣٣) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ أَنَّهُ انْتَهٰى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ، فَرَكَعَ قَبْلَ أَنْ يَّصِلَ إِلَى الصَّفِّ، ثُمَّ مَشٰى إِلَى الصَّفِّ وَذَكَرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: «**زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا، وَلَا تَعُدْ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ فِيهِ: فَرَكَعَ دُونَ الصَّفِّ، ثُمَّ مَشٰى إِلَى الصَّفِّ.

[333] حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ وہ نبی ﷺ کے پاس عین اس وقت پہنچے جبکہ آپ رکوع کی حالت میں تھے' چنانچہ انھوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا' پھر (رکوع کی حالت میں چلتے ہوئے) صف میں پہنچے' پھر (بعد میں) انھوں نے اس کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تیری حرص و طمع میں اضافہ فرمائے' آئندہ ایسا مت کرنا۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔) اس میں ابوداود نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا' پھر اسی حالت میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔

لغوی تشریح: [وَلَا تَعُدْ] بظاہر یہ عَوْد سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: آئندہ ایسا مت کرنا۔ بعض نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے جائز ہے کیونکہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز کا آغاز صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر نبی ﷺ نے ان کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد لَا تَعُدْ اس فعل کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اور رہا یہ معاملہ کہ آپ نے اسے نماز کے لوٹانے اور دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تو وہ اس لیے نہیں دیا کہ اس وقت وہ اس کا حکم نہیں جانتا تھا۔ اور کسی چیز کا علم نہ ہونا عذر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر بایں صورت نماز صحیح ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تنہا آدمی صف کے پیچھے

◀◀ النافلة، حديث: ٦٥٨.

٣٣٣ـ أخرجه البخاري، الأذان، باب إذا ركع دون الصف، حديث: ٧٨٣، وأبوداود، الصلاة، حديث: ٦٨٣، ٦٨٤ والحديث لا يدل على إدراك الركعة بإدراك الركوع كما حققه الإمام البخاري في جزء القراءة خلف الإمام.

نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس قسم کے معمولی سے فعل کو تو درگزر اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ اتفاقاً پہلی دفعہ دوڑ کر کوشش سے صف میں داخل ہونے کی نیت ہو۔ اگر فعل بدستور ہمیشہ چلا آ رہا ہو تو پھر اس کی بابت صحت یا فساد کا مستقل حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لاعلمی سے پہلی مرتبہ کسی کام کے صدور پر صحت کا حکم اس بات کو لازم نہیں کہ بعد ازاں مستقل طور پر اس پر صحت کا حکم لگا دیا جائے کہ بعد میں اگر عمداً بھی اس فعل کا صدور ہو تو وہ صحیح ہے، یعنی وہ کام صحت کی بنیاد اور دلیل نہیں بنتا۔ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی جیسا کہ آئندہ حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے امام کے ساتھ رکوع پا لیا اس نے رکعت پالی کیونکہ نبی ﷺ نے اسے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ نبیٔ اکرم ﷺ نے ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ اور جس کام سے منع کر دیا گیا ہو اس سے ایسا استدلال درست نہیں۔ طبرانی نے اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ مزید نقل کیے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: [صَلِّ مَا أَدْرَكْتَ، وَاقْضِ مَا سَبَقَكَ] ''جتنی نماز تو امام کے ساتھ پالے اسے پڑھ لے اور جو رہ گئی اسے پورا کر لے۔'' اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ رکعت شمار نہیں کی گئی۔

(٣٣٤) وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا يُصَلِّي خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الصَّلَاةَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[334] حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جو صف کے پیچھے تنہا کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اسے نماز لوٹانے کا حکم دیا۔ (اسے احمد، ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے حسن اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ طَلْقٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ: «**لَا صَلَاةَ لِمُنْفَرِدٍ خَلْفَ الصَّفِّ.**» وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ فِي حَدِيثِ وَابِصَةَ: «**أَلَا دَخَلْتَ مَعَهُمْ أَوِ اجْتَرَرْتَ رَجُلًا**»؟

اور ابن حبان میں طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔'' اور طبرانی نے وابصہ کی حدیث میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے: ''تو ان کے ساتھ ہی داخل کیوں نہ ہوا، یا پھر تو کسی نمازی کو (پہلی صف میں سے) پیچھے کھینچ لیتا۔''

لغوی تشریح: [أَلَا دَخَلْتَ] ہمزہ استفہام کا ہے اور ساتھ ہی حرف نفی لَا ہے، یا پھر ''ہمزہ'' پر فتحہ ہے اور ''لام'' پر تشدید ہے۔ اس صورت میں اسے حرف تحضیض قرار دیا جائے گا۔ ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے لیے استعمال ہونے والا

٣٣٤ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الرجل يصلي وحده خلف الصف، حديث: ٦٨٢، والترمذي، الصلاة، حديث: ٢٣٠، وأحمد: ٤/ ٢٢٨، وابن حبان (الموارد): ٢/ ١٠٤، ١٠٥، حديث: ٤٠٥ وحديث طلق أخرجه ابن حبان (الموارد): ٢/ ٩٨، حديث: ٤٠١، والزيادة في حديث وابصة أخرجها الطبراني في الكبير: ٢٢/ ١٤٥، ١٤٦، حديث: ٣٩٤ وسنده ضعيف جدًا، فيه السري بن إسماعيل وهو متروك.

حرف۔ [اِجْتَرَرْتَ رَجُلًا] (اگلی صف میں سے) ایک آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ احادیث صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دیتی ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ صف کے پیچھے منفرد (اکیلے) آدمی کی نماز درست ہے یا نہیں؟ امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہل علم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ دلیل اس کی یہی حدیث ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے ایسے آدمی کو دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نماز ہو جاتی ہے۔ اس آدمی کو تو آپ نے بطور تنبیہ نماز دوبارہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔ ② اس بارے میں صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگلی صف کو مکمل اور پورا کیا جائے، اگر پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو پچھلی صف میں اکیلے ہی پڑھ لی جائے کیونکہ درمیان میں سے آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں پہلی صف میں خلا پیدا ہو جائے گا جسے پر کرنے کے لیے نمازیوں کو حرکت کرنا پڑے گی اور ایک کنارے سے آدمی کو کھینچ کر لائے گا تو نماز کی حالت میں اتنا چلنا بہتر معلوم نہیں ہوتا' چنانچہ بہتر یہی ہے کہ وہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ ائمہ میں سے امام مالک' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ ③ طبرانی وغیرہ میں جو پہلی صف سے آدمی کھینچنے کا حکم ہے وہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ بہر حال صف کے پیچھے منفرد آدمی کی نماز اس وقت باطل ہوگی کہ جب وہ پہلی صف میں جگہ ہونے کے باوجود تنہا دوسری صف میں نماز پڑھے گا۔ پہلی صف مکمل ہونے اور اس میں جگہ نہ ہونے کی صورت میں تنہا آدمی کی دوسری صف میں نماز درست ہوگی۔ هذا ما عندي والله أعلم بالصواب.

راویٔ حدیث: [حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ] معبد میں "میم" کے نیچے کسرہ' "عین" ساکن اور "با" پر فتحہ ہے۔ ان کی کنیت ابوقرصافہ ہے۔ انصار کے قبیلۂ اسد بن خزیمہ سے تھے۔ قرصافہ میں "قاف" کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن ہے۔ ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ بعدازاں حیرہ کی طرف چلے گئے۔ ۹۰ ہجری کے قریب رقہ میں وفات پائی۔

(٣٣٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلَاةِ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةُ وَالْوَقَارُ، وَلَا تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[335] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب تم نماز کی اقامت سنو تو نماز کی طرف اطمینان وسکون اور وقار کے ساتھ چل کر آؤ' رفتار میں تیزی مت اختیار کرو۔ پھر جتنی نماز جماعت کے ساتھ پا لو اتنی پڑھ لو اور جو باقی رہ جائے اسے (بعد میں) پورا کر لو۔" (بخاری ومسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [اَلسَّكِينَةُ] یعنی حرکات میں سکون ہو اور عبث حرکات سے اجتناب ہو۔ [وَالْوَقَارُ] وقار کے معنی

٣٣٥۔ أخرجه البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة.....، حديث: ٦٣٦، ومسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار وسكينة، حديث: ٦٠٢.

سکینت کے قریب قریب ہیں اور یہ ہیئت کے متعلق ہے' مثلاً: اپنے دائیں بائیں التفات نہ کرنا اور نگاہیں پست رکھنا' دھیمی آواز سے گفتگو کرنا اور آہستہ روی اختیار کرنا۔

فائدہ: اس حدیث کی رو سے نمازی جب مسجد میں نماز باجماعت کے لیے آئے تو بڑے آرام وسکون اور وقار و عزت کے ساتھ آئے۔ دوڑتا ہوا نہ آئے۔ چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے۔ بولنے کی ضرورت ہو تو دھیمی اور پست آواز سے بولے۔ یوں اطمینان سے آنے کے بعد امام کو جس حالت میں پائے، نماز میں شریک ہو جائے اور باقی نماز کو بعد میں کھڑا ہو کر پورا کر لے۔ ایسی صورت میں مقتدی نے جو نماز امام کے ساتھ پڑھی وہ اس نمازی کی پہلی رکعتیں شمار ہوں گی یا پچھلی؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مقتدی کی پچھلی رکعتیں شمار ہوں گی جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی یہ پہلی رکعتیں شمار ہوں گی۔ یہی بات حدیث کے الفاظ فَأَتِمُّوا کے موافق ہے' نیز یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی یہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں؟ محتاط ترین اور قرین صواب بات یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوگی کیونکہ رکوع میں شامل ہونے کی صورت میں سورۂ فاتحہ اور قیام کی ادائیگی نہیں ہو پاتی' یہ دونوں رکن نماز ہیں۔ ان کے فقدان سے نماز کیسے ہوگی؟

(٣٣٦) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلَاةُ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهِ وَحْدَهُ، وَصَلَاتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهِ مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَانَ أَكْثَرُ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[336] حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی کا دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے سے زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اسی طرح جتنے افراد زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَزْكٰى] اس کے معنی ہیں: نہایت پاکیزہ اور بہت ہی اجر و ثواب کا موجب۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی کم از کم تعداد دو ہے۔ ایک امام اور دوسرا مقتدی (اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی وہ نماز اتنی ہی اللہ کے نزدیک محبوب ہوگی اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

(٣٣٧) وَعَنْ أُمِّ وَرَقَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[337] حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ

٣٣٦ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب في فضل صلاة الجماعة، حديث: ٥٥٤، والنسائي، الإمامة، حديث: ٨٤٤، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٤٢٩، وابن خزيمة، حديث: ١٤٧٧.

٣٣٧ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب إمامة النساء، حديث: ٥٩٢، وابن خزيمة: ٣/ ٨٩، حديث: ١٦٧٦، والبيهقي في الخلافيات ق ٤ ب.

عَنْهَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ .

نے اسے اپنے گھر والوں کی امامت کرانے کا حکم فرمایا تھا۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت فرائض امامت انجام دے سکتی ہے۔ کن کی امامت کرا سکتی ہے؟ اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ گھر کے افراد میں تو مرد بھی ہوتے ہوں گے' لہٰذا اس سے تو عورت کا مرد کی امام بننا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں کیونکہ مردوں پر فرض نماز کے لیے مسجد میں حاضری ضروری ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے' اس لیے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مرد نبی اکرم ﷺ کی اقتدا چھوڑ کر عورت کی اقتدا و امامت میں نماز پڑھتے ہوں' نیز ابوداود کی تفصیلی روایت کہ جس میں بوڑھے مؤذن کے اذان دینے کا ذکر ہے' اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ مؤذن بھی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا، لیکن یہ محض ایک احتمال ہی ہے' کسی بھی حدیث میں صراحتاً مؤذن کے نماز پڑھنے کا قطعاً ذکر نہیں ملتا، اس لیے غالب احتمال یہی ہے کہ مؤذن اذان دے کر نماز مسجد نبوی ہی میں پڑھتا ہوگا۔ واللّٰہ أعلم. علاوہ ازیں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں فاصلے والی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ مردوں کا عورتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے' نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ' یتیم اور ام سلیم رضی اللہ عنہا کو جب آپ نے جماعت کرائی تو ام سلیم اپنے بچوں کے ساتھ بھی کھڑی نہیں ہوئی۔ جب عورت اپنے لخت جگر کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تو امامت کیسے کرائے گی؟ عورت جماعت کی امامت کے وقت مرد امام کی طرح الگ صف میں تنہا کھڑی نہیں ہوگی بلکہ بقول امام شوکانی رحمہ اللہ عورتوں کے ساتھ ہی پہلی صف کے وسط میں کھڑی ہوگی۔ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما اسی طرح نماز پڑھاتی تھیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (المصنف لعبد الرزاق :۳/ ۱۴۱' والمصنف لابن أبي شيبة' الصلوات: ۱/ ۴۳۰' والمحلی لابن حزم: ۴/ ۲۲۰)

راویٔ حدیث: [ام ورقہ رضی اللہ عنہا] ام ورقہ بنت نوفل یا بنت عبداللہ بن حارث بن عویمر۔ انصار میں سے تھیں۔ قرآن کی حافظہ تھیں۔ آپ ﷺ سے غزوۂ بدر میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی مگر آپ نے ان کو اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو اپنے گھر ہی شہادت کا مرتبہ ملنے والا تھا۔ آپ ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو شہیدہ کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ ان کے دو غلام (غلام اور لونڈی) تھے جن کو انھوں نے مدبر بنایا تھا (کہ ان کی موت کے بعد وہ از خود آزاد ہو جائیں گے) مگر ان دونوں نے مل کر رات کے وقت ان کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر مار دیا اور خود راتوں رات فرار ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گرفتار کر کے دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلے آدمی تھے جن کو سولی دی گئی۔ یہ وہ خاتون تھیں جو نبی ﷺ کی اجازت سے اہل خانہ کی عورتوں کی امامت کراتی تھیں' اس لیے کہ ان کو قرآن مجید از بر تھا۔

(۳۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ ،

[338] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

۳۳۸۔ [صحیح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب إمامة الأعمى، حديث: ۵۹۵، وأحمد: ۳/ ۱۳۲، وحديث عائشة أخرجه ابن حبان(الإحسان): ۳/ ۲۸۷.

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِسْتَخْلَفَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ، يَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ أَعْمٰى. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ، وَنَحْوُهُ لِابْنِ حِبَّانَ عَنْ عَائِشَةَ.

ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا' وہ لوگوں کی امامت کراتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے۔ (اس روایت کو احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسی مفہوم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو اپنا نائب مقرر کرنا جائز ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ ② دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نابینے کی امامت درست اور جائز ہے۔ ③ تیسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا دوسروں کی بہ نسبت علم شریعت کا زیادہ عالم ہوسکتا ہے۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ افضل کی موجودگی میں دوسرا بھی نائب مقرر کیا جا سکتا ہے۔ ⑤ یہ نابینے صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تھے' ان کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں کئی دفعہ اپنا نائب مقرر فرمایا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامی امور وغیرہ کے لیے اپنا نائب مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں نماز کی امامت کے لیے مقرر فرمایا۔

(٣٣٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: **«صَلُّوا عَلٰى مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَصَلُّوا خَلْفَ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»**. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[339] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے [لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ] زبان سے کہا اس کی نماز جنازہ پڑھو اور جو [لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ] کہے اس کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔'' (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [صَلُّوا عَلٰی مَنْ ...... الخ] جس آدمی نے [لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ] کا اقرار کرلیا' خواہ وہ نیک ہو یا بد' اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ اور اسی طرح ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھ لو جس نے کلمۂ شہادت کہا۔ مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے اگرچہ کمزور اور ضعیف ہے (جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے بھی اسے سخت ضعیف کہا ہے۔) مگر بعض علماء کے نزدیک اس پر عمل کرنا قابل ترجیح ہے' اس لیے کہ اصول اور روایات اس بات کی صحت کی تائید کرتی ہیں کہ جس شخص کی نماز صحیح ہے' اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے' البتہ مستقل طور پر فاجر آدمی کو امام نہ بنایا جائے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ گار کلمہ گو آدمی کی نماز جنازہ درست ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے تو قائل ہیں مگر راہزن اور باغی کی نماز جنازہ کے قائل نہیں۔ ② علماء اور بزرگ لوگوں کو فاسق و فاجر اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ ③ نبی اکرم ﷺ نے ایک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی' البتہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''جاؤ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔''

٣٣٩۔ [ضعيف جدًا] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٥٦. * عثمان بن عبدالرحمن وخالد بن إسماعيل المخزومي مجروحان متروكان.

(٣٤٠) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ، وَالْإِمَامُ عَلٰى حَالٍ، فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[340] حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی حالت میں شامل ہو کر وہی کچھ کرے جو امام کرتا ہے۔'' (اسے ترمذی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ بعد میں شامل ہونے والا نمازی جس حالت میں امام کو پائے اسی حالت میں شامل ہو جائے۔ امام اگر رکوع میں ہے تو اسے بھی اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جانا چاہیے اور امام کو سجدے کی حالت میں پائے تو اس کو اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جانا چاہیے اور اگر امام بیٹھا ہو تو مسبوق کو بھی اسی حالت میں بیٹھ جانا چاہیے۔ جامع ترمذی کی یہ روایت گو سنداً ضعیف ہے مگر دیگر صحیح احادیث سے اس مسئلے کی تائید ہوتی ہے۔

١١ - بَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِ وَالْمَرِيضِ

باب:11-مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

(٣٤١) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ، فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ، وَأُتِمَّتْ صَلَاةُ الْحَضَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[341] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ابتدا میں (سفر و حضر کی) نماز دو دو رکعت فرض کی گئی تھی، پھر سفر کی نماز کو اسی حالت پر رکھا گیا اور حضر کی نماز (چار رکعتیں) مکمل کر دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: ثُمَّ هَاجَرَ، فَفُرِضَتْ أَرْبَعًا، وَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ عَلَى الْأَوَّلِ.

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ نے ہجرت کی تو نماز چار رکعت فرض کر دی گئی اور سفر کی نماز پہلی حالت پر برقرار رکھی گئی۔

وَزَادَ أَحْمَدُ: إِلَّا الْمَغْرِبَ، فَإِنَّهَا وِتْرُ النَّهَارِ، وَإِلَّا الصُّبْحَ، فَإِنَّهَا تُطَوَّلُ فِيهَا الْقِرَاءَةُ.

احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سوائے نماز مغرب کے کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور بجز صبح کی نماز کے کیونکہ اس نماز میں قراءت لمبی کی جاتی ہے۔

٣٤٠- [ضعيف] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما ذكر في الرجل يدرك الإمام وهو ساجد، حديث: ٥٩١. * سنده ضعيف من أجل حجاج بن أرطاة، وللحديث شواهد ضعيفة عند أبي داود، الصلاة، حديث: ٥٠٦ وغيره.

٣٤١- أخرجه البخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلوات في الإسراء، حديث: ٣٥٠، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين وقصرها، حديث: ٦٨٥، وحديث «ثم هاجر ....» أخرجه البخاري، حديث: ٣٩٣٥، وحديث «إلا المغرب فإنها وتر النهار» أخرجه أحمد: ٦/ ٢٤١، ٢٧٢ وهو حديث صحيح.

لغوی تشریح: [أَوَّلُ مَا فُرِضَتِ الصَّلَاةُ] حضر وسفر دونوں میں جو ابتداءً نماز فرض کی گئی۔ [رَكْعَتَانِ] دو دو رکعتیں مغرب کی نماز کے علاوہ۔ گرامر کے اعتبار سے أَوَّلُ مبتدا ہے اور رَكْعَتَانِ اس کی خبر ہے۔ اور ایک نسخہ میں رَكْعَتَيْنِ نصبی حالت میں ہے۔ اور اس کا منصوب ہونا درست ہے کیونکہ اس صورت میں یہ حال ہے اور خبر کے قائم مقام ہے۔ [فَأُقِرَّتْ] إِقْرَار سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو دو رکعت کی حالت پر برقرار رکھا گیا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔ [وَأُتِمَّتْ] یہ بھی صیغۂ مجہول ہے' یعنی مکمل کر دی گئی۔ [صَلَاةُ الْحَضَرِ] حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور وہ چار پوری ہو گئیں۔ اَلْحَضَر میں ''حا'' اور ''ضاد'' دونوں پر فتحہ ہے۔ سفر کے مقابلے میں حضر ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سفر میں قصر کرنا فرض ہے اور اسے پورا پڑھنا جائز نہیں' بعینہ جس طرح حضر میں چار رکعت پر اضافہ جائز نہیں۔ مدار استدلال لفظ فُرِضَتْ اور أُقِرَّتْ ہے جن کے بالترتیب معنی ہیں: فرض کی گئی' برقرار رکھی گئی۔ کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دو رکعتیں فرض ہیں ان میں رخصت نہیں' اور فرائض میں نہ کمی بیشی جائز ہے اور نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ فُرِضَتْ کا لفظ قُدِرَتْ کے معنی کا احتمال رکھتا ہے' اس صورت میں اس میں کوئی دلیل نہیں بنتی بلکہ یہ تو تعبیر کی انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے جو محض حضر و سفر کا فرق بیان کرنے کے لیے ہے' بغیر اس کے کہ اس میں کوئی اشارہ رخصت یا عزیمت کی طرف پایا جاتا ہو۔ ہمارے موقف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راویہ ہیں' انھوں نے سفر میں قصر نماز بھی پڑھی ہے اور پوری بھی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضر و سفر کی نماز دو دو رکعت فرض تھی' بعد میں سفر کی نماز کو اپنی حالت پر رکھا گیا' البتہ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ ② قرآن مجید میں نماز قصر کا جو بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز ہے' واجب نہیں۔ ③ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے جبکہ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ وغیرہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور اسے رخصت پر محمول کرتے ہیں اور یہی قول راجح ہے۔ ④ سنن دارقطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ دوران سفر میں نے پوری نماز پڑھی۔ آپ کو جب اس کی خبر دی تو آپ نے میری تحسین کی۔ (سنن الدارقطني: ۲/ ۱۸۸' و سنن الكبرى للبيهقي: ۳/ ۱۴۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اتباع میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر متاخرین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جو کہ صحیح موقف ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (زاد المعاد بتحقيق شعيب الأرنؤوط و عبدالقادر الأرنؤوط: ۱/ ۴۴۷۔ ۴۵۵)

(۳۴۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْصُرُ فِي السَّفَرِ وَيُتِمُّ، وَيَصُومُ وَيُفْطِرُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرُوَاتُهُ

[342] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ سفر میں (کبھی نماز) قصر پڑھتے اور (کبھی) پوری پڑھتے تھے اور (اسی طرح کبھی) روزہ رکھتے تھے اور (کبھی) چھوڑ بھی دیتے

۳۴۲۔ **[إسناده صحيح]** أخرجه الدارقطني: ۲/ ۱۸۹ وقال: "هذا إسناد صحيح" والعلة مردودة، والبيهقي: ۳/ ۱۴۳، وله شاهد صحيح عند النسائي في سننه الصغرى، وسنده صحيح.

ثِقَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ مَعْلُولٌ، وَالْمَحْفُوظُ عَنْ عَائِشَةَ مِنْ فِعْلِهَا، وَقَالَتْ: إِنَّهُ لَا يَشُقُّ عَلَيَّ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ.

تھے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر حدیث معلول ہے۔ اور محفوظ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود ایسا کرتی تھیں۔) اور انھوں نے فرمایا کہ ایسا کرنا مجھ پر گراں نہیں ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَقْصُرُ] قصر فرماتے، یعنی کبھی چار رکعتوں والی نماز دو رکعتیں ہی ادا فرماتے۔ قَصَرَ يَقْصُرُ، باب نَصَرَ يَنْصُرُ کے وزن پر ہے۔ [وَ يُتِمُّ] پوری نماز ادا فرماتے، یعنی کبھی چار رکعتیں پوری ادا فرماتے۔ [وَ يَصُومُ] سفر میں بھی کبھی روزہ رکھتے۔ [وَ يُفْطِرُ] اور کبھی روزہ چھوڑ بھی دیتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز قصر کرنا اور روزہ چھوڑ دینا مسافر کے لیے جائز ہے۔ اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سفر میں قصر و افطار پر عمل کرے چاہے نہ کرے، لیکن یہ مرفوع حدیث قابل استدلال نہیں کیونکہ اس میں علاء بن زہیر ایک راوی ہے جس کے بارے میں امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ثقات سے ایسی حدیثیں روایت کرتا تھا جو اثبات (قابل اعتماد) راویوں کی احادیث سے مشابہ نہیں ہوتی تھیں۔ اور یہ حدیث بھی اسی طرح کی ہے کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کے معارض ہے کہ آپ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ ہاں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوری نماز پڑھنا ثابت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی تھا کہ آپ سفر میں نماز قصر کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ کے فعل سے پوری نماز پڑھنا ثابت نہیں۔ واللہ أعلم.

(٣٤٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهُ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتٰى مَعْصِيَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَفِي رِوَايَةٍ: «كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى عَزَائِمُهُ».

[343] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جن کاموں میں اس نے رخصت عنایت فرمائی ہے، ان میں رخصت پر عمل کیا جائے، جس طرح اسے یہ ناپسند ہے کہ معصیت والے کاموں کو کیا جائے۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔) اور ایک روایت میں ہے: ''جیسے اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کے تاکیدی احکام (فرائض) کو ادا کیا جائے۔''

لغوی تشریح: [أَنْ تُؤْتٰى] گرامر کے لحاظ سے یہ مجہول واقع ہوا ہے۔ [رُخَصُهُ] یہ نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ''را'' پر ضمہ اور ''خا'' پر فتحہ کے ساتھ رُخْصَةٌ کی جمع ہے، یعنی جن امور میں رخصت کی گنجائش دی گئی ہے ان میں رخصت پر عمل کیا جائے۔ [عَزَائِمُهُ] عَزِيمَةٌ کی جمع ہے اور یہ رخصت کی ضد ہے۔ شارع نے شدت اور تکلیف کی وجہ سے یا کسی عذر کی بنا پر بعض واجبات کو چھوڑنے کی اجازت دی ہے اور بعض محرمات کو ضرورتاً مباح قرار دیا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ اور عزیمت، رخصت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔

٣٤٣۔ [حسن] أخرجه أحمد: ٢/ ١٠٨، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٥٤٥، وابن خزيمة: ٢/ ٧٣، حديث: ٩٥٠، ٢٠٢٧.

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ عمل کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ اگرچہ تعداد میں مکمل چار رکعتیں پڑھنے سے کم ہے مگر افضل یہی دو رکعتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنا اللہ کے ہاں اسی طرح محبوب ہے جیسے عزیمت پر عمل کرنا محبوب اور پسندیدہ ہے۔

(٣٤٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ مَسِيرَةَ ثَلَاثَةِ أَمْيَالٍ أَوْ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[344] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کی مسافت کے لیے سفر پر تشریف لے جاتے تو دو رکعتیں (نماز قصر) ادا فرماتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَمْيَالٍ أَوْ فَرَاسِخَ] اس حدیث کی سند کے ایک راوی شعبہ نے أَوْ بیان کر کے اپنے شک کا اظہار کیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف احوال بیان کرنا مقصود ہے۔ [أَمْيَال] مِیل کی جمع ہے۔ میل کی مقدار کیا ہے؟ کتنی ہے؟ اس بارے میں تین قول مشہور ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چھ ہزار ہاتھ جتنی مسافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چار ہزار ہاتھ جتنی مسافت مراد ہے۔ اور ان دونوں اقوال کے مطابق ایک ہاتھ کی لمبائی چوبیس انگشت ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ تین ہزار ہاتھ کے برابر مسافت مراد ہے۔ اور ہاتھ سے مراد ہے بتیس انگشت۔ دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ تقریباً ایک ہی مقدار بنتی ہے۔ فقط تعبیر کا فرق ہے۔ رہا ''فراسخ'' تو یہ فرسخ کی جمع ہے۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ یہ لفظ فارسی زبان کے فرسنگ سے معرب ہے۔ اور تین فرسخ ساڑھے چوبیس کلومیٹر کے مساوی ہوتے ہیں بشرطیکہ ہم ایک میل چھ ہزار ہاتھ کا مراد لیں' البتہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے تو پھر تین فرسخ کا فاصلہ پونے سترہ کلومیٹر کے مساوی بنتا ہے۔ یہ فاصلے کا تعین اندازاً ہے یقینی اور حتمی نہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نو میل کی مسافت سے سفر پر نکلنے کا عزم کیا ہو اس کے لیے قصر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ اس مسافت کے بارے میں' جس میں نماز قصر پڑھی جائے' بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ مسافت چار برد (اڑتالیس میل) ہے۔ اس کی دلیل آئندہ آئے گی۔ رہی یہ حدیث تو ہمارے زمانے کے علمائے اہلحدیث کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ نو میل' آج کل کے جدید نظام کے مطابق ۲۳' ۲۴ کلومیٹر' کی مسافت پر قصر کرنا جائز ہے۔

فوائد و مسائل: ① حدیث میں وارد الفاظ ''میل اور فرسخ'' کی وضاحت تو اوپر ہو چکی ہے کہ ان سے کیا مراد ہے اور نماز قصر کے لیے کتنی مسافت ہونی چاہیے' اس کا بھی مختصر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ قصر نماز کے لیے کوئی مسافت محدود و متعین نہیں ہے۔ مطلق سفر سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جب کوئی کسی مسافت کو سفر خیال کرے وہاں قصر نماز پڑھے۔ ② بلاشبہ قرآن مجید میں قصر کے لیے مطلقاً سفر کا ذکر ہے' جیسے سفر میں تیمم کے لیے سفر کی کوئی تعیین نہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین میل کا سفر بھی شرعی سفر شمار ہوتا ہے لیکن حدیث میں تین میل یا تین فرسخ کا ذکر ہے جس سے علماء نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ

٣٤٤۔ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين، حديث: ٦٩١.

یہاں تین فرسخ مراد لیے جائیں۔ اور تین فرسخ سے نو میل' جدید نظام کے مطابق ۲۳' ۲۴ کلو میٹر مسافت بنتی ہے' لہٰذا مذکورہ مسافت پر نماز قصر ادا کی جائے گی۔ ③ ظاہریہ نے تو تین میل تک مسافت کو نماز قصر کے لیے جائز قرار دیا ہے بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک میل پر بھی جائز ہے مگر ان کے پاس کوئی مضبوط عقلی و نقلی ثبوت نہیں ہے۔ اور بعض حضرات نے ۳۶ میل اور بعض نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل کی مسافت مقرر کی ہے۔ بہر حال یہ سب قیاسات پر مبنی ہیں' کسی کی تائید میں صحیح حدیث موجود نہیں۔ رہی چار برد والی روایت کہ چار برد (اڑتالیس میل) سے کم مسافت پر قصر جائز نہیں تو یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے' نیز اس کے ایک راوی عبدالوہاب بن مجاہد بن جبیر مکی کی روایت کو ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے بلکہ امام ثوری رحمہ اللہ نے تو اسے کذاب کہا ہے' اس لیے یہ استدلال کے لائق نہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے فاضل محقق نے بھی اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔

(٣٤٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلٰى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ، حَتّٰى رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[345] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' انھوں نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک کا سفر کیا' آپ مدینہ واپس آنے تک دو دو رکعتیں ہی ادا فرماتے رہے۔ (بخاری و مسلم- الفاظ بخاری کے ہیں۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آدمی اپنے گھر سے سفر کی نیت سے نکل پڑے تو وہ مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے۔ حدود شہر' یعنی موجودہ اصطلاح میں میونسپلٹی کی حدود سے نکلنے کے بعد' خواہ ایک میل کا سفر طے کیا ہو' نماز قصر ادا کرنا شروع کر سکتا ہے اور واپسی تک دوگانہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

(٣٤٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا يَقْصُرُ، وَفِي لَفْظٍ: بِمَكَّةَ، تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ: سَبْعَ عَشْرَةَ. وَفِي أُخْرٰى: خَمْسَ عَشْرَةَ.

[346] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ۱۹ روز قیام فرمایا (ان ایام میں) آپ قصر ہی ادا کرتے رہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے مکہ میں ۱۹ روز قیام فرمایا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔) اور ابوداود کی روایت میں ۱۷ روز کا ذکر ہے' اور ایک دوسری روایت میں ۱۵ روز کا۔

وَلَهُ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

اور ابوداود ہی میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی

٣٤٥۔ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب ما جاء في التقصير، حديث: ١٠٨١، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين، حديث: ٦٩٣.

٣٤٦۔ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب ما جاء في التقصير، حديث: ١٠٨٠، وأبوداود، صلاة السفر، حديث: ١٢٣٠ - ١٢٣٢، وحديث عمران أخرجه أبوداود، صلاة السفر، حديث: ١٢٢٩ وهو حديث حسن، وحديث جابر أخرجه أبوداود، صلاة السفر، حديث: ١٢٣٥ وهو حديث صحيح.

عَنْهُمَا : ثَمَانِيَ عَشْرَةَ. وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: أَقَامَ بِتَبُوكَ عِشْرِينَ يَوْماً يَقْصُرُ الصَّلَاةَ. وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي وَصْلِهِ.

ہے کہ آپ کی مدت قیام ۱۸ دن تھی۔ اور اسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپ نے تبوک میں بیس (۲۰) دن قیام فرمایا اور نماز قصر ادا کرتے رہے۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں' مگر اس کے موصول ہونے میں اختلاف ہے۔

فوائد و مسائل: ① مکہ میں مدت قیام کے بارے میں مختلف روایات منقول ہیں کہ نبی ﷺ وہاں ۱۹ روز یا ۱۸ روز یا ۱۷ روز یا ۱۵ روز قیام پذیر رہے۔ ان میں سے ہر مدت قیام کے حق میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی رائے ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اس سے زیادہ مدت ٹھہرنے کی نیت کرے تو نماز قصر نہیں کرے گا۔ ② یہ ذہن نشین رہے کہ مدت قیام میں اختلاف فتح مکہ کے موقع کا ہے' حجۃ الوداع کے موقع کا نہیں' کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ وہ تو صرف دس روز تھا۔ ③ ان روایات میں جمع و تطبیق کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ روز والی روایت دوسری روایات کے مقابلے میں صحیح ترین اور قوی ترین ہے۔ اس کی تائید اہل مغازی کا وہ بیان ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں بروز منگل صبح کو داخل ہوئے' وہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور حنین کی جانب بروز ہفتہ چھ شوال کو روانہ ہوئے۔ پس ان ایام کی تعداد دخول اور خروج کے ایام سمیت ۱۹ روز بنتی ہے اور ۱۸ روز والی روایت تو اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود یہ احتمال ہے کہ راوی کے ذہن میں راتوں کی تعداد ہو' دنوں کی تعداد نہ ہو کیونکہ آپ مکہ میں داخل بھی دن کو ہوئے تھے اور یہاں سے نکلے بھی دن کو تھے۔ یوں ۱۹ دن کی تعداد پوری ہوگئی اور راتوں کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ اس طرح ان دونوں روایتوں میں کوئی فرق اور تعارض باقی نہ رہا۔ اور اس تاویل کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ کی تعداد والی روایت میں لفظ لیل (شب) موجود ہے۔ اور سترہ یوم والی روایت کی صورت میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ غالباً راوی نے مکہ میں دخول اور خروج کے دونوں دن شمار نہیں کیے' لہٰذا انیس میں سے دو نکال دیں تو باقی سترہ ہی رہ جاتے ہیں۔ اور رہی پندرہ یوم والی روایت تو وہ روایت شاذ ہے اور ثقہ راویوں کی روایت کردہ روایات کے مخالف ہے' لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ راوی نے سترہ یوم والی روایت کو اصل قرار دے کر مکہ میں آپ کے داخل اور خارج ہونے کا دن نکال دیا ہو' اس طرح سترہ میں سے دو نکال دیے جائیں تو باقی پندرہ دن رہ جاتے ہیں۔ ④ ان روایات سے مدت قصر کے تعین پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان روایات میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اگر آپ اس مدت سے زیادہ قیام کرتے تو قصر چھوڑ دیتے اور پوری نماز پڑھتے بلکہ آپ سے تو تبوک کے مقام پر بیس دن کے قیام میں بھی قصر ثابت ہے۔ آپ نے قصر کو نہیں چھوڑا تھا۔ اور اس لیے کہ یہ سفر تو غزوہ اور لڑائی کا سفر تھا۔ محارب کو ہر لحہ ایسے مواقع پیش آ سکتے ہیں کہ اسے آگے بھی بڑھنا پڑے اور پیچھے بھی ہٹنا اور واپس ہونا پڑے۔ یہ صورت حال بذات خود نبی ﷺ کو بھی پیش آئی کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپ کو مجاہدین کا ایک چھوٹا سا دستہ عزّیٰ کے انہدام کے لیے روانہ کرنا پڑا اور اس دستے کی قیادت اور امارت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی' پھر معاً بعد دوسرا دستہ سواع بت کے انہدام کے لیے روانہ فرمایا' اس لشکر کی قیادت و امارت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی' پھر تیسرا دستہ مناۃ بت کے انہدام کے لیے روانہ فرمایا' اس کی امارت پر حضرت سعد بن زید رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور پھر چوتھا دستہ جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا' اس کی

قیادت بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ قبائل ثقیف و ہوازن کے اجتماع کی اطلاع ملی تو آپ نے خود آگے بڑھ کر ان کا سامنا کیا حتی کہ وادی حنین میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ پھر یہاں پر وہ معرکہ آرائی ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا جو مشہور و معروف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاہد و سپاہی اگر قیام کا ارادہ کرے، خواہ فتح یابی و کامرانی کے بعد ہی ہو اس کی نیت معتبر تسلیم نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی کیفیت تو اس مسافر کی سی ہوگی جو تذبذب و تردد میں مبتلا ہو کہ آج واپسی ہوتی ہے یا کل، پس ایسا متردد اور متذبذب مسافر ہمیشہ قصر نماز ہی ادا کرتا رہے گا، خواہ یہ کیفیت سالوں اور مہینوں پر محیط ہو، اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر قصر نماز ادا فرمانا، قصر نماز کی مدت متعین پر دلالت ہی نہیں کرتا۔⑤ اس بارے میں راجح مسلک وہی ہے جسے ائمۂ ثلاثہ: امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے کہ جو آدمی داخل اور خارج ہونے کے دونوں ایام کو چھوڑ کر صرف چار روز قیام کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ اور گرد و نواح میں دس دن گزارے تھے تو آپ ان ایام میں قصر نماز ادا فرماتے رہے۔ آپ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح داخل ہوئے اور مکہ سے آٹھ ذی الحجہ کے دن کے آغاز میں نکلے تھے۔ اس دوران میں آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے حتی کہ مناسک کی تکمیل فرمالی۔ اس اعتبار سے آپ کے قیام کی مدت صرف تین دن بنتی ہے، داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دو دن اس سے خارج ہیں۔ آپ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے حالت امن میں اس مدت سے زیادہ قیام فرمایا ہو اور آپ نے قصر نماز ادا کی ہو، یا اس سے کم مدت کا قیام فرمایا ہو اور قصر نماز ادا نہ فرمائی ہو، لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر ثابت ہوگیا اس پر اکتفا کیا جائے گا، اس پر اضافہ درست نہیں ہے۔⑥ مناسک حج کی تکمیل کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہاجرین کو مکہ میں تین دن سے زائد قیام کرنے سے منع فرمانا بھی اس کی دلیل ہے کہ مسافر اگر چار دن کا ارادہ کرے گا تو مقیم سمجھا جائے گا، نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت نافع رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہود کو حجاز سے جلاوطن کیا تو پھر ان میں جو تاجر کی حیثیت سے حجاز میں آنا چاہتا اسے بھی تین دن قیام کی اجازت دیتے۔ مصنف نے اسے اپنی کتاب التلخیص الحبیر میں نقل کر کے کہا ہے کہ اسے امام ابوزرعہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ۱۵، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ روز قصر نماز پڑھنے کا جو ذکر ہے، اس کی تطبیق اور روایات کے مابین جمع کی صورت اوپر مذکور ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے ہاں مدت قیام بھی مختلف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں تین دن اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ۱۵ دن۔ جب مسافر حالت تردد میں مبتلا ہو جائے اور واپسی کا حتمی فیصلہ نہ کر پائے تو ایسی صورت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اپنے اصحاب سمیت اور ایک قول کی رو سے امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایسا متردد و متذبذب مسافر تادم زیست یا واپسی تک قصر کر سکتا ہے، چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آذربائیجان میں چھ ماہ تک قصر نماز پڑھی اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نیشاپور کے مقام پر سال یا دو سال حالت تردد میں رہنا پڑا تو قصر ہی کرتے رہے۔ اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رامہرمز میں نو ماہ تک رکنا پڑا تو وہ قصر ہی کرتے رہے۔ ان واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ تردد اور تذبذب کی حالت میں قصر کی مدت مقرر نہیں ہے بلکہ جب تک ضرورت کا تقاضا ہو اتنی مدت تک قصر جائز ہے۔

(٣٤٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيغَ الشَّمْسُ، أَخَّرَ الظُّهْرَ إِلٰى وَقْتِ الْعَصْرِ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، فَإِنْ زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[347] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال آفتاب سے پہلے سفر کا آغاز فرماتے تو ظہر کی نماز کو عصر کے وقت تک موخر کر لیتے تھے' پھر سواری سے نیچے اترتے اور ظہر وعصر دونوں نمازوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ اور جب آفتاب' آغاز سفر سے پہلے زوال پذیر ہو جاتا تو پھر نماز ظہر ادا فرما کر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہوتے۔ (بخاری ومسلم)

وَفِي رِوَايَةِ الْحَاكِمِ فِي الْأَرْبَعِينَ بِالْإِسْنَادِ الصَّحِيحِ: صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ ثُمَّ رَكِبَ.

اور حاکم کی اربعین میں صحیح سند سے ہے کہ آپ نے ظہر و عصر کی نمازیں پڑھیں' پھر سواری پر سوار ہوئے۔

وَلِأَبِي نُعَيْمٍ فِي مُسْتَخْرَجِ مُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ فَزَالَتِ الشَّمْسُ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

اور ابونعیم کی ''مستخرج مسلم'' میں ہے کہ جب آپ سفر میں ہوتے اور آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو آپ ظہر اور عصر دونوں اکٹھی ادا فرما کر وہاں سے کوچ کرتے۔

لغوی تشریح: [اِرْتَحَلَ] سفر میں آرام اور استراحت کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ [تَزِيغَ الشَّمْسُ] آفتاب کا نصف النہار سے مغرب کی جانب زوال پذیر ہونا۔ [صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ] بظاہر تو ان الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف نماز ظہر ادا فرماتے تھے' عصر کی نماز کو اس کے ساتھ نہیں ملاتے تھے۔ لیکن اس روایت میں اس حکم سے سکوت کیا گیا ہے اور کچھ وضاحت نہیں ہوئی لیکن حاکم اور ابونعیم کی روایت میں صاف صاف ذکر ہے کہ آپ نے ظہر وعصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں اکٹھے پڑھا۔

فائدہ: اس حدیث کی رو سے سفر میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو جمع کر کے پڑھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جمع تقدیم ہو یا تاخیر دونوں طرح ثابت ہے۔ احناف جمع حقیقی کے قائل نہیں' جمع صوری کے قائل ہیں۔ مگر جامع ترمذی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمع صوری نہیں بلکہ جمع حقیقی تھی' چنانچہ اس کا مفہوم ہے کہ جب آفتاب زوال پذیر ہونے سے پہلے آپ سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز فرماتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ (جامع الترمذي' الجمعة' حديث:٥٥٣) امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ اور مستخرج ابونعیم کی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے مصنف رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی بات راجح ہے۔ واللّٰه أعلم.

٣٤٧ـ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب يؤخر الظهر إلى العصر إذا ارتحل قبل أن تزيغ الشمس، حديث: ١١١١، ومسلم، صلاة المسافرين، باب جواز الجمع بين الصلاتين في السفر، حديث: ٧٠٤، وأبو نعيم في المستخرج: ٢/ ٢٩٤.

(٣٤٨) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[348] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے تو آپ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

(٣٤٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لَا تَقْصُرُوا الصَّلَاةَ فِي أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ بُرُدٍ، مِنْ مَكَّةَ إِلٰى عُسْفَانَ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ، كَذَا أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[349] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چار بُرُد سے کم فاصلے پر نماز قصر نہ کرو' چار بُرُد مکے سے عسفان تک فاصلہ ہے۔'' (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اسے ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بُرُدٍ] ''باء'' اور ''راء'' دونوں پر ضمہ ہے۔ برید کی جمع ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے' لہٰذا چار برد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ [عُسْفَانَ] ''عین'' پر ضمہ کے ساتھ ہے' بروزن عثمان۔ یہ بہت بڑا قصبہ ہے اور مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جس آدمی نے استدلال کیا کہ چار برد سے کم فاصلے پر نماز قصر جائز نہیں اس نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی عبدالوہاب بن مجاہد متروک الحدیث ہے۔ اور امام ثوری رحمہ اللہ نے تو اسے کذب کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور ازدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کا اپنے باپ سے سماع ہی ثابت نہیں' لہٰذا یہ حدیث منقطع' ضعیف ہے اور اس صحیح حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جس میں اس سے کم مسافت پر قصر کرنے کا جواز ملتا ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود مکہ اور طائف کے مابین جتنے فاصلے پر قصر کرتے تھے' نیز مکہ و عسفان اور مکہ و جدہ کے مابین جتنا فاصلہ ہے اس پر بھی قصر کرتے تھے۔'' (الموطأ: ١/١٤٨) اسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں نقل کیا ہے مگر اس موقوف روایت سے فاصلے کی تعیین نہیں ہوتی۔

(٣٥٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**خَيْرُ أُمَّتِي الَّذِينَ إِذَا أَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوا، وَإِذَا سَافَرُوا قَصَرُوا وَأَفْطَرُوا**». أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ

[350] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں کہ جب ان سے برائی سرزد ہو جاتی ہے تو بخشش طلب کرتے ہیں اور جب سفر پر ہوتے ہیں تو نماز قصر کا اہتمام کرتے ہیں اور

٣٤٨ـ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، حديث: ٧٠٦.

٣٤٩ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الدارقطني: ١/ ٣٨٧. * فيه عبدالوهاب بن مجاهد وهو متروك متهم، وقول ابن عباس على غير لفظ الكتاب فليتنبه.

٣٥٠ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الطبراني في الأوسط: ٧/ ٢٨٦، حديث: ٦٥٥٤. * ابن لهيعة وأبوالزبير مدلسان وعنعنا.

ضَعِيفٍ، وَهُوَ فِي مَرَاسِيلِ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ مُخْتَصَرًا.

روزہ نہیں رکھتے۔'' (اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ اپنی اوسط میں روایت کیا ہے۔ اور یہ بیہقی کے ہاں سعید بن مسیّب کی مراسیل میں سے ہے جسے بیہقی نے مختصر بیان کیا ہے۔)

راویٔ حدیث: [حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ] کبار تابعین کے سردار تھے۔ علم کے اعتبار سے ان سب سے وسیع علم رکھتے تھے۔ یہ فقہ' حدیث' زہد' عبادت اور تقویٰ و ورع کے جامع تھے' یعنی جامع العلوم شخصیت تھے۔ ان کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال گزرنے کے بعد ہوئی تھی اور ۹۰ ہجری کے بعد فوت ہوئے جب کہ ان کی عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ ''مسیّب'' میں ''یا'' مشدد ہے اور اس پر فتحہ ہے لیکن اسے مکسور بھی پڑھا گیا ہے۔

(٣٥١) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَتْ بِي بَوَاسِيرُ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الصَّلَاةِ، فَقَالَ: «صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[351] حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ میں نے نبی ﷺ سے نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو' اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو پھر بیٹھ کر پڑھو' اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَوَاسِيرُ] یہ بہت خطرناک مرض ہے۔ مقعد کے امراض سے تعلق رکھتا ہے۔ مقعد کی رگوں کا پھیل جانا اس کا سبب ہے اور بسا اوقات اس میں سے خون بہتا ہے۔ بواسیر جمع ہے' اس کا واحد باسور ہے۔

فائدہ: بیٹھنے کی صورت بعض کے نزدیک چار زانو ہے اور بعض کے نزدیک تشہد کی سی صورت۔ دراصل بات یہ ہے کہ مریض جس طرح آسانی سے بیٹھ سکتا ہو اسی طرح بیٹھے' اسے ہر طرح اجازت ہے۔ چت لیٹ کر پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کسی حالت اور کسی پہلو پر بھی ممکن نہ ہو تو پھر جو صورت اختیار کر سکتا ہو کر لے۔ (یہ حدیث باب صفة الصلاة کے آخر میں نمبر ۲۶۰ کے تحت گزر چکی ہے۔)

(٣٥٢) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: عَادَ النَّبِيُّ ﷺ مَرِيضًا، فَرَآهُ يُصَلِّي عَلٰى وِسَادَةٍ فَرَمٰى بِهَا، وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الْأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَأَوْمِ إِيمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ،

[352] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مریض کی عیادت فرمائی تو دیکھا کہ وہ تکیے پر نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ نے وہ تکیہ دور پھینک دیا اور فرمایا: ''زمین پر نماز پڑھ' اگر تیرے بس میں ہے ورنہ اشارے سے پڑھ لے۔ ہاں' اپنے سجدوں کے لیے رکوع کی بہ نسبت ذرا زیادہ

٣٥١ـ أخرجه البخاري، تقصير الصلاة، باب إذا لم يطق قاعدًا صلى على جنب، حديث: ١١١٧.

٣٥٢ـ [إسناده ضعيف] تقدم ٢٦١.

وَصَحَّحَ أَبُوحَاتِمٍ وَقْفَهُ.

جھک۔" (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَادَ] عیادت سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے ہیں کسی مریض سے ملاقات کرنے یا دریافت احوال کو۔ [وِسَادَةٍ] یعنی تکیہ جسے سونے والا اپنے سر کے نیچے رکھتا ہے۔ (یہی حدیث اس سے پہلے باب صفة الصلاة کے آخر میں نمبر ۲۶۰ کے تحت گزر چکی ہے۔)

(٣٥٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي مُتَرَبِّعًا. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[353] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو (چارزانو ہو کر) نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُتَرَبِّعًا] تَرَبُّع سے ماخوذ ہے۔ یہ بیٹھنے کی ایک قسم ہے، وہ اس طرح کہ اپنا دایاں پاؤں اپنی بائیں ران کے نیچے اور اپنا بایاں پاؤں اپنی دائیں ران کے نیچے کر کے مقعد پر بیٹھنا۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے لیکن عذر کی بنا پر چوکڑی مار کر نماز ادا کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

١٢ - بَابُ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ

باب:12-نماز جمعہ کا بیان

(٣٥٤) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ، أَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ عَلٰى أَعْوَادِ مِنْبَرِهِ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ، ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[354] حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے منبر پر یہ فرماتے سنا ہے: "لوگ نماز جمعہ چھوڑنے سے ضرور باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلین میں سے ہو جائیں گے۔" (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ] جمعہ میں "جیم" اور "میم" دونوں پر ضمہ ہے۔ "میم" پر فتحہ اور جزم بھی جائز ہے۔ [أَعْوَادِ] عُود کی جمع ہے جس کے معنی لکڑی کے ہیں، یعنی منبر کی سیڑھیاں، یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اس منبر پر تشریف فرما تھے جو لکڑی سے بنا ہوا تھا، یعنی نہ آپ مٹی سے بنے ہوئے منبر پر تھے اور نہ کھجور کے اس تنے کے پاس

٣٥٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه النسائي، قيام الليل، باب كيف صلاة القاعد، حديث: ١٦٦٢، والحاكم: ١/ ٢٥٨. ※ حفص بن غياث عنعن، وحديث البخاري يخالفه، ولو صح لكان محمولاً على العذر.

٣٥٤ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب التغليظ في ترك الجمعة، حديث: ٨٦٥.

تھے جس کے ساتھ ٹیک لگاتے تھے۔ یہ منبر ۷ یا ۸ ہجری میں ایک انصاری خاتون کے میمون نامی غلام نے تیار کیا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں' پھر بعد میں مروان نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں پہلے منبر کے نچلے حصے میں چھ سیڑھیاں مزید بنا دیں۔ یہ منبر ۶۵۴ ہجری تک باقی رہا اور مسجد نبوی جب ۶۵۴ ہجری میں آگ لگنے سے جل گئی تو یہ منبر رسول بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آ کر خاکستر ہوگیا۔ (سبل السلام) [عَنْ وَدْعِهِمُ] ''واؤ'' پر فتحہ اور ''دال'' ساکن ہے' یہ مصدر ہے اور فاعل کی طرف مضاف ہے۔ [اَلْجُمُعَاتِ] اس مصدر کا مفعول ہے' یعنی ان لوگوں کے جمعہ کو چھوڑنے کی وجہ سے۔ [أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ] اللہ تعالیٰ لازماً مہر لگا دے گا۔ [عَلٰى قُلُوبِهِمْ] ان کے دلوں پر' بایں طور کہ دلوں پر زنگ چڑھا دے گا تو یہ لوگ جمعے کے لطف اور اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے دلوں میں سختی اور سنگ دلی پیدا فرما دے گا۔ [ثُمَّ لَيَكُونُنَّ] پہلے نون پر ضمہ اور دوسرے پر تشدید ہے۔ یہ جمع کا صیغہ ہے اور اس میں نون ثقیلہ برائے تاکید ہے' یعنی: پھر وہ ضرور ہو جائیں گے۔

فوائد و مسائل: ① جمعہ کے لغوی معنی ایک جگہ جمع ہونے کے ہیں' اس دن کو دور جاہلیت میں ''عروبہ'' کہتے تھے۔ اسلام نے اس کا نام جمعہ رکھا کہ مسلمان ایک مخصوص دن میں مخصوص اوقات میں عبادت الٰہی کے لیے مجتمع ہوں اور مل کر سب اکٹھے عبادت کریں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر بھی ہوں اور اجتماعی فیصلے بھی کیے جا سکیں۔ ② اس حدیث سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے' اسے کسی عذر شرعی کے بغیر ترک کرنے کی وجہ سے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور آدمی دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے' اور پھر آخر کار منافقین و غافلین کے زمرے میں شامل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا نماز جمعہ کو معمولی سمجھ کر اس بارے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرنا رسوائی اور خذلان کا موجب ہے اور توفیق الٰہی سے محروم رہنے کا باعث بھی۔

(٣٥٥) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، ثُمَّ نَنْصَرِفُ وَلَيْسَ لِلْحِيطَانِ ظِلٌّ نَسْتَظِلُّ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[355] حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے' پھر جب ہم جمعے سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو جاتے تو اس وقت دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس میں بیٹھ کر آرام کر لیں (یا اس سائے میں چل کر گھر پہنچ جائیں۔) (بخاری و مسلم- الفاظ بخاری کے ہیں۔)

وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: كُنَّا نُجَمِّعُ مَعَهُ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ نَرْجِعُ، نَتَتَبَّعُ الْفَيْءَ.

اور مسلم میں ہے کہ ہم آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے جب زوال ہو جاتا' پھر ہم واپس ہوتے تو بڑی جستجو سے سایہ تلاش کرتے۔

٣٥٥ـ أخرجه البخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية، حديث: ٤١٦٨، ومسلم، الجمعة، باب صلاة الجمعة حين تزول الشمس، حديث: ٨٦٠.

لغوی تشریح: [حِيطَان] حَائِط کی جمع ہے جو دیوار کے معنی میں ہے۔ [ظِلٌّ نَسْتَظِلُّ بِهِ] دیواروں کا اپنا سایہ اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس میں قدرے آرام کر سکیں۔ اس حدیث سے سائے کی کلی طور پر نفی مراد نہیں ہے، چنانچہ اس حدیث سے قبل از زوال آفتاب نماز جمعہ ادا کرنے کا استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ ہاں، جمعہ کو جلدی ادا کرنے کی دلیل ضرور ہے کہ جونہی زوال آفتاب ہو جمعے کی نماز ادا کر لی جائے۔ [كُنَّا نُجَمِّعُ] تجميع سے ماخوذ ہے، ہم نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ [نَتَتَبَّعُ] جستجو کر کے تلاش کرتے تھے۔ [اَلْفَيْءَ] "سایہ"

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ بہت جلد ادا کی جاتی تھی۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے بہرحال نہیں ہوتی تھی۔ اس کا وقت بھی نماز ظہر کا وقت ہے۔ علمائے اسلام کی اکثریت اسی طرف گئی ہے، البتہ امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے بھی ہو جاتا ہے، نیز امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خطبۂ جمعہ تو زوال سے پہلے جائز ہے مگر نماز درست نہیں، وہ زوال آفتاب کے بعد ہی ہے۔ آج کل جمعے کی نماز ظہر کی نماز سے بھی زیادہ دیر سے پڑھتے ہیں جو سراسر نبی ﷺ کے عمل کے مخالف ہے۔ خطباء و ائمۂ مساجد کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ] ابومسلم ان کی کنیت ہے۔ نام سلمہ بن عمرو بن اکوع ہے۔ اور اکوع کا نام سنان بن عبداللہ اسلمی مدنی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے نہایت بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے تیز رفتار تھے کہ دوڑنے میں گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بہت سخی، فاضل اور بھلائی کا مجسمہ تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ ہجری میں وفات پائی۔

(٣٥٦) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلَا نَتَغَدّٰى إِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ.

[356] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (جمعے کے روز) ہم قیلولے (دوپہر کا آرام) اور کھانے کا اہتمام نماز جمعہ کے بعد کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم- الفاظ مسلم کے ہیں۔) اور ایک روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہم ایسا کرتے تھے۔

لغوی تشریح: [نَقِيلُ] قَيْلُولَه سے ماخوذ ہے۔ باب ضَرَبَ يَضْرِبُ ہے۔ قیلولہ دوپہر کے وقت ذرا سستانے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں، خواہ نیند نہ آئے۔ [نَتَغَدّٰى] "غین" معجمہ اور "دال" مہملہ کے ساتھ، غداء سے ماخوذ ہے۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نصف النہار سے قبل نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے، مگر اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ قیلولہ اور غداء کا اطلاق زوال کے بعد پر مجازاً کیا گیا ہے۔ اور مدینہ و مکہ میں قیلولہ اور دوپہر کا کھانا نماز ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا جیسا کہ ارشاد باری سے ثابت ہوتا ہے:

٣٥٦ـ أخرجه البخاري، الجمعة، باب قول الله تعالى: فإذا قضيت الصلاة فانتشروا، حديث: ٩٣٩، ومسلم، الجمعة، باب صلاة الجمعة حين تزول الشمس، حديث: ٨٥٩.

﴿وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيرَةِ﴾ (النور: ۲۴:۵۸) ”اور جب تم دوپہر کو (آرام کے لیے) اپنے کپڑے اتار دیتے ہو۔“ (سبل السلام)

فائدہ: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت مآب میں نماز جمعہ جلدی ادا کی جاتی تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نماز جمعہ کے بعد گھر واپس جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے' پھر دوپہر کا آرام (قیلولہ) کرتے تھے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوالعباس ہے۔ خزرجی ساعدی انصاری ہیں۔ ان کا اسم گرامی حزن تھا۔ اسلام لانے کے بعد نبی ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے سہل رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ نام اچھا نہ ہو تو اسے بدل دینا چاہیے۔ جب نبی ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت حضرت سہل رضی اللہ عنہ پندرہ برس کے تھے۔ سو سال کے قریب عمر پا کر ۹۱ ہجری میں مدینہ میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہی صحابی تھے۔ ان سے تقریباً ایک سو احادیث مروی ہیں۔

(۳۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِمًا، فَجَاءَتْ عِيرٌ مِنَ الشَّامِ، فَانْفَتَلَ النَّاسُ إِلَيْهَا، حَتّٰى لَمْ يَبْقَ إِلَّا اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[357] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ کھڑے ہوئے جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ شام سے ایک تجارتی قافلہ آ گیا۔ سب لوگ جلدی سے اس قافلے کی طرف کھسک گئے اور صرف بارہ آدمی (خطبہ سننے کے لیے) باقی رہ گئے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عِيرٌ] ”عین“ کے نیچے کسرہ اور ”یا“ ساکن ہے۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹ۔ مراد اس جگہ تجارتی قافلہ ہے۔ [فَانْفَتَلَ] جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگ گئے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبۂ جمعہ کھڑے ہو کر دیا کرتے تھے۔ مسنون یہی ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا۔ نماز کے بعد نہیں' نیز ثابت ہوا کہ بارہ افراد بھی ہوں تو جمعہ درست ہے۔ شوافع نے جو چالیس کی تعداد کو ضروری قرار دیا ہے' وہ صحیح نہیں۔

(۳۵۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنْ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا فَلْيُضِفْ إِلَيْهَا أُخْرٰى، وَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُهُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ

[358] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی نے نماز جمعہ یا کسی دوسری نماز کی ایک رکعت (جماعت کے ساتھ) پا لی تو وہ دوسری رکعت (بقیہ نماز) اس کے ساتھ ملا لے۔ اور اس کی نماز پوری ہو جائے گی۔“ (اسے نسائی' ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ

۳۵۷۔ أخرجه مسلم، الجمعة، باب في قوله تعالى: ﴿وإذا رأوا تجارة أو لهوًا انفضوا اليها﴾، حديث: ۸۶۳.

۳۵۸۔ [صحيح] أخرجه النسائي، المواقيت، باب من أدرك ركعة من الصلاة، حديث: ۵۵۸، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ۱۱۲۳، والدارقطني: ۲/ ۱۲.

صَحِيحٌ ، لٰكِنْ قَوّٰى أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ .

الفاظ دارقطنی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو قوی قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَلْيُضِفْ] إِضَافَة سے ماخوذ ہے۔ ''لام'' اس میں امر کا ہے۔ مطلب ہے کہ ساتھ ملا لے۔ [أُخْرٰى] دوسری رکعت۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جمعے کی ایک رکعت پا لینے والا دوسری رکعت ساتھ ملا کر مکمل کر لے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک ہی رکعت پا سکا اس کا خطبۂ جمعہ تو فوت ہو گیا، مگر اس کا جمعہ صحیح ہو گا۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ ؒ دونوں کی یہی رائے ہے۔ خطبۂ جمعہ میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ ② مصنف ؒ نے گو یہاں اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے مگر التلخیص میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن [مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ] کی صحت میں تو کسی کو کلام نہیں۔ اس کے عموم میں جمعہ بھی شامل ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ایک رکعت سے کم ملے تو اس کی جمعے کی نماز نہیں ہوتی، تب اسے ظہر کی نماز چار رکعت پڑھنی چاہیے۔

(٣٥٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِمًا، يَجْلِسُ ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا، فَمَنْ أَنْبَأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِسًا فَقَدْ كَذَبَ . أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

[359] حضرت جابر بن سمرہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کھڑے ہو کر خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے، (پھر درمیان میں تھوڑا سا) بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہو کر خطاب فرماتے، چنانچہ جس کسی نے تمھیں یہ اطلاع دی کہ آپ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے تو اس نے بالکل جھوٹ بولا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَنْبَأَكَ] اَلْإِنْبَاء (باب افعال) سے ماضی کا صیغہ ہے، یعنی جو تمھیں خبر دے، اطلاع دے۔

فوائد و مسائل: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ① جمعہ کے دو خطبے ہیں۔ ② دونوں کے درمیان بیٹھنا مسنون ہے۔ ③ آپ دونوں خطبے کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ ④ شرعی عذر کے بغیر ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی اگر مسنون سمجھ کر کی جائے تو بدعت ہو گی۔ ⑤ ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ نبی ﷺ، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی ؓ سب کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ ⑥ بعض احادیث سے آپ کا منبر پر چڑھ کر مقتدیوں کی طرف رخ کر کے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنا بھی ثابت ہے۔ (سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات والسنة فيها، حديث:١١٠٩، وشرح السنة بتحقيق زهير الشاويش و شعيب الأرنؤوط: ٢٤٢/٤، ٢٤٣، والأجوبة النافعة، ص : ٥٨)

(٣٦٠) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا

[360] حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کی آنکھیں

٣٥٩ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة، حديث: ٨٦٢ .

٣٦٠ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: ٨٦٧، والنسائي، صلاة العيدين، حديث: ١٥٧٩ .

خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ، وَعَلَا صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتَّى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُولُ: «صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ»، وَيَقُولُ: «أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

سرخ ہو جاتیں' آواز بلند ہو جاتی اور غصہ سخت ہو جاتا حتی کہ آپ کی کیفیت اس طرح ہو جاتی جیسے کسی لشکر (کے حملے) سے ڈرا رہے ہیں کہ ''دشمن کا لشکر صبح کو پہنچا یا شام کو پہنچا'' اور فرماتے: ''حمد و صلاۃ کے بعد' بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے۔ (کاموں میں سے) بدترین کام' نئے کام ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: كَانَتْ خُطْبَةُ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: يَحْمَدُ اللهَ، وَيُثْنِي عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِثْرِ ذٰلِكَ، وَقَدْ عَلَا صَوْتُهُ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے: جمعے کے روز نبی ﷺ کا خطبہ (یوں) ہوتا تھا کہ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے' پھر اس کے بعد (خطبہ) ارشاد فرماتے اور آپ کی آواز بلند ہو جاتی۔

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ».

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں یہ ہے: ''جسے اللہ راہ ہدایت پر گامزن فرما دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔'' اور نسائی میں ہے: ''اور ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے۔''

لغوی تشریح: [کَأَنَّهُ مُنْذِرٌ] یعنی اس شخص کی طرح جو اپنی قوم کو اس لشکر عظیم سے ڈراتا ہے جو حملہ آور ہونے والا ہو۔ [یَقُولُ] وہ ڈرانے اور متنبہ کرنے والا اس قوم سے مخاطب ہو کر کہے۔ [صَبَّحَکُمْ] یہ باب تفعیل سے ہے' یعنی دشمن صبح سویرے تم پر یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ [مَسَّاکُمْ] یہ بھی باب تفعیل سے ہے' یعنی دشمن شام کے وقت تم پر حملہ آور ہو۔ دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ بالکل قریب ہے کہ دشمن تم پر ٹوٹ پڑے۔ [اَلْھَدْيُ] ''ہا'' پر فتحہ اور ''دال'' ساکن ہے۔ راستہ' سیرت اور طریق کار کے معنی میں ہے۔ [مُحْدَثَاتُھَا] نئی نئی چیزیں' بدعتیں جن کا ثبوت نہ کلام الٰہی میں ہو اور نہ سنت نبوی میں۔ [یُثْنِي عَلَیْهِ] أَثْنٰی یُثْنِي' باب افعال ہے اور ثناء سے ماخوذ ہے۔ ''یا'' پر ضمہ اور ''نون'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی اچھے اوصاف و اعمال پر تعریف کرنا۔ [ثُمَّ یَقُولُ عَلٰی إِثْرِ ذٰلِكَ] یعنی اس کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے [أَثَر] ''ہمزہ'' اور ''ثا'' دونوں پر فتحہ ہے اور ''ہمزہ'' کے نیچے کسرہ اور ''ثا'' پر سکون بھی آ سکتا ہے۔ [مَنْ یَّھْدِ اللّٰهُ ...... الخ] یہ جملہ آپ حمد کے بعد اور شہادت سے پہلے ادا فرماتے۔ [وَ کُلُّ ضَلَالَةٍ] کو [کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ] کے بعد کہتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بدعت کو دو قسموں: بدعت سیئہ اور بدعت حسنہ میں تقسیم کرنا درست نہیں بلکہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے' خواہ وہ سطحی عقل و خرد کے مالک حضرات کے نزدیک حسنہ ہی ہو کیونکہ اس کی بنیاد دراصل اللہ اور اس کے

رسول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو شارع بنانا ہے۔ اور یہ تو کھلی گمراہی و بدراہی ہے۔ اور جو حسنہ (نیکی و بھلائی) ہے کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ بدعت ہو؟ اور جو بدعت ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ حسنہ (نیکی و بھلائی) ہو؟

فائدہ: یہ وہ خطبۂ مسنونہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ثابت ہے۔ خطبے کے دوران میں خطیب پر مختلف حالتیں وارد ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کسی وقت چہرے پر ایسے آثار نمایاں ہوتے ہیں جس سے سامعین کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خطبے میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد وثنا ہونی چاہیے۔ خطبہ مختصر مگر جامع ہو۔ خطبے میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سامعین اس سے متاثر بھی ہوں اور محظوظ بھی' لیکن تکلف سے اجتناب کرنا چاہیے۔ خطبے کو طول دینے سے بھی احتراز کرنا چاہیے' اس لیے کہ مختصر مگر جامع خطبہ سامعین کی سمع خراشی کا موجب نہیں بنتا بلکہ اسے یاد رکھنا سہل اور آسان ہوتا ہے اور اپنا بہترین اثر چھوڑتا ہے۔

(٣٦١) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[361] حضرت عمار بن یاسر ؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبے کا مختصر ہونا اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قِصَرَ] ''قاف'' کے نیچے کسرہ اور 'صاد' پر فتحہ ہے' مختصر کے معنی میں ہے۔ [مَئِنَّةٌ] ''میم'' پر فتحہ ''ہمزہ'' کے نیچے کسرہ اور ''نون'' پر فتحہ اور تشدید ہے' یعنی علامت' نشانی۔ یہ اس خطیب کے فقیہ و دانا ہونے کی علامت و نشانی ہے۔

فائدہ: اس حدیث میں خطیب کی عقلمندی کی علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی نماز لمبی اور خطبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مختصر بات یاد رکھنی' ذہن نشین کرنی آسان ہوتی ہے۔ نبی ﷺ کے خطبات جمعہ عام طور پر مختصر مگر جامع ہوتے تھے جنھیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا' بآسانی نوک زبان ہو جاتے تھے۔ مگر صد افسوس کہ اس دور میں ہمارے خطباء کی عموماً الٹی گنگا بہتی ہے' یعنی خطبہ لمبا اور نماز مختصر' اس خلاف سنت طریقے کی بہرنوع اصلاح ضروری ہے۔

(٣٦٢) وَعَنْ أُمِّ هِشَامٍ بِنْتِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: مَا أَخَذْتُ ﴿قٓ وَٱلْقُرْءَانِ ٱلْمَجِيدِ﴾ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، يَقْرَؤُهَا كُلَّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[362] حضرت ام ہشام بنت حارثہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورۂ قٓ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے سن سن کر ازبر کر لی' آپ ہر جمعہ اس سورت کو منبر پر خطبۂ جمعہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبۂ جمعہ میں سامعین کو قرآن مجید سنانا اور سمجھانا چاہیے۔ ② اس

٣٦١۔ أخرجه مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: ٨٦٩.

٣٦٢۔ أخرجه مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: ٨٧٢.

حدیث میں وارد ہے کہ آپ نے عموماً سورۂ ق خطبۂ جمعہ میں تلاوت فرمائی' یہاں تک کہ حضرت ام ہشام rاللہ عنہا نے سن سن کر ساری سورت زبانی یاد کر لی۔ ③ اس سورت میں چونکہ موت' قیامت' جنت' دوزخ اور پند ونصائح کا ذکر ہے' اس لیے عموماً آپ اس کی تلاوت کرتے تاکہ آخرت یاد رہے اور فکر وعمل کی طرف طبیعت مائل رہے۔ ④ خطبے میں لایعنی قصے' بے مقصد باتیں اور شعر وشاعری وغیرہ مزاج شریعت کے منافی ہیں۔ ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ام ہشام رضی اللہ عنہا] حارثہ بن نعمان کی بیٹی اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی ماں جائی بہن ہیں۔ انصار کے مشہور قبیلے نجار سے تعلق کی وجہ سے انصاریہ نجاریہ کہلائیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خاتون بیعت رضوان میں شریک تھیں۔

(٣٦٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ لَا بَأْسَ بِهِ.

[363] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے جمعے کے روز اس وقت بات کی جب امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے کتابیں اٹھائی ہوئی ہوں۔ اور وہ شخص جس نے اسے کہا کہ خاموش رہ' اس کا جمعہ نہیں۔'' (اسے احمد نے ایسی سند سے روایت کیا جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔)

وَهُوَ يُفَسِّرُ حَدِيثَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي الصَّحِيحَيْنِ مَرْفُوعًا: «إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: أَنْصِتْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ».

اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے جو صحیحین میں مرفوعاً منقول ہے: ''جب تم نے اپنے ساتھی سے جمعے کے دن کہا کہ چپ رہ اور امام اس وقت خطبہ دے رہا ہو تو تو نے بھی لغو بات کی۔''

لغوی تشریح: [أَسْفَارًا] کتابیں۔ یہ سِفْر کی جمع ہے۔ ''سفر'' کے سین کے نیچے کسرہ ہے' اس کے معنی کتاب اور صحیفہ کے ہیں۔ [أَنْصِتْ] إِنْصَات سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں: خاموش رہ۔ [لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ] یعنی اسے جمعہ کی فضیلت نہیں ملے گی بلکہ اس سے محروم رہے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوئی کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس کی نماز جمعہ تو ادا ہو جائے گی مگر وہ جمعے کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ (سبل السلام) یہ تو اس شخص کے بارے میں ہے جو کسی دوسرے شخص کو دوران خطبہ میں بات کرنے سے منع کرتا ہے' اور جو شخص خود گفتگو کرتا ہے اس کی بد نصیبی اور رحمت سے محرومی کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں اور وہ اس دھمکی اور وعید کا کس قدر مستحق ہے۔ ایسے شخص کو گدھے سے تشبیہ دی گئی جو کتابوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے' اس لیے کہ وہ بھی صرف بوجھ اٹھاتا ہے لیکن ان سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جو اپنا قیمتی وقت' کاروبار اور گھر وغیرہ چھوڑ کر نماز جمعہ کے لیے دور سے چل کر آتا ہے مگر اپنی نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے دوران خطبہ میں گفتگو کر کے ثواب اور اجر سے محروم رہ جاتا ہے اور اسے جمعے کا ثواب نہیں

٣٦٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أحمد: ١/ ٢٣٠ . ※ مجالد بن سعيد ضعيف من جهة سوء حفظه وحديث «إذا قلت لصاحبك أنصت . . . » أخرجه البخاري، الجمعة، حديث: ٩٣٤، ومسلم، الجمعة، حديث: ٨٥١ .

ملتا۔ [وَ هُوَ يُفَسِّرُ] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں لفظ لغو کی وضاحت کرتی ہے کہ لغو کے کیا معنی ہیں۔ [لَغَوْتَ] یہ مخاطب کا صیغہ ہے، یعنی تو نے لغو اور بے فائدہ کام کا ارتکاب کیا۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے، تاہم دیگر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نمازیوں کو خطبۂ جمعہ پورے سکون و اطمینان اور انہماک و توجہ سے سننا چاہیے۔ کسی قسم کی ناروا حرکت نہیں کرنی چاہیے حتی کہ اگر کوئی آدمی بولنے اور گفتگو کرنے کی حماقت کرتا بھی ہے تو اسے منع نہیں کرنا چاہیے۔ پورا دھیان خطبے کے مضامین کی طرف ہونا لازمی ہے۔

(٣٦٤) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ، فَقَالَ: «صَلَّيْتَ»؟ قَالَ: لَا، قَالَ: «قُمْ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[364] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جمعے کے روز ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ نبی ﷺ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا: ”نماز پڑھی ہے؟“ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ”اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [قُمْ فَصَلِّ] قُمْ اور صَلِّ دونوں امر کے صیغے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جس آدمی نے پہلے دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو اسے دوران خطبہ میں دو رکعتیں پڑھنی چاہییں، یہ مستحب ہیں۔ یہ دونوں رکعتیں جمعہ سے پہلے کی ہیں یا پھر تحیۃ المسجد کی۔ اگر یہ تحیۃ المسجد کی شمار ہوں تو پھر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہو جاتیں، اس لیے کہ آپ کا اس آدمی کو فرمانا کہ کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص مسجد میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور نماز نہیں پڑھی تھی۔

فوائد و مسائل: ① معلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ کے دوران میں دو رکعت نماز پڑھنی چاہیے۔ اس میں استماع خطبہ کے عام حکم کی تخصیص ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطیب خطبۂ جمعہ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت بات چیت کر سکتا ہے بلکہ نئے آنے والے کو دو رکعت نماز پڑھنے کی تلقین بھی کر سکتا ہے۔ ③ احناف ان دو رکعتوں کے قائل نہیں۔ یہ حدیث ان کی تردید کرتی ہے۔

(٣٦٥) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الْجُمُعَةِ سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ. رَوَاهُ

[365] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جمعے کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھا کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

٣٦٤ـ أخرجه البخاري، الجمعة، باب من جاء والإمام يخطب صلى ركعتين، حديث: ٩٣١، ومسلم، الجمعة، باب التحية والإمام يخطب، حديث: ٨٧٥.

٣٦٥ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب ما يقرأ في يوم الجمعة، حديث: ٨٧٩، وحديث النعمان بن بشير أخرجه مسلم، حديث: ٨٧٨.

مُسْلِمٌ.

وَلَهُ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْعِيدَيْنِ وَفِي الْجُمُعَةِ ﴿سَبِّحِ ٱسْمَ رَبِّكَ ٱلْأَعْلَى﴾ وَ ﴿هَلْ أَتَىٰكَ حَدِيثُ ٱلْغَٰشِيَةِ﴾.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نماز عیدین اور نماز جمعہ میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی﴾ اور ﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَة﴾ پڑھتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض نمازوں میں آپ بالعموم مخصوص سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ نبی ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں وہی سورتیں ان نمازوں میں پڑھنی چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سورتوں کے علاوہ دوسری سورتیں پڑھنی ممنوع ہیں۔ ② مذکورہ بالا سورتوں کا نماز عیدین اور جمعہ میں پڑھا جانا اپنے اندر بہت سی حکمتیں پنہاں رکھتا ہے۔ ان سورتوں میں سے سورۂ جمعہ کا پڑھنا یہ حکمت رکھتا ہے کہ اس میں نماز جمعہ کے لیے آنے کی سعی و کوشش کرنے کی ترغیب ہے جو جمعہ کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔ نماز جمعہ میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی آتے تھے اس لیے ان کی گوشمالی کے لیے سورۂ منافقون پڑھتے تھے تاکہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہو نیز سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ میں احوال آخرت بکثرت بیان ہوئے ہیں اس لیے ان دونوں کو آخرت کی یاددہانی کے لیے پڑھتے تھے۔ سورۂ جمعہ میں نبوت کی فضیلت اور اس کی چار حکمتیں بھی مذکور ہیں اور امت پر نبی ﷺ کے احسان کی یاددہانی کرائی گئی ہے نیز ذکر الٰہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور سورۂ منافقون میں نفاق پر زجر و توبیخ کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما] ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ انصار مدینہ میں سے تھے اس لیے انصاری اور مدنی کہلائے۔ ہجرت کے ۱۴ ویں مہینے انصار میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ یہی نعمان رضی اللہ عنہ تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی پھر ان کو کوفہ کا والی بنایا گیا اس کے بعد حمص کا۔ ۶۴ ہجری کو راہط کے دن خالد بن خلی کلاعی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کے والد کے حالات پیچھے بیان ہو چکے ہیں۔

(٣٦٦) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الْعِيدَ، ثُمَّ رَخَّصَ فِي الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «مَنْ شَاءَ أَنْ يُصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

[366] حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نماز عید پڑھی اور جمعہ کے بارے میں رخصت و اجازت دے دی اور فرمایا: ''جو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔'' (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ایک ہی دن میں جمعہ اور عید آ گئی تو آپ نے نماز عید ادا

٣٦٦ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب إذا وافق يوم الجمعة يوم عيد، حديث: ١٠٧٠، والنسائي، صلاة العيدين، حديث: ١٥٩٢، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٣١٠، وأحمد: ٤/ ٣٧٢، وابن خزيمة: ٢/ ٣٥٩، حديث: ١٤٦٤.

فرمائی اور جمعہ کو ہر آدمی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ابوداود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے‘ آپ نے فرمایا: ”اس دن دو عیدوں کا اجتماع ہو گیا ہے‘ چنانچہ جو چاہے عید کی نماز کو کافی سمجھ لے‘ البتہ ہم جمعہ ضرور ادا کریں گے۔“ (سنن أبي داود‘ الصلاۃ‘ باب إذا وافق یوم الجمعة یوم عید‘ حدیث: ۱۰۷۳) ② اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ اگر عید کے روز جمعہ ہو تو عید پڑھنے کے بعد جمعہ ادا کرنا فرض نہیں رہتا بلکہ ظہر کی نماز پڑھی جا سکتی ہے‘ اس لیے دور دراز سے آنے والے اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر احناف اس کے قائل نہیں۔ ③ عوام کا یہ تصور کہ عید اور جمعہ اکٹھے ایک ہی دن آجائیں تو برسر اقتدار حکومت کا زوال ہوتا ہے‘ یہ سراسر وہم پر مبنی ہے۔ آپ نے تو اسے دو عیدوں کا دن قرار دیا ہے مگر بے خبری میں عوام اس سے بدشگونی لیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

(۳٦٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[367] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی جمعہ پڑھے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔“ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنی چاہییں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ بلکہ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دو دو کر کے چار رکعتیں پڑھی جائیں‘ تاہم اکٹھی بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ ② ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے بعد آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ (صحیح البخاري‘ الجمعة‘ باب الصلاۃ بعد الجمعة وقبلها‘ حدیث: ۹۳۷) اسی وجہ سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر جمعہ کے بعد گھر میں پڑھے تو دو رکعتیں ادا کرے اور اگر مسجد میں ادا کرنا چاہے تو چار رکعتیں پڑھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یوں ہی کرتے تھے۔ ③ احناف جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کے قائل ہیں مگر کسی بھی صحیح مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

(۳٦٨) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ لَهُ: إِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتّٰى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذٰلِكَ: أَنْ لَّا نُوصِلَ صَلَاةً بِصَلَاةٍ حَتّٰى نَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[368] حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جب تم نماز جمعہ پڑھو تو پھر دوسری کوئی نماز اس کے ساتھ نہ ملاؤ حتی کہ تم کسی سے کوئی بات کر لو یا وہاں سے نکل جاؤ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح حکم دیا تھا کہ ہم کسی نماز کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں حتی کہ ہم کوئی بات کر لیں یا وہاں سے نکل جائیں۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَلَا تَصِلْهَا] وصل سے ماخوذ ہے۔ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے۔ نہ ملا اس کے ساتھ‘ یعنی فرض

۳٦٧۔ أخرجه مسلم، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة، حديث: ۸۸۱.

۳٦٨۔ أخرجه مسلم، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة، حديث: ۸۸۳.

جمعہ کے ساتھ کوئی نماز نہ ملا۔ [تَخْرُجَ] نکل جائے، یعنی اس مسجد سے باہر نکل جائے جہاں فرض نماز ادا کی ہے یا اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد اسی جگہ فوراً کھڑے ہو کر سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔ یہ حکم صرف جمعہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر نماز کے نفل اور فرض میں یہ فرق بذریعۂ انتقالِ جگہ یا بذریعۂ گفتگو کر لینا چاہیے تاکہ نفل کی فرض سے مشابہت نہ ہو۔ ② نبی ﷺ نوافل و سنن بالعموم گھر پر ادا فرمایا کرتے تھے اور بہتر بھی یہی ہے۔ ③ نوافل و فرائض ایک ہی جگہ نہ پڑھنے کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا نامۂ اعمال میں درج ہو جائے اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سائب بن یزید] ان کی کنیت مشہور قول کے مطابق ابو یزید کندی ہے۔ ۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ ۸۰ ہجری میں فوت ہوئے۔

(٣٦٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنِ اغْتَسَلَ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَصَلّٰى مَا قُدِّرَ لَهُ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتّٰى يَفْرُغَ الْإِمَامُ مِنْ خُطْبَتِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى، وَفَضْلُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[369] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص غسل کر کے جمعہ کے لیے آئے، پھر نماز پڑھے جتنی اس کے لیے مقدر ہو، پھر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک کہ امام خطبۂ جمعہ سے فارغ ہو جائے، پھر امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس کے دو جمعوں کے درمیان کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں بلکہ مزید تین دنوں کے بھی۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَا قُدِّرَ لَهُ] تقدیر سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے، یعنی نماز پڑھے جتنی اللہ اسے توفیق دے اور اس کے مقدر میں ہو۔ [أَنْصَتَ] یہ فعل ماضی ہے اور اس کے معنی ہیں: خاموش رہا۔

فائدہ: اس حدیث میں نماز جمعہ کی بڑی ترغیب ہے۔ جو شخص غسل کر کے آئے، خطیب کے آنے سے پہلے ذکر و عبادت میں مصروف رہے، امام خطبہ شروع کرے تو خاموشی سے خطبہ سنے اور نماز جمعہ پڑھے تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک اور مزید تین دن کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، خواہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ لیکن جمہور صرف صغیرہ گناہوں کی معافی کے قائل ہیں۔ لیکن حدیث سے جمہور کے موقف کی تائید نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

(٣٧٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «فِيهِ

[370] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعے کے دن کا ذکر کیا اور فرمایا: ''اس میں ایک

٣٦٩ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب فضل من استمع وأنصت في الخطبة، حديث: ٨٥٧.

٣٧٠ـ أخرجه البخاري، الجمعة، باب الساعة التي في يوم الجمعة، حديث: ٩٣٥، ومسلم، الجمعة، باب في الساعة التي في يوم الجمعة، حديث: ٨٥٢.

سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُّسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي يَسْأَلُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئاً، إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ». وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيفَةٌ.

ایسی گھڑی ہے کہ جو بندۂ مسلم اس گھڑی میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ وہ اسے ضرور عنایت فرماتا ہے۔'' اور آپ نے اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا کہ وہ وقت بہت تھوڑا سا ہے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: وہ وقت خفیف سا ہوتا ہے۔

لغوی تشریح: [يُقَلِّلُهَا] تقلیل سے ماخوذ ہے' یعنی آپ قلت وقت کی جانب اشارہ فرما رہے تھے۔ [خَفِيفَةٌ] یعنی قلیل' تھوڑا سا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ گھڑی بہت ہی مختصر سی ہے جس میں دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعے کے روز ایک مخصوص وقت ایسا ہے جس میں بندے کی ہر دعا (سوائے قطع رحمی اور گناہ کے) شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تعیین بیان نہیں فرمائی۔ اس گھڑی کو بھی شب قدر کی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا تاکہ لوگ اسے تلاش کرنے میں اپنا زیادہ سے زیادہ قیمتی وقت صرف کریں۔ اس طرح ان کا شوق جستجو بڑھے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ ہو۔

(٣٧١) وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: «هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلَاةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ أَنَّهُ مِنْ قَوْلِ أَبِي بُرْدَةَ.

[371] حضرت ابوبردہ رحمہ اللہ نے اپنے والد حضرت (ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے بیان کیا' ان کے والد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتام جماعت تک کے دوران میں ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور دارقطنی نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابوبردہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

وَفِي حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عِنْدَ ابْنِ مَاجَه، وَجَابِرٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: أَنَّهَا مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ.

اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ابوداود اور نسائی نے روایت نقل کی ہے: وہ گھڑی نماز عصر سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصے میں ہے۔

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيهَا عَلٰى أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِينَ قَوْلًا

اس گھڑی کی بابت کافی اختلاف ہے حتی کہ اس کے

٣٧١ـ أخرجه مسلم، الجمعة، باب في الساعة التي في يوم الجمعة، حديث: ٨٥٣. * الحديث المرفوع، وقول أبي بردة صحيحان محفوظان كلاهما، وحديث عبدالله بن سلام أخرجه ابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١١٣٩ وهو حديث حسن، وحديث جابر أخرجه أبوداود، الصلاة، حديث: ١٠٤٨، والنسائي، الجمعة، حديث: ١٣٩٠، وسنده صحيح، وانظر فتح الباري: ٢/ ٤١٦ـ٤٢٢.

أَمْلَيْتُهَا فِي شَرْحِ الْبُخَارِيِّ.

بارے میں چالیس سے زیادہ اقوال (آراء) ہیں۔ میں نے ان سب کو (فتح الباری) شرح بخاری میں لکھ دیا ہے۔

لغوی تشریح: [هِيَ] اس سے مراد جمعے کے روز کی وہ گھڑی ہے جس میں دعائیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ [أَمْلَيْتُهَا] یہ سارے اقوال میں نے فتح الباری میں تحریر کر دیے ہیں۔ إملاء: دراصل اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی لکھوائے اور دوسرا لکھے۔ اس گھڑی کے بارے میں دو قول زیادہ مشہور اور راجح ہیں جو کہ متن والی حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں: ① دن کی آخری گھڑی، یعنی غروب آفتاب کے قریب وہ گھڑی ہوتی ہے۔ ② آغاز خطبہ سے اختتام نماز کے دوران میں وہ گھڑی ہو سکتی ہے، پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے قابل ترجیح کون سا قول ہے؟ بعض نے ان کے مابین بایں طور جمع و تطبیق کی کوشش کی ہے کہ یہ گھڑی ان دونوں وقتوں میں باری باری منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جمع و تطبیق کی صورت میں یہی تطبیق سب سے اچھی ہے۔ لیکن جمع و تطبیق کی اس صورت میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان اوقات میں تو نماز پڑھنا ممنوع ہے اور گزشتہ حدیث میں [وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي] کے الفاظ ہیں کہ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا انتظار کرنے والا گویا نماز ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

راویٔ حدیث: [ابوبردہ] عامر بن ابوموسیٰ اشعری نام ہے اور آپ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد، حضرت علی اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے احادیث سنیں۔ ۸۰ برس سے زیادہ عمر پا کر ۱۰۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ بردہ کا اعراب ''با'' پر ضمہ اور ''را'' ساکن کے ساتھ ہے۔

[حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابو یوسف ہے۔ علمائے یہود میں سے بہت بڑے عالم اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا۔ مدینہ منورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہی پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ان خوش بخت و خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی۔ مدینہ منورہ میں ۴۳ ہجری میں وفات پائی۔

(٣٧٢) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: مَضَتِ السُّنَّةُ أَنَّ فِي كُلِّ أَرْبَعِينَ فَصَاعِدًا جُمُعَةً. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[372] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: یہ طریقہ جاری رہا ہے کہ چالیس یا اس سے زیادہ تعداد میں جمعہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَضَتِ السُّنَّةُ] طریقہ جاری رہا ہے، نافذ چلا آ رہا ہے۔ [فَصَاعِدًا] چالیس کی تعداد سے زائد۔ [بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ] یہ سند اس لیے ضعیف ہے کہ اس میں ایک راوی عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ضعیف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس سے مروی احادیث کے متعلق کہا ہے کہ ان پر لکیر پھیر دو، اس لیے کہ وہ جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس کی اپنی گھڑی ہوئی (موضوع) ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ راوی ثقہ نہیں ہے۔ اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے دلیل لینا ہی جائز نہیں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی واضح ہو گا کہ جمعہ

٣٧٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٣، ٤. * خصيف وعبدالعزيز بن عبدالرحمٰن ضعيفان.

کے لیے کوئی متعین تعداد مشروط کرنا ایسی حدیث کے ذریعے جائز ہی نہیں۔

فوائد و مسائل: ① نماز جمعہ کے لیے نمازیوں کی تعداد کے بارے میں کسی صحیح حدیث میں کوئی ذکر نہیں' اس لیے علماء کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں' مثلاً: کسی نے چار' کسی نے سات اور کسی کے نزدیک نو' بارہ اور کسی نے بیس اور چالیس اور پچاس اور ستر کی رائے دی ہے۔ ان میں سے کسی کی بنیاد و اساس مرفوع صحیح حدیث پر نہیں ہے۔ جماعت تو دو آدمیوں سے بھی ہو سکتی ہے' چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سفر میں دو آدمی ہوں تو ایک اذان دے اور جو عمر میں بڑا اور قرآن زیادہ جانتا ہو وہ جماعت کرائے۔ (صحیح البخاري' الأذان' باب من قال لیؤذن في السفر مؤذن واحد' حدیث:٦٢٨' وصحیح مسلم' المساجد' باب من أحق بالإمامة' حدیث:٦٧٣) ② امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز جمعہ کے لیے چالیس کی تعداد ہونا ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک امام کے علاوہ دو مزید آدمیوں کا ہونا کافی ہے' البتہ وہ جمعہ کے لیے بڑے شہر کی شرط عائد کرتے ہیں جو قطعاً صحیح نہیں۔ اسلام میں پہلا جمعہ جُوَاثی بستی میں ادا کیا گیا۔ (صحیح البخاري' الجمعة' باب الجمعة في القری والمدن' حدیث:٨٩٢) جو کہ بڑے شہر کی تعریف سے خارج ہے۔

(٣٧٣) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فِي كُلِّ جُمُعَةٍ. رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

[373] حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہر جمعے میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بخشش کی دعا فرمایا کرتے تھے۔ (اسے بزار نے کمزور سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے' تاہم صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ خطیب کو جمعہ میں اپنے لیے اور دوسرے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔

(٣٧٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِي الْخُطْبَةِ يَقْرَأُ آيَاتٍ مِنَ الْقُرْآنِ، يُذَكِّرُ النَّاسَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ.

[374] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ قرآن حمید کی چند آیات خطبۂ جمعہ میں تلاوت فرما کر لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھنا مسنون ہیں۔ خطیب کو ان آیات کے ذریعے سے دنیا سے بے رغبتی' آخرت کی ترغیب اور اخلاق و کردار کی درستی کی طرف توجہ دلانی چاہیے۔ جتنی اصلاح

٣٧٣۔ [إسناده ضعیف جدا] أخرجه البزار (کشف الأستار): ١/ ٣٠٧، ٣٠٨. فیه یوسف بن خالد السمتي متروك متهم، وعلل أخرٰی.

٣٧٤۔ [إسناده صحیح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الرجل یخطب علی قوس، حدیث: ١١٠١، وأصله في مسلم، الجمعة، حدیث: ٨٧٢.

آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ہو سکتی ہے اور کسی ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں موضوع احادیث اور من گھڑت قصے کہانیوں سے اجتناب کرنا از حد ضروری ہے۔

(٣٧٥) وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «**الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ، إِلَّا أَرْبَعَةً: مَمْلُوكٌ، وَامْرَأَةٌ وَصَبِيٌّ وَمَرِيضٌ**» رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَقَالَ: لَمْ يَسْمَعْ طَارِقٌ مِّنَ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ مِنْ رِوَايَةِ طَارِقٍ الْمَذْكُورِ عَنْ أَبِي مُوسٰى.

[375] حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کو باجماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے مگر چار قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں: غلام' عورت' بچہ اور مریض۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور (ساتھ ہی) یہ بھی کہا ہے کہ طارق رضی اللہ عنہ نے (براہ راست) نبی ﷺ سے سماع نہیں کیا۔ یہی روایت حاکم نے ذکر کی ہے جس میں طارق رضی اللہ عنہ (جن کا ذکر کیا گیا ہے) نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام' عورت' بچے اور مریض پر جمعہ فرض نہیں۔ اگر پڑھ لیں تو پھر انھیں ظہر کی نماز ادا نہیں کرنی پڑے گی ورنہ نماز ظہر ادا کریں گے۔

راویٔ حدیث: [حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ] یہ کوفہ کے باشندے تھے۔ قبیلۂ بجیلہ سے تعلق تھا' اس لیے کوفی اور بجلی کہلائے۔ ان کی نسبت احمسی بھی ہے۔ نبی ﷺ کی زیارت ہوئی مگر آپ سے کچھ سنا نہیں۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں ۳۳ یا ۳۴ غزوات میں شریک ہوئے۔ ۸۲ ہجری میں وفات پائی۔

(٣٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لَيْسَ عَلٰى مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ**». رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[376] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسافر پر جمعہ فرض نہیں۔'' (اسے طبرانی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسافر پر بھی جمعہ فرض نہیں۔ یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے دوران حج میں جمعہ نہیں پڑھا تھا۔ (سبل السلام)

(٣٧٧) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ

[377] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

٣٧٥ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الجمعة للمملوك والمرأة، حديث: ١٠٦٧، والحاكم: ١/ ٢٨٨ وصححه. * طارق بن شهاب صحابي، ومراسيل الصحابة مقبولة على الراجح.

٣٧٦ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الطبراني في الأوسط: ١/ ٤٥٤، حديث: ٨٢٢، رواه عبدالله بن نافع عن أبيه، وابن نافع ضعيف.

٣٧٧ـ [ضعيف] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في استقبال الإمام إذا خطب، حديث: ٥٠٩ وسنده ضعيف، وللحديث شواهد ضعيفة، وحديث البراء رواه ابن خزيمة: لم أجده.

تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا اسْتَوٰی عَلَی الْمِنْبَرِ، اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوهِنَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ الْبَرَاءِ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ.

رسول اللہ ﷺ جب منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم اپنے رخ آپ کی طرف کر لیتے۔ (اسے ترمذی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اس کا ایک شاہد حضرت براء کی حدیث سے ابن خزیمہ میں موجود ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کی رو سے سامعین کو اپنا رخ خطیب کی طرف کرنا چاہیے۔ قبلے کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں۔ اس مسئلے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اجماع ہے۔ (سبل السلام) ② اس حدیث کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ ایسا راوی ہے جسے متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے مگر خود مصنف نے ذکر کیا ہے کہ اس کا شاہد موجود ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔

(۳۷۸) وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ حَزْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: شَهِدْنَا الْجُمُعَةَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَامَ مُتَوَكِّئًا عَلٰی عَصًا أَوْ قَوْسٍ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ.

[378] حضرت حکم بن حزن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ جمعہ میں حاضر تھے۔ آپ لاٹھی یا کمان کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کی رو سے خطیب خطبۂ جمعہ کے وقت کسی چیز کا سہارا لے سکتا ہے۔ ② یہ مستحب ہے۔ ③ حکمت اس کی یہ ہے کہ یہ چیز خطیب کے لیے ڈھارس کا کام دیتی ہے' ہاتھ بے فائدہ حرکت کرنے سے بچے رہتے ہیں اور آدمی میں تھکاوٹ کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

راوئ حدیث: [حضرت حکم بن حزن رضی اللہ عنہ] حکم میں "حا" اور "کاف" دونوں پر فتحہ ہے۔ اور حزن کی "حا" پر فتحہ اور "زا" ساکن ہے۔ ان کا پورا نام حکم بن حزن بن ابی وہب مخزومی ہے۔ ان کے اسلام کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ جنگ یمامہ سے پہلے اسلام قبول کیا' حالانکہ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔

۱۳ - بَابُ صَلَاةِ الْخَوْفِ

باب: 13 - نماز خوف کا بیان

(۳۷۹) عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ، عَمَّنْ صَلّٰی مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلَاةَ الْخَوْفِ:

[379] حضرت صالح بن خوات رحمہ اللہ نے ایسے شخص سے روایت کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن نبی ﷺ

۳۷۸ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، حديث: ۱۰۹٦.

۳۷۹ـ أخرجه البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث: ٤۱۳۱، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: ۸٤۱.

أَنَّ طَائِفَةً مِّنْ أَصْحَابِهِ ﷺ صَفَّتْ مَعَهُ، وَطَائِفَةً وِجَاهَ الْعَدُوِّ، فَصَلّٰى بِالَّذِينَ مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوا، فَصَفُّوا وِجَاهَ الْعَدُوِّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْأُخْرٰى، فَصَلّٰى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِي بَقِيَتْ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَوَقَعَ فِي الْمَعْرِفَةِ لِابْنِ مَنْدَةَ: عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ، عَنْ أَبِيهِ.

کے ساتھ نماز خوف پڑھی تھی۔ اس شخص نے بیان کیا کہ آپ ﷺ کے صحابۂ کرام کے ایک گروہ نے آپ کے ساتھ نماز کے لیے صف بندی کی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابلے کے لیے ان کے روبرو صف آرا ہوگیا۔ آپ نے ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ صف باندھ کر کھڑے تھے ایک رکعت پڑھائی' پھر آپ سیدھے کھڑے رہے اور انھوں نے اپنے طور پر باقی نماز مکمل کر لی' پھر وہ چلے گئے اور جا کر دشمن کے سامنے صف آرا ہوگئے اور دوسرا گروہ آ گیا۔ آپ نے اسے اپنی باقی ماندہ ایک رکعت پڑھائی' پھر آپ بیٹھے رہے اور انھوں نے اس دوران میں اپنے طور پر نماز مکمل کر لی' پھر آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ (بخاری ومسلم۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابن مندہ کی (کتاب) المعرفة میں ہے کہ صالح بن خوات یہ روایت اپنے والد سے بیان کرتے ہیں۔)

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ الْخَوْفِ] ''خوف کی نماز'' کا مطلب ہے: خوف کی حالت میں نماز پڑھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کفار کے لشکر کے بالمقابل ہو لیکن ابھی تک باہمی جنگ و جدال شروع نہ ہوئی ہو' نیزے پھینکنے اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئی ہو۔ البتہ جب فریقین میں مڈبھیڑ ہو چکی ہو' بندوقوں کے منہ کھل گئے ہوں' توپوں کے دہانے گولوں کی آگ اگل رہے ہوں' ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں گولے برسا رہی ہوں اور جنگی طیاروں سے بم گرائے جا رہے ہوں تو ایسے وقت میں مخصوص طریقے سے نماز ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ اس وقت تو جس طرح بھی ممکن ہو نماز پڑھ لی جائے' خواہ ٹولیوں کی صورت میں یا تن تنہا' کھڑے ہو کر' چلتے ہوئے یا سواری پر بیٹھے بیٹھے بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ [عَمَّنْ صَلّٰى ...... الخ] جس نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس سے کون شخص مراد ہے؟ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے۔ اور یہ بھی قول ہے کہ راوی کا باپ خوات رضی اللہ عنہ ہی مراد ہے جیسا کہ مصنف نے ابن مندہ کے حوالے سے حدیث کے آخر میں نقل کیا ہے اور یہی قول صحیح ہے' اس لیے کہ اس وقت سہل رضی اللہ عنہ ابھی بچے تھے۔ غزوات میں شریک ہونے کے قابل ہی نہیں تھے۔ [ذَاتِ الرِّقَاعِ] ''راء'' کے نیچے کسرہ اور ''قاف'' مخفف ہے۔ نجد میں غطفان کے علاقے میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ غزوہ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے' ۷ ہجری میں غزوۂ خیبر کے بعد واقع ہوا ہے۔ اسے ذات الرقاع کہنے کی وجہ ایک قول کے مطابق یہ تھی کہ رقاع کہتے ہیں کپڑے کے ٹکڑوں' چیتھڑوں اور پٹیوں وغیرہ کو۔ اور اس غزوے میں مسلمان مجاہدین کے پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے اور انھوں نے جوتوں کی جگہ پاؤں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ [وِجَاهَ الْعَدُوِّ] ''واؤ'' کے نیچے کسرہ ہے۔ دشمن کے روبرو' بالمقابل' دشمن کے سامنے۔ [وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ] اپنے طور پر نماز پوری کی' یعنی دوسری رکعت پوری کر کے سلام پھیرا۔

فوائد و مسائل: ① نمازِ خوف کئی طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ جیسا موقع محل ہوتا تھا اس کی مناسبت سے نماز ادا کی جاتی۔ مذکورہ بالا حدیث میں جو صورت ذکر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ امام نے ہر ایک گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور ایک ایک رکعت انھوں نے اپنے طور پر پڑھی۔ پہلے گروہ نے تو خود سلام پھیرا مگر دوسرے گروہ نے نبی ﷺ کے ساتھ۔ ② امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور کے نزدیک خوف کی صورت میں سفر و حضر دونوں میں نمازِ خوف پڑھنا جائز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نمازِ خوف کے لیے سفر کی شرط لگاتے ہیں۔ ③ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت: ﴿إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ......﴾ الآية (النسآء ۴:۱۰۱) میں دو شرطیں ہیں: ایک سفر اور دوسری خوفِ دشمن۔ مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نمازِ خوف اور نمازِ قصر دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔ سفر میں قصر کے لیے خوفِ دشمن کی شرط نہیں اور نمازِ خوف کے لیے سفر کی شرط نہیں۔ دونوں نمازوں کے ساتھ کوئی شرط لگانا بے معنی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت صالح بن خَوَّات رحمہ اللہ] صالح بن خوات بن جبیر بن نعمان انصاری مدنی۔ ''خا'' پر فتحہ اور ''واؤ'' پر فتحہ اور تشدید ہے۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے حدیث سنی ہے۔

[حضرت خَوَّات رضی اللہ عنہ] جلیل القدر صحابی ہیں۔ پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے غزوۂ احد ہے۔ اور ایک قول کے مطابق غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ ۴۰ ہجری میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ ہجری کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ یا ۷۱ سال تھی۔

(۳۸۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ قِبَلَ نَجْدٍ فَوَازَيْنَا الْعَدُوَّ، فَصَافَفْنَاهُمْ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَصَلّٰى بِنَا، فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَّعَهُ، وَأَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى الْعَدُوِّ، وَرَكَعَ بِمَنْ مَّعَهُ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ انْصَرَفُوا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِي لَمْ تُصَلِّ، فَجَاءُوا، فَرَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ، فَرَكَعَ لِنَفْسِهِ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[380] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نجد کی طرف نبی ﷺ کی معیت میں ایک غزوے میں گیا۔ ہم نے دشمن کو اپنے سامنے پایا تو ہم نے ان کے بالمقابل صفیں بنائیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور ہمیں نماز پڑھائی۔ ایک جماعت، نماز ادا کرنے کے لیے آپ کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور ایک گروہ دشمن کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ جو جماعت آپ کے ساتھ (نماز میں شریک) تھی اس نے آپ کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کیے اور اس گروہ کی جگہ واپس چلی گئی جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ پھر اس جماعت کے افراد آئے، آپ نے ان کے ساتھ بھی ایک رکوع اور دو سجدے کیے، پھر آپ نے سلام پھیر دیا مگر ان (دونوں) میں سے ہر ایک (گروہ) نے اٹھ کر (الگ الگ

۳۸۰۔ أخرجه البخاري، الخوف، باب صلاة الخوف، حديث: ۹۴۲، ومسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: ۸۳۹.

اپنی رکعت ادا کرتے ہوئے) ایک رکوع اور دو سجدے کیے۔
(بخاری و مسلم- الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [قِبَلَ] ''قاف'' کے کسرہ اور ''با'' کے فتحہ کے ساتھ ہے، یعنی طرف، جہت۔ [نَجدٍ] بلاد عرب کی سطح مرتفع اور بالائی جانب جو حجاز کے مشرق میں واقع ہے۔ [فَوَازَینَا] مقابلے میں آئے، ہم نے سامنا کیا، بالمقابل ہوئے۔ [فَصَافَفْنَا] ہم نے صف بندی کی اور دو صفوں میں کھڑے ہوئے۔ اور یہ موقع نماز عصر کا تھا۔ [ثُمَّ انصَرَفُوا ...... الخ] پہلی رکعت مکمل کر کے واپس چلے گئے۔ ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی تھی اور سلام بھی نہیں پھیرا تھا۔ اور اس وقت نبی ﷺ سیدھے کھڑے رہے۔ [فَجَاءُوا] پھر اس گروہ کے لوگ آئے جو حفاظت اور پہرے داری کر رہے تھے۔ [ثُمَّ سَلَّمَ] پھر نبی ﷺ نے تنہا سلام پھیرا۔ [فَقَامَ کُلٌّ وَاحِدٍ ......الخ] ہر ایک الگ الگ اٹھا۔ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بقیہ رکعت ایک دوسرے کے بعد پوری کی (ورنہ اگر سب نے دوسری رکعت کو بیک وقت شروع کر دیا ہوتا تو حفاظت نہ ہو سکتی۔) اور ابوداود میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت (جو اس کی تائید کرتی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ نے پہلے دونوں رکعتوں کو اکٹھے پڑھ لیا، پھر وہ پہلے گروہ کی جگہ پر چلا گیا اور پہلا گروہ واپس آیا اور اس نے ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیرا، اس طرح اس کی بھی نماز کی دو رکعتیں پوری ہو گئیں۔

فوائد و مسائل: ① مصنف نے نماز خوف کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے چودہ، ابن العربی اور امام نووی رحمہما اللہ نے سولہ اور شیخ ابوالفضل نے ترمذی کی شرح میں سترہ صورتیں ذکر کی ہیں۔ سنن ابی داود میں آٹھ صورتیں ہیں۔ ② امام احمد رحمہ اللہ کے بقول نماز خوف کے سلسلے میں چھ یا سات صحیح احادیث ثابت ہیں، ان میں سے جس کے مطابق نماز پڑھی جائے جائز ہے، کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ حالات کے مطابق جس طور پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ ③ اس نماز کے مسنون و مشروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اور صاحب زاد المعاد نے بھی اس نماز کی یہی چھ کیفیتیں بیان کی ہیں اور جن حضرات نے اس سے زیادہ ذکر کی ہیں انھوں نے جہاں کہیں بیان واقعہ میں اختلاف دیکھا اسے الگ شمار کر لیا، حقیقت میں وہ الگ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

(٣٨١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْخَوْفِ، فَصَفَفْنَا صَفَّيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَالْعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ

[381] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز خوف میں حاضر تھا۔ ہم نے دو صفیں بنائیں۔ ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑی ہوئی جبکہ دشمن ہمارے اور قبلے کے درمیان میں تھا۔ نبی ﷺ نے اللہ

٣٨١ـ أخرجه مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: ٨٤٠، وحديث أبي عياش الزرقي أخرجه أبوداود، صلاة السفر، حديث: ١٢٣٦ وسنده صحيح، وحديث جابر أخرجه النسائي، صلاة الخوف، حديث: ١٥٥٣ وهو حديث صحيح، وحديث أبي بكرة أخرجه أبوداود، صلاة السفر، حديث: ١٢٤٨ وهو حديث صحيح.

ﷺ، وَكَبَّرْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَكَعَ، وَرَكَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَرَفَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ، وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ الْعَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ قَامَ الصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ.

اکبر کہا اور ہم سب نے بھی اللہ اکبر کہا' پھر آپ نے رکوع کیا اور ہم سب نے بھی رکوع کیا' پھر آپ نے رکوع سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہم سب نے بھی اپنے سر اٹھائے' پھر آپ سجدے میں گر گئے اور آپ کے ساتھ والی صف بھی جبکہ پچھلی صف دشمن کے مقابلے کے لیے کھڑی رہی۔ جب آپ نے سجدہ پورا کر لیا تو وہ صف جو آپ کے قریب تھی کھڑی ہو گئی۔ پھر راوی نے ساری حدیث بیان کی۔

وَفِي رِوَايَةٍ: ثُمَّ سَجَدَ، وَسَجَدَ مَعَهُ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، فَلَمَّا قَامُوا سَجَدَ الصَّفُّ الثَّانِي، ثُمَّ تَأَخَّرَ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، وَتَقَدَّمَ الصَّفُّ الثَّانِي، وَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ، وَسَلَّمْنَا جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي عَيَّاشٍ الزُّرَقِيِّ مِثْلُهُ، وَزَادَ: إِنَّهَا كَانَتْ بِعُسْفَانَ.

ایک اور روایت میں ہے کہ پھر آپ نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ پہلی صف نے بھی سجدہ کیا' پھر جب یہ سب کھڑے ہو گئے تو دوسری صف سجدے میں چلی گئی۔ اور پھر پہلی صف پیچھے ہٹ گئی اور دوسری صف آگے آ گئی۔ اور (آگے حدیث) اس کی مثل بیان کی۔ اور اس کے آخر میں ہے کہ پھر نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور ہم سب نے بھی سلام پھیر دیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) اور ابوداود نے ابوعیاش زرقی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ وہ عسفان کے مقام پر (ادا کی گئی) تھی۔

وَلِلنَّسَائِيِّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ جَابِرٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِطَائِفَةٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى بِآخَرِينَ أَيْضًا رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ. وَمِثْلُهُ لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ.

اور نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند کے ساتھ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں' پھر سلام پھیر دیا۔ پھر دوسرے گروہ کو بھی اسی طرح دو رکعات پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ اور ابوداود میں بھی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

لغوی تشریح: [صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللّٰهِ] ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھی (اور دوسری صف اس پہلی صف کے پیچھے تھی۔) [ثُمَّ انْحَدَرَ] پھر سجدہ کرنے کے لیے نیچے ہوئے اور جھکے۔ [وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ] یعنی آپ کے ساتھ اگلی صف سجدے کے لیے جھکی جو آپ کے قریب اور آپ سے متصل تھی۔ [فِي نَحْرِ الْعَدُوِّ] دشمن کے مقابلے میں۔ ہر چیز کا اول حصہ اس کا نحر کہلاتا ہے۔ یہ دشمن جہینہ قبیلے کے افراد تھے۔ [فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ] جب سجدہ پورا کر لیا اور صحیح طور پر ادا کر لیا۔ [فَذَكَرَ] راوی حدیث نے ذکر کیا۔ [اَلْحَدِيثَ] ذَكَرَ کا مفعول ہے' یعنی ساری حدیث بیان کی۔ اور اس میں

ہے کہ دوسری صف سجدے میں گر گئی۔ [بِعُسْفَانَ] عسفان بروزن عثمان ہے۔ غزوۂ عسفان ۶ ہجری میں عمرۂ حدیبیہ کے موقع پر واقع ہوا' اس میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکیں' چنانچہ انھوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ' جو کہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے' کو دوسو گھوڑ سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ مکہ کے راستے میں حائل ہو گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو نماز ظہر میں دیکھا تو سوچا کہ مسلمان اس وقت بے خبری کے عالم میں ہیں۔ کاش! ہم ان پر حملہ آور ہوتے تو انھیں قتل کر سکتے' چنانچہ انھوں نے نماز عصر کی حالت میں حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تو اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا حکم نازل فرما دیا اور یوں خالد بن ولید کو حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر صلح ہوئی جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ عسفان وہ پہلا غزوہ ہے جہاں نماز خوف پڑھی گئی۔ اور پہلی نماز جو اس جگہ نماز خوف کی صورت میں ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جس کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ [مِنْ وَجْهٍ آخَرَ] دوسری سند اور دوسرے طریق سے۔ [صَلّٰى بِطَائِفَةٍ] یعنی آپ نے ایک جماعت کو فرض پڑھائے اور دوسرے گروہ کو نفل۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز جائز ہے۔ اور یہ نماز پچھلی مذکورہ نماز کے علاوہ دوسری نماز تھی کیونکہ وہ تو عسفان کے موقع پر پڑھی گئی اور یہ بطن نخلہ میں۔ نماز خوف کی صورتیں احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ خوف کے موقع پر ان انواع میں سے جس نوعیت کی نماز پڑھی جائے' جائز ہو گی۔

فائدہ: اس حدیث میں نماز خوف کی ایک اور صورت ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نماز خوف مختلف طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ سنن نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس طرح آپ ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں۔ تو گویا آپ نے دو تو فرض پڑھے اور دو نفل ادا کیے کیونکہ دو مرتبہ دو دو فرض تو نہیں ہوتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی فرض پڑھ سکتے ہیں۔ احناف نے اس مقام پر انصاف سے کام نہیں لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قیاس کو چھوڑ کر حدیث صحیح کی اتباع کرتے لیکن ہوا یوں کہ امام طحاوی رحمہ اللہ جیسے صاحب علم و فضل نے تو الٹا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کر دیا' حالانکہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوعیاش زُرَقی رضی اللہ عنہ] ان کا نام زید بن ثابت ہے۔ انصاری زرقی مشہور ہیں۔ زرقی کے ''زا'' پر ضمہ اور ''را'' پر فتحہ ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ ۴۰ ہجری کے بعد وفات پائی۔

(۳۸۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى صَلَاةَ الْخَوْفِ بِهٰؤُلَاءِ رَكْعَةً، وَبِهٰؤُلَاءِ رَكْعَةً، وَلَمْ يَقْضُوا. رَوَاهُ

[382] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان لوگوں کو بھی ایک رکعت پڑھائی اور ان کو بھی ایک ہی رکعت۔ اور انھوں نے نماز کو پورا نہیں کیا۔ (اسے احمد' ابوداود

۳۸۲ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب من قال يصلي بكل طائفة ركعة ولا يقضون، حديث: ۱۲٤٦، والنسائي، صلاة الخوف، حديث: ۱۵۳۰، وأحمد: ۵/ ۳۸۵، ۳۹۹. وابن حبان (الموارد)، حديث: ۵۸٦، وابن خزيمة، حديث: ۱۳٤۳، وحديث ابن عباس أخرجه ابن خزيمة، حديث: ۱۳٤٤.

أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَمِثْلُهُ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا.

اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔)

فائدہ: یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز خوف کم از کم ایک رکعت ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ اس نظریے کا قائل ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ابن عباس، ابو ہریرہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اس کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شدت خوف کے وقت اشاروں سے صرف ایک رکعت پڑھی جائے گی۔ ان کے نظریے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے جسے مسلم اور ابوداود وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔ (صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب صلاة المسافرین و قصرها، حدیث:٦٨٧، و سنن أبي داود، صلاة السفر، باب من قال يصلي بكل طائفة ركعة ولا يقضون، حدیث:١٢٤٧) مگر جمہور علماء اور ائمۂ اربعہ کہتے ہیں کہ خوف، تعداد رکعات پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ان حضرات نے پہلی احادیث کی بہت بعید تاویلات کی ہیں مگر الفاظ حدیث ان کی تردید کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ جس حدیث میں ایک رکعت کا ذکر ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے دونوں رکعتیں امام کے ساتھ پوری نہیں کیں بلکہ ایک رکعت اکیلے اکیلے پڑھی اور دو پوری کر لیں۔

(٣٨٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**صَلَاةُ الْخَوْفِ رَكْعَةٌ عَلٰى أَيِّ وَجْهٍ كَانَ**». رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[383] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز خوف ایک رکعت ہی ہے جس طرح بھی ادا ہو جائے۔'' (اسے بزار نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث کی رو سے بعض حضرات امام اور مقتدی دونوں کے لیے ایک ہی رکعت کے قائل ہیں، چنانچہ سفیان رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمن بیلمانی سخت ضعیف راوی ہے۔

(٣٨٤) وَعَنْهُ مَرْفُوعًا: «**لَيْسَ فِي صَلَاةِ الْخَوْفِ سَهْوٌ**». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[384] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مرفوعاً مروی ہے: ''نماز خوف میں سجدۂ سہو نہیں۔'' (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ] ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے کیونکہ یہ روایت عبدالحمید بن السری سے مروی

٣٨٣۔ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه البزار (كشف الأستار): ١/ ٣٢٦، وفيه محمد بن عبدالرحمن بن البيلماني وهو منكر الحديث ضعيف.

٣٨٤۔ [إسناده ضعيف] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٥٧ وقال: "تفرد به عبدالحميد بن السري وهو ضعيف".

ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اور پھر صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ مرفوع بھی نہیں بلکہ موقوف ہے۔ امیر الیمانی نے ذکر کیا ہے کہ ایک قول کے مطابق علماء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ (سبل السلام)

١٤ - بَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ

باب:14-نماز عیدین کا بیان

(٣٨٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اَلْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُ النَّاسُ، وَالْأَضْحٰى يَوْمَ يُضَحِّي النَّاسُ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

[385] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عید الفطر اس روز ہے جس روز لوگ روزے (پورے کر کے) چھوڑ دیں۔ اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس دن لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ] عیدین سے مراد عید الاضحیٰ اور عید الفطر ہے۔ عید' عربوں کے ہاں اظہار مسرت کے لیے منعقد ہونے والے ہر موسمی اجتماع کو کہا جاتا ہے۔ عید کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ عَوْد سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں: لوٹنا۔ اور یہ بھی ہر سال کے بعد واپس لوٹ کر آتی ہے اور بار بار آتی رہتی ہے' یا پھر یہ معنی ہیں کہ اس کے واپس آنے کی وجہ سے مسرت و سرور لوٹ آتا ہے۔ صرف کی رو سے عید اصل میں عِوْدٌ تھا۔ جو ''عین'' کے نیچے کسرہ اور ''واؤ'' ساکن کے ساتھ ہے۔ واؤ ساکن ماقبل مکسور کی وجہ سے واؤ کو ''یا'' میں تبدیل کر دیا گیا۔ عید کی جمع اعیاد ہے جو ''یا'' کے ساتھ ہے' یہ اس لیے کہ اعواد (جس کے معنی خشک لکڑیوں کے ہوتے ہیں) اور اعیاد کے درمیان فرق ہو جائے کیونکہ اس میں واؤ ہے۔ عید الفطر کا آغاز ۲ ہجری میں ہوا اور عید الاضحیٰ کی ابتدا بھی ایک قول کے مطابق ۲ ہجری میں ہوئی۔ والله أعلم.

[يُفْطِرُ النَّاسُ] افطار سے ماخوذ ہے۔ یہاں عید الفطر منانا مراد ہے۔ [يُضَحِّي النَّاسُ] تَضْحِيَة سے ماخوذ ہے۔ اور یہ دراصل قربانی کے جانور ذبح کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یوم اضحیٰ (قربانی کے دن) کو عید الاضحیٰ منانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ وہ دن ہوں گے جن میں لوگ یہ دونوں عیدیں منائیں گے۔ بالفاظ دیگر معنی یہ ہوئے کہ اگر لوگ چاند دیکھنے میں غلطی یا خطا کر جائیں تو پھر رمضان اور ذوالقعدہ دونوں کی تعداد تیس دن مکمل کر لیں' پھر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے باہر نکلیں اور مناسک حج بھی انھی تیس دنوں کے حساب سے ادا کریں۔ اس کے بعد اگر ان کے سامنے یہ واضح اور ثابت ہو جائے کہ انھوں نے چاند دیکھنے میں غلطی کی اور خطا کھائی ہے اور مہینہ ۲۹ روز کا پورا ہو گیا تھا تو ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں بلکہ وہ صحیح ہے اور اللہ کے نزدیک وہ ہو چکا۔ یہ تو محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جناب سے اپنے بندوں کے لیے تخفیف اور نرمی ہے۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اگر کسی شخص واحد نے اپنے طور پر عید کا چاند دیکھ لیا لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو معتبر نہ سمجھا تو تنہا یہ آدمی اپنی رؤیت کے یقینی ہونے کی بنیاد پر کوئی عمل نہیں کرے گا' وہ روزہ رکھے گا نہ افطار کرے گا اور نہ قربانی کرے گا' بلکہ ان تمام امور میں وہ عام لوگوں اور غالب

٣٨٥- **[صحيح]** أخرجه الترمذي، الصوم، باب ما جاء في الفطر والأضحى متى يكون، حديث: ٨٠٢، وقال: "حسن غريب صحيح".

اکثریت کے ساتھ رہے گا۔ مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس پر اسے یقین ہو اس کے حق میں اسی کے مطابق حکم متعین ہو جائے گا اور وہ اپنے یقین کی بنا پر انفرادی طور پر عمل کرے گا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اہل اسلام کی صرف دو عیدیں ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری یا چوتھی کسی عید کا تصور اور نشان اسلام میں کہیں دور دور تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے کئی اور عیدیں منانا شروع کر رکھی ہیں، حالانکہ شریعت اسلامیہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ② دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیدیں اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادات میں اجتماعیت کا تصور ہے۔ ایک آدمی چاند دیکھ کر کوئی عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا بلکہ اسے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ادا کرنے میں لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت کرنی چاہیے اور اگر اسے یقین کامل ہو جائے تو پھر بھی عیدین کی نماز عام لوگوں کے ساتھ ہی ادا کرے گا۔

(٣٨٦) وَعَنْ أَبِي عُمَيْرِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ عُمُومَةٍ لَّهُ مِنَ الصَّحَابَةِ، أَنَّ رَكْبًا جَاءُوا، فَشَهِدُوا أَنَّهُمْ رَأَوُا الْهِلَالَ بِالْأَمْسِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يُفْطِرُوا، وَإِذَا أَصْبَحُوا أَنْ يَغْدُوا إِلَى مُصَلَّاهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ.

[386] حضرت ابوعمیر بن انس رحمہ اللہ اپنے چچوں سے، جو کہ نبی ﷺ کے صحابہ تھے، بیان کرتے ہیں کہ چند سوار (آپ کی خدمت میں) آئے اور انھوں نے شہادت دی کہ ہم نے کل شام چاند دیکھا تھا۔ آپ نے حکم دے دیا: ''روزہ افطار کر لو اور کل صبح (نماز عید کے لیے) اپنی عیدگاہ میں آ جاؤ۔'' (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابوداود کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: [عُمُومَةٍ] عَمٌّ کی جمع ہے جس کے معنی چچا کے ہیں۔ [مِنَ الصَّحَابَةِ] یہ جار مجرور عُمُومَةٍ کی صفت واقع ہو رہا ہے، یعنی یہ چچا صحابی تھے۔ یہ حدیث متصل ہے، اس کی سند میں کسی قسم کا ضعف نہیں کیونکہ صحابی کا نام نہ لینا نقصان دہ نہیں ہے۔ [رَكْبًا] ''را'' پر فتحہ اور ''کاف'' ساکن کے ساتھ۔ راکب کی جمع ہے، یعنی سواروں کی جماعت۔ [يَغْدُوا] یائے مضارع پر فتحہ ہے، صبح کے وقت جائیں، یعنی دن کے اول حصے میں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ٢٩ رمضان کو ایسی جگہ چاند نظر آ جائے جہاں کا مطلع مختلف نہ ہو تو دوسرے روز صحیح اور قابل اعتبار ذرائع سے اطلاع ملنے پر روزہ اسی وقت افطار کر دیا جائے گا۔ ② اگر قبل از زوال خبر ملی تو اسی روز نماز عید بھی ادا کر لی جائے ورنہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنی چاہیے اور اجتماعی طور پر پڑھنی چاہیے۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ چاند کی رؤیت کا اعلان سرکاری طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ⑤ اعلان جانی پہچانی شخصیت کے توسط سے کیا جانا چاہیے۔ ⑥ عصر حاضر میں قابل اعتماد شہادتوں کے بعد ریڈیو ٹی وی سے اعلان کیا جا سکتا ہے۔

٣٨٦۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب إذا لم يخرج الإمام للعيد من يومه، حديث: ١١٥٧، وأحمد: ٥/ ٥٧، ٥٨، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٥٣، والنسائي، صلاة العيدين، حديث: ١٥٥٨.

راویٔ حدیث: [حضرت ابوعمیر بن انس رحمہ اللہ] ان کا نام عبداللہ بن مالک انصاری تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صغار تابعین میں شمار ہوتے ہیں' ثقہ تھے۔ چوتھے طبقے کے راوی ہیں۔ اپنے باپ کے بعد کافی دیر زندہ رہے۔

(٣٨٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يَغْدُو يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ مُعَلَّقَةٍ -- وَوَصَلَهَا أَحْمَدُ --: (وَيَأْكُلُهُنَّ أَفْرَادًا).

[387] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن (نماز کے لیے) اس وقت تک نہیں نکلتے تھے جب تک طاق عدد میں چند کھجوریں تناول نہ فرما لیتے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔) اور ایک معلق روایت میں ہے جسے امام احمد نے موصول ذکر کیا ہے کہ آپ ان کھجوروں کو ایک ایک کر کے تناول فرماتے تھے۔

فوائد و مسائل: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں: ① نماز عید کے لیے باہر جانا مسنون ہے۔ ② نماز عیدالفطر کے لیے جانے سے پہلے طاق عدد میں کھجوریں کھانی مسنون ہیں۔ ③ کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہیے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں۔ یہ تہذیب واخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی بھی چیز کھائی جا سکتی ہے۔ واللہ أعلم۔ ④ کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی حریص و لالچی نہ بنے' نیز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلنا چاہیے تاکہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(٣٨٨) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَطْعَمَ، وَلَا يَطْعَمُ يَوْمَ الْأَضْحٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[388] حضرت (عبداللہ) ابن بریدہ رحمہ اللہ اپنے والد (بریدہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں' انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید الفطر کے لیے کچھ کھائے بغیر نہ نکلتے تھے' البتہ عید قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرما لیتے کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَلَا يَطْعَمُ يَوْمَ الْأَضْحٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ] آپ عیدالاضحیٰ کے دن نماز عید سے پہلے کچھ نہیں کھاتے

٣٨٧ـ أخرجه البخاري، العيدين، باب الأكل يوم الفطر قبل الخروج، حديث: ٩٥٣، وأحمد: ٣/ ١٢٦، ٢٣٢، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٧٥٤، وابن خزيمة، حديث: ١٤٢٩.

٣٨٨ـ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الأكل يوم الفطر قبل الخروج، حديث: ٥٤٢، وقال: غريب، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٥٩٣، وأحمد: ٥/ ٣٥٣.

تھے۔ امام بیہقی ؒ نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔ (السنن الکبرٰی للبیهقی : ۳/۲۸۳)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے' البتہ کھجوروں' چھواروں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پہ سہاگا ہے۔

(۳۸۹) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ الْعَوَاتِقَ وَالْحُيَّضَ فِي الْعِيدَيْنِ، يَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ، وَتَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[389] حضرت ام عطیہ ؓ سے مروی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تاکہ وہ بھی خیر و بھلائی اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہوں' البتہ حائضہ عورتیں جائے نماز سے الگ رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں' صرف دعا میں شرکت کریں۔) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أُمِرْنَا] صیغۂ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والا معلوم ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ اور بخاری کی روایت میں تو صاف طور پر [أَمَرَنَا نَبِيُّنَا] کے الفاظ ہیں' یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا۔ [أَنْ نُخْرِجَ] إِخْرَاج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انھیں لے کر عیدگاہ کی طرف نکلیں۔ [الْعَوَاتِقَ] نوجوان بالغ کنواری لڑکیاں' یا جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عَاتِق کی جمع ہے اور نُخْرِجَ کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ [وَالْحُيَّضُ] ''حا'' پر ضمہ اور ''یا'' پر فتحہ اور تشدید کے ساتھ۔ حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنھیں ایام حیض آ رہے ہوں۔ عواتق پر اس کا عطف ہے۔ [يَشْهَدْنَ الْخَيْرَ] اس روز کی برکت' بھلائی اور فضیلت میں حاضر ہو کر حصے دار بنیں۔ [وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ] دَعْوَة یہاں دعا کے معنی میں ہے' یعنی سب عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔ [وَتَعْتَزِلُ] الگ رہیں۔

فوائد و مسائل: ① خواتین کا نماز عید کے لیے جانا اس حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ ② ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ خود اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں کو عیدگاہ میں لے جاتے تھے۔ (مسند أحمد : ۱/۲۳۱' و سنن ابن ماجه' إقامة الصلوات والسنة فيها' حديث:۱۳۰۹) حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت علی ؓ خواتین کا نماز عید میں حاضر ہونا واجب سمجھتے تھے۔ ③ احناف نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور اسے ابتدائے اسلام کا واقعہ بتایا ہے تاکہ اہل اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو اور کثرت تعداد اہل کفر و شرک کے لیے باعث اذیت ہو اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھے' مگر یہ تاویل جس پر علامہ طحاوی نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے' قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت

۳۸۹۔ أخرجه البخاري، العيدين، باب خروج النساء والحيض إلى المصلى، حديث: ۹۷۴، ومسلم، صلاة العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين إلى المصلى، حديث: ۸۹۰.

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ گواہی دیتے ہیں کہ ازواج مطہرات وغیرہ عید پڑھنے جاتی تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کم عمر تھے' ظاہر ہے کہ ان کی یہ گواہی فتح مکہ کے بعد کی ہے جس وقت اظہار قوت کی ضرورت ہی نہیں تھی' اس لیے عورتوں کو عید گاہ میں بہر نوع حاضر ہونا چاہیے۔ اور جو لوگ باطل تاویلات کرتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔

(٣٩٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ يُصَلُّونَ الْعِيدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[390] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ' ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما عیدین کی نماز' خطبے سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں نماز پہلے ادا کی جائے اور خطبہ بعد میں۔ بنوامیہ کے دور میں مروان بن حکم وہ پہلا حکمران ہے جس نے نماز سے پہلے خطبہ دینے کا آغاز کیا۔ اسی وقت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس پر احتجاج کیا اور برملا کہا کہ تو نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ (صحیح مسلم' صلاة العیدین' باب صلاة العیدین' حدیث:٨٨٩)

(٣٩١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى يَوْمَ الْعِيدِ رَكْعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُمَا وَلَا بَعْدَهُمَا. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

[391] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عید کے روز دو ہی رکعتیں ادا فرمائیں' نہ پہلے کچھ پڑھا اور نہ بعد میں کوئی نماز پڑھی۔ (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث کی رو سے عید گاہ میں سوائے دو رکعت نماز عید کے اور کوئی نماز پہلے یا بعد میں پڑھنا نبی ﷺ سے ثابت نہیں' البتہ جب واپس گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

(٣٩٢) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الْعِيدَ بِلَا أَذَانٍ وَّلَا إِقَامَةٍ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

[392] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ اس کی اصل بخاری میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت ہمارے فاضل محقق کے نزدیک قابل عمل اور قابل حجت ہے' نیز شیخ

٣٩٠ـ أخرجه البخاري، العيدين، باب الخطبة بعد العيد، حديث: ٩٦٣، ومسلم، صلاة العيدين، حديث: ٨٨٨.

٣٩١ـ أخرجه البخاري، العيدين، باب الخطبة بعد العيد، حديث: ٩٦٤، ومسلم، صلاة العيدين، باب ترك الصلاة قبل العيد وبعدها في المصلى، حديث: ٨٨٤، وأبوداود، صلاة الاستسقاء، حديث: ١١٥٩، والترمذي، الجمعة، حديث: ٥٣٧، والنسائي، صلاة العيدين، حديث: ١٥٨٨، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٢٩١، وأحمد: ١/ ٢٨٠، ٣٤٠، ٣٥٥.

٣٩٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب ترك الأذان في العيد، حديث: ١١٤٧. ابن جريج مدلس وعنعن، وأصله في البخاري، العيدين، حديث: ٩٥٩.

البانی ؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا مذکورہ روایت سے ثابت ہوا کہ نمازعید بغیر اذان واقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کے لیے اذان واقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کے قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مسنون ہے۔

(٣٩٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يُصَلِّي قَبْلَ الْعِيدِ شَيْئًا، فَإِذَا رَجَعَ إِلٰى مَنْزِلِهِ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

[393] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' انھوں نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے' البتہ جب (نماز عید کی ادائیگی کے بعد) واپس گھر تشریف لاتے تو دو رکعت نماز (نفل) ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح اور حسن قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں حافظ ابن حجر ؒ نے اس مسئلے کی بابت فتح الباری میں سیر حاصل بحث کی ہے اور سنن ابن ماجہ کی مذکورہ روایت کو حسن قرار دے کر دونوں قسم کی روایات میں تطبیق دی ہے کہ جن احادیث میں نفل وغیرہ نہ پڑھنے کا ذکر ہے' اس سے مراد یہ ہے کہ آپ عیدگاہ میں کوئی نوافل ادا نہیں کرتے تھے۔ گھر آ کر ادا کیے جانے والے نفلوں کا تعلق نماز عید سے نہیں بلکہ یہ مطلق نفل ہیں' لہٰذا معلوم ہوا کہ عید کے دن نماز عید کے علاوہ عیدگاہ میں کوئی نماز نہیں' البتہ گھر میں نماز عید کے بعد دو رکعت نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتح الباري:٢/ ٦١٣' ٦١٤' والموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد:١٧/ ٣٢٤-٣٢٦' وسنن ابن ماجه بتحقيق الدكتور بشار عواد' حديث:١٢٩٣)

(٣٩٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰى إِلَى الْمُصَلّٰى، وَأَوَّلُ شَيْءٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلَاةُ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُومُ مُقَابِلَ النَّاسِ - وَالنَّاسُ عَلٰى صُفُوفِهِمْ - فَيَعِظُهُمْ وَيَأْمُرُهُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[394] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس سے آپ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے' چنانچہ آپ انھیں وعظ ونصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں: ① عیدگاہ میں عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپ سے ثابت نہیں۔ ② خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہیے۔ ③ خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہیے۔ ④ خطبہ

٣٩٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في الصلاة قبل صلاة العيد وبعدها، حديث:١٢٩٣.* ابن عقيل ضعيف ضعفه الجمهور على الراجح.

٣٩٤ـ أخرجه البخاري، العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، حديث:٩٥٦، ومسلم، صلاة العيدين، حديث:٨٨٩.

کھڑے ہو کر دینا چاہیے' نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہییں۔ ⑤ سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہیے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہیے۔ ⑥ نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عیدگاہ میں ادا کرنا مسنون ہے۔ آج کل بلا عذر مسجدوں میں نماز عید پڑھنے کا عام رواج ہو گیا ہے جو بہر حال ختم ہونا چاہیے۔ ⑦ نبی ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عیدگاہ میں منبر رکھوایا اور اس پر خطبہ دیا۔ (صحيح البخاري' العيدين' حديث:٩٥٦) البتہ ابن حبان کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبۂ عید ضرور ارشاد فرمایا ہے جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔ (صحيح ابن حبان (الإحسان): ٤:٢٠١' رقم: ٢٨١٤' وموارد الظمآن' رقم:٥٧٥' ومسند أبي يعلى: ٢:٤٠٢' رقم:١١٨٢)

(٣٩٥) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ: «اَلتَّكْبِيرُ فِي الْفِطْرِ سَبْعٌ فِي الْأُولٰى، وَخَمْسٌ فِي الْأُخْرٰى، وَالْقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلْتَيْهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْبُخَارِيِّ تَصْحِيحَهُ.

[395] حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں' نبی ﷺ نے فرمایا: ''عیدالفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراءت تکبیرات کے بعد ہے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے۔)

لغوی تشریح: [سَبْعٌ فِي الْأُولٰى] پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعائے افتتاح' خواہ تکبیرات عید سے پہلے پڑھے یا بعد میں' دونوں طرح جائز ہے۔ [وَ خَمْسٌ فِي الْأُخْرٰى] اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہے اور قیام کی تکبیر ان کے علاوہ ہے' اس طرح کل چھ تکبیریں ہوئیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے کہ اگر جدہ سے عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں' اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے' امام دارقطنی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے اور شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت کیا ہے۔ اور یہاں جدہ سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ ② جمہور ائمۂ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد' امام علی بن مدینی' امام اسحاق' امام ابوعبیدہ' امام بخاری' امام دارقطنی اور امام دارمی رحمہم اللہ وغیرہم نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہائے اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ ③ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔'' اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع

٣٩٥ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب التكبير في العيدين، حديث: ١١٥١، والترمذي في علل الكبير: ١/ ٨٨.

میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی، معلوم نہیں کہ حافظ ابن حجر نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس قول کو کہاں سے نقل کیا ہے؟ میں نے اس کے متعلق تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ روایت امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی ''العلل الکبیر'' میں نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے نصب الرایہ: ۲/ ۲۱۷ میں بھی اسی کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ④ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ، حضرت سعد، حضرت ابن عباس اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات سے بھی ہوتی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہ و تابعین اور فقہائے مدینہ کے علاوہ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ ⑤ شارح ترمذی، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید قابل دید ہے۔ ⑥ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دیگر فقہائے کوفہ چھ تکبیروں کے قائل ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع میں جانے سے پہلے، مگر اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت ثابت نہیں۔ جمہور صحابہ وتابعین کا عمل ہی راجح اور دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ ⑦ تکبیرات عیدین کے ساتھ رفع الیدین کرنے کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ امام ابن حزم اس کی بابت لکھتے ہیں: [لَمْ يَصِحَّ قَطُّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ رَفَعَ فِيهِ يَدَيْهِ] (المحلی: ۵/ ۸۳، ۸۴) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً یہ ثابت نہیں کہ آپ نے ان تکبیروں میں رفع الیدین کیا ہے۔'' محقق عصر شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ مسنون نہیں ہے۔ (إرواء الغلیل: ۳/ ۱۱۴) تاہم تکبیرات عیدین کے ساتھ رفع الیدین کرنے کی بابت ائمہ کے اقوال ضرور ملتے ہیں۔ عطاء بن ابی رباح سے پوچھا گیا: کیا امام نماز عیدین میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، وہ رفع الیدین کرے اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہاتھ اٹھائیں۔ (المصنف لعبد الرزاق: ۳/ ۲۹۷) نیز امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تکبیرات عیدین کے موقع پر ہاتھ اٹھانے چاہییں اگرچہ میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ (الفریابی بحوالہ إرواء الغلیل: ۳/ ۱۱۳) اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ تکبیرات عیدین میں ہاتھ اٹھانے چاہییں۔ (الأم: ۱/ ۲۳۷) لہٰذا ان اقوال کی روشنی میں اگر کوئی تکبیرات عیدین میں رفع الیدین کرتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور کوئی نہیں کرتا تو اس کا بھی جواز ہے۔ اس میں تشدد نامناسب ہے۔ واللّٰه أعلم.

(٣٩٦) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْأَضْحٰى وَالْفِطْرِ بِـ ﴿قٓ﴾ وَ﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[396] حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز میں سورۂ قٓ اور سورۂ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ تلاوت فرماتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(٣٩٧) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ

[397] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ

٣٩٦۔ أخرجه مسلم، صلاة العيدين، باب ما يقرأ به في صلاة العيدين، حديث: ٨٩١.

٣٩٧۔ أخرجه البخاري، العيدين، باب من خالف الطريق إذا رجع يوم العيد، حديث: ٩٨٦، وحديث ابن عمر أخرجه ◄◄

قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْعِيدِ خَالَفَ الطَّرِيقَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ.

ﷺ عید کے روز عیدگاہ کے لیے جانے اور واپسی کے لیے راستہ تبدیل کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداود میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔)

لغوی تشریح: [خَالَفَ الطَّرِيقَ] مطلب اس کا یہ ہے کہ عیدگاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ۔ نبیٔ اکرم ﷺ کی اقتدا میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہیے تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(٣٩٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْمَدِينَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا، فَقَالَ: قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللّٰهُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا: يَوْمَ الْأَضْحٰى، وَيَوْمَ الْفِطْرِ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

[398] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو روز کھیل کود کے لیے مقرر تھے۔ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دونوں دنوں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن عنایت فرما دیے ہیں: ایک عیدالاضحیٰ کا دن اور دوسرا عیدالفطر کا۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَلَهُمْ] اس سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ [يَوْمَانِ] عید' فرحت اور مسرت کے لیے دو دن۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کر مناتے تھے وہ یوم نیروز اور یوم مہرجان تھے۔ یہ دونوں کلمے فارسی سے معرب کیے گئے ہیں۔ نیروز اصل میں نوروز (نیا دن) تھا۔ اہل ہیئت کے نزدیک یہ شمسی سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اور یہ نوروز وہ پہلا دن ہے جس روز سورج برج حمل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کلمے مہرجان کی اصل مہر گان (گاف کے ساتھ) ہے۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کو اس نام کے ساتھ موسوم کیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں' ان میں گرمی ہوتی ہے نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ اب بھی عید کے دن ہیں۔ عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقالی کر رکھی تھی۔ شارع علیہ السلام کا ان دنوں کی عید منانے سے منع فرما دینا اس کی دلیل ہے کہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا اور اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے بشرطیکہ شریعت کے منافی نہ ہو' البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

◄◄ أبوداود، الصلاة، حديث: ١١٥٦ وسنده حسن.

٣٩٨- [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب صلاة العيدين، حديث: ١١٣٤، والنسائي، صلاة العيدين، حديث: ١٥٥٧، وحميد صرح بالسماع عند أحمد: ٣/ ٢٥٠.

(٣٩٩) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ يَّخْرُجَ إِلَى الْعِيدِ مَاشِيًا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

[399] حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عیدگاہ کی جانب پیدل چل کر جانا سنت ہے۔ (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً سخت ضعیف قرار دیا ہے' نیز دیگر محققین نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے' تاہم امام ترمذی رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت کو حسن قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ اکثر اہل علم حضرات کا اس حدیث پر عمل ہے۔ ان کے نزدیک عید کی نماز کے لیے عیدگاہ کی طرف پیدل جانا مستحب ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ شاید امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیگر شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے جو سنن ابن ماجہ' باب ماجاء في الخروج إلى العيد ماشيًا کے تحت آئی ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ مذکورہ باب کی تمام روایات انفرادی طور پر ضعیف ہیں لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسئلے کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔ اور پھر اس مسئلے کی تائید و توثیق میں ایک مرسل روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے میں شرکت اور عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز کی ادائیگی کے لیے پیدل تشریف لے جاتے تھے' نیز سعید بن مسیّب کا قول ہے کہ عیدالفطر کی تین سنتیں ہیں: ''عیدگاہ کی طرف پیدل جانا' نماز عید کی ادائیگی کے لیے جانے سے پہلے کوئی چیز کھانا اور عید کی نماز کے لیے غسل کرنا۔'' مذکورہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ کی طرف پیدل جانا کم از کم مستحب ضرور ہے' تاہم ضرورت کے پیش نظر سواری پر سوار ہو کر بھی جایا جا سکتا ہے۔ والله أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ٣/ ١٠٣، ١٠٤)

(٤٠٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي يَوْمِ عِيدٍ، فَصَلّٰى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةَ الْعِيدِ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

[400] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک موقع پر عید کے روز بارش ہو گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ (اسے ابوداود نے کمزور سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود معناً صحیح ہے' یعنی مسئلہ اسی طرح ہے کہ نماز عید کھلے میدان میں پڑھنا افضل ہے' تاہم معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً نماز عید باہر عیدگاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ ② مسئلے کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔

٣٩٩ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الترمذي، أبواب الصلاة، باب ما جاء في المشي يوم العيد، حديث: ٥٣٠، وقال: "هذا حديث حسن"، الحارث الأعور ضعيف جدًا متهم، وأبوإسحاق عنعن.

٤٠٠ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب يصلي بالناس العيد في المسجد، حديث: ١١٦٠، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٣١٣. * عيسى بن عبدالأعلى مجهول (تقريب) وشيخه مستور، وله شاهد ضعيف عند البيهقي: ٣/ ٣١٠.

③ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عیدگاہ میں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وسیع وفراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عیدگاہ میں ادا فرمائی ہے۔ ہاں، ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے عذر پیش آ گیا تو آپ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی، اس لیے عیدگاہ میں پڑھنا افضل ہے۔ ④ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حتی الوسع ہمیشہ افضل کام پر مداومت و محافظت فرمائی ہے، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز عید کے لیے عیدگاہ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اگر باہر نکل کر نماز عید پڑھنا مسنون نہ ہوتا تو میں مسجد میں پڑھتا، اس لیے عیدگاہ میں نماز پڑھنا ہی مسنون اور افضل ہے۔

١٥ - بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ

باب:15-نماز کسوف کا بیان

(٤٠١) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ، فَقَالَ النَّاسُ: اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْعُوا اللّٰهَ وَصَلُّوا، حَتّٰى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتّٰى تَنْجَلِيَ».

[401] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں (آپ کے لخت جگر) ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز سورج گرہن لگا تو لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شمس وقمر اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ انھیں گرہن کسی کی موت و حیات کی وجہ سے نہیں لگتا، چنانچہ جب تم انھیں اس حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہاں تک کہ وہ (سورج) واضح ہو جائے (گرہن کھل جائے۔)'' (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے: ''نماز پڑھتے رہو یہاں تک کہ وہ روشن ہو جائے۔''

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: «فَصَلُّوا، وَادْعُوا، حَتّٰى يَنْكَشِفَ مَا بِكُمْ».

اور بخاری میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''چنانچہ نماز پڑھو اور دعا مانگو یہاں تک کہ وہ کیفیت جو تمھارے سامنے ہے، دور ہو جائے۔''

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ] کسوف کہتے ہیں رنگت کی سیاہی مائل تبدیلی کو۔ کہا جاتا ہے: [كَسَفَتِ الشَّمْسُ وَانْكَسَفَتْ] یعنی سورج سیاہ ہو گیا، اس کی شعاعیں غائب ہو گئیں۔ اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل

٤٠١ـ أخرجه البخاري، الكسوف، باب الصلاة في كسوف الشمس، حديث: ١٠٤٣، وحديث أبي بكرة أخرجه البخاري، الكسوف، حديث: ١٠٤٠.

لغت نے کہا ہے کہ سورج گرہن کے لیے کسوف اور چاند گرہن کے لیے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے اگرچہ ایک دوسرے کے لیے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ [يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ] ابراہیم ؓ نبی اکرم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ یہ ۱۰ ہجری ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ [اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ] یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ وتخیل کے مطابق تھا کہ کسوف وخسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتے ہیں۔ [آيَتَانِ] نشانیاں، علامات۔ [مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ] اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت، وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں، یا عذاب اور غلبے سے اپنے بندوں کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لیے ہیں، یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت وطاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع ونقصان اور دفع ضرر کے مالک ومختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع ونقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ [حَتّٰى تَنْكَشِفَ] یہاں تک کہ وہ (سورج یا چاند) صاف ہو جائے اور روشن ہو جائے اور ان پر چھائی ہوئی سیاہی دور ہو جائے۔ [حَتّٰى تَنْجَلِيَ] یہاں تک کہ صاف اور روشن ہو جائے۔ [حَتّٰى يُكْشَفَ] صیغۂ مجہول ہے، یعنی وہ کیفیت اٹھ جائے، دور ہو جائے، زائل ہو جائے۔

فوائد ومسائل: ① آفتاب وماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اتنی بڑی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں، نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطۂ الٰہی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطے سے انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع وضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ وخیال کی تردید ہے۔ ② اس موقع پر نماز ودعا مسنون ہے۔ نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپ سے ثابت ہیں۔ ہر رکعت میں دو، تین یا چار رکوع کیے جا سکتے ہیں، تاہم صحیح ترین احادیث میں ہر رکعت میں دو دو رکوع کا ذکر ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (التمهيد: ٣/ ٣٠٢- ٣٠٨، والتوسل والوسيلة: ٨٦، وزاد المعاد: ١/ ٤٥٣- ٤٥٥) [فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا] "پس جب تم انھیں دیکھو" کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکروہہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ ③ یہ نماز سنت ہے یا واجب؟ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ ؒ وجوب کے قائل ہیں۔ ④ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام، دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع ہیں۔ رکعت کے پہلے قیام میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے پر اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے کہ اس میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی یا نہیں۔ امام مالک ؒ دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔ درست بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ رکوع کے بعد قومہ کرنے کی بجائے دوبارہ قراءت شروع کر دینا ایک ہی رکعت کا تسلسل ہے، لہٰذا اس موقع پر نئے سرے سے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی جائے گی۔ واللہ أعلم. ⑤ رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے، تو اس کی بابت درست اور راجح بات یہی ہے کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے۔ نماز کے بعد قبلہ رو ہو کر خوب گڑگڑا کر دعا کی جائے۔ حضرت ابی بن کعب ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد قبلہ رو ہو کر دعا کرتے رہے یہاں تک کہ گرہن صاف ہو گیا۔ (تاریخ دمشق: ٧/ ١٢٩) نیز

احادیث میں اس موقع پر صدقہ کرنے، عذاب قبر سے پناہ مانگنے اور غلام آزاد کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

وضاحت: [ابراہیم] رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا ہے۔ اسکندریہ اور مصر کے حکمران مقوقس نے انھیں نبی ﷺ کو بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ آپ کے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ جمادی الاولیٰ ۹ ہجری کو پیدا ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۲۹ شوال ۱۰ ہجری کو وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں ایک دودھ پلانے والی نے اس کی مدت رضاعت کو پورا کیا ہے۔'' (صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المسلمين، حديث: ١٣٨٢)

(٤٠٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلَاةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلّٰى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكْعَتَيْنِ وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُ: فَبَعَثَ مُنَادِيًا يُنَادِي: «اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ».

[402] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے گرہن کی نماز میں قراءت بلند آواز سے کی اور دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار ہی سجدے کیے۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: آپ نے منادی کرنے والے کو بھیجا جو [اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ] ''نماز جمع کرنے والی ہے۔'' کی منادی کرتا تھا۔

لغوی تشریح: [أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ] رکعات سے یہاں رکوع مراد ہیں۔ [فِي رَكْعَتَيْنِ] ہر رکعت میں دو رکوع۔ [وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ] منصوب ہے اس وجہ سے کہ اس کا عطف [أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ] پر ہے۔ یہ اس بات پر متنبہ کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ سجود میں اضافہ و زیادتی نہیں۔ ان کی تعداد ہر رکعت میں دو ہی رہے گی۔ [اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ] دونوں مرفوع ہیں، اس لیے کہ پہلا مبتدا اور دوسرا اس کی خبر ہے۔ اور دونوں منصوب ہونے کی صورت میں پہلا، فعل محذوف کا مفعول ہوگا جو [اُحْضُرُوا] ہو سکتا ہے اور دوسرا حال واقع ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نماز کسوف کے لیے اذان کے علاوہ کسی اور طرح اعلان کرنا مستحب ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے فرمائی۔ ② یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں بلکہ اس میں ایک رکوع کا اضافہ ہے۔ اس روایت کی رو سے آپ ایک رکعت میں دو رکوع فرماتے۔ اور یہی موقف راجح ہے جیسا کہ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ ظاہر ہے ہر رکوع سے اٹھ کر نئے سرے سے قراءت کی ہوگی۔ اس طرح قراءت کا بھی اضافہ ہوا۔ ③ اس کا خاص وقت مقرر و متعین نہیں ہے، جب سورج یا چاند کو گرہن ہوگا اسی وقت نماز پڑھی جائے گی۔ ④ عام نمازوں کے لیے تو اذان مقرر ہے اور صلاۃ کسوف و خسوف کے لیے [اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ] کہنا مشروع ہے۔ پنجگانہ نماز کے لیے یہ کہنا ثابت نہیں ہے۔

٤٠٢ـ أخرجه البخاري، الكسوف، باب الجهر بالقراءة في الكسوف، حديث: ١٠٦٥، ومسلم، الكسوف، باب صلاة الكسوف، حديث: ٩٠١.

(٤٠٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: اِنْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَصَلّٰى، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا نَحْوًا مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انْصَرَفَ، وَقَدِ انْجَلَتِ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[403] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپ نے نماز کسوف ادا فرمائی' اس میں لمبا قیام کیا' سورۂ بقرہ کی تلاوت کے برابر۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا' پھر سر اٹھایا (رکوع سے کھڑے ہوئے) تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم۔ پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا۔ پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا۔ پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا۔ اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا۔ پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا' پھر سجدہ کیا پھر (آخر کار) سلام پھیر دیا تو (اس دوران میں) سورج روشن ہو چکا تھا' پھر آپ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم- یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

وَفِي رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: صَلّٰى حِينَ كُسِفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ فِي أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

مسلم کی ایک روایت میں ہے: آپ نے سورج گرہن کے موقع پر نماز پڑھی تو آٹھ رکوع' چار سجدوں کے درمیان ادا کیے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مِثْلُ ذٰلِكَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: صَلّٰى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں بھی ہے: آپ نے چھ رکوع' چار سجدوں کے ساتھ ادا کیے۔

وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: صَلّٰى، فَرَكَعَ خَمْسَ رَكَعَاتٍ،

اور ابوداود میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ رکوع اور دو سجدے

٤٠٣ـ أخرجه البخاري، الكسوف، باب صلاة الكسوف جماعة، حديث: ١٠٥٢، ومسلم، الكسوف، باب ما عرض على النبي ﷺ في صلاة الكسوف من أمر الجنة والنار، حديث: ٩٠٧، وحديث علي أخرجه أحمد: ١/١٤٣، وابن خزيمة، حديث: ١٣٨٨، ١٣٩٤ وهو حديث حسن، وحديث جابر أخرجه مسلم، الكسوف، حديث: ٩٠٤. وحديث أبي بن كعب أخرجه أبوداود، صلاة الإستسقاء، حديث: ١١٨٢ وسنده ضعيف.

وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ، وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ . پہلی رکعت میں کیے اور اسی طرح دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح: [نَحْوًا مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ] تقریباً سورۂ بقرہ کی قراءت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں قراءت آہستہ کی گئی ہے بلند آواز سے نہیں' اس لیے کہ اگر نبی ﷺ نے قراءت بلند آواز سے کی ہوتی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو انھیں اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات' جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں' ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہے کہ وہ آپ سے دور کھڑے تھے' اس لیے قراءت نہ سن سکے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آپ کے قریب ہی کھڑے تھے' پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت آپ ﷺ نے فرمائی' وہ اسے بعینہٖ یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو' اس وجہ سے انھیں اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے سورۂ بقرہ کی قراءت کا اندازہ لگایا ہو۔ علاوہ ازیں بلند آواز سے پڑھنے پر دلالت کرنے والی روایات صحیح ترین ہیں اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مُثبِت ہیں۔ اور یہ اصول ہے کہ مثبت' منفی پر مقدم ہوتا ہے' لہٰذا دلائل کی رو سے بلند آواز سے پڑھنے پر دلالت کرنے والی روایات زیادہ راجح اور ثابت ہیں۔ [دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ] یعنی پہلے قیام سے کم۔ [دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ] اور [دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ] کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا تھا۔

فوائد و مسائل: ① تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ② روایات میں دو دو رکوع' تین تین رکوع' چار چار رکوع یا پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں پڑھنے کا ذکر ہے۔ ③ بعض نے ان کے درمیان جمع اور تطبیق دیتے ہوئے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے اور کسوف رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے' لہٰذا ان روایات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا لازمی ہے تاکہ تعارض دور ہو' چنانچہ یقینی اور قطعی طور پر وہی احادیث راجح ہیں جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلے کی تنقیح و تحقیق ہو جائے۔ ④ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین' پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ جس روز فوت ہوئے وہ ۱۰ ہجری ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی جبکہ انگریزی کے لحاظ سے ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے۔ اور بعض نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوا' البتہ اس سے پہلے وقوع ہوا یا نہیں' اس کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب سیرت رحمۃ للعالمین میں نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور میں وقوع پذیر ہونے والے سورج گرہن کی تعداد ذکر کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد دس بار سورج گرہن کا واقعہ پیش آیا۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپ کے لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان

سب کے آخر میں واقع ہوا۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کو بیان کیا جہاں یہ واقعات ہوئے ہیں تا کہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کیا ہے' انھوں نے بتایا کہ میں نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیر اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو معاملہ پیش آیا ہے' اللہ کی قسم! اسے میں ضرور دیکھوں گا۔ (صحیح مسلم' الکسوف' باب ذکر النداء بصلاۃ الکسوف: الصلاۃ جامعۃ' حدیث: ۹۱۳) ⑤ یہ سیاق دلالت کرتا ہے کہ یہ نبی ﷺ کے دور میں مدینے میں پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے' پہلے کا نہیں۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا۔ (صحیح مسلم' الکسوف' باب ما عرض علی النبی ﷺ..... ' حدیث : ۹۰۴) اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا۔ اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے' لہٰذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلا گرہن ۲۸ ربیع الثانی ۹ ہجری بمطابق ۱۳ اگست ۶۳۰ء کو ہوا۔ اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے۔ اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلے میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔ اور دوسرا گرہن ۲۹ شوال ۹ ہجری بمطابق ۷ فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا۔ اور تیسرا گرہن ۲۸ شوال ۱۰ ہجری بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا۔ اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعات میں سے دو گرہن ہوئے ہیں۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینے میں واقع ہوا' یعنی پہلا گرہن شدید گرمی میں لگا۔ اور ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر جو جنوری کے مہینے میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن تھا۔ اور جو ۹ ہجری شوال کے مہینے میں (فروری میں) واقع ہوا وہ دوسرا گرہن تھا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا دیکھنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ بہر حال جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں دو دفعہ سورج گرہن واقع ہوا لیکن یہ تعدد' روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تحقیق اور تلاش میں سودمند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلقہ روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں' پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین' چار چار اور پانچ پانچ رکوع کیے؟ ⑤ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز گرہن کی نماز کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔ اکثر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ صحیح مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھنا ثابت ہے' پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں' لہٰذا ہمارے نزدیک' خواہ ہم متعدد

واقعات تسلیم کریں یا نہ کریں' وہ روایات قوی ترین ہیں جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے۔ سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے راجح بھی ہیں۔ امام شافعی' امام بخاری' شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث راجح ہیں۔ واللّٰہ أعلم. اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے' حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(٤٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلَّا جَثَا النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «**اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا**». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ.

[404] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب بھی تیز و تند ہوا چلتی تو نبی ﷺ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر یوں (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے: ''الٰہی! اس (ہوا) کو رحمت بنا' اسے عذاب نہ بنا۔'' (اسے شافعی اور طبرانی دونوں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [هَبَّت] هُبُوب سے ماخوذ ہے۔ نَصَرَ يَنْصُرُ باب سے ہے۔ ہوا کا تیز و تند چلنا۔ [اَلرِّيحُ] مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں' یا تیز و تند ہوا کو۔ [قَطُّ] ''طاء'' پر تشدید ہے۔ یہ ضمہ پر مبنی ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کے لیے آتا ہے جس طرح ابدا کا لفظ مستقبل کے لیے آتا ہے۔ [جَثَا] یہ لفظ ''جیم'' اور ''ثاء'' کے ساتھ ہے اور نَصَرَ يَنْصُرُ باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

(٤٠٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ ﷺ صَلّٰى فِي زَلْزَلَةٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هٰكَذَا صَلَاةُ الْآيَاتِ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ. وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مِثْلَهُ، دُونَ آخِرِهِ.

[405] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ آپ نے زلزلے کی وجہ سے چار سجدوں اور چھ رکوعوں سے نماز پڑھی اور فرمایا کہ آیات الٰہی کی نماز اسی طرح پڑھی جاتی ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور امام شافعی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے' البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں ہیں۔)

لغوی تشریح: [فِي زَلْزَلَةٍ] اس میں فِي سبب بیان کرنے کے لیے ہے اور اس کے معنی ہیں: زلزلے کی وجہ سے۔ [سِتَّ رَكَعَاتٍ] چھ رکوع۔ [أَرْبَعَ سَجَدَاتٍ] چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو

٤٠٤ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الشافعي في الأم: ١/ ٢٥٣، والطبراني في الكبير: ١١/ ٢١٣، حديث: ١١٥٣٣ وفيه حسين بن قيس متروك. ✽ فيه قوله: أخبرني من لا أتهم: هو مجهول، والعلاء بن راشد مثله في الجهالة.

٤٠٥ـ [إسناده صحيح] أخرجه البيهقي: ٣/ ٣٤٣، وحديث علي أخرجه الشافعي وسنده ضعيف، فيه بلاغ الشافعي، أي لم يذكر سنده.

سجدے ہوتے تھے۔ [صَلَاةُ الْآيَاتِ] آیات سے یہاں ناگہانی اور پریشان کن واقعات مراد ہیں۔ [دُونَ آخِرِهِ] یعنی حدیث کے آخری الفاظ [هٰكَذَا صَلَاةُ الْآيَاتِ] نہیں ہیں، تاہم ہمارے فاضل محقق ﷾ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگہانی حادثے اور ارضی وسماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہیے۔ اسے [صَلَاةُ الْآيَاتِ] کہتے ہیں۔ ② اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا اور انھیں مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے، یہ ناقابل معافی جرم ہے اور اس کی بالکل بخشش نہیں، اس لیے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ تمام اعمال اکارت جائیں۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

١٦ - بَابُ صَلَاةِ الْاِسْتِسْقَاءِ

باب: 16- نماز استسقا کا بیان

(٤٠٦) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعًا، مُتَبَذِّلًا، مُتَخَشِّعًا، مُتَرَسِّلًا، مُتَضَرِّعًا، فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي الْعِيدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[406] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ تواضع کرتے ہوئے، ترک زینت کرتے ہوئے، خشوع ظاہر کرتے ہوئے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اور بڑی زاری اور تضرع کرتے ہوئے نماز کے لیے باہر نکلے اور نماز عید کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمھارے اس خطبے کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابوعوانہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ صَلَاةِ الْاِسْتِسْقَاءِ] اِسْتِسْقَاء کے معنی ہیں: باران رحمت طلب کرنا، یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سِقَايَة اور سَقْي پانی اور بارش کو کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ دونوں پینے اور سیراب کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ [خَرَجَ] عیدگاہ کی طرف نکلے۔ [مُتَوَاضِعًا] تَوَاضُع سے ماخوذ ہے۔ تواضع، بڑائی اور تکبر کی ضد کو کہتے ہیں۔ بڑائی اور تکبر میں اظہار شان و آن ہوتی ہے جبکہ تواضع میں عاجزی و خاکساری۔ [مُتَبَذِّلًا] تَبَذُّل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے: زیب و زیبائش کو چھوڑ دینا اور پھٹے پرانے کپڑے زیب تن کرنا۔ [مُتَخَشِّعًا] خشوع کو ظاہر کرنے والا، یعنی اس کے بدن، نظر اور آواز سے دھیما پن نمایاں ہوتا ہو۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعے سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ [مُتَرَسِّلًا] جلد بازی نہ کرنے والا، آرام و

٤٠٦ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، صلاة الاستسقاء، باب جماع أبواب صلاة الاستسقاء وتفريعها، حديث: ١١٦٥، والترمذي، الجمعة، حديث: ٥٥٨، والنسائي، الاستسقاء، حديث: ١٥٠٧، وابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: ١٢٦٦، وأحمد: ١/ ٢٣٠، ٢٦٩، ٣٥٥، وابن حبان (الإحسان): ٤/ ٢٢٩، حديث: ٢٨٥١، وأبوعوانة: ٦/ ٣٣، القسم المفقود.

سکون سے چلنے والا۔ [مُتَضَرِّعًا] تَضَرُّع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا' یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت وضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغے اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہیں کہ حال واقع ہو رہے ہیں۔ [لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ] تمھارے اس خطبے کی طرح آپ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپ خطبے کی حالت میں دعا' تضرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابوداود کی روایت میں ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز استسقا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقا کے لغوی معنی ہیں: پانی کے لیے درخواست کرنا' دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ ② استسقا کی دو قسمیں ممکن ہیں: ادنیٰ اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کے لیے باہر نکل کر عجز وانکسار اور خشوع وخضوع کی حالت میں نماز استسقا ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔ دعا کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز کے بعد ہاتھوں کی پشت چہرے کی طرف کر کے دعا مانگی جائے۔ (صحیح مسلم' صلاۃ الاستسقاء' باب رفع الیدین..... ' حدیث:۸۹۶) ③ نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبۂ جمعہ کے دوران میں ایک آدمی نے آپ سے بارش کے لیے دعا کی درخواست کی تو آپ نے اسی وقت منبر پر کھڑے ہوئے دعا فرمائی جس کے نتیجے میں بارش شروع ہوگئی اور آئندہ جمعے تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبے کے دوران میں دعا کر سکتا ہے' اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ ④ خطبے کے دوران میں خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ ⑤ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔ ⑥ استسقا کی نماز دو رکعت ہے اور اس کا وقت بھی سورج نکلنے کے بعد کا ہے۔ علاوہ ازیں وہ باہر کھلے میدان' یعنی عیدگاہ میں ادا کی جاتی ہے' اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے ''عید کی نماز'' سے تشبیہ دی۔ ⑦ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جس میں تکبیرات عیدین کی طرح پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیروں کا ذکر ہے' محققین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (سنن الدارقطني: ۲/ ۶۷' ۶۸) ⑧ ''تمھارے اس خطبے کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ بھی بنیادی طور پر دعا ہی پر مشتمل تھا' اسے تمھاری طرح غیر ضروری باتیں کر کے طول نہیں دیا۔ ⑨ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجة الله البالغة میں لکھا ہے: ''نبی ﷺ سے نماز استسقا ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھٹا پرانا ہو' ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ وزاری کریں۔ اس کے بعد امام انھیں دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قراءت بلند آواز سے کرے۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے۔ اس دوران میں چادر کو الٹا کرے۔'' جس کا طریقہ تفصیل کے ساتھ آگے آ رہا ہے۔

(۴۰۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: شَكَا النَّاسُ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قُحُوطَ

[407] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے بارش بند ہو جانے کی شکایت کی تو آپ

۴۰۷ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب رفع اليدين في الاستسقاء، حديث: ۱۱۷۳، وقصة التحويل: ذكرها البخاري، الاستسقاء، حديث: ۱۰۲۴، وبدرس أبي جعفر أخرجه الدارقطني: ۲/ ۶۶، وسنده ضعيف، حفص بن غياث مدلس وعنعن، والسند مرسل.

الْمَطَرِ، فَأَمَرَ بِمِنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي الْمُصَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْمًا يَخْرُجُونَ فِيهِ، فَخَرَجَ حِينَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللّٰهَ، ثُمَّ قَالَ: «**إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ أَنْ تَدْعُوهُ، وَوَعَدَكُمْ أَنْ يَّسْتَجِيبَ لَكُمْ**» ثُمَّ قَالَ: «**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ، اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ الْغَنِيُّ، وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلَاغًا إِلٰى حِينٍ**». ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتّٰى رُئِيَ بَيَاضُ إِبْطَيْهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ، وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، فَأَنْشَأَ اللّٰهُ تَعَالٰى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

نے منبر (لے جانے) کا حکم فرمایا، چنانچہ آپ کے لیے عیدگاہ میں منبر لا کر رکھ دیا گیا۔ آپ نے لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا کہ وہ سارے باہر نکلیں، پھر آپ اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا، آپ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور حمد و ستائش بیان کی، پھر (لوگوں سے مخاطب ہو کر) فرمایا: ''تم نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے کہ اسے پکارو وہ تمھاری دعا قبول فرمائے گا۔'' پھر فرمایا: ''تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو کائنات کا پروردگار، بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ روز جزا کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما۔ جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لیے قوت اور ایک وقت تک کے لیے گزران بنا دے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے اور آپ دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہو گئے (قبلہ رو ہو گئے) اور اپنی چادر کو پلٹایا جبکہ آپ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے، بعد ازاں لوگوں کی جانب منہ کیا اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لمحے اللہ تعالیٰ نے ایک بدلی بھیجی، وہ گرجی، چمکی، پھر برسنے لگی۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور غریب کہا ہے اور اس کی سند عمدہ ہے۔)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ، وَفِيهِ: فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، جَهَرَ

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں چادر تبدیل کرنے کا قصہ موجود ہے۔ اور اس روایت میں ہے: پھر آپ نے قبلے کی طرف رخ کیا اور دعا فرماتے

فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ.

رہے' پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی اور ان میں قراءت بلند آواز سے کی۔

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ لِيَتَحَوَّلَ الْقَحْطُ.

اور دارقطنی میں ابوجعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپ نے اپنی چادر اس لیے پلٹی کہ قحط سالی بھی اسی طرح پلٹ جائے۔

لغوی تشریح: [قُحُوطَ الْمَطَرِ] قُحُوط میں ''قاف'' پر ضمہ ہے۔ قَحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے' یعنی بندش بارش' باران رحمت کا نازل نہ ہونا۔ [وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْمًا] یعنی ایک دن مقرر فرما دیا۔ [بَدَا] نمایاں ہوا' ظاہر ہوا۔ [حَاجِبُ الشَّمْسِ] سورج کا پہلا حصہ' ایک کنارہ، یا آفتاب کی روشنی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ [جَدْبَ دِيَارِكُمْ] اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت۔ [أَنْ يَسْتَجِيبَ لَكُمْ] دعا کو قبول فرماتا ہے جیسے کہ اس نے فرمایا: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن ٤٠:٦٠) ''تم مجھے پکارو میں تمھاری پکار کو قبول کروں گا۔'' اور فرمایا: ﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة ٢:١٨٦) ''میں تو پکارنے والے کی پکار قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے۔'' [الْغَيْثَ] بارش۔ [بَلَاغًا إِلَى حِينٍ] یعنی ایسی روزی عطا فرما جو ہمیں لمبے عرصے تک لے چلے۔ اَلْبَلَاغ کے معنی ہیں: وہ چیز جس کے ساتھ کسی مطلوب ومقصود تک پہنچا جائے۔ [حَتَّى رُئِيَ ......] صیغۂ مجہول ہے۔ [اَلْإِبط] جسم کا وہ حصہ جو بازو اور کندھے کے نیچے ہے۔ إِبْط کی باء ساکن ہے' البتہ اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ [حَوَّلَ] تَحوِيل سے ماخوذ ہے' یعنی آپ نے پلٹایا' پھیرا۔ [إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ] لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف۔ [وَقَلَّبَ رِدَاءَهُ] یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف' نچلے حصے کو اوپر اور کپڑے کی اندرونی جانب کو باہر والی جانب کیا اور اسی طرح ان کیفیات کو برعکس بھی کیا۔ اس کا طریق کار یوں ہے کہ اپنے سیدھے (دائیں) ہاتھ سے' بائیں جانب کے نچلے کونے کو پکڑا جائے اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے کونے کو پکڑا جائے' پھر دائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے کونے کو دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے۔ اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ [وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ] یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ [فَأَنْشَأَ] پیدا کیا۔ [فَرَعَدَتْ] اس میں کڑک اور گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ [وَبَرَقَتْ] ''را'' کے فتحہ کے ساتھ' بُرُوق سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: بادل کا چمکنا۔ [فِي الصَّحِيحِ] اور صحیح بخاری میں ہے۔ [مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ] اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہیں۔ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ [لِيَتَحَوَّلَ الْقَحْطُ] تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے' یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبزی وشادابی میں تبدیل ہو جائے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقا کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ ② خطبۂ استسقا نماز سے پہلے پڑھا گیا اور استسقا کے لیے آپ نے دعا میں ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس

ﷺ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھائے ہوئے نہیں دیکھا۔ (صحیح البخاري' المناقب' باب صفة النبيﷺ' حدیث:٣٥٦٥' وصحیح مسلم' صلاة الاستسقاء' باب رفع الیدین بالدعاء في الاستسقاء' حدیث: ٨٩٦) امام نووی ؒ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبے کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔ سنن دارقطنی کی ابوجعفر باقر والی مرسل روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ حضرت جابر ؓ سے مستدرک حاکم اور بیہقی میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر اس لیے الٹی کہ قحط (خوشحالی میں) بدل جائے۔ اسے امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے' دیکھیے: (المستدرك للحاكم:١/٣٢٦' والسنن الكبرى للبيهقي:٣/ ٣٥١) لہٰذا دارقطنی کی مرسل روایت سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اسے موصولاً روایت کرنے والا راوی ثقہ ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت ابوجعفر باقر ؒ] ابوجعفر ''باقر'' (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ نام محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب ہے۔ امامیہ اثنا عشریہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ انھیں ''باقر'' اس لیے کہتے ہیں کہ تبقر کے معنی وسعت علمی کے ہیں اور ان کا علم بڑا وسیع تھا' بڑے ماہر و متبحر عالم تھے۔ ۵٦ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ١١٧ ہجری میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

(٤٠٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا دَخَلَ الْمَسْجِدَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! هَلَكَتِ الْأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَادْعُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «**اَللّٰهُمَّ! أَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ! أَغِثْنَا، اَللّٰهُمَّ! أَغِثْنَا**»، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[408] حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعے کے روز مسجد میں داخل ہوا' اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اموال (مویشی) ہلاک ہوگئے اور آمدورفت کے راستے بند ہوگئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی: ''الٰہی! بارش سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یاالٰہی! باران رحمت سے ہماری فریاد رسی فرما۔ اے اللہ! باران رحمت سے ہماری فریاد رسی فرما۔'' پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [اَلسُّبُلُ] سبیل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: راستہ۔ ''سین'' اور ''با'' دونوں پر ضمہ ہے۔ راستوں کے

٤٠٨ـ أخرجه البخاري، الاستسقاء، باب الاستسقاء في المسجد الجامع، حديث: ١٠١٣، ومسلم، صلاة الاستسقاء، باب الدعاء في الاستسقاء، حديث: ٨٩٧.

بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کے لیے چارہ پیدا نہیں ہو رہا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہو گئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے۔ یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنھیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے' جب چیزیں ہی نہیں تو بار برداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمد و رفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ [يُغِيثُنَا] مضارع کی ''یا'' پر ضمہ ہے' یعنی ہمیں بارش سے نواز دے تاکہ ہماری تکلیف دور ہو۔ [فَرَفَعَ يَدَيْهِ] صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ (صحيح البخاري' الاستسقاء' باب رفع الناس أيديهم مع الإمام في الاستسقاء' حديث:١٠٢٩) اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ [أَغِثْنَا] إِغَاثَة سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے جو دعا کے لیے استعمال کیا گیا ہے' یعنی ہمیں باران رحمت سے سیراب فرما۔ [فَذَكَرَ الْحَدِيثَ] راوی نے ساری حدیث بیان کی۔ جس میں مذکور ہے کہ اس دعا کے بعد بارش مسلسل نازل ہوتی رہی حتی کہ دوسرے جمعے کے روز پھر ایک آدمی دوران خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرت بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بارش رک گئی' بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہو گیا۔ مصنف نے [وَفِيهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا] کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انبیائے کرام ﷩ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے' ورنہ نبی اکرم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ ② اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام ﷡ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی ﷺ ازخود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحط سالی سے نجات دے۔ ③ یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ کا علم بھی نہیں رکھتے تھے' ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ قحط سالی کی وجہ سے بیرون شہر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔ ④ وہ آدمی کون تھا' اس میں اختلاف ہے۔ کسی نے حضرت ابوسفیان ؓ کا نام لیا ہے' حالانکہ وہ اس وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ انداز گفتگو اور طرز کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل یقیناً کوئی مسلمان تھا ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپ کو مشکل کشا سمجھ کر آپ ہی سے درخواست کرتا کہ اے اللہ کے رسول! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ بعض نے کہا: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے بارش کے لیے صرف دعا ہی فرمائی ہے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابوحنیفہ ؒ نے غالباً اسی سے استدلال کیا ہے کہ استسقا کے لیے صرف دعا کرنا سنت ہے۔ مگر دوسری احادیث سے نماز استسقا پڑھنا بھی ثابت ہے۔ ⑤ اس سلسلے کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے بارش کے لیے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے: (۱) ایک دفعہ تو آپ لوگوں کو عیدگاہ میں لے گئے' نماز پڑھائی' خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (سنن أبي داود' صلاة الاستسقاء' حديث:١١٧٣) (۲) ایک دفعہ خطبۂ جمعہ کے دوران ہی میں منبر پر کھڑے کھڑے صرف دعا فرمائی۔ (صحيح البخاري' الاستسقاء' حديث:١٠١٤) (۳) ایک مرتبہ آپ نے باقاعدہ منبر

منگوایا' اس پر بیٹھ کر مختصر خطبہ ارشاد فرمایا' دعا کی' پھر دو رکعت نماز بھی پڑھائی۔ (سنن ابن ماجہ' حدیث:۱۲۷۰) ایک مرتبہ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے دعا کی۔ (سنن أبي داود' حديث:۱۱۶۹) ایک دفعہ مسجد سے باہر نکل کر زوراء کے قریب احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (سنن أبي داود' حديث:۱۱۶۸) اور ایک دفعہ کسی جنگ کے دوران میں بارش کے لیے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (زاد المعاد بتحريج شعيب الأرنؤوط و عبدالقادر الأرنؤوط : ۱/ ۴۳۹۔۴۴۴)

(٤٠٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ كَانَ إِذَا قُحِطُوا اسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِي إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِينَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا، فَيُسْقَوْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[409] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (کے زمانے میں) جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (کی دعا) کے ذریعے سے بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے: ''اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ (کی دعا) کے ذریعے سے بارش طلب کرتے تھے' تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا۔ اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا (کی دعا کے ذریعے سے) بارش طلب کرتے ہیں' لہٰذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ (اس دعا کی قبولیت کے نتیجے میں) انھیں بارش سے سیراب کر دیا جاتا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قُحِطُوا] صیغۂ مجہول ہے' یعنی وہ قحط کا شکار ہو گئے۔ [نَسْتَسْقِي بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ] حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دعا کو وسیلہ بنا کر اور ان سے سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے' اس لیے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ [اَللّٰهُمَّ! إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِي إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا] الٰہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان کی دعا اور سفارش کے ذریعے سے بارش طلب کرتے تھے' نہ کہ ان کی ذات سے۔ [وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ] اور اب آپ کی وفات کے بعد آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا: الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہوں کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور وہ توبہ کے بغیر دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی ﷺ کے ساتھ تعلق رکھنے اور آپ کا قریبی ہونے کی وجہ سے مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے' یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں' گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب میں توبہ کے ذریعے سے فریاد رسی کے طلب گار ہیں' تیرے حضور سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں' لہٰذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا کہ پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی' زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی

٤٠٩۔ أخرجه البخاري، الاستسقاء، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، حديث: ١٠١٠.

اور لوگوں میں زندگی آ گئی۔ اس واقعے کو زبیر بن بکار نے اپنی کتاب الأنساب میں ذکر کیا ہے۔ مزید دیکھیے: (مرعاة: ۲/ ۳۹۹، و سبل السلام)

فوائد و مسائل: ① بعض لوگوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی کی ذات کا وسیلہ پکڑنا جائز ہے کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو طلب بارش کے لیے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کے لیے دعا مانگی' حالانکہ یہ استدلال سراسر لغو اور مردود ہے' اس لیے کہ یہ لوگ زندہ و مردہ اور حاضر و غائب کی ذات بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں' جبکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کو وسیلہ بنانا ثابت ہوتا ہے' ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح کسی شخصیت کا وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبیٔ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بھی جائز ہوتا کیونکہ آپ کی ذات اقدس جس طرح حالت زندگی میں محترم اور عزت والی تھی اسی طرح وفات کے بعد بھی محترم اور عزت والی ہے۔ جس طرح یہ لوگ فوت شدگان اولیاء کی ذات کو وسیلہ بناتے ہیں اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ کی ذات کو وسیلہ بناتے' حالانکہ اس طرح نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ اگر شخصیت کا وسیلہ جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر بیٹھ کر نبی ﷺ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا وسیلہ پکڑتے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر کھلی جگہ جا کر استسقا کی شکل و صورت اختیار نہ کرتے' لٰہذا ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دعا کو وسیلہ و ذریعہ بنایا تھا۔ قرآن و سنت میں صرف تین قسم کا وسیلہ جائز ہے: ٭ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کو واسطہ اور وسیلہ بنانا' جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ﴾ (الأعراف ۷:۱۸۰) ٭ اپنے نیک اعمال کو واسطہ بنانا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی دعا قرآن میں ذکر کی: ﴿رَبَّنَا اِنَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (آل عمران ۳:۱۶) اسی طرح غار میں بند ہونے والے تین نیک آدمیوں کا واقعہ۔ (صحیح البخاري' الأدب' باب إجابة دعاء من بر والديه' حدیث: ۵۹۷۴) ٭ زندہ نیک و صالح آدمی کی دعا کو واسطہ اور وسیلہ بنانا' جس طرح آپ ﷺ کی دعا کے ذریعے سے بارش طلب کی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ کسی قسم کا وسیلہ اور واسطہ جائز نہیں ہے۔ ② اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کے لیے کسی نیک اور صالح فرد کو' جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو' ساتھ لے جانا چاہیے۔ ③ اس حدیث سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں تواضع و انکسار اور خاکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ ⑤ اس حدیث سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی' خواہ فوت شدہ سے مرتبے اور منصب میں کم تر ہو' دعا اسی سے کرانی چاہیے۔ ⑥ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں ثابت نہیں ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ] نبی ﷺ کے چچا تھے۔ ان کی کنیت ابوالفضل ہے۔ بیت اللہ کی آبادکاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تاکہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوے میں شریک بھی ہوئے۔ غزوۂ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ ہجری رجب یا رمضان میں

وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

(٤١٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ ثَوْبَهُ حَتّٰى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ، وَقَالَ: إِنَّهُ حَدِيثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[410] حضرت انس ؓ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ بارش ہونے لگی۔ تو آپ نے اپنے بدن اطہر سے کپڑا ہٹا لیا حتی کہ بارش آپ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور آپ نے فرمایا: ''یہ ابھی ابھی اپنے رب کے ہاں سے آئی ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَحَسَرَ ثَوْبَهُ] رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدن مبارک کے بعض حصے سے کپڑا ہٹا لیا۔ [حَتّٰى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ] حتی کہ بارش کے کچھ قطرے آپ کے جسم پر پڑ گئے۔ [حَدِيثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ] اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسے رب نے پیدا کیا اور بنایا ہے، یعنی بارش رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی پیدا فرمایا ہے، لہٰذا اس کے ذریعے سے برکت حاصل کی جائے۔

فوائد و مسائل: ① حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش اللہ کی رحمت ہے۔ ابھی یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گناہ گار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ ② اس حدیث میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ ③ بارش کے پانی میں نہانا مفید اور جائز ہے۔

(٤١١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ قَالَ: «**اَللّٰهُمَّ! صَيِّبًا نَافِعًا**». أَخْرَجَاهُ.

[411] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بارش کو دیکھتے تو اس طرح دعا مانگتے: ''اے اللہ! اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔'' (اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [صَيِّبًا] ''صاد'' پر فتحہ اور ''یا'' کے نیچے کسرہ اور تشدید ہے۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اصل میں تھا: [اِجْعَلْهُ صَيِّبًا نَافِعًا] یعنی اسے نفع بخش بنا دے۔ [أَخْرَجَاهُ] اسے ان دونوں نے نکالا (بیان کیا) ہے۔ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(٤١٢) وَعَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ

[412] حضرت سعد ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

٤١٠ـ أخرجه مسلم، صلاة الاستسقاء، باب الدعاء في الاستسقاء، حديث: ٨٩٨.

٤١١ـ أخرجه البخاري، الاستسقاء، باب ما يقال إذا أمطرت، حديث: ١٠٣٢، ومسلم، صلاة الاستسقاء، باب التعوذ عند رؤية الريح والغيم.......، حديث: ٨٩٩.

٤١٢ـ **[إسناده ضعيف جدا]** أخرجه أبوعوانة: ٢/ ١١٩ . * فيه أبومحمد عبدالله بن محمد بن عبدالله الانصاري المدني ولم أجد له ترجمة، ولعله البلوي المترجم في لسان الميزان وهو كذاب.

النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ: «اَللّٰهُمَّ! جَلِّلْنَا سَحَابًا كَثِيفًا، قَصِيفًا، دَلُوقًا، ضَحُوكًا، تُمْطِرُنَا مِنْهُ رُذَاذًا، قِطْقِطًا، سَجْلًا، يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ». رَوَاهُ أَبُو عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ.

بارش طلب کرنے کے لیے یہ دعا مانگی: ''الٰہی! ہمیں ایسے بادل سے ڈھانپ لے جو گہرا تہ بہ تہ، کڑ کنے والا، زور سے برسنے والا، چمکنے گرجنے والا ہو، تو اس سے ہم پر چھوٹے چھوٹے قطرات والی، انتہائی باریک بوندوں والی اور موسلا دھار بارش برسا۔ اے بزرگی اور عزت کے مالک!'' (اسے ابوعوانہ نے اپنی ''صحیح'' میں روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [جَلِّلْنَا] تَجْلِيل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے، یعنی امر دعا کے لیے ہے۔ معنی ہیں کہ یہ بادل روئے زمین پر چھا جائے۔ [كَثِيفًا] گاڑھا، تہ بہ تہ [قَصِيفًا] ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زوردار بارش کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فَعِيل کے وزن پر ہیں۔ [دَلُوقًا] ''دال'' پر فتحہ اور ''لام'' پر ضمہ ہے۔ زور سے برسنے والا، جیسے کہتے ہیں: [دَلَقَ السَّيْلُ عَلَى الْقَوْمِ] یعنی سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ [ضَحُوكًا] ''ضاد'' پر فتحہ اور ''حا'' پر ضمہ ہے۔ ایسا چمکنے والا جس میں بجلی ہو۔ [رُذَاذًا] ''را'' پر ضمہ اور ''ذال'' مخفف ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطرے، باریک باریک بوندیں۔ [قِطْقِطًا] دونوں ''قاف'' کسرہ کے ساتھ اور پہلا ''طا'' ساکن ہے۔ باریک بوندیں حتی کہ رُذاذ سے بھی چھوٹے قطرے جو رائی کے دانوں کے برابر ہوں۔ [سَجْلًا] ''سین'' پر فتحہ اور ''جیم'' ساکن ہے۔ زوردار بارش۔ یہ مصدر ہے۔ اس کے ساتھ سَحَابًا کی صفت بیان کی گئی ہے معنی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے، یعنی موسلا دھار برسنے والا بادل۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ سے استسقا کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں، تاہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہاں پر اس دعا کو ذکر کرنے کے بعد حدیث پر حکم کی بابت خاموشی اختیار فرمائی ہے جبکہ تلخیص الحبیر میں اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے غریب الفاظ ہیں، نیز ابوعوانہ نے اسے نہایت کمزور سند سے بیان کیا ہے۔ (التلخيص الحبير: ۲/ ۹۹) علاوہ ازیں ہمارے فاضل محقق نے بھی اسے سنداً سخت ضعیف قرار دیا ہے۔

(٤١٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَسْتَسْقِي، فَرَأَى نَمْلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلٰى ظَهْرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَاءِ، تَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! إِنَّا خَلْقٌ مِّنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنًى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «اِرْجِعُوا فَقَدْ سُقِيتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[413] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت سلیمان علیہ السلام بارش طلب کرنے کے لیے باہر نکلے تو انھوں نے ایک چیونٹی کو پشت کے بل لیٹے ہوئے، ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے دیکھا، جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی: الٰہی! ہم بھی تیری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں اور تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: چلو واپس چلیں، تم اپنے

٤١٣ـ [حسن] أخرجه أحمد، ولم أجده، عزاه المؤلف في كتابه اتحاف المهرة: ١٦/ ١ ص ٧٠، حديث: ٢٠٣٩٩ إلى الحاكم فقط، قال المؤلف: أخرجه الحاكم في المستدرك: ١/ ٣٢٥ وصححه [ووافقه الذهبي].

غیر کی دعا کی بدولت بارش سے سیراب کر دیے گئے ہو۔''
(اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُسْتَلْقِيَةٌ عَلٰى ظَهْرِهَا] اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ [قَوَائِمَهَا] قَائِمَةٌ کی جمع ہے۔ پاؤں۔ [خَلْقٌ] ''خا'' پر فتحہ اور ''لام'' ساکن ہے۔ تیری مخلوقات میں سے ایک مخلوق۔ [سُقْيَاكَ] ''سین'' پر ضمہ اور ''قاف'' ساکن ہے۔ تیری بارش۔ [سُقِيتُمْ] صیغۂ مجہول۔ تم لوگ بارش کے ساتھ سیراب کر دیے گئے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سابقہ پیغمبر بھی بارش کی بندش کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر بارش طلب کرنے جاتے تھے۔ ② دعائے استسقا یا نماز استسقا آبادی سے باہر ہی ادا کرنی چاہیے' اس طرح آبادی کی گہما گہمی' ہنگامہ خیزی اور شور و شغف سے دور ہو کر اللہ کی طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

(٤١٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِسْتَسْقٰى فَأَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

[414] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بارش کے لیے دعا فرمائی تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کی پشت کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ إِلَى السَّمَاءِ] ہاتھوں کی پشت کو چہرے کی طرف کیا۔ یہ صورت عام معمول کے مطابق دعا مانگنے کی صورت کے برعکس ہے۔ جب کسی ضرر کو دور کرنا مطلوب ہو تو اسی طرح دعا کرتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ سے سیدھے ہاتھوں سے دعا مانگنا بھی منقول ہے جبکہ اس حدیث میں عام طریقۂ دعا کے برعکس یہ طریقہ اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ ② ان دونوں طریقوں میں علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ رحمت طلب کرنے کے لیے دعا کے وقت ہتھیلیوں کا رخ اوپر کو ہونا چاہیے اور جب ضرر و مصیبت کو دور کرنے کے لیے دعا مانگی جائے تو ہتھیلیوں کا رخ نیچے کو کیا جائے۔ اس سے تفاؤل (اچھی فال) مراد ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہماری حالت کو اس طرح تبدیل فرما دے۔ ③ دعائے استسقا کے وقت چادر کو الٹانے اور پھیرنے میں بھی غالباً یہی حکمت کارفرما ہے اور ہتھیلیوں کے نیچے کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کے منہ بھی نیچے کر دے تاکہ بارش خوب برسے جو خشک سالی کو ہریالی سے بدل ڈالے۔

١٧ - بَابُ اللِّبَاسِ

باب: 17- لباس کا بیان

(٤١٥) عَنْ أَبِي عَامِرٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ

[415] حضرت ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'

٤١٤ـ أخرجه مسلم، صلاة الاستسقاء، باب رفع اليدين بالدعاء في الاستسقاء، حديث: ٨٩٦.

٤١٥ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، اللباس، باب ما جاء في الخز، حديث: ٤٠٣٩، وأصله في البخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر ويسميه بغير اسمه، حديث: ٥٥٩٠.

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَ وَالْحَرِيرَ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں لازماً کچھ ایسی قومیں ہوں گی جو زنا اور ریشم کو حلال سمجھیں گی۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ اللِّبَاسِ] جو لباس حرام اور حلال ہیں' ان کا بیان ہے۔ اور کتاب الصلاۃ میں اس کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ نماز کے صحیح اور خراب ہونے کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ [اَلْحِرَ] شیخ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ نے الباعث الحثیث' ص ۳۴ پر لکھا ہے کہ حِرَ میں ''حا'' کے نیچے کسرہ اور ''را'' مخفف ہو تو اس صورت میں زنا کے معنی میں مستعمل ہے' یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ خز یعنی ''خا'' معجمہ اور ''زا'' معجمہ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے جس سے مراد ریشم کی ایک قسم ہے۔ مگر یہ دراصل تصحیف ہے جیسا کہ حافظ ابوبکر بن العربی نے کہا ہے' ملاحظہ ہو: (فتح الباري : ١٠/ ٤٥-٤٩) [اَلْحَرِيرَ] ریشم کی تمام اقسام کے لیے حریر کا لفظ مستعمل ہے۔

فائدہ: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں: ایک ریشم کا پہننا' دوسرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا آدمی کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے' اسی لیے اسے امت کے مردوں پر حرام قرار دیا گیا ہے' نیز یہ زینت اور لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورتوں کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کے لیے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ] ان کا نام عبداللہ بن ہانی یا عبید بن وہب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٤١٦) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ وَالدِّيبَاجِ، وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[416] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے' باریک اور موٹا ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [دِيبَاج] موٹے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(٤١٧) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ

[417] حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول

٤١٦ـ أخرجه البخاري، اللباس، باب افتراش الحرير، حديث: ٥٨٣٨.

٤١٧ـ أخرجه البخاري، اللباس، باب لبس الحرير للرجال وقدر ما يجوز منه، حديث: ٥٨٢٨، ومسلم، اللباس، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة، حديث: ٢٠٦٩.

قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ، إِلَّا مَوْضِعَ إِصْبَعَيْنِ أَوْثَلَاثٍ أَوْأَرْبَعٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

اللہ ﷺ نے ریشم پہننے سے منع فرمایا' سوائے دو یا تین یا چار انگشت جگہ کے برابر۔ (بخاری و مسلم۔ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

فائدہ: مردوں کے لیے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے' البتہ خارش وغیرہ کے عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

(٤١٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِي قَمِيصِ الْحَرِيرِ، فِي سَفَرٍ، مِنْ حِكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[418] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کو دوران سفر میں ریشمی قمیص پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی' اس وجہ سے کہ انھیں خارش تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [فِي سَفَرٍ] غزوے کے لیے جاتے ہوئے دوران سفر میں۔ [مِنْ حِكَّةٍ] خارش کی وجہ سے۔ ''حا'' کے نیچے کسرہ اور ''کاف'' پر تشدید ہے۔ خارش کی ایک قسم۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے جوؤں کی شکایت کی تھی تو آپ نے ریشم زیب تن کرنے کی اجازت عنایت فرما دی۔ (صحيح البخاري' الجهاد والسير' باب الحرير في الحرب' حديث:٢٩٢٠) اور یہ بھی ممکن ہے کہ خارش جوؤں ہی کی وجہ سے ہوتی ہو۔ انھیں ریشم کی رخصت اس لیے دی کہ ریشم میں نرمی اور گداز پن ہوتا ہے جو خارش کی تکلیف میں کمی کا باعث ہے' نیز اس کپڑے میں جوئیں بھی کم ہی پڑتی ہیں۔ گویا دفع ضرر کی حد تک ریشم کی اجازت ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت زبیر رضی اللہ عنہ] یہ زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد قرشی اسدی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے حواری' یعنی قریبی ساتھی تھے۔ آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر اور عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ غزوات میں اسلام کے جری اور بہادر افراد میں شمار ہوتے تھے۔ جنگ جمل سے واپسی کے بعد ۳۶ ہجری کو شہید کر دیے گئے۔

(٤١٩) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَسَانِي النَّبِيُّ ﷺ حُلَّةً سِيَرَاءَ، فَخَرَجْتُ فِيهَا، فَرَأَيْتُ الْغَضَبَ فِي وَجْهِهِ، فَشَقَّقْتُهَا بَيْنَ نِسَائِي. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ

[419] حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے ریشمی دھاریوں والا حلّہ (جوڑا) عنایت فرمایا۔ میں اسے پہن کر باہر نکلا تو میں نے آپ کے رخ انور پر غصے اور ناراضی کے آثار دیکھے' چنانچہ میں نے

٤١٨ـ أخرجه البخاري، اللباس، باب ما يرخص للرجال من الحرير للحكة، حديث: ٥٨٣٩، ومسلم، اللباس، باب إباحة لبس الحرير للرجل، حديث: ٢٠٧٦.

٤١٩ـ أخرجه البخاري، اللباس، باب الحرير للنساء، حديث: ٥٨٤٠، ومسلم، اللباس، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء، حديث: ٢٠٧١.

مُسْلِمٍ.

اسے پھاڑ کر اپنی (رشتے دار) خواتین میں تقسیم کر دیا۔
(بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [كَسَانِي] مجھے پہنایا، یعنی مجھے عنایت فرمایا۔ [حُلَّة] "حا" پر ضمہ اور "لام" پر تشدید ہے۔ نیا کپڑا، نیا لباس۔ حُلَّه دراصل ایک رنگ کے دو کپڑوں، ازار (تہبند) اور چادر کو کہتے ہیں جو سارے بدن کو ڈھانپ لے۔ [سِيَرَاءَ] نصب کی صورت میں حُلَّه کی صفت ہے اور جر کی صورت میں حُلَّه کا مضاف الیہ ہے۔ اور سِيَرَاء کے "سین" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر فتحہ ہے۔ وہ چادر جس میں دھاریاں ہوں یا جس میں ریشم استعمال ہوا ہو۔ [فَخَرَجْتُ فِيهَا] میں اسے پہن کر باہر نکلا۔ [فَرَأَيْتُ الْغَضَبَ فِي وَجْهِهِ] میں نے آپ کے رخ انور پر غصے و ناراضی کے آثار دیکھے، اس لیے کہ یہ حلہ ریشمی تھا۔ [فَشَقَقْتُهَا] میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا یا بانٹ دیا۔ [بَيْنَ نِسَائِي] اپنے گھر کی خواتین میں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کی اہلیہ، والدہ، چچا زاد بہن اور بھاوج (عقیل کی بیوی) ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا نام فاطمہ تھا، یعنی (فاطمہ بنت محمد (ﷺ)، فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ زوجۂ عقیل ؓ)

فوائد و مسائل: ① نبی ﷺ کو یہ حلہ تحفے کے طور پر ملا تھا۔ آپ نے یہ حضرت علی ؓ کو دے دیا جسے حضرت علی ؓ نے زیب تن فرمایا مگر آپ ﷺ نے اس پر اظہار غصہ فرمایا اور ناراض ہوئے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں نے تمھیں پہننے کے لیے نہیں دیا تھا بلکہ اس لیے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔" (صحیح مسلم، اللباس والزینة، حدیث:۲۰۷۱) چنانچہ حضرت علی ؓ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ ② اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے، خواہ اس کا استعمال مرد کے لیے جائز نہ ہو۔

(٤٢٠) وَعَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيرُ لِإِنَاثِ أُمَّتِي. وَحُرِّمَ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

[420] حضرت ابوموسیٰ ؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال کر دیا گیا ہے اور مردوں پر حرام۔" (اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح بھی قرار دیا ہے۔)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے سونا پہننا بصورت زیور جائز ہے مگر ترغیب نہیں، اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(٤٢١) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللّٰهَ

[421] حضرت عمران بن حصین ؓ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ جب وہ اپنے کسی

٤٢٠ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، اللباس، باب ما جاء في الحرير والذهب، حديث: ١٧٢٠، والنسائي، الزينة، حديث: ٥١٥١، وأحمد: ٤/ ٣٩٢.

٤٢١ـ [صحيح] أخرجه البيهقي: ٣/ ٢٧١، وأحمد: ٤/ ٤٣١، وللحديث شواهد.

يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلٰى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَّرٰى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ.

بندے پر انعام فرمائے تو اس نعمت کا اثر اس پر دیکھے۔'' (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہیے۔ ② اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ ③ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(٤٢٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْقَسِّيِّ وَالْمُعَصْفَرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[422] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ''قس'' (شہر) کے بنے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْقَسِّيِّ] ''قاف'' پر فتحہ اور ''سین'' کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید ہے اور اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ ''قس'' شہر کی طرف منسوب ہے۔ یہ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام ہے جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے۔ یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ قـز کی طرف منسوب ہے۔ اور یہ ریشم کا بیکار بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ ''زا'' اور ''سین'' کے قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ''زا'' کو ''سین'' میں تبدیل کر دیا اور قـز سے قـس بن گیا۔ [وَالْمُعَصْفَرِ] رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفر سے رنگا ہوا۔ عصفر ہندی زبان میں کسنبے کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی اور زردی کے درمیان درمیان ہوتا ہے۔ ہندو کاہن، سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ واللہ أعلم.

(٤٢٣) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: رَأٰى عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ثَوْبَيْنِ مُعَصْفَرَيْنِ، فَقَالَ: «أُمُّكَ أَمَرَتْكَ بِهٰذَا؟». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[423] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے دیکھے تو فرمایا: ''کیا تیری ماں نے تجھے یہ پہننے کا حکم دیا ہے؟'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رَأٰى عَلَيَّ] علیٰ حرف جر ہے اور اس کے ساتھ ''یائے متکلم'' مجرور ہے، اس لیے ''یا'' کے اوپر تشدید ہے۔ [أُمُّكَ أَمَرَتْكَ؟] أَمَرَ سے صیغۂ واحد مؤنث غائب ہے۔ یہ بات آپ نے شدید ناپسندیگی کے اظہار کے طور پر فرمائی۔

٤٢٢ـ أخرجه مسلم، اللباس، باب النهي عن لبس الرجل الثوب المعصفر، حديث: ٢٠٧٨.

٤٢٣ـ أخرجه مسلم، اللباس، باب النهي عن لبس الرجل الثوب المعصفر، حديث: ٢٠٧٧.

فائدہ: بعض علماء نے اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے: کیا اسے تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں' اس لیے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً نبی ﷺ نے تنبیہ اور زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔'' (صحیح مسلم' اللباس والزینة' حدیث:۲۰۷۷)

(٤٢٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَّيْنِ وَالْفَرْجَيْنِ بِالدِّيبَاجِ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا حَتّٰى قُبِضَتْ، فَقَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضٰى، نَسْتَشْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمُفْرَدِ: وَكَانَ يَلْبَسُهَا لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

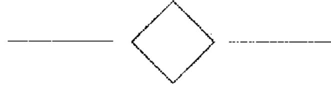
[424] حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا ایک چوغہ نکالا جس کے گریبان' آستینیں اور چاک (سینے کی پٹیوں) پر دبیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں رہا' جب وہ وفات پا گئیں تو میں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ نبی ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ ہم اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے اور شفا طلب کرتے ہیں۔ بخاری نے الأدب المفرد میں یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کے لیے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: [مَكْفُوفَةَ] منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ مَكْفُوف کا مطلب ہے: ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہو۔ [الْجَيْب] ''جیم'' پر فتحہ اور ''یا'' ساکن ہے۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے' یعنی گریبان۔ [وَالْكُمَّيْنِ] ''کاف'' پر ضمہ اور ''میم'' پر تشدید کے ساتھ۔ کُم کا تثنیہ ہے۔ قمیص کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ [وَالْفَرْجَيْنِ] ''فا'' پر فتحہ اور ''را'' ساکن کے ساتھ۔ فرج کا تثنیہ ہے۔ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے' بسا اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے' مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہونے لگا۔ [دِيبَاج] دبیز' موٹا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا ہے۔ [حَتّٰى قُبِضَتْ] صیغۂ مجہول' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ [فَقَبَضْتُهَا] تو میں نے اس جبے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ [نَسْتَشْفِي بِهَا] صیغۂ معروف کا متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں يُسْتَشْفٰى صیغۂ مجہول بھی ہے' یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی کیونکہ وہ رسول اکرم ﷺ کے جسد اطہر کو چھوتا تھا۔ [لِلْوَفْدِ] ''واؤ'' پر فتحہ اور ''فا'' ساکن ہے۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر یا کسی معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور اجلاس کے مواقع پر زینت و زیبائش کے

٤٢٤۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، اللباس، باب الرخصة في العلم وخيط الحرير، حديث: ٤٠٥٤، وأصله في صحيح مسلم، اللباس والزينة، حديث: ٢٠٦٩، والأدب المفرد للبخاري، حديث: ٣٤٨.

لیے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا مفہوم بھی اس حدیث میں ہے کہ یہ ریشم کپڑے کے عرض میں لگا ہوا ہو' اور اگر لمبائی میں لگا نا ہو تو آستینوں اور گریبان کی گولائی اور چاک کے طول کے حساب سے ہو۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت' امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں کے لیے وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مواقع کے لیے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے۔ عمدہ' اچھا اور صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہیے بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو۔ فخر و ریا' کبر و نخوت اور شان نمائی سے بچا جائے اور ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا جائے۔



٣ - كِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے سے متعلق احکام ومسائل

(٤٢٥) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ: اَلْمَوْتِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[425] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لذتوں کو توڑ دینے والی' یعنی موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو۔'' (اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كِتَابُ الْجَنَائِزِ] ''جیم'' پر فتحہ ہے اور بس۔ جنائز، جنازۃ کی جمع ہے۔ جنازہ کی ''جیم'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے اور یہ چارپائی پر رکھی ہوئی میت پر بولا جاتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق ''جیم'' پر فتحہ ہے' اس صورت میں اس کے معنی میت کے ہیں اور کسرے (زیر) کی صورت میں اس سے مراد وہ چارپائی ہے جس پر میت پڑی ہو۔ اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے' یعنی فتحہ کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرے کی صورت میں میت۔ کتاب الصلاۃ کے متصل بعد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین کے جملہ امور وافعال میں سے نماز جنازہ زیادہ اہم ہے' اور ان دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلاۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق نماز جنازہ کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال میں ہوئی۔

٤٢٥۔ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، الزهد، باب ما جاء في ذكر الموت، حديث:٢٣٠٧، وقال: حسن غريب، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٨٢٥، وابن حبان (الإحسان): ٤/ ٢٨٢، حديث: ٢٩٨٤.

[أَكْثِرُوا] إِكْثَار سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو۔ [هَاذِمِ] مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور یہ [اَللَّذَّاتِ] کی طرف مضاف ہے۔ [هَاذِم] ''ذال'' کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے کاٹ ڈالنے والی' توڑ دینے والی۔ موت کا نام هَاذِمِ اللَّذَّات' یعنی لذتوں کو توڑ دینے والی اس لیے رکھا گیا ہے کہ جب موت کی یاد آتی ہے تو تمام لذتیں اور مزے ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی یاد آدمی کو دنیا کی لذتوں سے بے رغبت کر دیتی ہے' یا اس نام کی وجہ یہ ہے کہ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی' سب ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک روایت میں [هَادِمِ] (دال مہملہ کے ساتھ) بھی منقول ہے جو هَدَمَ الْبِنَاءَ وَالْجِدَار کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص عمارت یا دیوار کو گرائے۔ اس میں دنیا کی فانی اور زوال پذیر لذتوں کو منہدم' اجڑی ہوئی اور تباہ شدہ عمارت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' اس لیے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ [اَلْمَوْتِ] جر (کسرہ) کی صورت میں عطف بیان ہوگا اور رفع صورت میں هُوَ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور نصب کی صورت میں أعني کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اور یہ هاذم کی تفسیر و وضاحت ہے۔

فائدہ: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرینش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کے مشاہدے میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہر ایک کے اعزہ و اقرباء' احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے' سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی' خوف' محاسبۂ اعمال' قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا مزید جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے' اسی لیے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(٤٢٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لَابُدَّ مُتَمَنِّيًا، فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ! أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[426] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے' جو اس پر نازل ہوئی ہو' موت کی تمنا و خواہش ہرگز ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہیے: اے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے خیر کا باعث ہو اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [لَا يَتَمَنَّيَنَّ] تمني سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کے لیے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ [لِضُرٍّ] ''ضاد'' پر ضمہ ہے اور کبھی فتحہ بھی آ جاتا ہے۔ کسی جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے۔ [لَابُدَّ] ''با'' پر ضمہ اور ''دال'' پر

٤٢٦ـ أخرجه البخاري، المرضى، باب تمني المريض الموت، حديث: ٥٦٧١، ومسلم، الذكر والدعاء، باب كراهية تمني الموت لضر نزل به، حديث: ٢٦٨٠.

تشدید ہے۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ [أَحْيِنِي] اس میں ہمزہ قطعی ہے، یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہیں: مجھے زندگی عطا فرما۔ [تَوَفَّنِي] مجھے وفات دے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آ کر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے، البتہ شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں فتنے کے اندیشے کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔ ② ایک سچے پکے مومن کے لیے زندگی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نیک آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے، بدکردار اور بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے، اس لیے دنیوی مصائب و آلام، مفلسی، غربت اور بیماری وغیرہ سے تنگ آ کر موت کی آرزو نہ کرے، البتہ رب کائنات سے ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ ③ اگر دین کے بارے میں کسی فتنے اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت کی تمنا اور آرزو کی جا سکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو درجات کی بلندیوں پر پہنچانے کا باعث ہیں۔

؎ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

(٤٢٧) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**اَلْمُؤْمِنُ يَمُوتُ بِعَرَقِ الْجَبِينِ**». رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[427] حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''مومن پیشانی کے پسینے کے ساتھ مرتا ہے۔'' (اس روایت کو تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِعَرَقِ الْجَبِينِ] عرق کی ''عین'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ ہے۔ معنی ہیں: پسینہ، یعنی وہ پانی جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ مومن کے گناہوں کی تطہیر کے لیے موت کے وقت اس کی پیشانی پر پسینہ رونما ہوتا ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس میں کنایہ کیا گیا ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن طلب حلال، صوم و صلاۃ کی ادائیگی اور احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلے میں محنت و مشقت اور کدوکاوش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(٤٢٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ:

[428] حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے مرنے والوں کو

٤٢٧ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، الجنائز، باب ما جاء أن المؤمن يموت بعرق الجبين، حديث: ٩٨٢، وقال: حسن، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٨٢٩، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٥٢، وابن حبان (موارد الظمآن)، حديث: ٧٣٠.

٤٢٨ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب تلقين الموتى لا إله إلا الله، حديث: ٩١٦، وأبوداود، الجنائز، حديث: ٣١١٧، والترمذي، الجنائز، حديث: ٩٧٦، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٨٢٧، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٤٤، ١٤٤٥.

«لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْأَرْبَعَةُ.

[لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ] کی تلقین کرو۔'' (اسے مسلم اور چاروں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَقِّنُوا] تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: یاددہانی کراؤ۔ [مَوْتَاكُمْ] مَوْتٰی، میت کی جمع ہے۔ اس سے وہ قریب المرگ لوگ مراد ہیں جن پر موت کے ابتدائی آثار محسوس ہو رہے ہوں۔

فائدہ: اس حدیث میں صرف لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کا ذکر ہے' اس لیے اسی پر اکتفا بہتر ہے اور حدیث کے ظاہر الفاظ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ تلقین سے عام طور پر علماء نے یہ مراد لیا ہے کہ قریب الوفات شخص کے پاس لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پڑھا جائے تا کہ وہ بھی سن کر پڑھ لے۔ علامہ محمد فواد عبدالباقی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کے حاشیے میں یہی لکھا ہے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم، الجنائز، باب تلقین الموتی: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) جبکہ بعض علماء اس کی بابت فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ میت، یعنی جو مر رہا ہو اسے نرمی سے یہ کلمہ یاد دلائیں اور زیادہ اصرار نہ کریں' ایسا نہ ہو کہ وہ انکار کر بیٹھے' البتہ مولانا عبدالتواب محدث ملتانی، علامہ ناصر الدین البانی رحمہما اللہ اور کئی دیگر علمائے محققین کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تلقین سے مراد کلمۂ توحید پڑھ کر اسے صرف سنانا ہی نہیں بلکہ اسے کہا جائے کہ وہ بھی پڑھے' اور یہ اس لیے کہ لفظ ''تلقین'' کا اصل مفہوم ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے' وہ اس طرح کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی سے اعادہ کرانے کے لیے کوئی بات کہنا' سکھانا' بتانا اور بالمشافہ سمجھانا' اسی کو تلقین کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ خود جناب رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا: [يَا خَالُ! قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ] یعنی ''ماموں جان! لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہیے۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے: (مسند أحمد: ١٥٢/٣) اور حدیث کی رو سے یہی رائے اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔ واللہ أعلم.

(٤٢٩) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اِقْرَءُوا عَلٰى مَوْتَاكُمْ يٰسٓ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[429] حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اِقْرَءُوا] امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: پڑھو' پڑھا کرو۔ [عَلٰى مَوْتَاكُمْ] جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہو۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورۂ یٰسٓ پڑھنے کی بنا پر میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے' اس لیے قریب المرگ شخص پر سورۂ یٰسٓ پڑھنے کا رواج صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہے' لہٰذا اس کے بجائے یہ دعا کی جائے کہ اے اللہ! اس کے لیے اس دشوار مرحلے

٤٢٩ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الجنائز، باب القراءة عند الميت، حديث: ٣١٢١، والنسائي في الكبرٰى، حديث: ١٠٩١٣، وعمل اليوم والليلة، حديث: ١٠٧٤، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٤٨، وابن حبان (الإحسان): ٣/٥، حديث: ٢٩٩١. ※ فيه أبوعثمان وهو مجهول كما قال ابن المديني وغيره، وأبوه لا يعرف، والحديث ضعفه الدار قطني.

کو آسان فرمادے۔

راویٔ حدیث: [حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ] معقل میں ''میم'' پر فتحہ'' ''عین'' ساکن اور ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے۔ مزینہ قبیلے کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نہر منسوب ہے جو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے کھودی تھی' اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے: [إِذَا جَاءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ] ''جب اللہ کی نہر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی نہر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔'' آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخر دور میں ۶۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک یزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(٤٣٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَدْ شَقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ»، فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لَا تَدْعُوا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُؤَمِّنُ عَلٰى مَاتَقُولُونَ»، ثُمَّ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّينَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّرْ لَهُ فِيهِ، وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[430] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت تشریف لائے تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ آپ نے اسے بند کر دیا اور پھر فرمایا: ''جب روح قبض کی جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے۔'' (یہ سن کر) گھر کے لوگ گھبراہٹ اور پریشانی سے رونے اور چیخنے لگے تو آپ نے فرمایا: ''اپنے لیے اچھی اور بہتر دعا کے سوا کچھ نہ کہا کرو کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں۔'' پھر آپ نے دعا فرمائی: ''الٰہی! ابوسلمہ (رضی اللہ عنہ) کی مغفرت فرما' ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ و مرتبہ بلند فرما' اس کی قبر کشادہ و وسیع فرما' اسے منور فرما' اس کے پیچھے رہنے والوں میں نائب و قائم مقام ہو جا۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [شَقَّ] ''شین'' پر فتحہ کے ساتھ۔ صیغۂ معلوم ہے۔ [بَصَرُهُ] اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے جب کہ اسے فعل لازم مانا جائے۔ اور نصبی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے' یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ اور آنکھ کا کھلا رہ جانا موت سے کنایہ ہے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹتی نہیں بلکہ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔ [فَأَغْمَضَهُ] آپ نے اسے بند کر دیا' یعنی آنکھ کے پپوٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ [قُبِضَ] صیغۂ مجہول ہے۔ [فَضَجَّ] اس میں فا' تعقیب کے لیے ہے' یعنی پھر اہل خانہ نے اس کی موت کا سن کر گھبراہٹ اور پریشانی سے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح وَاوَیْلَاہ اور وَاثُبُورَاہ کہہ رہے تھے' اس لیے آپ ﷺ نے انھیں تلقین فرمائی کہ ایسے نہ کہو بلکہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کیونکہ فرشتے

٤٣٠۔ أخرجه مسلم، الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له إذا حضر، حديث: ٩٢٠.

تمھارے لیے آمین کہتے ہیں۔ [تُؤَمِّنُ] تأمین سے ہے' یعنی آمین کہتے ہیں۔ [وَافْسَحْ] وسیع وکشادہ فرما دے۔ [نَوِّرْ] تنویر سے امر کا صیغہ ہے' یعنی اس کے لیے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ [وَاخْلُفْهُ] باب نَصَرَ یَنْصُرُ سے' یعنی اس کا نائب وقائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ [فِي عَقِبِهِ] ''عین'' پر فتحہ اور ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اور عقبہ سے اس جگہ اس کے پیچھے رہنے والے مراد ہیں' یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل وعیال اور اولاد وغیرہ میں سے جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب ومحافظ بن جا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی روح جسد خاکی سے جب پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں' انھیں فوراً بند کر دینا چاہیے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل وعیال اور اعزہ واقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہیے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کے لیے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت وبخشش کی دعا کی جا سکتی ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی' مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

وضاحت: [حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ] ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ آپ' رسول اللہ ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں کے رضاعی بھائی ہیں۔ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی ثویبہ نے انھیں اپنا دودھ پلایا۔ اپنی اہلیہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہو گیا مگر پھر خراب ہو گیا اور ۴ ہجری میں جمادی الاولیٰ کی تین تاریخ کو وفات پائی۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شوال میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حرم نبوی میں داخل فرما لیا۔

(٤٣١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ، سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[431] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب فوت ہوئے تو آپ کو ایک دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [سُجِّيَ] تسجية (باب تفعيل) سے صیغۂ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔ [بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ] اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور موصوف صفت کی بھی۔ اور بُرد کی ''با'' پر ضمہ اور ''را'' ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا۔ اور حِبَرَة میں ''حا'' کے نیچے کسرہ اور ''با'' پر فتحہ ہے۔ بیل بوٹے والی چادر۔ اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔

فوائد ومسائل: ① میت کو غسل دینے سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ ② اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نبی ﷺ پر بھی موت وارد ہوئی ہے۔ ③ اس حدیث سے حیات النبی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا کہ اگر

٤٣١ـ أخرجه البخاري، اللباس، باب البرود والحبر والشملة، حديث: ٥٨١٤، ومسلم، الجنائز، باب تسجية الميت، حديث: ٩٤٢.

آپ نے وفات نہیں پائی تو آپ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا گیا جو فوت ہونے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے' یعنی غسل اور تدفین وتجہیز وغیرہ۔

(٤٣٢) وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَبَّلَ النَّبِيَّ ﷺ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[432] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی وفات کے بعد آپ (کی پیشانی) کو بوسہ دیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قَبَّلَ] تقبیل (باب تفعیل) سے ماخوذ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کو تعظیم وتکریم کے نقطۂ نظر سے بوسہ دینا جائز ہے کیونکہ کسی ایک صحابی سے بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو ناپسندیدہ سمجھنا منقول نہیں' گویا اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ (نيل الأوطار للشوكاني)

(٤٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ، حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

[433] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''مومن کی روح اس کے قرض کی وجہ سے لٹکی رہتی ہے حتی کہ اس کی طرف سے (قرض) ادا کر دیا جائے۔'' (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مُعَلَّقَةٌ] تَعْلِيق (باب تفعیل) سے ماخوذ ہے' یعنی جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے وہ اس کے لیے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا۔ [بِدَيْنِهِ] ''دال'' پر فتحہ ہے۔ قرض اور ہر وہ چیز جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمے واجب ہو۔ [حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ] صیغۂ مجہول ہے' یعنی تاوقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا کر دیا جائے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تاوقتیکہ جس کا حق تھا وہ اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار اور بوجھ میت کے ذمے رہتا ہے جب تک کہ اس کی طرف سے ادا نہ ہو جائے' خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب ورفقاء میں سے کوئی شخص یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اس بات کا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے لیا تھا' جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے اور جن لوگوں نے دوسروں کی کوئی چیز یا مال فریب' دھوکے سے یا ڈاکا ڈال کر حاصل کیا ہوگا' ان کا کیا حشر ہوگا؟ ② اگر مرنے والے نے اپنے پیچھے اتنا مال چھوڑا ہو کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو وارث سب سے پہلے اس

٤٣٢ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب الدخول على الميت بعد الموت إذا أدرج في أكفانه، حديث: ١٢٤١، ١٢٤٢.

٤٣٣ـ [حسن] أخرجه الترمذي، الجنائز، باب ما جاء عن النبي ﷺ أنه قال: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه، حديث: ١٠٧٨، وأحمد: ٢/ ٤٤٠، ٤٧٥.

کے مال میں سے قرض کی ادائیگی کے پابند ہیں۔ اگر وہ اتنا مفلس وغریب تھا کہ ترکے میں ادائیگی قرض کے بقدر نہیں چھوڑا تو پھر اسلامی ریاست اس کے قرض ادا کرنے کی پابند ہوگی' چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو کوئی قرض چھوڑ جائے' اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔'' (صحیح البخاري' الاستقراض' حدیث:٢٣٩٨' وصحیح مسلم' الفرائض' حدیث:١٦١٩) اور کبھی یوں فرمایا: ''اس کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر ہے۔'' (سنن ابن ماجه' أبواب الفرائض' حدیث:٢٧٣٨) اس سے معلوم ہوا کہ قرض کی معافی نہیں کیونکہ یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

(٤٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي الَّذِي سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ ، فَمَاتَ : اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ ، وَكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْنِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

[434] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اس آدمی کے متعلق' جو اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہوگیا تھا' فرمایا: ''اسے پانی اور بیری (کے پتوں) سے غسل دو اور اسے اس کے (احرام والے) دونوں کپڑوں میں کفن دو۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [فِي الَّذِي سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ] یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوران احرام میں ہی اپنے اونٹ سے گر گئے جس سے ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ [بِمَاءٍ وَسِدْرٍ] بیری کے پتوں کا طریقۂ استعمال تین طرح سے ہے: پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں۔ اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنالی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے' پھر خالص اور صاف پانی سے میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہوگا۔ [كَفِّنُوهُ] تكفين (باب تفعيل) سے امر کا صیغہ ہے۔

فوائد ومسائل: اس حدیث سے درج ذیل مسائل ثابت ہوتے ہیں: ① عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ ② اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ ③ حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ ④ انھی احرام کے کپڑوں میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر نہ ڈھانپا جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سر ننگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ پڑھتا ہوا اٹھے گا۔ (صحیح البخاري' جزاء الصید' باب سنة المحرم إذا مات' حدیث: ١٨٥١) بیری کے پتوں کے استعمال میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالباً نہ

٤٣٤ـ أخرجه البخاري، جزاء الصيد، باب المحرم يموت بعرفة...، حديث: ١٨٥٠، ومسلم، الحج، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات، حديث: ١٢٠٦.

ہونے کے برابر تھا۔

(٤٣٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ ﷺ، قَالُوا: وَاللهِ مَا نَدْرِي نُجَرِّدُ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ لَا؟ اَلْحَدِيثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

[435] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب رسول اللہ ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں معلوم نہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مرنے والوں کے اتارتے ہیں یا نہ اتاریں؟ یہ لمبی حدیث ہے۔ (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَا نَدْرِي] ہمیں معلوم نہیں۔ [نُجَرِّدُ] تجرید سے ماخوذ ہے۔ بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں انھوں نے کسی کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو، لہٰذا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے، اس لیے آپ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں، ورنہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا، البتہ قابل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(٤٣٦) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُغَسِّلُ ابْنَتَهُ، فَقَالَ: «**اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذٰلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الْآخِرَةِ كَافُورًا، أَوْ شَيْئًا مِّنْ كَافُورٍ**»، فَلَمَّا فَرَغْنَا آذَنَّاهُ، فَأَلْقٰى إِلَيْنَا حَقْوَهُ، فَقَالَ: «**أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «**اِبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا**». وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَفَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلَاثَةَ قُرُونٍ، فَأَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا.

[436] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''اسے تین یا پانچ مرتبہ غسل دو، یا اس سے بھی زیادہ، اگر ضرورت محسوس کرو، ایسے پانی کے ساتھ جس میں بیری کے پتے ملے ہوں اور آخری بار میں کافور ڈالو یا فرمایا کہ کچھ کافور ڈالو۔'' جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپ کو اطلاع بھجوادی، چنانچہ آپ نے اپنا تہبند ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا: ''اسے اس کے جسم کے ساتھ لپیٹ دو، یعنی سب سے پہلے اسے یہ پہناؤ۔'' (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے: ''غسل ان

٤٣٥ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب في ستر الميت عند غسله، حديث: ٣١٤١، وأحمد: ٦/ ٢٦٧.

٤٣٦ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب غسل الميت ووضوئه بالماء والسدر، حديث: ١٢٥٣، ومسلم، الجنائز، باب في غسل الميت، حديث: ٩٣٩.

کی دائیں اطراف اور اعضائے وضو سے شروع کرو۔'' بخاری کی ایک روایت میں ہے: ہم نے ان کے سر کے بالوں کو تین مینڈھیاں بنا کر انھیں ان کی پشت پر ڈال دیا۔

لغوی توضیح: [و نحن نغسّل ابنته] مشہور روایت کے مطابق یہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی' حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ ہجری کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ فوت ہونے والی خواتین کو غسل دیا کرتی تھیں۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے یہ بات بڑی پختگی اور وثوق سے نقل کی ہے۔ [إن رأيتنّ ذلك] اگر تم یہ سمجھو کہ صفائی کے لیے تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ [بماء و سدر] پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ۔ یہ اغسلنها کے متعلق ہے' یعنی پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو۔ [في الأخيرة كافورا] راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''کافور'' کہا یا [شيئا من كافور] فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لیا جائے۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم ہے: غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ [و اجعلن في آخر ذلك كافورا] بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ (سنن النسائي' الجنائز' حديث:۱۸۹۵) [آذنّاه] إيذان سے صیغۂ جمع متکلم ہے' یعنی ہم نے آپ کو خبر دی۔ [حقوه] ''حا'' مہملہ پر فتحہ اور کسرہ بھی جائز ہے اور ''قاف'' ساکن ہے۔ اس سے مراد تہبند اور ازار ہے۔ اصل میں تو یہ تہبند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں مگر مجازی طور پر ازار کے لیے بولا جاتا ہے۔ [أشعرنها إياه] إشعار سے امر کا صیغہ ہے' یعنی میرے اس تہبند کو کفن کے کپڑوں کے نیچے بطور شعار استعمال کرو۔ شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی صاحبزادی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ [ابدأن] آغاز کریں' ابتدا کریں۔ [بميامنها] ميمنة کی جمع ہے' یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ [فضفرنا شعرها] الضّفر سے مراد مینڈھی ہے' یعنی بالوں کو اس طرح بٹ دے کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ [ثلاثة قرون] قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی ﷺ کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔ (سبل السلام)

فوائد و مسائل: ① اس واقعے سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہیے' البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ' یعنی طاق عدد کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہیے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غسل کا آغاز دائیں جانب کے اعضائے وضو سے کرنا چاہیے۔ ③ خاتون میت کے سر کے بال تین حصوں میں تقسیم کر کے مینڈھیاں بنا کر پیچھے ڈال دیے جائیں۔ انھیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہیے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا چاہیے یا جسم پر کافور مل دینا چاہیے۔ ⑤ کافور کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔

(٤٣٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كُفِّنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ بِيضٍ سَحُولِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا عِمَامَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[437] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ بستی کے ساختہ' سفید رنگ کے تین ایسے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا جو سوتی تھے اور ان میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [كُفِّنَ] تکفین سے ماخوذ ہے۔ [ثَلَاثَةَ أَثْوَابٍ] تین کپڑوں' یعنی ازار' چادر اور لفافے میں کفن دیا گیا۔ [بِيضٍ] با کے نیچے کسرہ ہے اور یہ أَبْيَض کی جمع ہے۔ [سُحُولِيَّةٍ] ''سین'' اور ''حا'' دونوں پر ضمہ ہے۔ اور ''سین'' پر فتحہ اور ''حا'' پر ضمہ بھی منقول ہے۔ سحول کی طرف منسوب ہے جو یمن کا ایک قصبہ یا بستی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا کیونکہ سحل سے مراد صاف کرنا ہے اور دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سحولیہ کے معنی ''نقیہ'' (صفائی وطہارت اور پاکیزگی و نظافت) کے ہوں گے۔ [كُرْسُفٍ] ''کاف'' اور ''سین'' دونوں پر ضمہ اور ان کے درمیان میں ''را'' ساکن ہے۔ اس سے مراد روئی ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت کو' خواہ مرد ہو یا عورت تین کپڑوں میں کفن دینا چاہیے۔ عورتوں کو تین کپڑوں سے زائد کفن دینا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ واللہ أعلم. ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ پگڑی۔ اور کفن میں سوتی کپڑا بہتر ہے۔ ② تین کپڑوں سے مراد جمہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی' تہبند اور بڑی چادر ہے۔

(٤٣٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ اللهِ بْنُ أُبَيٍّ جَاءَ ابْنُهُ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ: أَعْطِنِي قَمِيصَكَ أُكَفِّنْهُ فِيهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[438] حضرت ابن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی (منافق) فوت ہوا تو اس کا بیٹا (عبداللہ ؓ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے آپ اپنی قمیص عنایت فرما دیں تاکہ میں اس میں اسے کفن دے دوں' چنانچہ آپ نے اسے اپنی قمیص عنایت فرما دی۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [فَأَعْطَاهُ] اپنی قمیص عطا فرما دی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے لیکن صحیح بخاری میں حضرت جابر ؓ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا' پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ (صحیح البخاري' الجنائز' حدیث: ١٢٧٠) علماء نے ان کے درمیان تطبیق

٤٣٧ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب الثياب البيض للكفن، حديث: ١٢٦٤، ومسلم، الجنائز، باب في كفن الميت، حديث: ٩٤١.

٤٣٨ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب الكفن في القميص الذي يكف أو لا يكف، حديث: ١٢٦٩، ومسلم، صفات المنافقين، حديث: ٢٧٧٤.

دیتے ہوئے کہا ہے کہ ممکن ہے آپ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو' دفن کے بعد جب یہ وعدہ یاد دلایا گیا تو آپ نے قمیص عنایت فرما دی۔ آپ نے اپنی قمیص اس لیے عنایت فرمائی تھی کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو آپ نے لباس دیے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے' ان کا قد لمبا تھا' کسی کی قمیص انھیں پوری نہیں آتی تھی' عبداللہ بن ابی منافق نے اپنی قمیص دی تو انھیں پوری آ گئی۔ نبی ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے' اس لیے یہ قمیص اسے پہنائی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ ② اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی' اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا لحاظ رکھتے تھے' اس لیے قوم کے راہنما و قائدین حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

وضاحت: [عبدالله بن أبيّ] جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہونے کا دعویٰ کیا لیکن حقیقت میں منافقین کا لیڈر رہا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوۂ احد کے موقع پر لشکر کا تہائی حصہ لے کر واپس ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورۂ منافقون میں آیت: ﴿لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ (المنافقون ٦٣:٨) اسی کے متعلق ہے' یعنی اس نے کہا تھا کہ جب ہم مدینے لوٹ کر جائیں گے تو مدینے کا سب سے باعزت شخص (خود کو مراد لے رہا تھا) وہاں کے ذلیل ترین شخص کو ضرور نکال دے گا۔ اور اس ذلیل شخص سے اس خبیث کی مراد رسول اللہ ﷺ تھے۔ اور اس نے کہا تھا کہ ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾ (المنافقون ٦٣:٧) یعنی ''تم اللہ کے رسول کے آس پاس رہنے والوں پر خرچ نہ کرو حتی کہ وہ یہاں سے بھاگ جائیں۔'' ذی القعدہ ۹ ہجری میں فوت ہوا۔ أُبيّ کے ''ہمزہ'' پر ضمہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

[إبْنُـهُ] اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ ان کا شمار عظیم اور صاحب فضل صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے ﴿لَئِنْ رَّجَعْنَا...... الخ﴾ کہا تھا تو انھوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(٤٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اِلْبَسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبِيضَ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ،

[439] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اپنے کپڑوں میں سے سفید لباس زیب تن کیا کرو کیونکہ یہ تمھارے سب ملبوسات میں سے بہترین اور عمدہ لباس ہے۔ اور اپنے مرنے والوں کو بھی اس میں کفن دیا

٤٣٩- [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الطب، باب في الكحل، حديث: ٣٨٧٨، والترمذي، الجنائز، حديث: ٩٩٤، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٧٢، وأحمد: ١/ ٢٤٧، ٣٦٣.

وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ .

کرو۔'' (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس نبی ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا' گو آپ نے رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ ② مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہیے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(٤٤٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ .

[440] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے اچھا کفن دینا چاہیے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ ② اچھا اور عمدہ کفن دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہیے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ ③ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ حدیث میں آ رہی ہے۔

(٤٤١) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «**أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ**»؟ فَيُقَدِّمُهُ فِي اللَّحْدِ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ .

[441] حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ شہدائے احد میں سے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے (کفن) میں اکٹھا کرتے اور دریافت فرماتے: ''ان میں سے قرآن کسے زیادہ یاد تھا؟'' چنانچہ جسے زیادہ یاد ہوتا' اسے لحد میں آگے رکھتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [قَتْلٰى] قتیل کی جمع ہے جو مقتول کے معنی میں ہے۔ [أُحُدٍ] ''ہمزہ'' اور ''حا'' دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوۂ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا جو تاریخ اسلام میں مشہور و معروف ہے۔ یہ غزوہ ۳ ہجری شوال کے مہینے میں ہوا تھا جس میں ستر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا اور نبی اکرم ﷺ کے رباعی دانت بھی زخمی ہوئے۔ [أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ] جسے قرآن زیادہ ازبر ہو اور اس کا زیادہ علم رکھتا ہو۔ [فَيُقَدِّمُهُ] تقدیم سے ماخوذ ہے' یعنی اسے پہلے رکھتے اور آگے کرتے۔ [اَللَّحْدِ] میت کو قبر میں رکھنے کے لیے قبر کے پہلو میں جو شگاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

فوائد و مسائل: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں: ① ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفنانا

٤٤٠ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب في تحسين كفن الميت، حديث: ٩٤٣ .

٤٤١ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب من يقدم في اللحد، حديث: ١٣٤٧ نحو المعنى .

درست ہے۔ ② دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے' البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کرنا چاہیے اور قبلے کی جانب مقدم کرنا چاہیے۔ ③ شہدائے فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا جیسا کہ نبی ﷺ نے شہدائے احد کے بارے میں فرمایا: ''انھیں غسل مت دو' ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک اور کستوری جیسی خوشبو دے رہا ہوگا۔'' (مسند أحمد: ۳/ ۲۹۹) ④ شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہدائے احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے' امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ (صحیح البخاري' الجنائز' حدیث : ۱۳۴۴) امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کے لیے دعائے مغفرت ہے ورنہ شہید کی نماز جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(٤٤٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «لَا تُغَالُوا فِي الْكَفَنِ، فَإِنَّهُ يُسْلَبُ سَرِيعًا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

[442] حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو سنا' آپ فرما رہے تھے: ''(اپنے مردوں کو بہت) قیمتی کفن نہ دیا کرو کیونکہ وہ تو بہت جلد چھین لیا جاتا ہے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا تُغَالُوا] مغالاۃ سے ماخوذ ہونے کی صورت میں ''تا'' اور ''لام'' دونوں مضموم ہوں گے' یا تَغَالِي سے ہے اور اس صورت میں ایک ''تا'' محذوف ہوگی' نیز ''تا'' اور ''لام'' دونوں پر زبر ہوگی۔ اس سے مراد اسراف اور قیمت میں زیادتی کرنا ہے۔ [يُسْلَبُ] صیغۂ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اچھا کفن دینے کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد سفید' صاف ستھرا' کھلا اور ساتر ہونا ہے۔ درمیانی قیمت کا ہو' بہت گھٹیا اور ناقص نہ ہو' اس سے مراد اسراف وفضول خرچی نہیں ہے۔

فائدہ: بہت قیمتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ اسے دیر یا سویر بوسیدہ ہو جانا ہے۔ یہ روایت سنداً ضعیف ہے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت کا فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انھی میں کفن دینا کیونکہ زندہ آدمی نئے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (صحیح البخاري' الجنائز' باب موت یوم الاثنین' حدیث: ۱۳۸۷)

(٤٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «لَوْ مُتِّ قَبْلِي لَغَسَّلْتُكِ»، اَلْحَدِيثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه.

[443] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہوگئی تو میں تمھیں غسل دوں گا۔'' یہ لمبی حدیث ہے۔ (اسے احمد اور ابن ماجہ

٤٤٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب كراهية المغالاة في الكفن، حديث: ٣١٥٤ . * عمرو بن هاشم الجنبي لين الحديث، أفرط فيه ابن حبان (تقريب)، وابن أبي خالد عنعن، وفيه علة أخرى.

٤٤٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في غسل الرجل امرأته وغسل المرأة زوجها، حديث: ١٤٦٥، وأحمد: ٦/ ٢٢٨، الزهري مدلس وعنعن.

وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور سنن ابن ماجہ کی تحقیق وتخریج میں اس کی بابت مزید لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث کے بعض حصوں کے شواہد صحیح بخاری میں ہیں۔ دیکھیے: سنن ابن ماجہ' تحقیق وتخریج' حدیث: ۱۴۶۵- علاوہ ازیں دیگر محققین نے مذکورہ روایت کو حسن قرار دیا ہے' ان کی تحقیقی بحث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث حسن درجے کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد:۴۳/۸۱/۸۲' وإرواء الغليل' حديث:۷۰۰) بنابریں خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے اور کفن بھی پہنا سکتا ہے۔ بعض علماء نے اسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص قرار دیا ہے لیکن تخصیص کی کوئی دلیل نہیں' بلکہ صحابۂ کرام ؓ کے عمل سے اس کی عمومیت ثابت ہے جیسا کہ موطا امام مالک اور سنن کبریٰ بیہقی میں مروی ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ کی وفات پر ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس نے انھیں غسل دیا۔ (الموطأ للإمام مالك' الجنائز' باب غسل الميت' و السنن الكبرى للبيهقي:۳/۳۹۷) اسی طرح حضرت علی ؓ کی بابت بھی مروی ہے کہ انھوں نے بھی اپنی زوجۂ محترمہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کو ان کی وفات پر غسل دیا تھا۔ (سنن الدارقطني' الجنائز' والسنن الكبرىٰ للبيهقي:۳/۳۹۶) اس لیے باقی امت کے لیے بھی یہی حکم ہے' اسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم.

(٤٤٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ يُغَسِّلَهَا عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

[444] حضرت اسماء بنت عمیس ؓ سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ ؓ نے یہ وصیت کی تھی کہ حضرت علی ؓ خود انھیں غسل دیں۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے' اس لیے حضرت علی ؓ نے خود حضرت فاطمہ ؓ کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہوگیا جیسا کہ تفصیل گزشتہ حدیث کے تحت گزر چکی ہے۔

وضاحت: [حضرت فاطمہ ؓ] نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار ہیں۔ ۲ ہجری رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابی طالب ؓ نے انھیں اپنی زوجیت میں لیا اور ذوالحجہ میں رخصتی ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ ہجری رمضان المبارک میں نبی ﷺ کی وفات کے چھ ماہ بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(٤٤٥) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ -

[445] حضرت بریدہ ؓ سے غامدیہ کے قصے میں مروی

٤٤٤ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٧٩، والبيهقي: ٣/ ٣٩٦. * أم جعفر بنت محمد بن جعفر وهي أم عون بن محمد، لم أجد من وثقها، وقال ابن التركماني: "في سنده من يحتاج إلى كشف حاله"، وفي الحديث علة أخرى ذكرها ابن التركماني.

٤٤٥ـ أخرجه مسلم، الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى، حديث: ١٦٩٥.

فِي قِصَّةِ الْغَامِدِيَّةِ الَّتِي أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزِّنَا - قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصَلَّى عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ہے جس کے متعلق نبی ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں سنگساری کا حکم دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں: آپ نے اس کی (نماز جنازہ کی) بابت حکم دیا' پھر خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے دفن کیا گیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي قِصَّةِ الْغَامِدِيَّةِ] غامد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے انھیں غامدیہ کہا جاتا ہے جو کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک شاخ تھی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو اعتراف کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے' لہٰذا نبی ﷺ نے بچے کی ولادت اور مدت رضاعت مکمل ہو جانے کے بعد اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ رجم کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ [فَصَلَّى عَلَيْهَا] اکثر شارحین کے نزدیک یہ معروف کا صیغہ ہے اور بعض کے نزدیک صیغۂ مجہول ہے۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل' حديث:٢٣٢٢ و نيل الأوطار' باب الصلاة على من قتل في حد) ② صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے بذات خود غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے' مثلاً: خودکشی کرنے اور زنا وغیرہ کرنے والے کے بارے میں قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا' البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام (کبیر) اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہیے تاکہ فساق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(٤٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[446] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے چوڑے نیزے سے خودکشی کی تھی۔ آپ نے اس کی نماز نہ پڑھی۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أُتِيَ] صیغۂ مجہول ہے اور اس کے معنی ہیں: لایا گیا۔ [بِمَشَاقِصَ] مِشْقَصٌ کی جمع ہے' مِشْقَصٌ کی ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے۔ چوڑا نیزہ۔ [فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ] اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ اس کی سزا کے طور پر خود نماز جنازہ نہ پڑھی۔ اور اس جیسا فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے' دھمکانے کے لیے آپ نے ایسا کیا۔

فائدہ: خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ بالکل نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز وفضلاء اور معتبر شخصیات تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گی' البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ سنن نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔'' (سنن النسائي' الجنائز' باب ترك الصلاة على من قتل نفسه' حديث:١٩٦٦) یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز

٤٤٦ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب ترك الصلاة على القاتل نفسه، حديث: ٩٧٨.

جنازہ پڑھی تھی، جیسے ابتدا میں آپ مقروض کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے، البتہ صحابہ کو فرما دیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو اور دوسرا موقف ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

(٤٤٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْمَرْأَةِ الَّتِي كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ - قَالَ: فَسَأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُونِي؟» - فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوا أَمْرَهَا - فَقَالَ: «دُلُّونِي عَلٰى قَبْرِهَا»، فَدَلُّوهُ، فَصَلّٰى عَلَيْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[447] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس عورت کے بارے میں، جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس کے متعلق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ تو فوت ہو چکی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟'' گویا انھوں نے اس کے معاملۂ وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر بتاؤ۔'' صحابۂ کرام نے آپ کو قبر بتا دی، چنانچہ آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَزَادَ مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللّٰهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِي عَلَيْهِمْ».

اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ پھر آپ نے فرمایا: ''یہ قبریں اہل قبور کے لیے اندھیروں سے بھری ہوئی ہیں اور اللہ تعالیٰ میری نماز سے ان کی قبروں کو ان کے لیے روشن کر دیتا ہے۔''

لغوی تشریح: [تَقُمُّ] ''قاف'' پر ضمہ اور ''میم'' پر تشدید ہے، یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیاں، کپڑے کے چیتھڑے، کوڑا کرکٹ، غبار اور بھوسا وغیرہ باہر نکالا کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام أم محجن تھا۔ [آذَنْتُمُونِي] اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے تاکہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ [صَغَّرُوا] نبی ﷺ کی عظمت کے اعتبار سے انھوں نے اس کی وفات کو معمولی سمجھا۔ [دُلُّونِي] ''دال'' پر ضمہ ہے اور یہ دلالۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ [فَدَلُّوهُ] ''دال'' پر فتحہ اور ''لام'' پر ضمہ ہے اور یہ دلالۃ سے ماضی کا صیغہ ہے۔ [ظُلْمَةً] تمییز واقع ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

 **فوائد و مسائل:** اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ ① دفن کرنے کے بعد میت کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے، گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (الطبقات الکبرٰی لابن سعد: ۶۱۸/۳۔ ۶۲۰) ② مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انھی قبروں کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے، روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔ ③ مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ ④ مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ ⑤ مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا ضروری ہے۔ صفائی جھاڑو

٤٤٧ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب كنس المسجد، حديث: ٤٥٨، ومسلم، الجنائز، باب الصلاة على القبر، حديث: ٩٥٦.

سے بھی کی جا سکتی ہے اور کپڑے سے بھی۔ ⑥ نبی ﷺ کی غریبوں سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ آپ کو اپنے کارکن مرد و عورت دونوں سے کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا۔

(٤٤٨) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْهٰى عَنِ النَّعْيِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

[448] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نعي (موت کے لیے کھلے عام منادی) سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلنَّعْيِ] موت کی اطلاع دینا۔ صرف اس قدر خبر دینا کہ لوگ اس کے کفن دفن اور نماز جنازہ میں شرکت کر سکیں، ممنوع نہیں ہے۔ البتہ دور جاہلیت کے طریقے سے منادی کرنا ممنوع ہے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس منادی میں نوحہ ہوتا اور مرنے والے کے افعال کو فخریہ انداز میں بازاروں اور گلی کوچوں میں گھوم پھر کر بیان کیا جاتا تھا۔

فائدہ: ہمارے فاضل محقق نے مذکورہ روایت کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے' تاہم دیگر احادیث کی روشنی میں مطلقاً موت کی اطلاع دینا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ حبشہ میں حضرت نجاشی رحمہ اللہ کی وفات ہوئی تو مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو خبر دی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ علاوہ ازیں جنگ موتہ میں حضرت زید' حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے خبر ہوئی' چنانچہ آپ نے اسی وقت مدینہ منورہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان حضرات کی شہادت کی خبر دی۔ دیکھیے: (صحيح البخاري' الجنائز' حديث:١٢٤٥) لہٰذا مذکورہ روایت میں ممانعت سے مراد اعلان کا وہ جاہلی انداز ہے کہ جب کوئی آدمی مر جاتا تو چند افراد کو مقرر کیا جاتا کہ بازاروں اور گلی کوچوں میں گھوم پھر کر اس کی وفات کا رو رو کر اعلان کریں اور اس کے افعال اور محاسن کو فخریہ انداز میں بیان کریں۔ واللہ أعلم.

(٤٤٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ، وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلّٰى، فَصَفَّ بِهِمْ، وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[449] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی وفات کی خبر اسی روز دی جس روز وہ فوت ہوا تھا۔ آپ صحابۂ کرام کو لے کر جنازگاہ کی طرف تشریف لے گئے' صف بندی کروائی اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس حدیث سے کسی کی موت کی اطلاع دینا ثابت ہو رہا ہے اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا جواز بھی معلوم ہو رہا

٤٤٨ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، الجنائز، باب ماجاء في كراهية النعي، حديث:٩٨٦، وابن ماجه، الجنائز، حديث:١٤٧٦، وأحمد:٥/ ٣٨٥، ٤٠٦. ☼ قال يحيٰى بن معين في بلال بن يحيى: "روايته عن حذيفة مرسلة"، وبه ضعف الحديث.

٤٤٩ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب الرجل ينعىٰ إلى أهل الميت بنفسه، حديث:١٢٤٥، ومسلم، الجنائز، باب في التكبير على الجنائز، حديث:٩٥١.

ہے' تاہم یہ مسئلہ آج تک علماء کے مابین مختلف فیہ چلا آ رہا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ہر ایک میت کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے حتی کہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ ہر شام کو نماز جنازہ پڑھے اور نیت یہ کرے کہ ہر اس مسلمان کی نماز جنازہ ہے جو آج روئے زمین پر فوت ہوا ہے۔ کچھ اہل علم کا کہنا ہے کہ ہر ایک کی غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں' صرف اس شخص کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور شیخ ابن عثیمین رحمہما اللہ نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے' جبکہ ایک تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ہر اس شخص کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جائے جس نے علم نافع وغیرہ کی صورت میں مسلمانوں پر احسان کیا ہو' تاہم اس مسئلے کی بابت ہمارے نزدیک راجح اور اقرب الی الصواب بات درج ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنا ہے:

- فوت ہونے والا اچھی شہرت اور سیاسی' مذہبی اور علمی حیثیت کا حامل ہو۔ ہر چھوٹے بڑے کی نماز جنازہ غائبانہ طور پر پڑھنا غیر مسنون ہے۔
- غائبانہ نماز جنازہ کی ادائیگی میں سیاسی یا مالی مفادات وابستہ نہ ہوں' صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مطلوب ہو۔
- اس کے لیے اعلانات کرنا' اشتہارات اور بینر وغیرہ لگانا' مخصوص علمائے کرام یا مذہبی و سیاسی قائدین سے نماز جنازہ پڑھوانا' نیز انتظار اور اسی قسم کے دیگر ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنا' جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں یہ وبا عام ہے' شرعی طور پر محل نظر ہے' لہٰذا اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔
- غائبانہ نماز جنازہ کے موقع پر تقاریر یا خطابات کا بھی قطعاً اہتمام نہ ہو' ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔ بصورت دیگر فوت ہونے والے شخص کے لیے صرف دعا کرنا ہی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھا جائے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. ۞ غائبانہ نماز جنازہ کا طریقہ وہی ہے جو میت سامنے ہونے کی صورت میں نماز جنازہ کا ہے۔

وضاحت: [نجاشی رحمہ اللہ] ''نون'' پر فتحہ اور ''جیم'' مخفف ہے۔ حبشہ کے بادشاہ کا لقب ہے جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے۔ نجاشی کا اصل نام أصحمہ بن أبجر تھا۔ کفار مکہ کے فتنے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے مسلمانوں نے اسی بادشاہ کے دور میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ اسے نبی ﷺ نے ۶ ہجری کے آخر میں یا محرم ۷ ہجری میں عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے خط لکھ کر' اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آپ کے مکتوب گرامی کو بوسہ دیا' اسے اپنی آنکھوں سے بھی لگایا' پھر اپنے تخت شاہی سے نیچے اتر آیا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ کو یہ ساری صورتحال تحریر کر کے بھجوا دی۔ ۹ ہجری کے بعد رجب میں غزوۂ تبوک کے بعد وفات پائی' پھر نبی ﷺ نے اس کے نائب کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ بہت سے لوگوں کو ان دونوں خطوط کے بارے میں التباس واختلاط ہے۔

(٤٥٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ

[450] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے: ''جس کسی مسلمان کے

٤٥٠ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب من صلى عليه أربعون شفعوا فيه، حديث: ٩٤٨.

رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيَقُومُ عَلٰى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلًا، لَا يُشْرِكُونَ بِاللّٰهِ شَيْئًا، إِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس (مرنے والے) کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے جنازے میں زیادہ افراد کی شرکت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ② اس حدیث میں چالیس موحد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے۔ بعض احادیث میں سو کی تعداد ہے۔ (سنن ابن ماجه' الجنائز' حديث: ۱۴۸۸) اور بعض میں تین صفوں کا ذکر ہے۔ (سنن أبي داود' الجنائز' حديث: ۳۱۶۶) لیکن یہ روایت ضعیف ہے' تاہم بعض حضرات نے مالک بن ہبیرہ کے اثر کو حسن قرار دے کر اس مسئلے کا اثبات کیا ہے جیسا کہ امام شوکانی وغیرہ نے بھی اس حدیث سے تین صفوں کی فضیلت کا اثبات کیا ہے۔ دیکھیے: (نيل الأوطار: ۶۲/۴) ③ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپ نے تعداد کا ذکر فرمایا ہے۔ اور بعض علماء اس کی بابت یوں لکھتے ہیں: ممکن ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے سو افراد کی دعا سے میت کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہو' بعد میں امت محمدیہ پر مزید احسان فرماتے ہوئے چالیس افراد کی دعا کی بشارت دے دی ہو۔ واللّٰه أعلم.

(۴۵۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نِفَاسِهَا، فَقَامَ وَسَطَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[451] حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [فِي نِفَاسِهَا] بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے۔ ② حضرت انس رضی اللہ عنہ سے' ابوداود اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہیے۔ (سنن أبي داود' الجنائز' حديث: ۳۱۹۴' وجامع الترمذي' الجنائز' حديث: ۱۰۳۴) امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول اسی طرح منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً بلافرق مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑے ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلے میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منبع ایمان ہے' اس لیے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہیے لیکن یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

۴۵۱ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب الصلاة على النفساء إذا ماتت في نفاسها، حديث: ۱۳۳۱، ومسلم، الجنائز، باب أين يقوم الإمام من الميت للصلاة عليه، حديث: ۹۶۴.

(٤٥٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: وَاللهِ لَقَدْ صَلّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[452] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں کیونکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ علاوہ ازیں طبقات ابن سعد میں ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ (الطبقات الكبرى لابن سعد:٣/٢٠٦) نیز مسند سعید بن منصور میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ (المصنف لعبدالرزاق: ٣/ ٥٢٦، و السنن الكبرى للبيهقي:٤/٥٢) اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ (المصنف لعبدالرزاق:٣/ ٥٢٦، ٥٢٧) اگر ایسا کرنا ناجائز ومکروہ ہوتا تو خلفائے راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ ② نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے، البتہ مسجد سے باہر پڑھنا افضل اور بہتر ہے۔ واللّٰه أعلم.

وضاحت: [بیضاء] سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فهريه ہے۔ اور ان کے خاوند کا نام وہب بن ربیعہ قرشی فہری ہے۔ سہل اور سہیل اس کی اولاد تھے۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ تو ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے قریش کے اس صحیفے کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد پاس کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انھوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا۔ اور ایک قول کے مطابق انھوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں زبردستی حاضر کیے گئے۔ مسلمانوں نے انھیں بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ میں نے انھیں مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انھوں نے مدینے میں وفات پائی۔ رہے حضرت سہیل رضی اللہ عنہ تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ غزوۂ تبوک ۹ ہجری کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ ان دو کے علاوہ تیسرے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے غزوۂ بدر میں جام شہادت نوش کیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کے کافی عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(٤٥٣) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلٰى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلٰى جَنَائِزِنَا أَرْبَعًا، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلٰى جَنَازَةٍ

[453] حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے تھے۔ (مگر خلاف معمول) ایک مرتبہ انھوں نے پانچ

٤٥٢ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب الصلاة على الجنازة في المسجد، حديث: ٩٧٣.

٤٥٣ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب الصلاة على القبر، حديث: ٩٥٧، وأبوداود، الجنائز، حديث: ٣١٩٧، والترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٢٣، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٩٨٤، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٥٠٥.

خَمْسًا، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُكَبِّرُهَا . رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْأَرْبَعَةُ.

تکبیریں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ ② تکبیرات جنازہ چار سے لے کر نو تک مروی ہیں جن کی تفصیل شیخ البانی رحمہ اللہ نے احکام الجنائز میں بیان کی ہے۔ احادیث اور آثار بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ تکبیرات جنازہ چار سے لے کر نو تک نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہیں' ان میں سے جس پر بھی عمل کر لیا جائے جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تنوع اختیار کیا جائے' یعنی کبھی چار' کبھی پانچ' کبھی چھ...... تکبیرات کے ساتھ جنازہ پڑھ لیا جائے' جیسے دعائے استفتاح وغیرہ کی بابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی پڑھ لی جائے تو جائز ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک پر التزام کرنا ہو تو پھر چار تکبیرات پر کرنا چاہیے کیونکہ اس کی بابت احادیث کثرت سے مروی ہیں۔ رہی یہ بات کہ صرف چار تکبیرات پر سلف اور خلف کا اجماع ہے' درست نہیں' لہٰذا راجح یہی ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے لے کر نو تک تکبیریں کہی جا سکتی ہیں' البتہ اگر ہمیشہ ایک ہی طریقے پر نماز جنازہ پڑھنی ہو تو پھر چار تکبیرات کو کثرت احادیث کی بنا پر ترجیح دینی چاہیے۔ واللّٰه أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (أحكام الجنائز و بدعها للألباني، ص: ۱۴۱-۱۴۶) رہا تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین کرنا تو اس کی بابت رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث صحیح سند سے مروی نہیں جیسا کہ امام شوکانی' امام ابن حزم' سید سابق اور محقق عظیم شیخ البانی رحمہ اللہ کا موقف ہے' اس کی بابت لکھتے ہیں کہ صرف پہلی تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا جائے کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے یہی ثابت ہے۔ دیکھیے: (أحكام الجنائز و بدعها للألباني، ص: ۱۴۷، طبع مكتبة المعارف، الرياض، والمحلى لابن حزم: ۵/ ۱۲۸، و فقه السنة: ۱/ ۲۶۶) البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔ دیکھیے: (صحيح البخاري، تعليقًا، الجنائز، باب سنة الصلاة على الجنازة، قبل الحديث: ۱۳۲۲، و السنن الكبرى للبيهقي: ۴/ ۴۴) اور حضرت عبداللہ بن عمر کی بابت معروف ہے کہ وہ سنت رسول پر سختی سے عمل کیا کرتے تھے' لہٰذا ان کا تکبیرات جنازہ کے ساتھ رفع الیدین کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے کرتے دیکھا ہوگا۔ ان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی ایسا عمل کریں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو۔ بنابریں تکبیرات جنازہ کے ساتھ رفع الیدین کرنے کو بدعت نہیں کہنا چاہیے کیونکہ صحابی کے عمل اور قول کو بدعت نہیں کہا جا سکتا' نیز اس کی بابت بحث و تکرار بھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ جمہور علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے' لہٰذا ہمیں راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی تکبیرات جنازہ کے ساتھ رفع الیدین کرتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کا جواز بھی ہے' اس میں بحث و تکرار اور تشدد مناسب نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتاوى الدين الخالص: ۷/ ۱۷۰-۱۷۲)

راویٔ حدیث: [ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ] انصاری مدنی ہیں۔ پھر کوفہ میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوفی کہلائے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے ان کا سماع ثابت ہے۔ ان کی کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

خلافت کے اختتام میں ابھی چھ سال باقی تھے جب ان کی پیدائش ہوئی۔ ۸۶ ہجری میں معرکۂ جماجم میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ انھوں نے نہر بصرہ میں ڈوب کر شہادت پائی۔

(٤٥٤) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ كَبَّرَ عَلٰى سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ سِتًّا، وَقَالَ: إِنَّهُ بَدْرِيٌّ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ. وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

[454] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ میں چھ تکبیریں کہیں اور فرمایا کہ یہ بدری ہیں۔ (اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: بَدْرِيٌّ بدری سے مراد یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ بدری ہونے کا شرف و بزرگی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے چھ تکبیریں کہیں کہ اس طرح ان کے لیے زیادہ دعا کی جا سکے۔

فائدہ: اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی بزرگی اور شرف کا لحاظ رکھتے ہوئے چار سے زائد تکبیریں کہی جا سکتی ہیں۔

وضاحت: حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ حنیف تصغیر ہے۔ انصاری، اوسی اور مدنی ہیں۔ غزوۂ بدر اور باقی غزوات و مشاہد میں حاضر تھے۔ غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بصرہ پر عامل مقرر کیا اور صفین میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مابین مؤاخات ہوئی۔ ۳۸ ہجری میں وفات پائی۔

(٤٥٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُكَبِّرُ عَلٰى جَنَائِزِنَا أَرْبَعًا، وَيَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولٰى. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[455] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ (بھی) پڑھتے تھے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس روایت کی سند میں محمد بن عبداللہ بن عقیل ضعیف راوی ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتا ہے، البتہ اگلی حدیث اس کی مؤید اور شاہد ہے جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے اس طرف تحقیق و تخریج میں اشارہ کیا ہے، لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل حجت اور قابل عمل ہے۔ بنابریں اس روایت اور آئندہ آنے والی روایت دونوں سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کی پہلی تکبیر کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ اب یہ کہنا کہ قراءت

٤٥٤ـ [صحيح] أخرجه سعيد بن منصور كما في فتح الباري: ٧/ ٣١٨، وأصله في البخاري، حديث: ٤٠٠٤. * إسماعيل ابن أبي خالد عنعن، وله شاهد عند البخاري في التاريخ الكبير: ٤/ ٩٧، وللحديث شواهد أخرى.

٤٥٥ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الشافعي في الأم: ١/ ٢٧٠ نحو المعنى. وسنده ضعيف جدًا من أجل إبراهيم بن محمد بن أبي يحيى، ولكن الحديث صحيح لأن له شواهد صحيحة في صحيح البخاري، وغيره، انظر الحديث الآتي.

کی نیت سے نہ پڑھے بلکہ صرف دعا کی نیت سے پڑھے' محض ایسی تاویل ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ② سنن نسائی کی ایک روایت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت پڑھنے کا ذکر بھی مروی ہے۔ (سنن النسائي' الجنائز' باب الدعاء' حديث:١٩٨٩) ③ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تو سورۂ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا واجب ہے۔ اور بعض حضرات اس کی مشروعیت کے قائل نہیں۔ مگر اس کی عدم مشروعیت پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔

(٤٥٦) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ، فَقَالَ لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[456] حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انھوں نے اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: (میں نے اس لیے سورۂ فاتحہ پڑھی ہے) تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ] تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ یہ طریقہ نبی ﷺ سے ماخوذ ہے۔ یہاں سنت سے وہ سنت مراد نہیں جو فرض کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ یہ فقہائے کرام کی جدید اصطلاح ہے' لہٰذا یہ اس کے وجوب کے منافی نہیں۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی اور وجہ بھی بیان کر دی کہ تمھیں بتانے کے لیے میں نے ایسا کیا ہے کہ یہ مسنون ہے۔ گویا نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے۔

راویٔ حدیث: [طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمہ اللہ] یہ (حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمہ اللہ) زہری قرشی' مدنی تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مشہور و معروف صحابی کے بھتیجے تھے۔ طلحہ ندی کے لقب سے مشہور تھے۔ ثقہ اور بڑے پائے کے فقیہ تھے۔ اوساط تابعین میں شمار کیے گئے ہیں۔ ۹۷ ہجری میں ۷۲ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

(٤٥٧) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلٰى جَنَازَةٍ، فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ «اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ، وَالثَّلْجِ، وَالْبَرَدِ. وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا، كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ

[457] حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز جنازہ پڑھائی تو میں نے آپ کی دعا میں سے اتنا حصہ یاد کر لیا: [اَللّٰهُمَّ!...... وَعَذَابَ النَّارِ] ''اے اللہ! اس کی مغفرت فرما اور اس پر رحم فرما۔ اور اسے عافیت دے اور اس سے درگزر فرما۔ اس کی مہمان نوازی اچھی فرما۔ اس کی قبر کشادہ و فراخ کر دے۔ اسے پانی' برف اور اولوں سے دھو دے (بالکل صاف کر

٤٥٦ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة، حديث: ١٣٣٥.

٤٥٧ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب الدعاء للميت في الصلاة، حديث: ٩٦٣.

دَارِهِ، وَأَهْلًا خَيْرًا مِّنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَعَذَابَ النَّارِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

دے۔) اسے گناہوں سے ایسا صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اور اسے اس (دنیاوی) گھر سے بہتر وعمدہ گھر اور اہل وعیال سے بہتر اہل وعیال عطا فرما۔ اسے جنت میں داخل فرما۔ اسے قبر کے فتنہ وآزمائش اور عذاب دوزخ سے محفوظ رکھ۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [نُزُلَهُ] ''نون'' اور ''زا'' دونوں پر ضمہ ہے' اور یہ بھی جائز ہے کہ ''زا'' ساکن ہو' یعنی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی خورونوش کی کوئی چیز۔ اس جگہ اجر وثواب مراد ہے۔ [وَسِّعْ] توسیع سے ماخوذ ہے اور دعا کے لیے امر کا صیغہ ہے۔ کشادہ ووسیع کر۔ [مَدْخَلَهُ] ''میم'' پر فتحہ ہے' البتہ میم پر ضمہ پڑھنا بھی درست ہے۔ جائے داخلہ۔ لیکن یہاں قبر مراد ہے۔ [اَلْبَرَدِ] ''با'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ ہے' اولے مراد ہیں۔ [نَقِّهِ] ''قاف'' پر تشدید ہے۔ تنقیة سے ماخوذ دعائیہ کلمہ ہے کہ پاک کر دے' صاف ستھرا کر دے۔ [اَلدَّنَسِ] ''دال'' اور ''نون'' دونوں پر فتحہ' میل کچیل۔ [أَبْدِلْهُ] ابدال (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ بدل دے' اس کے عوض عطا کر۔ [وَقِهِ] اس میں واؤ عطف کی ہے۔ ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے جو وقایة سے ماخوذ دعائیہ کلمہ ہے اور ''ہ'' ضمیر میت کی طرف راجع ہے' یعنی بچا اسے' حفاظت فرما اس کی' محفوظ رکھ اسے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی' تبھی تو حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ سنن ابن ماجہ وغیرہ میں تو صراحتاً منقول ہے کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: [شَهِدْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ فَسَمِعْتُهُ......] ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ایک انصاری کا جنازہ پڑھایا۔ میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے......'' (سنن ابن ماجه' الجنائز' باب ما جاء في الدعاء في الصلاة على الجنازة' حديث:۱۵۰۰) ② اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز جنازہ بآواز بلند پڑھائی تھی' اس لیے مذکورہ حدیث اور دیگر دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ سراً اور جہراً دونوں طرح پڑھانا جائز ہے جبکہ بعض علماء اس کی بابت یوں فرماتے ہیں کہ دعا میں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے' اس لیے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے' البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ واللّٰه أعلم.

راویٔ حدیث: [حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ] شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلۂ اشجع سے تعلق کی وجہ سے اشجعی کہلائے۔ غزوۂ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلۂ اشجع کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ ہجری میں وہیں فوت ہوئے۔

(٤٥٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلٰى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: «اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا، وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا، وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا، وَأُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ! مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ، اَللّٰهُمَّ! لَاتَحْرِمْنَا أَجْرَهُ، وَلَاتَفْتِنَّا بَعْدَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْأَرْبَعَةُ.

[458] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کی نماز جنازہ پڑھتے تو یوں فرماتے: ”الٰہی! ہمارے زندہ اور مردہ‘ ہمارے حاضر و غائب‘ ہمارے چھوٹے اور بڑے‘ ہمارے مرد و عورت (سب) کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الٰہی! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھنا اور جسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز فرمانا۔ الٰہی! ہمیں اس (میت) کے اجر و ثواب سے محروم نہ کرنا اور نہ ہمیں اس کے بعد فتنے میں ڈالنا۔“ (اسے مسلم اور چاروں نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [شَاهِدِنَا] جو حاضر ہیں۔ [صَغِيرِنَا] کم عمر اور چھوٹی عمر والوں کے حق میں بلندیٔ درجات کی دعا ہے‘ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ [فَأَحْيِهِ] إحياء سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے جو دعا کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ [لَا تَحْرِمْنَا] ”تا“ پر فتحہ اور ”را“ کے نیچے کسرہ۔ حرمان سے مشتق ہے۔ نہ محروم رکھنا ہمیں۔ [أَجْرَهُ] اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ [لَا تَفْتِنَّا] دوسری ”تا“ کے نیچے کسرہ اور ”نون“ جمع پر تشدید ہے۔ باب ضَرَبَ يَضْرِبُ ہے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لیے مقام عبرت بنا دے۔ حدیث کے آخر میں ہے [رَوَاهُ مُسْلِمٌ] ”اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔“ جبکہ یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ کسی کاتب سے غلطی ہوگئی ہے‘ مصنف سے نہیں۔ واللہ أعلم.

(٤٥٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[459] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے‘ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لیے خوب خلوص دل سے دعا کرو۔“ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① نماز جنازہ پڑھنے والے دراصل مرنے والے کے لیے رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو‘ اس لیے سفارش کرنے والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ ② یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے‘ لہٰذا اس کے لیے جتنے خلوص قلب سے دعا کی جا سکتی

٤٥٨ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب الدعاء للميت، حديث: ٣٢٠١، والترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٢٤، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٩٨٦، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٩٨. * قوله: "رواه مسلم" وهم من المؤلف أو من بعده، والله أعلم.

٤٥٩ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب الدعاء للميت، حديث: ٣١٩٩، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ٣١.

ہو کرنی چاہیے' لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں' خلوص نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے' اور ایک دومنٹ میں جنازے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

(٤٦٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[460] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جنازہ لے جانے میں جلدی کیا کرو' اس لیے کہ اگر وہ نیک ہے تو پھر وہ بھلائی ہی ہے جس کی طرف تم اسے لے جا رہے ہو اور اگر وہ نیک نہیں ہے تو پھر شر ہے جسے تم اپنی گردن سے اتار رہے ہو۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أَسْرِعُوا] چلنے میں جلدی کرو' یا اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کی تجہیز و تکفین میں جلدی کرو۔ [تَضَعُونَهُ] وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلے میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ کنایہ ''اپنے سے دور کر دینے'' کے معنی میں مستعمل ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وفات ہو جانے کے بعد میت کو دفن کرنے میں جلدی کرنی چاہیے' دور دراز کے اقارب و احباب کو جمع کرنا اور ان کی آمد کے انتظار میں تاخیر کرنا خلاف سنت ہے' نیز اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے گھر سے دور کسی اور جگہ یا کسی دوسرے ملک میں فوت ہو جاتا ہے تو اسے اپنے ملک میں واپس لانے کے بجائے ادھر ہی دفن کر دینا چاہیے جس ملک میں اس کی وفات ہوئی ہے' مثلاً: اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب جاتا ہے اور وہاں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اسے واپس پاکستان لانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے ادھر ہی دفن کرنا اقرب الی السنہ ہے۔

(٤٦١) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلّٰي عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتّٰى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[461] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جنازے کے ساتھ حاضر رہے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے' اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا۔ اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔'' دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''دو قیراط دو بڑے بڑے پہاڑوں کے

٤٦٠ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب السرعة بالجنازة، حديث: ١٣١٥، ومسلم، الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، حديث: ٩٤٤.

٤٦١ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، حديث: ١٣٢٥، ومسلم، الجنائز، باب فضل الصلاة على الجنازة واتباعها، حديث: ٩٤٥، وحديث "من تبع جنازة مسلم" أخرجه البخاري، الجنائز، حديث: ١٣٢٣.

برابر ہیں۔'' (بخاری ومسلم)

وَلِمُسْلِمٍ: «حَتّٰى تُوضَعَ فِي اللَّحْدِ».

اور مسلم کی روایت میں ہے: ''میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔''

وَلِلْبُخَارِيِّ أَيْضًا مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: «مَنْ تَبِعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا، وَكَانَ مَعَهَا حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلُ جَبَلِ أُحُدٍ».

اور بخاری کی روایت میں ہے: ''جس نے کسی مسلمان کے جنازے میں ایمان کی حالت میں اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔''

لغوی تشریح: [قِيرَاطٌ] ''قاف'' کے نیچے کسرہ۔ نصف دانق کو قیراط کہتے ہیں اور دانق سے مراد درہم کا چھٹا حصہ ہے۔ قیراط جلدی سمجھ میں آجانے والا پیمانۂ وزن تھا' اس لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس زمانے میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ چونکہ قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے' اس لیے آپ نے تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی بتانا مطلوب ومقصود تھا کہ اسے دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ [إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا] دونوں مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازے میں شرکت کا مقصد صرف طلب اجر وثواب ہو' کوئی اور غرض نہ ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں الفاظ حال واقع ہو رہے ہیں' یعنی جنازہ اسی حالت میں پڑھے کہ وہ مومن ہو اور ثواب کے لیے پر امید ہو۔ اس صورت میں إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا' بمعنی مُؤْمِنًا مُحْتَسِبًا ہوں گے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں جنازے کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ ② اس حدیث میں اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازے میں شرکت کا اہتمام کریں۔

(٤٦٢) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ، يَمْشُونَ أَمَامَ الْجَنَازَةِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ

[462] حضرت سالم ؒ اپنے والد (ابن عمر ؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر ؓ کو جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (اسے پانچوں

٤٦٢ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب المشي أمام الجنازة، حديث: ٣١٧٩، والترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٠٧، ١٠٠٩، والنسائي، الجنائز، حديث: ١٩٤٥، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٤٨٢، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ٢٠، حديث: ٣٠٣٥، وقول الترمذي: «أهل الحديث كلهم يرون ...» يعني من شيوخه، وإلا فبعض أهل الحديث صححه كابن حبان رحمه الله، والمرسل شاهد له.

النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةٌ بِالْإِرْسَالِ. نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور نسائی اور ایک گروہ نے اس میں مرسل ہونے کی علت بیان کی ہے۔)

فائدہ: جنازے کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہیے یا پیچھے؟ مختلف روایات سے نبی ﷺ کا عمل دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرح سے ثابت ہے۔

راویٔ حدیث: [سالم رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعمر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور اپنے دور کے معتبر عالم تھے۔ مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت ثابت، عالم اور فاضل تھے۔ اخلاق و سیرت اور عادات میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ذوالقعدہ یا ذوالحجہ کے مہینے میں ۱۰۶ ہجری میں فوت ہوئے۔

(٤٦٣) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[463] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کیا گیا لیکن پختہ حکم نہیں دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [نُهِينَا] صیغۂ مجہول۔ [لَمْ يُعْزَمْ] صیغۂ مجہول، یعنی یہ ممانعت ہمارے لیے لازمی قرار نہیں دی گئی۔ یہ نہی کراہت و ناپسندیدگی کے لیے ہے۔ شاید انھوں نے قرائن سے ممانعت و نہی کو کراہت پر محمول کیا ہے ورنہ درحقیقت نہی کو تحریم پر محمول کیا جاتا ہے اور نہی میں اصل بھی یہی ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں اس بات کی صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ (صحيح البخاري، الحيض، حديث: ٣١٣) ② اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو کیونکہ ان میں بے صبری زیادہ ہوتی ہے مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہو گیا تو جس طرح آپ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازے میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے پیغام بھیجا کہ جنازہ مسجد میں لایا جائے تاکہ وہ بھی نماز جنازہ میں شریک ہو سکیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جنازہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے حجروں کے پاس رکھا گیا تاکہ وہ جنازہ پڑھ لیں، پھر اسے مقاعد کی طرف باب الجنائز سے نکال کر قبرستان میں لے جایا گیا۔ (بعد میں) انھیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اس عمل پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ مبارک میں جنازہ مسجد میں نہیں لے جایا جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات معلوم ہوئی تو فرمایا: لوگوں کو جس بات کا علم نہیں ہوتا، اس پر کتنی جلدی تنقید کرنے لگتے ہیں، ہم پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ جنازہ مسجد میں لے جایا گیا، حالانکہ

٤٦٣ــ أخرجه البخاري، الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة، حديث: ١٢٧٨، ومسلم، الجنائز، باب نهي النساء عن اتباع الجنائز، حديث: ٩٣٨.

رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن بیضاء کا جنازہ مسجد ہی کے اندر ادا کیا تھا۔ (صحیح مسلم، الجنائز، باب الصلاۃ علی الجنازۃ في المسجد، حدیث:۹۷۳) ③ اس حدیث سے درج ذیل دو مسئلے ثابت ہوئے: ایک تو یہ کہ عورت بھی نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہے اور دوسرا یہ کہ مسجد کے اندر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

(٤٦٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ تَبِعَهَا فَلَا يَجْلِسْ حَتّٰى تُوضَعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[464] حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی جنازے کو آتا دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ، نیز جو شخص جنازے کے ساتھ ہو وہ جنازے کے (زمین پر) رکھے جانے سے پہلے نہ بیٹھے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [فَقُومُوا] امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے، یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے دونوں قسم کے فرامین میں سے جو آخری ارشادات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قیام چھوڑ دیا تھا۔ [حَتّٰى تُوضَعَ] آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے، وجوب پر نہیں۔

فائدہ: موت کا عمل انسان کے لیے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے، نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں، اس لیے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ کو علم ہوا کہ جنازے کے لیے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے اور صرف وجوب کو منسوخ قرار دیا ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ وغیرہ نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے۔

(٤٦٥) وَعَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ يَزِيدَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَدْخَلَ الْمَيِّتَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيِ الْقَبْرِ، وَقَالَ: هٰذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ.

[465] حضرت ابواسحاق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ نے میت کو قبر کی پائینتی کی طرف سے قبر میں اتارا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِنْ قِبَلِ رِجْلَيِ الْقَبْرِ] یعنی اس جانب سے جہاں میت کے پاؤں ہوتے ہیں۔ یہ حال کا اطلاق محل پر ہے، یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔

٤٦٤ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب من تبع جنازة فلا يقعد حتى توضع ....، حديث: ١٣١٠، ومسلم، الجنائز، باب القيام للجنازة، حديث: ٩٥٩.

٤٦٥ـ **[إسناده صحيح]** أخرجه أبوداود، الجنائز، باب في الميت يدخل من قبل رجليه، حديث: ٣٢١١.

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہیے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت ابو اسحاق رحمہ اللہ] عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی کوفی۔ مشہور تابعی ہیں۔ آپ سے بکثرت روایات مروی ہیں مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ ہجری میں فوت ہوئے۔

[حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ] خطمی انصاری۔ قبیلۂ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل وصفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ کے مقام پر فوت ہوئے۔

(٤٦٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «**إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُورِ فَقُولُوا: بِسْمِ اللهِ، وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُولِ اللهِ**». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوَقْفِ.

[466] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو یوں کہو: [بِسْمِ اللّٰهِ' وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ] ''اللہ کے نام سے اور رسول اللہ ﷺ کے دین پر (دفن کر رہے ہیں)۔'' (اسے احمد' ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے جبکہ دارقطنی نے معلول قرار دیتے ہوئے اسے موقوف کہا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنا مسنون ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرح امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو گو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔ (المستدرك للحاكم: ١: ٣٦٦)

(٤٦٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا**». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ، وَزَادَ ابْنُ مَاجَه مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: «**فِي الْإِثْمِ**».

[467] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میت کی ہڈی توڑنا ایسے ہی ہے جیسے زندہ انسان کی ہڈی توڑنا۔'' (اسے ابوداود نے مسلم کی شرط والی سند سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے: ''گناہ میں۔'')

٤٦٦۔ [صحيح] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب في الدعاء للميت إذا وضع في قبره، حديث: ٣٢١٣، والترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٤٦، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٥٥٠، والنسائي في الكبرى، حديث: ١٠٩٢٧، وعمل اليوم والليلة، حديث: ١٠٨٨، وأحمد: ٢: ٤٠، ١٢٨، وابن حبان (الموارد)، حديث: ٧٧٢.

٤٦٧۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان؟ حديث: ٣٢٠٧، وحديث أم سلمة أخرجه ابن ماجه، حديث: ١٦١٧ وسنده ضعيف، فيه عبدالله بن زياد مجهول (تقريب).

لغوی تشریح: [فِي الْإِثْمِ] گناہ میں یعنی مردہ شخص کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسے ہے جیسے کسی زندہ انسان کی ہڈی توڑنا۔ نہ کہ درد اور الم و تکلیف کے اعتبار سے۔

فائدہ: دین اسلام نے جس طرح انسان کی زندگی میں اس کے ساتھ بدسلوکی اور بے حرمتی کو ممنوع قرار دیا ہے اسی طرح اس کے فوت ہو جانے کے بعد بھی اس کی عزت و تکریم اور حرمت کو برقرار رکھا ہے۔ موجودہ دور میں پوسٹ مارٹم کے نام سے مردہ انسان کی چیر پھاڑ کا کام غیر شرعی ہے۔ انتہائی شدید شرعی مصلحت کے بغیر اس پر عمل کرنا ناجائز ہے۔ سعودی علمائے کرام نے اس مسئلے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: ① کسی فوجداری دعویٰ کی تحقیق کی غرض سے پوسٹ مارٹم۔ ② وبائی امراض کی تحقیق کی غرض سے پوسٹ مارٹم۔ ③ تعلیم و تعلم، یعنی اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لیے پوسٹ مارٹم۔ پہلی اور دوسری صورت میں پوسٹ مارٹم جائز ہے کیونکہ ان صورتوں میں امن و امان اور معاشرے کو وبائی امراض سے بچانے کی بہت سی مصلحتیں کارفرما ہیں اور اس میں اس میت کی بے حرمتی کا جو پہلو ہے، جس کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہو، وہ ان یقینی اور بہت سی مصلحتوں کے مقابلے میں چھپ جاتا ہے۔ باقی رہی تیسری قسم، یعنی تعلیمی مقاصد کے لیے پوسٹ مارٹم، تو شریعت اسلامیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مصالح کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور مفاسد کو کم سے کم کیا جائے، خواہ اس کے لیے دو ضرر رساں چیزوں میں سے اس کا ارتکاب کرنا پڑے جس کا ضرر کم ہو اور اسے ختم کیا جا سکے جس کا نقصان زیادہ ہو، اور جب مصالح میں تعارض ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے گا جو راجح ہو، حیوانی لاشوں کا پوسٹ مارٹم انسانی لاشوں کے پوسٹ مارٹم کا بدل نہیں ہو سکتا، اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ بہت سی مصلحتیں ہیں جو آج کی علمی ترقی کے باعث طبی مقاصد کے لیے بہت کارآمد ہیں، لہٰذا انسانی لاش کا پوسٹ مارٹم جائز ہے۔ لیکن شریعت نے چونکہ مسلمان کو موت کے بعد بھی اسی طرح عزت و تکریم سے نوازا ہے جس طرح زندگی میں اسے عزت و شرف سے سرفراز کیا ہے جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے، اور پوسٹ مارٹم چونکہ عزت و تکریم کے منافی ہے اور اس میں انسانی لاش کی بے حرمتی ہے، اور پوسٹ مارٹم کی ضرورت چونکہ غیر معصوم، یعنی مرتد اور حربی لوگوں کی لاشوں کے آسانی سے میسر آ جانے کی وجہ سے پوری ہو جاتی ہے، لہٰذا اس مقصد کے لیے غیر معصوم، یعنی مرتد اور حربی لوگوں کی لاشوں کو استعمال کرنے پر اکتفا کیا جائے اور ان کے علاوہ دیگر لاشوں کو استعمال نہ کیا جائے۔ واللہ أعلم. (تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاویٰ اسلامیہ (اردو) ۲: ۹۷، ۹۸ مطبوعہ دارالسلام لاہور۔) سنن ابن ماجہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی اضافے کی بابت ہمارے فاضل محقق لکھتے ہیں کہ یہ اضافہ سنداً ضعیف ہے۔ اور شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ اضافہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے بلکہ کسی راوی کی تفسیر اور وضاحت ہے، تاہم مذکورہ حدیث مومن میت کی ہڈی توڑنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (أحکام الجنائز و بدعها للألباني، ص: ۲۹۵، ۲۹۶ طبع مکتبة المعارف، الریاض، وإرواء الغلیل، رقم: ۷۶۳)

(٤٦٨) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ [468] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

٤٦٨ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب في اللحد ونصب اللبن على الميت، حديث: ٩٦٦، وحديث جابر أخرجه البيهقي: ٣/ ٤١٠، وقال الحافظ: "وصححه ابن حبان": ولم أجده، وحديث "نهى أن يجصص القبر" أخرجه مسلم، الجنائز، حديث: ٩٧٠.

اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: اِلْحَدُوا لِي لَحْدًا وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبِنَ نَصْبًا، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کہ انھوں نے کہا: میرے لیے لحد والی، یعنی بغلی قبر بنانا اور اس پر کچی اینٹیں چننا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الْأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر زمین سے صرف ایک بالشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ.

اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔

لغوی تشریح: [اِلْحَدُوا] فتح یَفْتَحُ سے امر کا صیغہ ہے۔ لحد قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں۔ [وَانْصِبُوا] ضَرَبَ یَضْرِبُ سے صیغۂ امر ہے۔ أَقِیمُوا کے معنی میں ہے، یعنی نصب کرو، قائم کرو۔ [اَللَّبِنَ] ''لام'' پر فتحہ اور ''با'' کے نیچے کسرہ ہے۔ وہ اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے، جب اسے آگ میں پکایا جائے تو آجُرّ کہتے ہیں جس کی ''جیم'' پر ضمہ اور ''را'' پر تشدید ہے۔ [قَدْرَ شِبْرٍ] ''شین'' کے نیچے کسرہ اور ''با'' ساکن ہے۔ انگوٹھے کے سرے سے لے کر چھنگلی کے سر تک کا فاصلہ، یعنی بالشت۔ [أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ] تجصیص سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے، یعنی چونے کے ساتھ تعمیر کرنا۔ [وَ أَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ] صیغۂ مجہول ہے، یعنی قبر کو بلند اور نمایاں کرنے کی غرض سے اس پر عمارت تعمیر نہ کی جائے، یا قبر کے اردگرد گنبد وغیرہ جیسی عمارت نہ بنائی جائے۔

فوائد و مسائل: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے: ① قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہیے۔ ② رسول اللہ کے زمانۂ اقدس میں قبر تیار کرنے کے دو طریقے رائج تھے: ایک لحد اور دوسرا شق۔ لحد، یعنی بغلی قبر، اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے گڑھا کھودا جائے، پھر اس میں قبلے کی جانب میت کو رکھنے کے لیے جگہ بنائی جائے۔ اور شق کا مطلب یہ ہے کہ بڑا گڑھا کھود کر اس کے درمیان میں میت کے لیے نسبتاً چھوٹا گڑھا کھودا جائے۔ احادیث مذکورہ سے دونوں کا جواز ثابت ہوتا ہے جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: جب نبی اکرم ﷺ فوت ہوئے اس وقت مدینے میں ایک آدمی لحد والی قبر بنایا کرتا تھا اور ایک آدمی شق والی (سیدھی۔) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم اپنے رب سے استخارہ کرتے ہیں (بہتر چیز کی دعا کرتے ہیں) اور دونوں کو بلا بھیجتے ہیں جو پیچھے رہ گیا، اسے چھوڑ دیں گے۔ (اور جو پہلے آ گیا، وہ اپنے طریقے پر قبر تیار کر دے گا) چنانچہ ان دونوں کو پیغام بھیجا گیا تو لحد بنانے والا پہلے آ گیا، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ کے لیے بغلی قبر تیار کروائی۔ (مسند أحمد: ۳/ ۱۳۹، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في الشق، حديث: ۱۵۵۷، ۱۵۵۸) نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لحد ہمارے لیے ہے اور شق ہمارے سوا دوسروں کے لیے ہے۔" (سنن أبي داود' الجنائز' باب في اللحد' حديث:٣٢٠٨) علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ شق والی قبر دوسروں کے لیے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے لیے جائز نہیں۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں میں زیادہ شق والی قبر کا رواج ہے اور مسلمان زیادہ تر لحد (بغلی قبر) بناتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ لحد بنانا مستحب ہے کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے رسول اللہ ﷺ کے لیے لحد ہی کھودی گئی تھی۔ دیکھیے: (صحيح مسلم بشرح النووي' الجنائز:٧/٤٨' ٤٩' حديث:٩٦٦) لہٰذا جہاں زمین سخت ہو اور لحد والی (بغلی) قبر بن سکتی ہو وہاں لحد بنانا مستحب اور افضل ہے' البتہ شق (صندوقی قبر) بنانا بھی جائز ہے جیسا کہ احادیث سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ والله أعلم. ③ پکی اینٹیں اندر لگانی چاہییں۔ ④ قبر پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا اور قبر کو پختہ بنانا شرعاً منع ہے اور یہ ممانعت تحریمی ہے۔ ⑤ قبر کو کوئی مخصوص شکل دینا بھی درست نہیں۔ نبی ﷺ کی ابدی آرام گاہ کوہان نما تھی اور ایک بالشت سے بلند نہیں ہے اور یہی کیفیت حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کی ہے۔

(٤٦٩) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى عَلٰى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونٍ، وَأَتَى الْقَبْرَ، فَحَثٰى عَلَيْهِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ، وَهُوَ قَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

[469] حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی قبر پر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے تین لپ مٹی ڈالی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور دیگر محققین کے نزدیک بھی مذکورہ روایت ضعیف ہے' تاہم مذکورہ روایت میں بیان کردہ مسئلے کی تائید دیگر صحیح احادیث سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک میت کا جنازہ پڑھا' پھر اس کی قبر پر تشریف لائے اور اس کے سر کی طرف سے اس پر (مٹی کی) تین لپیں ڈالیں۔ (سنن ابن ماجه' الجنائز' باب ما جاء في حثو التراب في القبر' حديث:١٥٦٥) لہٰذا جنازہ پڑھنے والا اگر دفن تک رکے تو اسے چاہیے کہ قبر پر کم از کم تین لپیں مٹی ڈالے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ میت کو دفنانے کے بعد قبر پر تین لپیں مٹی ڈالنا مذکورہ روایت' یعنی حضرت ابوہریرہ کی حدیث کی رو سے مستحب ہے لیکن وہ روایت جس میں پہلی لپ کے بعد مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ اور دوسری کے بعد وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ اور تیسری لپ کے بعد وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى پڑھنے کا ذکر ہے' وہ محققین کے نزدیک ضعیف ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے' لہٰذا اس بحث اور دلائل کی رو سے کوئی کلمہ اور لفظ ادا کیے بغیر تین لپیں مٹی ڈالنا مستحب عمل ہے۔ والله أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (أحكام الجنائز و بدعها للألباني' ص:١٩٤' طبع مكتبة المعارف' الرياض' و إرواء الغليل' رقم:٧٥١)

وضاحت: [عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ] جمحی قرشی ہیں۔ آپ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بڑے عابد و زاہد صحابی تھے۔ جاہلیت ہی کے زمانے میں انھوں نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دے لیا تھا۔ ١٣ آدمیوں کے بعد اسلام

٤٦٩ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٧٦. * فيه عاصم بن عبيدالله، والقاسم بن عبدالله العمري متروك.

قبول کیا۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے تیسویں ماہ یعنی شعبان میں وفات پائی۔ مہاجرین میں سب سے پہلے یہی فوت ہوئے۔ آپ بقیع قبرستان میں دفن ہوئے۔

(٤٧٠) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: **اِسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ، وَاسْأَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ**. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[470] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر پر (قبر کے پاس) کھڑے ہو جاتے اور فرماتے: ''اپنے بھائی کے لیے بخشش مانگو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے باز پرس کی جائے گی۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت سے قبر میں باز پرس ہوتی ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسنون یہ ہے کہ دفن کے بعد واپس آتے ہوئے قبر پر میت کے لیے استغفار اور ثابت قدمی کی دعا کی جائے۔ ③ قبر سے یا قبرستان سے چالیس قدم دور آ کر دعا کرنے اور اس کے علاوہ دیگر رسمیں ادا کرنے والی بات بالکل غلط ہے۔ اس کا شریعت اسلامی میں قطعاً کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

(٤٧١) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيبٍ - أَحَدِ التَّابِعِينَ - قَالَ: كَانُوا يَسْتَحِبُّونَ إِذَا سُوِّيَ عَلَى الْمَيِّتِ قَبْرُهُ وَانْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلَانُ! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلَانُ! قُلْ: رَبِّيَ اللّٰهُ، وَدِينِيَ الْإِسْلَامُ، وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ ﷺ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْقُوفًا، وَلِلطَّبَرَانِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أُمَامَةَ مَرْفُوعًا مُطَوَّلًا.

[471] حضرت ضمرہ بن حبیب رحمہ اللہ - جو ایک تابعی ہیں - سے مروی ہے کہ لوگ مستحب سمجھتے تھے کہ جب میت کی قبر برابر اور ہموار کر دی جائے اور لوگ جانے لگیں تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کو مخاطب ہو کر یوں کہا جائے: اے فلاں! لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہو۔ اسے تین مرتبہ کہے۔ اے فلاں! کہو: "رَبِّيَ اللّٰهُ وَ دِينِيَ الْإِسْلَامُ وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ" ''میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور محمد ﷺ میرے نبی ہیں۔'' (اسے سعید بن منصور نے موقوف بیان کیا ہے اور طبرانی نے بھی ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بالکل اسی طرح لمبی مرفوع حدیث بیان کی ہے۔)

٤٧٠ـ **[إسناده حسن]** أخرجه أبوداود، الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، حديث: ٣٢٢١، والحاكم: ١/ ٣٧٠.

٤٧١ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه سعيد بن منصور. * فيه أشياخ من أهل حمص، وهم مجهولون، وحديث أبي أمامة، أخرجه الطبراني في الكبير: ٨/ ٢٩٨، حديث: ٧٩٧٩ وسنده ضعيف، فيه جماعة لم يعرفهم الهيثمي كما في مجمع الزوائد: ٢/ ٣٢٤، وقال الحافظ في التلخيص الحبير: ٢/ ١٣٥، ١٣٦، حديث: ٧٩٦، "وإسناده صالح، وقد قواه الضياء، في أحكامه. وفي السند: محمد بن إبراهيم بن العلاء الحمصي، قال الحافظ في تقريب التهذيب: «منكر الحديث».

لغوی تشریح: [کَانُوا یَسْتَحِبُّونَ] پسند کرنے والوں سے یہاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ [سُوِّيَ] تسویۃ سے ماخوذ ہے۔ ''المنار'' میں ہے: ''تلقین'' کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک بلاشبہ موضوع ہے۔ اور ابن قیم نے زادالمعاد فی ھدی خیر العباد میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے۔ اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے' اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ (سبل السلام)

فائدہ: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن درجے کی روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اہل شام کے علاوہ میں نے کسی اور کو یہ عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ علاوہ ازیں ہمارے فاضل محقق نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت ضمرہ بن حبیب رحمہ اللہ] ان کی کنیت ابوعتبہ ہے۔ ضمرہ میں ''ضاد'' پر فتحہ اور ''میم'' ساکن ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: ضمرہ بن حبیب بن صہیب زبیدی۔ زبیدی کی ''زا'' پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے' اس لیے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔

(٤٧٢) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْبِ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ». زَادَ ابْنُ مَاجَه مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا».

[472] حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب ان کی زیارت کیا کرو۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔) ترمذی نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے: ''کیونکہ قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔'' اور ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ اضافہ بیان کیا ہے: ''یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنادیتی ہے۔''

لغوی تشریح: [فَزُورُوهَا] زیارۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ یہ اجازت ممانعت کے بعد تھی۔ [تُذَكِّرُ] تذکیر سے ماخوذ ہے' یعنی یاددہانی کراتی ہے۔ [تُزَهِّدُ] تزھید سے ماخوذ ہے' یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ② ابتدا میں نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کے لیے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ ③ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس وغیرہ کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

٤٧٢۔ [صحيح] أخرجه مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ في زيارة قبر أمه، حديث: ٩٧٧، والترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٥٤ وقال: "حسن صحيح" وحديث ابن مسعود أخرجه ابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٥٧١ وهو حديث حسن.

(٤٧٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[473] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کے لیے جانے والی خواتین پر لعنت کی ہے۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

 **فوائد ومسائل:** ① یہ حدیث خواتین کے زیارت قبور کے لیے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے' اس کے برعکس بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کے لیے جانا بھی ثابت ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت ورخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت ورخصت دی گئی تو اس میں مرد وعورت سب شامل ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تاحال زیارت قبور کی حرمت خواتین کے لیے برقرار ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع فزع' آہ وبکا کثرت سے کرتی ہیں۔ اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس صورت میں منع کیا گیا ہے جب کہ وہ حرام کام کا ارتکاب کریں جس طرح کہ وہ جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں' روتی پیٹتی اور بین کرتی ہیں' جزع فزع کرتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں۔ یہ امور اسلام کی تعلیم کے منافی ہیں' اس لیے ان سے منع کیا گیا ہے۔ ② اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے' اخروی یاددہانی اور تذکیر کے لیے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تطبیق کی یہ صورت نہایت شاندار ہے۔ ③ مذکورہ روایت کی بابت ہمارے فاضل محقق لکھتے ہیں کہ مذکورہ روایت تو سنداً ضعیف ہے' البتہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی حدیث جس میں زَائِرَاتِ الْقُبُورِ کی بجائے زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ کے الفاظ ہیں' حسن درجے کی ہے۔ دیکھیے: (سنن أبي داود' الجنائز' باب في زيارة النساء القبور، حديث:٣٢٣٦' و جامع الترمذي' الصلاة' حديث:٣٢٠) امام شوکانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ صحیح حدیث میں زَوَّارَات کا لفظ ہے جو مبالغے کا صیغہ ہے' یعنی عورتوں کے بکثرت قبرستان جانے پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار زیارت قبور کے لیے جانے کا جواز اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ قبرستان میں جا کر مدفونین کے لیے کس طرح دعا کروں تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ نہیں فرمایا کہ تم جایا ہی نہ کرو بلکہ فرمایا: ''یوں کہہ: [اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ...]'' (صحيح مسلم' الجنائز' باب مايقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها' حديث: ٩٧٤) شیخ البانی رحمہ اللہ اس مسئلے کی بابت لکھتے ہیں کہ عورتوں کے لیے بھی زیارت قبور ویسے ہی مستحب ہے' جیسے مردوں کے لیے' پھر مذکورہ روایت کی بابت لکھتے ہیں: زائرات القبور کے الفاظ ضعیف ہیں اور زوّارات القبور کے الفاظ صحیح ہیں جن سے عورتوں کے لیے بکثرت قبرستان جانے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (أحكام الجنائز وبدعها' ص:٢٢٩-٢٣٥' طبع: مكتبة المعارف' الرياض)

٤٧٣ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجدًا، حديث: ٣٢٠ بطوله. ✽ أبوصالح باذام مولى أم هانيء ضعيف مدلس حدث به بعد اختلاطه، والحديث حسن، بلفظ: أن رسول الله ﷺ لعن زوارات القبور، أخرجه الترمذي، الجنائز، حديث: ١٠٥٦ وغيره.

(٤٧٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلنَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ. أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ.

[474] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور سننے والی پر لعنت کی ہے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلنَّائِحَةَ] نیاحة سے ماخوذ ہے۔ مرنے والے کے اوصاف و شمائل اور محاسن کو گن گن کر بلند آواز سے بیان کرنا، رونا اور چیخ و پکار کرنا۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے، تاہم نوحے کی ممانعت دیگر صحیح احادیث میں موجود ہے جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت جریر رحمہ اللہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حمص شہر میں خطبہ دیا تو اس خطبے کے دوران میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے نوحہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث:١٥٨٠، والمعجم الكبير للطبراني: ١٩/٣٤٣، حديث:٧٨٦) بلکہ نبیٔ اکرم ﷺ عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا باقاعدہ عہد لیتے تھے جیسا کہ آئندہ روایت میں مروی ہے۔ علاوہ ازیں احادیث میں تو اس کی بابت سخت وعید بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ جاہلیت کا رواج ہے۔ نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مرگئی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تارکول کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی قمیص تیار کرے گا۔'' (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في النهي عن النياحة، حديث:١٥٨١) نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میت پر نوحہ کرنا جاہلیت کا رواج ہے۔ نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مرگئی تو اسے قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے جسم پر تارکول کی قمیصیں ہوں گی، پھر ان پر آگ کے شعلوں کی قمیص پہنائی جائے گی۔'' (سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث:١٥٨٢) اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت جو آگے آرہی ہے، اس میں مذکور ہے کہ مرنے والے کو اس پر نوحہ کیے جانے کی وجہ سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ حکم اور وعیدیں صرف عورت کے لیے خاص نہیں بلکہ مرد بھی اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو قیامت کو اسے بھی یہی سزا ملے گی۔ احادیث میں عورتوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ عرب میں عورتیں ہی نوحہ کرتی تھیں۔ ارشاد نبوی ہے: ''جو شخص رخساروں پر تھپڑ مارے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی طرح پکارے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (صحيح البخاري، الجنائز، حديث:١٢٩٧) اس میں مرد بھی شامل ہیں۔ ان احادیث اور اس قسم کی دیگر احادیث سے اس کی ممانعت واضح ہے، بلکہ مسند احمد کی حسن درجے کی روایت میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جنازے کے ساتھ جانے سے منع فرما دیا ہے جس کے ساتھ نوحہ کرنے والی عورتیں ہوں۔ بہرحال ان تمام احادیث سے نوحے کی ممانعت اور اس پر وعید ثابت ہوتی ہے۔ جب نوحہ کرنا اتنا بڑا گناہ ہے تو نوحہ سننا تو بالاولیٰ گناہ ہوگا۔ والله أعلم.

٤٧٤ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب في النوح، حديث: ٣١٢٨. * قال أبوحاتم الرازي: "حديث منكر، محمد بن الحسن وأبوه وجده ضعفاء في الحديث".

(٤٧٥) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ لَّانَنُوحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[475] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ ہم میت پر نوحہ نہیں کریں گی۔ (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل: ① اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مرنے والوں پر نوحہ اور بین کرنا، چیخنا چلانا، واویلا کرنا، گریبان چاک کرنا اور منہ نوچنا وغیرہ حرام افعال ہیں۔ ② غم سے آنکھوں کا اشک بار ہونا اور آنسوؤں کا بے اختیار بہہ نکلنا حرام نہیں، گویا آنکھوں کا فعل حرام نہیں بلکہ زبان کا فعل حرام ہے۔

(٤٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**الْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ.

[476] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''مرنے والے کو اس پر نوحہ کیے جانے کے سبب سے اس کی قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔'' (بخاری ومسلم، نیز ان دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطے سے بھی اسی طرح روایت بیان کی ہے۔)

فائدہ: اس حدیث میں ایک اشکال ہے کہ اس طرح تو کسی دوسرے کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کے لیے عذاب ثابت ہو رہا ہے، حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى﴾ (بني إسرائيل ١٧:١٥) ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' علمائے کرام نے اس اشکال کے متعدد جواب دیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ بھی تھا اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا تو اس صورت میں اسے عذاب ہوگا ورنہ نہیں۔ اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو، بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ واللّٰہ أعلم.

(٤٧٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ بِنْتًا لِلنَّبِيِّ ﷺ تُدْفَنُ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ عِنْدَ الْقَبْرِ، فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[477] حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کی ایک صاحبزادی کی تدفین کے موقع پر حاضر تھا۔ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

٤٧٥۔ أخرجه البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من النوح والبكاء، والزجر عن ذلك، حديث: ١٣٠٦، ومسلم، الجنائز، باب التشديد في النياحة، حديث: ٩٣٦.

٤٧٦۔ أخرجه البخاري، الجنائز، باب قول النبي ﷺ يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه، حديث: ١٢٩٠، ومسلم، الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء أهله عليه، حديث: ٩٢٧، وحديث المغيرة أخرجه البخاري، الجنائز، حديث: ١٢٩١، ومسلم، الجنائز، حديث: ٩٣٣.

٤٧٧۔ أخرجه البخاري، الجنائز، باب قول النبي ﷺ يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه، حديث: ١٢٨٥.

لغوی تشریح: [شَهِدتُ بِنتًا] یہ آپ کی صاحبزادی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں جنھوں نے ۹ ہجری میں وفات پائی۔ [تُدفَنُ] صیغۂ مجہول ہے‘ یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ [تَدمَعَانِ] ’’تا‘‘ اور ’’میم‘‘ دونوں پر فتحہ ہے‘ یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے‘ مکروہ نہیں۔ نبی ﷺ کے‘ اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ بھی روتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ’’اے ابن عوف! یہ تو ایک رحمت ہے۔‘‘ پھر آپ نے روتے ہوئے فرمایا: ’’آنکھ اشکبار ہے اور دل غمگین ہے لیکن ہمیں زبان سے وہی کچھ کہنا ہے جس سے ہمارا مالک راضی ہو۔‘‘ (صحيح البخاري‘ الجنائز‘ باب قول النبي ﷺ: إنابك لمحزونون‘ حديث: ۱۳۰۳) گویا غم کی وجہ سے شفقت پدری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قابل مذمت و ملامت نہیں‘ البتہ زبان سے چیخ و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(٤٧٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: **«لَا تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلَّا أَنْ تُضْطَرُّوا»**. أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ، لٰكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهِ.

[478] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’’اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کے لیے مجبور ہو جاؤ۔‘‘ (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا حتیٰ کہ اس کی نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔)

لغوی تشریح: [لَا تَدفِنُوا] باب ضَرَبَ يَضرِبُ سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ [زَجَرَ] زجر سے ماخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔

فائدہ: میت کی تدفین کے اوقات کی بابت حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے روکتے تھے: ① جب سورج طلوع ہو رہا ہو حتیٰ کہ بلند ہو جائے۔ ② عین دوپہر (زوال) کے وقت حتیٰ کہ سورج ڈھل جائے۔ ③ اور جب سورج غروب ہونے کے قریب ہو حتیٰ کہ پوری طرح غروب ہو جائے۔ (صحيح مسلم‘ صلاة المسافرين‘ باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها‘ حديث: ۸۳۱) نیز بلوغ المرام کی مذکورہ روایت‘ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اپنے مردوں کو رات کے وقت دفن نہ کرو‘ سوائے اس کے کہ تمھیں کوئی مجبوری ہو۔‘‘ اور صحیح مسلم کی روایت میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا ہے الا یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی گئی ہو۔ ان تمام احادیث کو جمع کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان اوقات میں مردوں کو دفن کرنا جائز نہیں الا یہ کہ کوئی مجبوری اور اشد ضرورت پیش آ جائے‘ نیز رات کو تدفین کی ممانعت ممکن

٤٧٨ـ [حسن] أخرجه ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في الأوقات التي لا يصلى فيها على الميت، حديث: ١٥٢١ وسنده ضعيف، وللحديث شاهد عند مسلم، الجنائز، حديث: ٩٤٣.

ہے اس گمان کی وجہ سے ہو کہ نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے لہٰذا اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی گئی ہو تو کسی عذر کے پیش نظر رات کو بھی دفن کرنا پڑے تو جائز ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک صحابی کو رات کے وقت اس کی قبر میں دفن کیا تھا۔ (جامع الترمذي' الجنائز' باب ماجاء في الدفن بالليل' حديث:١٠٥٧) نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رات کے وقت دفن کیا گیا۔ (صحيح البخاري' الجنائز' باب الدفن بالليل' قبل الحديث: ١٣٤٠) مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رات کے وقت دفن کیا۔ (المصنف لابن أبي شيبة: ٣/٣١' رقم:١١٨٢٦' ١١٨٢٧ و فتح الباري: ٣/٥٢٩) امام شوکانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ احادیث اس بات کا ثبوت ہیں کہ رات کے وقت دفن کرنا جائز ہے۔ علاوہ ازیں جمہور بھی اسی کے قائل ہیں۔ (نيل الأوطار: ٣/٣٨)

(٤٧٩) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ، حِينَ قُتِلَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اِصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ**». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

[479] حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انھوں نے فرمایا: جب جعفر (بن ابی طالب) رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس وہ چیز آ گئی جس نے انھیں (کھانا پکانے سے) مشغول کر دیا ہے۔'' (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو انھیں کھانا کھلانا مسنون ہے۔ ② ہمسائے کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ ③ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اعزہ واقرباء کے لیے سنت ہے' باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ ④ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں لوگوں کا جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔ دیکھیے: (مسند أحمد: ٢/٢٠٤' و سنن ابن ماجه' الجنائز' حديث: ١٦١٢)

وضاحت: | **حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ** | حضرت جعفر رضی اللہ عنہ' ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی اور اس کے متبعین نے انھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا' پھر انھوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا تھا۔ نبی ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا: ''مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے زیادہ مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔'' (المعجم الكبير للطبراني: ٢/١٠٨) بہت ہی زیادہ سخی انسان تھے۔ ۸ ہجری میں موتہ کے معرکے میں جام شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکے میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں

٤٧٩ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل الميت، حديث: ٣١٣٢، والترمذي، الجنائز، حديث: ٩٩٨، وابن ماجه، الجنائز، حديث: ١٦١٠، وأحمد: ١/ ٢٠٥.

بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں بازوؤں کے بدلے میں ان کے دو پر لگا دیے ہیں جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔'' (المعجم الكبير للطبراني: ٢/ ١٠٧) اسی وجہ سے انھیں جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر ذوالجناحین بھی انھی کا لقب ہے۔

(٤٨٠) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى الْمَقَابِرِ أَنْ يَقُولُوا: اَلسَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[480] حضرت سلیمان بن بریدہ رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھایا کرتے تھے کہ وہ جب قبرستان جائیں تو کہیں: ''سلامتی ہو تم پر اے گھروں والو! مومنوں اور مسلمانوں میں سے۔ اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ اور ہم اپنے اور تمھارے لیے اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَهْلَ الدِّيَارِ] ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار: دار کی جمع ہے۔ قبر کو گھر سے تشبیہ دی گئی ہے، اس لیے کہ قبر میت کے لیے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر فوت شدگان کے لیے اور اپنے لیے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ② [مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ] سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک، کافر اور ملحد کے لیے دعا کرنا اور ان کے لیے بخشش مانگنا جائز نہیں۔ ③ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس، مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں، یہ سب کام خلاف شرع اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقے سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

راویٔ حدیث: [حضرت سلیمان بن بریدہ بن حصیب اسلمی مروزی رحمہ اللہ] مشہور تابعی ہیں۔ امام ابن معین اور ابوحاتم رحمہما اللہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کہیں مذکور نہیں، مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث صحیح مسلم میں منقول ہیں۔

(٤٨١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقُبُورِ الْمَدِينَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ

[481] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینے کے قبرستان سے ہوا۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو۔ اللہ ہماری اور تمھاری مغفرت فرمائے۔ تم ہمارے پیش رو

٤٨٠ـ أخرجه مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، حديث: ٩٧٥.

٤٨١ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه الترمذي، الجنائز، باب ما يقول الرجل إذا دخل المقابر، حديث: ١٠٥٣. ☆ قابوس فيه لين (تقريب).

سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

ہو اور ہم تمھارے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَنْتُمْ سَلَفُنَا] سلفنا میں ''سین'' اور ''لام'' دونوں پر فتحہ ہے، یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ [وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ] اثر میں ''ہمزہ'' اور ''ثا'' پر فتحہ ہے، یعنی ہم تمھارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور تمھیں ملنے والے ہیں۔

فائدہ: اصحاب القبور کو سلام' ایک دعائیہ کلام ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے لیے سلامتی کی دعا ہوتی ہے' مردوں کو سنانا مقصود نہیں ہوتا' جس طرح خط لکھتے وقت غائب دوست کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہا جاتا ہے' اس سے خطاب مقصود نہیں ہوتا بلکہ دعائیہ کلام مقصود ہوتا ہے۔ بعینہٖ اصحاب القبور کو سلام سنانا مقصود نہیں ہوتا اور نہ وہ سنتے ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ﴾ (الفاطر ۳۵:۲۲) یعنی آپ قبروں والوں کو نہیں سنا سکتے۔

(۴۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلٰى مَا قَدَّمُوا». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُغِيرَةِ نَحْوَهُ، لٰكِنْ قَالَ: «فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ»

[482] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مردوں کو برا بھلا نہ کہو' اس لیے کہ انھوں نے جو کچھ آگے بھیجا ہے وہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسی طرح روایت کیا ہے لیکن اس میں [فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ] کے الفاظ ہیں' یعنی پھر (برا بھلا کہنے سے) تم زندہ لوگوں کو تکلیف پہنچاؤ گے۔'')

لغوی تشریح: [لَا تَسُبُّوا] سَبٌّ سے ماخوذ ہے۔ باب نَصَرَ يَنْصُرُ ہے۔ گالی گلوچ' سب وشتم' برے اور قبیح وصف بیان کرنا۔ [أَفْضَوْا] إِفْضَاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں' پا چکے ہیں۔ [إِلٰى مَا قَدَّمُوا] جو اعمال وافعال وہ آگے بھیج چکے ہیں۔ یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ [فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ] إِيذَاء سے ماخوذ ہے' یعنی تمھارا مردوں کو برا بھلا کہنا اور سب وشتم کرنا اس کے زندہ ورثاء واقرباء کے لیے باعث اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے قرابت داری کا تعلق ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے کیونکہ کسی فوت ہونے والے کا اس انداز سے تذکرہ کرنا' بالخصوص مسلمان کا' جو اس کے عزیز واقارب کے لیے اذیت اور تکلیف کا باعث ہو' باہمی لڑائی جھگڑے کا باعث بنتا ہے' اس لیے شریعت اسلامیہ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔

۴۸۲ـ أخرجه البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من سب الأموات، حديث: ۱۳۹۳، وحديث المغيرة أخرجه الترمذي، البر والصلة، حديث: ۱۹۸۲ وهو حديث حسن.

٤ - كِتَابُ الزَّكَاةِ

زکاۃ سے متعلق احکام ومسائل

(٤٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ: «إِنَّ اللّٰهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[483] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا۔ پھر ساری حدیث بیان کی‘ جس میں ہے: ”اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے وصول کی جائے اور انھی کے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔“ (بخاری ومسلم‘ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [كِتَابُ الزَّكَاةِ] لغت میں زکاۃ‘ زیادہ کرنے اور پاکیزہ کرنے کو کہتے ہیں۔ زکاۃ کو بھی اسی لیے یہ نام دیا گیا ہے کہ یہ مال کو پاکیزہ بنا دیتی ہے اور صاحب مال کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے اور زکاۃ دینے والے کے مال میں اضافہ کرتی ہے‘ نیز اس کے اجر وثواب کو بھی بڑھاتی ہے۔ اس کی تاریخ فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ ہجری میں رمضان کی فرضیت سے پہلے فرض ہوئی‘ اور بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ ہی میں ہو گئی تھی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ منورہ میں ۲ ہجری کو نازل ہوئے۔ [بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ] آپ نے ۱۰ ہجری

٤٨٣ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب لا تؤخذ كرائم أموال الناس في الصدقة، حديث: ١٤٥٨، ومسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، حديث: ١٩.

میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا۔ اور ایک قول کے مطابق ۹ ہجری کے آخر میں۔ اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ ہجری میں بھیجا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر واپس آئے اور شام کا رخ کیا اور ''طاعون عمواس'' میں وفات پائی۔ [فَذَكَرَ الْحَدِيثَ] اس لمبی حدیث میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے لیے وصیت تھی کہ وہ اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ [اِفْتَرَضَ] فرض اور واجب کی ہے۔ [فَتُرَدُّ] اس میں ''فا'' تعقیب کے لیے ہے' یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔ رَدّ سے ماخوذ' صیغۂ مجہول ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد باسعادت سے زکاۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہو گیا تھا۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکاۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی' البتہ اگر مقامی فقراء سے بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکاۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ ③ زکاۃ ادا کرنا صاحب نصاب لوگوں پر فرض ہے اور مستحق لوگوں تک پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اسے ادا کرنے کے ساتھ کسی پر احسان نہیں ہوتا بلکہ اپنا فرض نبھایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح یہ زکاۃ کا مال غرباء کا حق ہے۔ وہ اپنا حق وصول کرتے ہیں' کسی کا احسان نہیں اٹھاتے۔ جس طرح کہ نماز اور روزہ ادا کرنا انسان کی ذمہ داری ہے اور اللہ کا حق ہے' ان کی ادائیگی سے نماز پڑھنے والا اور روزہ رکھنے والا اللہ پر احسان نہیں کرتا بلکہ اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اللہ کا حق ادا کرتا ہے' اسی طرح زکاۃ غرباء کا حق ہے جسے ان تک پہنچانا ہوتا ہے اور یہ ان پر کوئی احسان نہیں ہوتا۔

(٤٨٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ كَتَبَ لَهُ: هٰذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، وَالَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ بِهَا رَسُولَهُ: «فِي كُلِّ أَرْبَعٍ وَّعِشْرِينَ مِنَ الْإِبِلِ فَمَا دُونَهَا الْغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَّعِشْرِينَ إِلٰى خَمْسٍ وَّثَلَاثِينَ، فَفِيهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُنْثٰى، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّثَلَاثِينَ إِلٰى خَمْسٍ وَّأَرْبَعِينَ فَفِيهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُنْثٰى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّأَرْبَعِينَ، إِلٰى سِتِّينَ، فَفِيهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةُ

[484] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضۂ زکاۃ کے سلسلے میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دیا تھا: ''اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں' ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری۔ جب تعداد پچیس سے پینتیس تک ہو جائے تو اس تعداد پر بنت مخاض (ایک سالہ) اونٹنی لازم ہو گی۔ اگر وہ میسر نہ ہو تو پھر ابن لبون (دو سالہ) نر بچہ واجب ہو گا۔ اور جب چھتیس سے پینتالیس تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں بنت لبون (دو سالہ) اونٹنی عائد ہو گی۔ جب چھیالیس سے ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں

٤٨٤ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: ١٤٥٤.

الْجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَّسِتِّينَ، إِلٰى خَمْسٍ وَّسَبْعِينَ، فَفِيهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّسَبْعِينَ، إِلٰى تِسْعِينَ، فَفِيهَا بِنْتَا لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدٰى وَتِسْعِينَ، إِلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ، فَفِيهَا حِقَّتَانِ طَرُوقَتَا الْجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ، فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حِقَّةٌ. وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهُ إِلَّا أَرْبَعٌ مِّنَ الْإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا. وَفِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ، فِي سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِينَ، إِلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ إِلٰى مِائَتَيْنِ، فَفِيهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى مِائَتَيْنِ، إِلٰى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِيهَا ثَلَاثُ شِيَاهٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِي كُلِّ مِائَةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عَنْ أَرْبَعِينَ شَاةً، شَاةً وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ. وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ، وَلَا تَيْسٌ، إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ الْمُصَّدِّقُ. وَفِي الرِّقَةِ: فِي مِائَتَيْ دِرْهَمٍ، رُبْعُ الْعُشْرِ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ إِلَّا تِسْعِينَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ، وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ، أَوْ

حقہ (تین سالہ) جفتی کے قابل جوان اونٹنی ذمے پڑے گی۔ جب اکسٹھ سے پچھتر تک پہنچ جائے تو ان میں جذعہ (چار سالہ اونٹنی) لازم ہوگی۔ جب چھہتر سے نوے تک تعداد ہو جائے تو ان میں دو بنت لبون (دو دو سالہ دو اونٹنیاں) پڑیں گی۔ جب اکانوے سے ایک سو بیس تک عدد پہنچ جائے تو ان میں دو حقے (تین تین سالہ دو جوان اونٹنیاں) ادا کرنا ہوں گی جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر بنت لبون (دو سالہ) اور ہر پچاس پر حقہ (تین سالہ اونٹنی) واجب ہوگی۔ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد پر کوئی زکاۃ نہیں الا یہ کہ ان کا مالک چاہے۔ بکریوں کی زکاۃ' جو باہر (جنگل وصحرا میں) چرنے جاتی ہوں' ان میں چالیس سے لے کر ایک سو بیس تک صرف ایک بکری زکاۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے تو دو بکریاں زکاۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائیں گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے تو ہر سو پر ایک بکری زکاۃ وصول کی جائے گی۔ اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک عدد بھی کم ہوں تو مالک پر کوئی زکاۃ نہیں الا یہ کہ مالک چاہے۔ اور زکاۃ کے ڈر سے متفرق (الگ الگ) جانوروں کو اکٹھا نہ کیا جائے اور اکٹھے جانوروں کو الگ الگ نہ کیا جائے۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے مشترکہ ہوں تو وہ مشترکہ طور پر (زکاۃ کا حصہ نکالنے کے بعد) آپس میں اپنے اپنے حصے کے مطابق حساب کر لیں۔ زکاۃ میں بوڑھا اور یک چشم (کانا) جانور نہ لیا جائے اور نہ سانڈ ہی لیا جائے الا یہ کہ زکاۃ دینے والا آپ چاہے۔ چاندی (میں زکاۃ) کا نصاب

عِشْرِينَ دِرْهَمًا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ صَدَقَةُ الْحِقَّةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الْحِقَّةُ، وَعِنْدَهُ الْجَذَعَةُ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْجَذَعَةُ، وَيُعْطِيهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِينَ دِرْهَمًا أَوْ شَاتَيْنِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

دوسو درہم ہے۔ اس میں سے چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس ایک سونوے درہم ہوں تو اس پر زکاۃ واجب نہیں الا یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکاۃ میں جذعہ (چار سالہ اونٹنی) واجب ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو بلکہ حقہ (تین سالہ جوان اونٹنی) ہو تو اس سے حقہ اور دو بکریاں وصول کی جائیں گی بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب ہوسکیں' یا بیس درہم وصول کیے جائیں گے۔ اور جس کی زکاۃ میں حقہ (تین سالہ جوان اونٹنی) آتی ہو لیکن اس کے پاس تین سالہ جوان اونٹنی نہ ہو بلکہ جذعہ (چار سالہ اونٹنی) ہو تو اس سے وہی جذعہ (چار سالہ اونٹنی) وصول کر لی جائے گی مگر زکاۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں دے گا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كَتَبَ لَهُ] حضرت انس رضی اللہ عنہ کو اس وقت یہ تحریر کر کے دیا جب انھیں بحرین کی طرف زکاۃ کی وصولی پر عامل بنا کر بھیجا۔ [هٰذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ] یہ فرضیت زکاۃ کا نوشتہ ہے۔ اس تحریری مکتوب کا آغاز انھی مذکورہ الفاظ سے ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں مکتوب کے شروع میں [بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ] ہے۔ دیکھیے تخریج حدیث ہذا۔ [فَمَا دُونَهَا] اس کا مطلب ہے چوبیس سے کم۔ [الْغَنَمِ] بکری اور بھیڑ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں الغنم مبتدا مؤخر ہے اور اس کی خبر [فِي كُلِّ أَرْبَعٍ وَّ عِشْرِينَ فَمَا دُونَهَا] ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس تعداد و مقدار میں بکری یا بھیڑ زکاۃ میں نکالنا واجب ہے۔ [فِي كُلِّ خَمْسٍ] ہر پانچ کی تعداد سے مراد اونٹ ہیں۔ جب پانچ اونٹ ہوں گے تو زکاۃ کا نصاب شروع ہوگا اور اس تعداد پر [شَاةٌ] ایک بکری یا بھیڑ دینا ہوگی۔ [بِنْتُ مَخَاضٍ] اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ مخاض اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ جائے کہ وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو' خواہ ابھی تک وہ حاملہ نہ ہوئی ہو۔ اسے (بنت مخاض) مخاض کی بیٹی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا شمار ان میں سے ہے جو حاملہ ہوتی ہیں اور مؤنث کی قید تاکید کے لیے ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ نر اونٹ وہ کام نہیں دے سکتا جو مادہ دے سکتی ہے۔ [ابْنُ لَبُونٍ] لبون کے ''لام'' پر فتحہ ہے۔ اس سے مراد وہ اونٹ ہے جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

[بِنْتُ لَبُونٍ] یہ عمر میں ابن لبون کے برابر ہوتی ہے' یعنی وہ اونٹنی جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ [حِقَّةٌ] ''حا'' کے نیچے کسرہ اور ''قاف'' پر تشدید ہے۔ اس سے مراد وہ مادہ اونٹنی ہے جو تین سال کی عمر پوری کر کے

چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کی جمع حقاق آتی ہے اور اس کا مذکر [حِقٌّ] ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اسے حقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں: حقدار اور قابل ہونے والی' چونکہ یہ اس قابل ہو چکی ہوتی ہے کہ اس پر سواری کی جا سکے اور بار برداری کے بھی قابل ہو جاتی ہے اور اسی طرح نر کی جفتی کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے طَرُوقَةُ الْجَمَلِ بھی کہا گیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ نر اگر اس سے جفتی کرے تو کر سکتا ہے' خواہ اس سے وطی نہ بھی کی گئی ہو لیکن اس کے قابل ضرور ہو چکی ہوتی ہے۔ [جَذَعَةٌ] ''جیم'' اور ''ذال'' دونوں پر فتحہ ہے جو پورے چار سال کو پہنچ چکی ہو اور پانچویں میں قدم رکھ چکی ہو۔ [فَإِذَا زَادَتْ] جب اونٹوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو جائے۔ [عَلٰی عِشْرِينَ وَ مِائَةٍ] ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔

[فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ......] تو انھیں چالیس اور پچاس کے دو گروپوں اور حصوں میں تقسیم کر لیں گے' مثلاً: مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں ہم اس تعداد کو چند حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک سو اکیس میں چالیس چالیس کے تین گروپ بنیں گے' چنانچہ اس صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی اور جو ایک زائد بچے گا اس پر کوئی زکاۃ نہیں۔ اور جب یہ ایک سو تیس ہو جائیں گے تو ایک گروپ پچاس کا اور دو' چالیس چالیس کے بنیں گے اور اس صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس چالیس پر دو بنت لبون ادا کی جائیں گی۔ بس اسی طرح دس کے اضافے کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوتا چلا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکاۃ ہوگی یہاں تک کہ یہ تعداد ایک سو انتیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضائے کلام یہ ہے کہ کسروں کو شمار نہیں کیا جاتا اور دہائیوں کے مکمل ہونے پر زکاۃ ہے' مثلاً: دس' بیس' تیس۔ علٰی ھذا القیاس. (عون المعبود اور سبل السلام) [إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا] الا یہ کہ اونٹوں کا مالک رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکاۃ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے' اس پر واجب نہیں ہے۔ [فِي سَائِمَتِهَا] یہ فِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ سے بدل ہے۔ بکریوں میں سے سائمہ وہ ہے جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنے پر ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔ ان کے نزدیک زکاۃ واجب ہونے کے لیے جنگلوں وغیرہ کے چارے پر انحصار کی شرط ہے۔ [إِلٰی عِشْرِينَ وَ مِائَةٍ شَاةٍ شَاةٌ] ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے۔ پہلا شَاةٍ کا لفظ مائة کی تمیز ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور دوسرا شاةٌ مبتدا مؤخر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ فِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ ہے۔ اور شاۃ کے لفظ میں نر و مادہ' بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاۃ کا مترادف ہے' یعنی شاۃ اور غنم دونوں ہم معنی ہیں۔ [فَإِذَا زَادَتْ عَلٰی عِشْرِينَ وَ مِائَةٍ] جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے' خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو' اس میں دو بکریاں ہیں۔ اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں۔ [فَإِذَا زَادَتْ عَلٰی ثَلٰثِ مِائَةٍ فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ] اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری زکاۃ میں وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جب تعداد چار سو تک پہنچ جائے' جمہور کا یہی قول ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی' پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے حضرت ابن

عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے مرفوعاً نقل کیا ہے: ''جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے۔ جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکاۃ نہیں۔'' (جامع الترمذي، الزكاة، حديث:٦٢١) [فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ] جب آدمی کی بکریاں جنگل میں چرنے چگنے والی چالیس سے کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکاۃ نہیں پڑتی۔ [نَاقِصَةً] منصوب ہے۔ كانت کی خبر واقع ہو رہا ہے۔ [مِنْ أَرْبَعِينَ شَاةً شَاةً وَاحِدَةً] دونوں شاة منصوب ہیں۔ پہلا لفظ عدد سے تمیز واقع ہو رہا ہے اور دوسرا حرف جر محذوف ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے جسے منصوب بنزع الخافض کہتے ہیں، یعنی اصل میں تھا بشاة واحدة۔ یا پھر یہ ناقصة کا مفعول ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے پاس باہر چرنے چگنے والی بکریوں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکاۃ نہیں ہے اور جب تعداد میں ایک سے زیادہ بکریوں کی کمی واقع ہو جائے پھر تو کسی صورت بھی زکاۃ نہیں۔

[وَلَا يُجْمَعُ] صیغۂ مجہول۔ نہ جمع کیا جائے گا، نہ اکٹھا کیا جائے گا۔ [وَلَا يُفَرَّقُ] ''را'' پر تشدید کے ساتھ، صیغۂ مجہول ہے۔ [خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ] مفعول لہ واقع ہو رہا ہے، اس لیے منصوب ہے، یعنی زکاۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشے کے پیش نظر جمع یا الگ نہ کرے۔ زیادہ زکاۃ پڑنے کا اندیشہ مال کے مالک کو ہو گا اور کم زکاۃ پڑنے کا خوف زکاۃ وصول کرنے والے عامل کو ہو گا۔ اور نہی دونوں فریقین کے لیے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے، مثلاً: تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ ہونے کی صورت میں ہر ایک پر ایک بکری زکاۃ ہے، اس طرح مجموعی طور پر انھیں تین بکریاں زکاۃ ادا کرنی پڑے گی۔ جب زکاۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو وہ بکریاں جمع کر لیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح انھیں صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے۔ اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں، دو سو ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکاۃ دینا لازمی ہے کیونکہ دو سو سے ایک بکری زائد ہے۔ مگر جب زکاۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کر لیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمے ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ اس حدیث میں مال کے مالکوں کو اس طرح کے طریقوں کے ساتھ حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکاۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم شریک ہیں، انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا نہیں ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اپنی اپنی ایک سو بیس یا اس سے کچھ کم بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک پر ایک بکری زکاۃ واجب ہے، مگر زکاۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں از خود جمع کرتا ہے جس سے ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ ان سے تین بکریاں وصول کر لیتا ہے۔ اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے، مثلاً: ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملکیت میں ہیں جو کہ آپس میں شریک ہیں، ان پر صرف ایک ہی بکری زکاۃ واجب ہے مگر زکاۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کر لیتا ہے، بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے وصول کرتا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں، یعنی کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا قلت کے نقطۂ نظر سے، دونوں معنوں کا احتمال

ہے‘ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں‘ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔

[وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ] خلیطین کے معنی: شریکین ہیں اور اس میں مِن بیانیہ ہے جو اسم موصول کے بیان کے لیے ہے۔ [اَلْخُلْطَةُ] یعنی شرکت یہ ہے کہ چرواہا‘ چراگاہ‘ نر (سانڈ) اور پانی پلانے کی جگہ ایک ہو۔ [فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ] سویة میں ''یا'' پر تشدید ہے‘ اس کے معنی مساوات اور برابری کے ہیں‘ اور تراجع کا مطلب یہ ہے کہ جب زکاۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعی مال پر واجب زکاۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کر لیتا ہے (حالانکہ اس کے ذمے تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔) تو اب زکاۃ دینے والا اپنے دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت وصول کر لے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکاۃ ادا ہو جائے گی۔ کمی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بِالسَّوِيَّةِ سے یہی برابری مراد ہے‘ مثلاً: دو شریکوں کا کل مال چالیس بکریاں ہیں۔ دونوں کی بیس بیس ہیں‘ اب ان میں سے ایک شریک اپنے حصے کی بکری زکاۃ میں ادا کر دے اور آدھی قیمت اپنے ساتھی سے وصول کر لے۔

[لَا يُخْرَجُ] صیغۂ مجہول ہے‘ نہیں نکالا جائے گا۔ [هَرِمَةٌ] ''ہا'' پر فتحہ اور ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ [وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ] عوار کے ''عین'' پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں‘ عیب کے معنی میں ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے ''عین'' پر فتحہ کی صورت میں اس کا معنی عیب کے ہوں گے اور ضمہ کی صورت میں کانا کے۔ اور بہتر یہی ہے کہ اسے فتحہ سے پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ [وَلَا تَيْسٌ] ''تا'' پر فتحہ اور ''یا'' ساکن ہے۔ سانڈ بکرا جو بکریوں پر جفتی کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ [إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْمُصَدِّقُ] مصدق کے ''صاد'' پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ تشدید کے ساتھ اس کی اصل متصدق ہے اور یہ باب تفعل ہے‘ یعنی زکاۃ و صدقہ دینے والا ہے۔ (مال کا مالک۔) اس صورت میں استثنا فقط لفظ تیس کی طرف راجع ہے‘ یعنی سانڈ بکرا زکاۃ میں لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر سانڈ بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا ''صاد'' مخفف ہے اور یہ باب تفعیل ہے جس کے معنی ہیں: صدقہ لینے والا‘ اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا۔ اس صورت میں استثنا تینوں کی طرف راجع ہے‘ یعنی بوڑھی کھوسٹ‘ عیب والی اور سانڈ بکرے تمام کے ساتھ استثنا کا تعلق ہے‘ یعنی ایسے جانور زکاۃ میں نہ دیے جائیں الا یہ کہ زکاۃ لینے والا ان کے لینے میں زیادہ مصلحت محسوس کرے اور مساکین کے لیے زیادہ اچھا سمجھے۔

[وَفِي الرِّقَةِ] رقة میں ''را'' کے نیچے کسرہ اور ''قاف'' مخفف ہے‘ یہ اصل میں وَرِق تھا۔ وَرِق ''واؤ'' پر فتحہ اور ''را'' کے نیچے کسرہ کے ساتھ ہے‘ چاندی کو کہتے ہیں۔ [رُبُعُ الْعُشْرِ] ربع کے ''را'' اور عشر کے ''عین'' پر ضمہ ہے اور ''با'' اور ''شین'' ساکن ہیں۔ یا دونوں پر ضمہ بھی آ سکتا ہے۔ ربع کسی چیز کا چوتھا حصہ‘ عشر دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا۔ دو سو درہم باون تولے اور چھ ماشے چاندی کے برابر ہوتے ہیں جس کا وزن آج کل کے حساب سے تقریباً 618 گرام اور 182 ملی گرام بنتا ہے۔ [فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ] اور اگر چاندی نہ ہو۔ [إِلَّا تِسْعِينَ وَ مِائَةٍ] مگر ایک سو نوے درہم ہوں‘ یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں تو ان پر زکاۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ سو پورا ہونے

سے پہلے آخری دہائی نوے ہی ہے۔ اور حساب کا معاملہ یہ ہے کہ جب گنتی اکائیوں سے تجاوز کر جائے تو عقود سے گنتی کی جاتی ہے۔ اور عقود کہتے ہیں دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں کو۔

[فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ] جذعہ کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ [وَ يَجْعَلُ] مالک شامل کرے گا۔ [مَعَهَا شَاتَيْنِ] اس کے ساتھ دو بکریاں، نقصان و کمی کی تلافی کرنے کے لیے کیونکہ حقہ جذعہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ [إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ] بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں۔ [أَوْ عِشْرِينَ دِرْهَمًا] بیس درہم۔ أَوْ یہاں تخییر کے لیے ہے، یعنی اختیار حاصل ہے کہ چاہے یہ دے دے، چاہے وہ دے دے۔ [وَيُعْطِيهِ الْمُصَدِّقُ] ''صاد'' پر تخفیف اور ''دال'' پر تشدید ہے۔ زکاۃ وصدقہ وصول کرنے والا، سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں مال مویشی اور چاندی کی زکاۃ کا نصاب مذکور ہے، نیز اس میں زکاۃ وصول کرنے کا طریق کار، زکاۃ میں وصول کیے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان اور زکاۃ کی وصولی کا اہتمام مذکور ہے۔ ② اس حدیث میں یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نہ تو مالک کو دھوکا دینے کی کوشش کی جائے اور نہ سرکاری اہل کار ہی کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ③ ہر قسم کے مویشیوں پر زکاۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چگنے والوں پر ہے۔

(٤٨٥) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِينَ بَقَرَةً تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِينَارًا، أَوْ عَدْلَهُ مَعَافِرِيًّا. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَأَشَارَ إِلَى اخْتِلَافٍ فِي وَصْلِهِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[485] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں یمن کی طرف (عامل مقرر کر کے) بھیجا تو انھیں حکم دیا کہ وہ ہر تیس گایوں میں سے ایک سال کا ایک بچھڑا یا بچھڑی وصول کرے اور ہر چالیس میں سے ایک مسنہ (دو دانت والی گائے یا بیل) وصول کرے۔ اور ہر بالغ مرد سے ایک دینار یا اس کے برابر معافری کپڑا (جزیے کے طور پر) لے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ متن کے الفاظ احمد کے ہیں اور اسے ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور اس کے موصول ہونے کے بارے میں اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز اسے ابن حبان اور حاکم دونوں نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِنْ كُلِّ ثَلَاثِينَ بَقَرَةً] یہ نصاب متفق علیہ ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تیس سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زہری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انھوں نے اس مسئلے کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کیا ہے لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ بقرة اسم جنس ہے اور ''تا'' اس

٤٨٥۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: ١٥٧٦، والترمذي، الزكاة، حديث: ٦٢٣، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٤٥٢، وابن ماجه، الزكاة، حديث: ١٨٠٣، وأحمد: ٥/ ٢٣٠، ٢٣٣، ٢٤٧، وابن حبان (الإحسان): ٧/ ١٩٥، حديث: ٤٨٦٦، والحاكم: ١/ ٣٩٨: الأعمش مدلس وعنعن.

میں ''وحدت'' کی علامت ہے' تانیث کی نہیں۔ یہ مذکر ومؤنث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔[تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً] تبیع اسے کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو۔ اور أَوْ اس میں تخییر کے لیے ہے' یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے' چاہے نر وصول کرے۔[مُسِنَّةٌ] اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں' یعنی جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔[وَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ] ہر بالغ سے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو' خواہ احتلام سے دوچار ہوا ہو یا ابھی نہ ہوا ہو۔[دِينَارًا] غیر مسلم مردوں سے ایک دینار بطور جزیہ وصول کیا جائے گا۔[أَوْ عَدْلَهُ] ''عین'' پر فتحہ اور ''دال'' ساکن ہو تو اس سے مراد وہ چیز ہے جو قیمت میں کسی شے کے مساوی ہو۔ اور اگر ''عین'' کے نیچے کسرہ ہو تو پھر وہ چیز مراد ہے جو شکل وصورت میں کسی شے کے مساوی ہو۔ اور ایک قول کے مطابق ''عین'' پر فتحہ ہو یا کسرہ' دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ برابر کے معنی ہیں۔[مَعَافِرِيًّا] وہ چادریں جو یمن میں بنتی ہیں اور معافر کی طرف منسوب ہیں۔ معافر بروزن مساجد ہمدان کا ایک قبیلہ ہے' انھی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

فوائد ومسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین میں سے بعض نے حسن اور بعض نے صحیح قرار دیا ہے اور انھوں نے اس کے شواہد کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا پر قابل حجت ہے۔ اس حدیث کی اسنادی بحث اور مذکورہ مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ٧/٢١-٢٣و٣٦، ٣٣٩، ٣٤١' و إرواء الغليل: ٣/٢٦٨-٢٧١' رقم: ٧٩٥' و سنن ابن ماجه بتحقيق الدكتور بشار عواد' حديث: ١٨٠٣' ١٨٠٤) ② تیس سے کم گائے بیلوں میں زکاۃ واجب نہیں۔ ③ گائے بیلوں کی زکاۃ کا حساب کرنے کے لیے دیکھنا چاہیے کہ ان کے تیس تیس یا چالیس چالیس کے کتنے گروہ بنتے ہیں' پھر اس کے مطابق ایک سال یا دو سال کے بچھڑے بچھڑیاں لے لی جائیں' یعنی تیس پر ایک سال کا ایک جانور اور چالیس پر دو سال کا ایک جانور واجب ہے۔ اس کے بعد ساٹھ پر ایک ایک سال کے دو جانور' ستر پر دو سال کا ایک اور ایک سال کا ایک' اسّی پر دو سال کے دو' نوے پر ایک سال کے تین' سو (١٠٠) پر دو سال کا ایک اور ایک سال کے دو بچھڑے بچھڑیاں بطور زکاۃ ادا اور وصول کیے جائیں گے۔ ④ بھینس عرب کا جانور نہیں' اس لیے حدیث میں اس کا ذکر نہیں آیا لیکن اپنے فوائد' قدر و قیمت اور شکل وشباہت کے لحاظ سے یہ گائے سے ملتا جلتا ہے' اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے بھی گائے کے حکم میں سمجھا جائے۔ امام ابن منذر نے اس پر اجماع لکھا ہے کہ بھینسیں بھی گایوں کے حکم میں ہیں۔ دیکھیے: (فتاوی ابن تيميه: ٢٥/٣٧) بنابریں گائیں اور بھینسیں مل کر نصاب پورا ہوتا ہو تو زکاۃ ادا کر دی جائے۔ ⑤ زکاۃ میں وہ جانور دیا جائے جس کی تعداد ریوڑ میں زیادہ ہو' مثلاً: اگر بیس گائیں اور بھینسیں دس ہیں تو زکاۃ کے طور پر ایک سالہ بچھڑی دی جائے اور اگر دس گائیں اور بیس بھینسیں ہیں تو ایک سالہ کٹڑا یا کٹڑی دی جائے۔ واللہ أعلم.

(٤٨٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تُؤْخَذُ

[486] حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ (شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ)

٤٨٦ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب أين تصدق الأموال، حديث: ١٥٩١، وأحمد: ٢/١٨٥.

صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِينَ عَلٰى مِيَاهِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «لَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ إِلَّا فِي دُورِهِمْ».

سے روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں سے زکاۃ ان کے پانی پلانے کی جگہوں پر وصول کی جائے گی۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔) اور ابوداود کی روایت میں ہے: ''مسلمانوں کے مالوں کی زکاۃ ان کے گھروں ہی میں جا کر حاصل کی جائے۔''

لغوی تشریح: [عَلٰى مِيَاهِهِمْ] میاہ، ماء کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چشمے' تالاب اور گھاٹ ہیں جہاں لوگوں کے جانور ہوتے ہیں۔ [إِلَّا فِي دُورِهِمْ] یہ دار کی جمع ہے۔ اس سے لوگوں کی اپنی رہائش گاہیں' مکانات' پانی کے گھاٹ' ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ سرکاری زکاۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکاۃ کی وصولی کرے' ایسا نہیں کہ خود لوگوں کے گھروں سے دور دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آ کر زکاۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

فائدہ: اس حدیث میں عامل زکاۃ کو زکاۃ وصول کرنے کے لیے لوگوں کے پاس ان کے گھروں اور مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے تاکہ کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہ کیا جا سکے اور وہ اپنی حاکمیت کی دھونس بھی نہ جما سکے بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جا کر زکاۃ وصول کرے۔ حضرت جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب تمھارے پاس کچھ ناپسندیدہ لوگ آئیں گے' جب وہ تمھارے پاس آئیں تو انھیں خوش آمدید کہنا اور ان کے اور جو وہ لینا چاہیں' ان کے درمیان آڑے نہ آنا۔ اگر انھوں نے عدل وانصاف کیا تو اس کا اجر ملے گا اور اگر ظلم کیا تو اس کا وبال اٹھائیں گے۔ تم انھیں راضی رکھنا' بلاشبہ تمھاری زکاۃ کی تکمیل انھیں راضی رکھنے میں ہے اور انھیں چاہیے کہ تمھارے لیے دعائے خیر کریں۔'' (سنن أبي داود' الزكاة' باب رضاء المصدق' حديث: ١٥٨٨)

(٤٨٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فَرَسِهِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِمُسْلِمٍ: «لَيْسَ فِي الْعَبْدِ صَدَقَةٌ، إِلَّا صَدَقَةَ الْفِطْرِ.»

[487] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان پر اس کے (خدمت گار) غلام اور اس (کی سواری) کے گھوڑے پر زکاۃ (فرض) نہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ''غلام میں زکاۃ نہیں مگر صدقۃ الفطر ہے۔''

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکاۃ نہیں' یعنی جو غلام اپنی خدمت کے لیے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لیے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکاۃ نہیں' البتہ اگر برائے تجارت ہوں تو ان پر زکاۃ ہوگی۔ جمہور علماء اور اکثر فقہاء کا یہی موقف ہے۔ گھوڑوں پر زکاۃ کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (سنن ابوداود (اردو)' الزكاة' باب في زكاة

٤٨٧ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب ليس على المسلم في عبده صدقة، حديث: ١٤٦٣، ومسلم، الزكاة، باب لا زكاة على المسلم في عبده وفرسه، حديث: ٩٨٢.

السائمة' حدیث:۱۵۷۴' طبع دارالسلام' لاہور)

(٤٨٨) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فِي كُلِّ سَائِمَةِ إِبِلٍ: فِي أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، لَا تُفَرَّقُ إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا، مَنْ أَعْطَاهَا مُؤْتَجِرًا بِهَا، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَمَنْ مَنَعَهَا، فَإِنَّا آخِذُوهَا وَشَطْرَ مَالِهِ، عَزْمَةً مِّنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا، لَا يَحِلُّ لِآلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَعَلَّقَ الشَّافِعِيُّ الْقَوْلَ بِهِ عَلَى ثُبُوتِهِ.

[488] حضرت بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ (حکیم) اس (بہز) کے دادا سے روایت کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر چالیس اونٹوں میں جو کہ جنگل میں چرتے ہوں ایک بنت لبون (دو سالہ مادہ اونٹنی) ہے اور انھیں ان کے حساب سے جدا جدا نہ کیا جائے گا۔ جو شخص حصول ثواب کی نیت سے زکاۃ ادا کرے گا تو اس کے لیے اس کا اجر وثواب ہے۔ اور جو زکاۃ روکے گا تو ہم اس سے زبردستی وصول کریں گے اور اس کا آدھا مال (مزید بھی) لیں گے۔ یہ ہمارے پروردگار کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ اس میں آل محمد کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔'' (اسے احمد' ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور شافعی نے اس کے ثابت ہونے پر اپنے قول کو معلق رکھا ہے۔)

لغوی تشریح: [سَائِمَةِ إِبِلٍ] سائمة، إبل کی طرف مضاف ہے۔ [فِي أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ] یعنی فی الجملہ چالیس میں بنت لبون دو سالہ اونٹنی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے ۳۶ سے ۴۵ تک میں ایک بنت لبون کا ذکر ہے اور اس حدیث میں چالیس کی تعداد' اس وقت مراد ہے جب ایک سو بیس سے اونٹ زیادہ ہوں تو پھر چالیس پر بنت لبون ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل موجود ہے' یا یہ کہ ۴۰ کی تعداد بھی ۳۶ سے ۴۵ کے مابین ہے۔ ان دونوں کے مابین جتنے اونٹ ہوں ۴۰ ہوں یا اس سے کم وبیش ان پر زکاۃ ہے۔ یہ مفہوم ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں منطوق مروی ہے' اس لیے اعتبار منطوق روایت کا ہے۔ اور محض ۴۰ کے عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ [لَا يُفَرَّقُ] تفریق سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے' یعنی الگ الگ اور جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ [إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا] اس کے معنی ہیں کہ مالک اپنی ملکیت کی چیزوں کو دوسرے کی ملکیت سے الگ نہ کرے جبکہ دونوں کے مویشی اکٹھے ہوں جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے' یا یہ معنی ہوں گے کہ تمام اونٹوں کو چالیس کے حساب سے شمار کیا جائے' اس صورت میں نہ مریل اور کمزور کو چھوڑا جائے گا نہ کسی فربہ کو' نہ چھوٹے کو اور نہ بڑے کو۔ [مُؤْتَجِرًا بِهَا] حصول اجر وثواب کے ارادے سے انھیں زکاۃ میں دینے والا۔ [وَ مَنْ مَنَعَهَا] اور جس نے نہ دیا۔ [فَإِنَّا آخِذُوهَا] تو ہم اسے بزور اور زبردستی وصول کریں گے۔ [وَ شَطْرَ مَالِهِ] یعنی کچھ مال یا آدھا مال' زکاۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر۔ اس کا عطف

٤٨٨ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: ١٥٧٥، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٤٥١، وأحمد: ٥/ ٢، ٤، والحاكم: ١/ ٣٩٨.

آخِذُوهَا کی ضمیر مجرور پر ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ، یعنی شُطِّرَ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کر دے اور بہترین حصہ خود وصول کر لے۔ [عَزْمَةً] رفعی حالت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں فعل محذوف کا مفعول مطلق ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے۔ [مِنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا] اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ہے۔ [لَایَحِلُّ لِآلِ مُحَمَّدٍ ......الخ] آل محمد کے لیے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب بن عبدمناف مراد ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بالخصوص آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ [وَ عَلَّقَ الشَّافِعِيُّ] تعلیق سے ماخوذ ہے۔ [اَلْقَوْلَ بِهِ]، یعنی اس حدیث کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ زکاۃ نہ دینے والے سے اس کا نصف مال بطور سزا لے لیا جائے گا۔ [عَلٰى ثُبُوتِهِ] امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اہل علم نے ثابت نہیں مانا، اگر یہ صحیح ثابت ہو جائے تو میرا قول اس کے مطابق ہے کیونکہ اس کا دارومدار بہز بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے۔ اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکاۃ نہ دینے والے سے مقدار زکاۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

راویٔ حدیث: [بہز بن حکیم رحمہ اللہ] ابو عبدالملک ان کی کنیت ہے۔ بہز کی ''با'' پر فتحہ اور ''ہا'' ساکن ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: بهز بن حكيم بن معاوية بن حيده۔ حیدہ کی ''حا'' پر فتحہ، ''یا'' ساکن اور ''دال'' پر فتحہ ہے۔ قشیری (تصغیر کے ساتھ) اور بصری ہیں۔ طبقۂ سادسہ کے تابعی ہیں۔ ان کی حدیث سے استدلال کرنے میں اختلاف ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ ان کی احادیث صحیح ہیں۔ امام ابن معین، امام ابن مدینی اور امام نسائی رحمہم اللہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے لیکن امام ابوحاتم نے کہا ہے کہ ان سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ اور امام ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ بہت غلطیاں کرتے تھے۔ ۱۴۰ ہجری کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۱۶۰ ہجری سے پہلے۔

[عَنْ أَبِيهِ] یعنی حکیم بن معاویہ، یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے انھیں ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

[عَنْ جَدِّهِ] معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب قشیری رضی اللہ عنہ۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے کئی احادیث منقول ہیں۔

(٤٨٩) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتّٰى يَكُونَ لَكَ

[489] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمھارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکاۃ ہے۔ اور تجھ پر کوئی چیز لازم نہیں حتیٰ کہ تیرے پاس بیس دینار ہوں اور ان پر پورا

٤٨٩۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: ١٥٧٣، وحديث ابن عمر أخرجه الترمذي، الزكاة، حديث: ٦٣١ وسنده ضعيف - في سند أبي داود أبوإسحاق وعنعن، وفي سند الترمذي عبدالرحمن بن زيد بن أسلم ضعيف.

عِشْرُونَ دِينَارًا، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتّٰى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَهُوَ حَسَنٌ، وَقَدِ اخْتَلَفُوا فِي رَفْعِهِ.

سال گزر جائے' تو ان میں نصف دینار زکاۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہوگا تو اسی حساب سے اس پر زکاۃ ہوگی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکاۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔'' (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: مَنِ اسْتَفَادَ مَالًا، فَلَا زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتّٰى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

اور ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس شخص کو مال مستفاد (سال کے دوران میں حاصل ہونے والا مال) ملا اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکاۃ نہیں۔ اور راجح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

لغوی تشریح: [حَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ] یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ [عِشْرُونَ دِينَارًا] بیس دینار کا موجودہ وزن ساڑھے سات تولے یعنی ۸۵ گرام بنتا ہے۔ [فَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ] اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہوگا' خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر' اس پر زکاۃ واجب ہے۔ اور اس میں وقص (دو مقداروں کے درمیان والی تعداد جس پر زکاۃ نہیں پڑتی) نہیں ہے۔ [مَنِ اسْتَفَادَ مَالًا] جو مال حاصل ہوا ہو۔ [وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ] راجح بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کے لیے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل السلام)

فائدہ: اس حدیث میں سونے اور چاندی کے نصاب زکاۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکاۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سوا تین ماشے ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے باون تولے نصاب زکاۃ مقرر کیا گیا ہے۔ اور سونے کے بیس دینار پر زکاۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے: 4.25 گرام کے جس کا کل وزن 85 گرام' یعنی ساڑھے سات تولے بنتا ہے۔ اور اس کی زکاۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ باقی رہا مسئلہ کرنسی نوٹوں کا تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے سونا اور چاندی نقدی کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ آج کل کرنسی نوٹ استعمال ہوتے ہیں۔ علمائے امت کا اجماع ہے کہ کرنسی کو انھی پر قیاس کیا جائے گا۔ سعودی علماء اور پاک و ہند کے علماء نے کرنسی نوٹوں کے لیے چاندی کو نصاب بنایا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح زکاۃ دینے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی جس میں غرباء و مساکین کا فائدہ زیادہ ہے' اگر سونے کو نصاب بنایا جائے گا تو بہت سے اصحاب حیثیت بھی زکاۃ دینے والوں سے نکل جائیں گے' مثلاً: جس کے پاس تقریباً دو لاکھ روپے سے کم پیسے فاضل بچت کے طور پر ایک سال پڑے رہے ہوں گے' وہ بھی صاحب نصاب متصور نہیں ہوگا کیونکہ ساڑھے سات تولے سونے کی موجودہ قیمت (30 ہزار روپے فی تولہ کے حساب سے) دو لاکھ پچیس ہزار ہوگی۔ یوں لاکھوں افراد اصحاب حیثیت لوگوں کے دائرے سے نکل جائیں گے جس کا سارا نقصان غرباء و مساکین اور مدارس دینیہ کو ہوگا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ موقف راجح معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ اجتہادی مسئلہ ہے' اس لیے

دونوں میں سے کسی کو بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ چاندی کا نصاب اصل ماننے کی صورت میں ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت جتنی فاضل رقم رکھنے والا صاحب نصاب ہوگا اور سونے کو کرنسی کی بنیاد ماننے کی صورت میں ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت جتنی فاضل رقم رکھنے والا صاحب نصاب متصور ہوگا' اور اس سے کم رقم رکھنے والا شخص زکاۃ سے مستثنیٰ ہوگا۔ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اسے متابعات اور شواہد کی بنیاد پر حسن قرار دیا ہے' جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سونے اور چاندی کے نصاب کے لیے مذکورہ حدیث صحیح بنیاد ہے۔ واللہ أعلم. تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ۳/ ۲۸۹) جامع ترمذی میں مروی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو بھی ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے شواہد وغیرہ ذکر کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت دیگر شواہد کی بنیاد پر صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ۳/ ۲۵۴-۲۵۸) مال مستفاد کی بابت حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ اپنی کتاب ''زکاۃ' عشر اور صدقۃ الفطر'' میں یوں رقم طراز ہیں: مال مستفاد کا مطلب' زکاۃ کی ادائیگی کے بعد' دوران سال میں حاصل ہونے والا مال ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

① مالِ مستفاد اس کے پاس موجود مال کا نفع اور اسی کا ثمرہ ہو' جیسے تجارت کے ذریعے سے حاصل ہونے والا نفع' یا جانوروں سے دورانِ سال حاصل ہونے والے بچے۔ سال پورا ہونے پر یہ نفع اور جانوروں کے بچے بھی شامل ہوں گے' ان کا الگ حساب نہیں ہوگا' مثلاً: پہلے اس نے 10 ہزار روپے کی زکاۃ دی تھی' سال پورا ہونے تک اس کے پاس 10 کی بجائے 15 یا 20 ہزار روپے ہو گئے' اب اسے 15 یا 20 ہزار کی زکاۃ ادا کرنی ہوگی' اسی طرح مثلاً: اس نے پہلے ایک بکری زکاۃ میں دی تھی کیونکہ اس کے پاس 120 یا اس سے کچھ کم تھیں' آئندہ سال پورا ہونے تک بچے ملا کر دو سو بکریاں ہو گئیں تو اب اسے دو بکریاں زکاۃ کے طور پر دینی پڑیں گی۔ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

② مالِ مستفاد اسی جنس سے ہو جس جنس کی اس نے پہلے زکاۃ ادا کی لیکن دورانِ سال ملنے والا یہ مال اس مال کا نفع یا اس کے پاس موجود جانوروں سے تولد پذیر ہونے والا نہ ہو' بلکہ اس نے الگ سے یہ مال خریدا ہو' یا ورثے یا ہبے میں اسے ملا ہو' اس کی بابت بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اسے بھی پہلی صورت کی طرح پچھلے مال سے ملا دیں گے اور سال پورا ہونے پر سب کی زکاۃ نکالیں گے لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ دوسری صورت کا یہ مال چونکہ پہلے مال کا نفع یا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی الگ مستقل حیثیت ہے' اس لیے اس پر زکاۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس پر الگ سال گزرے گا۔ مذکورہ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

③ مالِ مستفاد' اس کے پاس موجود مال کی جنس سے نہ ہو' مثلاً: اس کے پاس بکریاں تھیں' جن کی اس نے زکاۃ ادا کر دی تھی' اب 6' 7 مہینے کے بعد اسے کچھ اونٹ یا گائیں مل گئی ہیں۔ اگر ملنے والا یہ مال اتنی تعداد میں ہے کہ وہ زکاۃ کے نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی زکاۃ اس کا سال الگ پورا ہونے پر ادا کی جائے گی' پہلے مال کے ساتھ ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان آخری دونوں صورتوں میں مذکورہ حدیث کا انطباق ہوتا ہے۔ یہاں دونوں صورتوں میں صاحب مال اپنی خوشی سے پہلے مال کے ساتھ ہی ان کی بھی زکاۃ ادا کر دیتا ہے تو بات اور ہے' خوشی سے

بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا مرغوب اور پسندیدہ ہی ہے' تاہم شرعاً ایسا کرنے کا پابند نہیں ہے۔

(٤٩٠) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضًا.

[490] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے بیلوں پر زکاۃ واجب نہیں۔ (اسے ابوداود اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْبَقَرِ الْعَوَامِلِ] عوامل، عاملة کی جمع ہے۔ عاملہ وہ جانور ہیں جنھیں کھیتی باڑی کے لیے جوتتے ہیں' گاہنے کا کام لیتے ہیں' کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی بنا پر صحیح قرار دیا ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس پر طویل بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت قابل حجت ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود (مفصل)' رقم:١٤٠٤) بنابریں رہائشی مکان' گھر میں استعمال ہونے والی اشیاء اور کارخانوں کی عمارتوں اور مشینریوں پر زکاۃ نہیں۔ اگر ان پر بھی زکاۃ ہوتی تو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ بعض دفعہ لاکھوں کروڑوں روپے کارخانوں اور مشینریوں پر لگانے کے باوجود کئی سال تک کوئی نفع نہیں ہوتا' اس صورت میں اگر کارخانے دار کو کاروبار میں لگائے ہوئے لاکھوں کروڑوں کی سالانہ زکاۃ بھی ادا کرنا پڑتی تو اس کی مشکلات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے' اس لیے اسلام نے عمارتوں' آلات واوزار اور مشینریوں کو زکاۃ سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ ہاں' ان کے ذریعے سے جو منافع حاصل ہوگا اس پر زکاۃ ہوگی اور وہ بھی تب' جب منافع میں سے جو کچھ اس کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچ جائے اور وہ اس کے پاس ایک سال تک پڑا رہے اور اس کی مقدار بھی نصاب کے مطابق ہو۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط کم ہوگی تو زکاۃ اس پر عائد نہیں ہوگی۔ واللہ أعلم. اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے کام لیا جائے' یعنی وہ آلات وذرائع کے طور پر استعمال ہوں' ان پر کوئی زکاۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے ان کی مشینری پر بھی زکاۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(٤٩١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَّجِرْ لَهُ، وَلَا

[491] حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی مال دار یتیم کا متولی

٤٩٠ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: ١٥٧٢، والدارقطني: ٢/ ١٠٣، أبو إسحاق عنعن.

٤٩١ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في زكاة مال اليتيم، حديث: ٦٤١، وذكر كلامًا، والدارقطني: ٢/ ١٠٩، ١١٠. * المثنى ضعيف، وتابعه محمد بن عبيدالله العرزمي وهو متروك، وللحديث طرق ضعيفة منها شاهد مرسل عند الشافعي في الأم: ٢/ ٢٩ وسنده ضعيف مرسل، ابن جريج عنعن.

يَتْرُكْهُ حَتّٰى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ مُرْسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ.

بنے' اسے چاہیے کہ مال یتیم کو تجارت میں لگائے۔ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکاۃ ہی اسے کھا جائے۔" (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے' البتہ امام شافعی کے پاس ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: [مَنْ وَلِيَ] باب عَلِمَ يَعْلَمُ کے وزن پر معروف کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص والی اور سرپرست بنے۔ اور لام پر تشدید کی صورت میں صیغۂ مجہول کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ [فَلْيَتَّجِرْ] باب افتعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ [وَلَا يَتْرُكْهُ] نہی کا صیغہ ہے' یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ [حَتّٰى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ] کہ زکاۃ ہی اسے کھا جائے' یعنی سال بہ سال اس پر زکاۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکاۃ واجب ہے' باوجود اس کے کہ وہ ابھی شریعت کا مکلف نہیں ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا؟ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو اس کا شاہد بیان کیا ہے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے' تاہم مذکورہ روایت میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ درست اور راجح ہے' اگرچہ علماء اور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ یتیم کے مال سے زکاۃ نکالی جائے یا نہیں؟ اس موقف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمر' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عائشہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ بھی یتیم کے مال میں سے زکاۃ نکالنے کے قائل تھے۔ مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ کسی بھی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ بچے کے مال میں سے عدم زکاۃ کا قول ثابت نہیں۔ دیکھیے: (تحفة الأحوذي: ٢/ ١٥) گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک بھی یہی ہے کہ یتیم کے مال میں سے زکاۃ نکالی جائے اور جمہور علماء کا بھی یہی مسلک ہے۔ احناف' جو یتیم کے مال کی زکاۃ کے قائل نہیں' وہ کہتے ہیں کہ یتیم کے مال میں سے صدقۃ الفطر کی ادائیگی ضروری ہے۔ اسی طرح زرعی پیداوار میں سے عشر ادا کرنا بھی ضروری ہے' حالانکہ اس تفریق کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے کہ یتیم کی زرعی پیداوار میں سے عشر تو نکالا جائے لیکن اس کے دوسرے مال کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔

(٤٩٢) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أَوْفٰى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا أَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[492] حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب لوگ زکاۃ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ان کے لیے یوں دعا فرماتے تھے۔ "یا اللہ! ان پر رحم و کرم فرما۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکاۃ

٤٩٢ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب صلاة الإمام ودعائه لصاحب الصدقة ....، حديث: ١٤٩٧، ومسلم، الزكاة، باب الدعاء لمن أتى بصدقة، حديث: ١٠٧٨.

پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کے لیے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔ ② نماز اور روزے کی طرح زکاۃ بھی فرض ہے' جس طرح نماز اور روزے کو خود ادا کر کے فریضے کی ادائیگی ہوتی ہے' اسی طرح زکاۃ بھی خود ادا کر کے اس فریضے سے اپنے آپ کو جلدی بری کرنا چاہیے۔

(٤٩٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ الْعَبَّاسَ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فِي تَعْجِيلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَن تَحِلَّ، فَرَخَّصَ لَهُ فِي ذٰلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

[493] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ آیا زکاۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے؟ تو آپ نے انھیں اس کی اجازت دے دی۔ (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ مقررہ وقت آنے سے پہلے۔ حلول سے ماخوذ ہے' باب ضَرَبَ يَضْرِبُ ہے' یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکاۃ' سال گزرنے اور وقت مقررہ آنے سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

فوائد ومسائل: زکاۃ اگرچہ اپنے وقت پر' یعنی سال گزرنے کے بعد ہی واجب ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شدید ضرورت ہو تو اصحاب حیثیت لوگوں سے پیشگی زکاۃ بھی لی جا سکتی ہے' اور اس کی زیادہ سے زیادہ حد دو سال ہے' یعنی دو سال کی پیشگی زکاۃ لی جا سکتی ہے' اس سے زیادہ نہیں کیونکہ جس واقعے سے پیشگی زکاۃ لینے کا جواز ثابت ہوتا ہے وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے' ان سے نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر دو سال کی زکاۃ پیشگی وصول فرمائی تھی۔ اس کی طرف اشارہ صحیح بخاری و صحیح مسلم اور دیگر کتب احادیث کی روایات سے ملتا ہے۔ نبی ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بابت فرمایا: ''ان کی زکاۃ میرے ذمے ہے اور اس کی مثل اس کے ساتھ اور بھی۔'' (صحيح البخاري' الزكاة' حديث:١٤٦٨' وصحيح مسلم' الزكاة' حديث:٩٨٣) علمائے کرام نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ ان سے دو سال کی پیشگی زکاۃ وصول کر لی گئی ہے' دو سال کی زکاۃ ان سے طلب نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دو سال کی پیشگی زکاۃ لینے کی متعدد روایات آتی ہیں جنھیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں نقل کیا ہے' لیکن ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ضعف ہے جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے بھی مذکورہ روایت کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے' تاہم اس کے مجموعی طرق سے کم از کم اس واقعہ کی اصلیت کا اثبات ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتح الباري:٣/٤٢٠)

(٤٩٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِّنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ،

[494] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچ اوقیوں سے کم چاندی میں کوئی زکاۃ نہیں۔ اور پانچ سے کم اونٹوں میں بھی زکاۃ نہیں۔

٤٩٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في تعجيل الزكاة، حديث:٦٧٨، الحكم بن عتيبة مدلس وعنعن.

٤٩٤ـ أخرجه مسلم، الزكاة، باب:١، حديث:٩٨٠، وحديث أبي سعيد الخدري أخرجه البخاري، الزكاة، حديث:١٤٠٥، ومسلم، الزكاة، حديث:٩٧٩.

وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِّنَ الْإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِّنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور پانچ وسق سے کم کھجوروں میں بھی زکاۃ نہیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِّنْ تَمْرٍ وَّلَا حَبٍّ صَدَقَةٌ. وَأَصْلُ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور مسلم ہی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلے میں زکاۃ نہیں۔ (حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و مسلم میں ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوَاقٍ] اس پر تنوین ہے۔ اور قاف کے بعد ''یاء'' مشددہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے' أوقیه کی جمع ہے۔ أوقیه کے ''ہمزہ'' پر ضمہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ ایک اُوقیے میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیوں کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانے کے مطابق دو سو درہم کا وزن 615 گرام بنتا ہے۔ [اَلْوَرِقِ] ''واؤ'' پر فتحہ اور ''را'' کے نیچے کسرہ ہے اور ''را'' ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی کے ہیں۔ [ذَوْدٍ] ''ذال'' پر فتحہ اور ''واؤ'' ساکن ہے' اونٹ کے معنی میں ہے۔ یہ اسم جمع ہے۔ اس میں مذکر و مؤنث اور قلیل و کثیر سبھی شامل ہیں' اسی لیے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ [أَوْسُقٍ] ''ہمزہ'' پر فتحہ' ''واؤ'' ساکن اور ''سین'' پر ضمہ ہے۔ وسق کی جمع ہے۔ وسق کی ''واؤ'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع کے ہوئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے' نیز جدید پیمانے کے مطابق ایک صاع تقریباً اڑھائی کلوگرام کا ہوتا ہے۔ [أَوْسَاقٍ] وسق کی جمع ہے' اوسق کی طرح۔ [حَبٍّ] ''حا'' پر فتحہ اور ''با'' پر تشدید ہے۔ بیج' تخم' مثلاً: گندم کا بیج' جو اور مسور وغیرہ۔ لفظ دُونَ چاروں جگہ أَقَلُّ کے معنی میں ہے' یعنی مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکاۃ واجب نہیں۔

فائدہ: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیے بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں ہے' اس لیے کہ ایک اوقیے میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیوں کے دو سو درہم ہو گئے' لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا۔ تین سو صاع حجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے تقریباً بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلے سے کم میں کوئی زکاۃ نہیں' مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور' خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس میں بھی زکاۃ ہے۔ مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ نبی ﷺ نے جب خود وزن مقرر فرما دیا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر اس جنس میں' جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے' اس میں زکاۃ ہے' مثلاً: گندم' چاول' جو' باجرہ' مکئی' ماش' مونگ اور چنے وغیرہ۔

(٤٩٥) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا، الْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «أَوْ كَانَ بَعْلًا الْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوِ النَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ».

[495] حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں' وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جو زمین آسمان (بارش) اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا وہ خود بخود (جڑوں سے پانی کھینچنے سے) سیراب ہو' اس میں دسواں حصہ (عشر) زکاۃ ہے' اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو' اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔) ابوداود کی روایت میں ہے: ''اگر زمین نمی والی ہو (جسے سیراب کرنے کی ضرورت نہ ہو) تو اس میں عشر ہے اور اگر جانوروں کے ذریعے سے (یا ڈول سے پانی) کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو' اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔''

لغوی تشریح: [فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ] اس سے مراد بارش' اولے' برف' شبنم وغیرہ ہے' اور یہ خبر مقدم ہے۔ [وَالْعُيُونُ] عین کی جمع ہے۔ ان چشموں کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتے ہیں اور کبھی کبھی ان سے نہریں بن جایا کرتی ہیں اور بسا اوقات نالوں کی صورت میں پانی بہتا ہے اور ان سے پانی لینا آسان ہوتا ہے' نہ تو بار بار ان سے چلو بھرنے پڑتے ہیں اور نہ کسی آلے کے ذریعے سے نکالنے کا تکلف کرنا پڑتا ہے' بلکہ بغیر کسی مشقت ومحنت کے ان کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ [أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا] ''عین'' اور ''ثا'' دونوں پر فتحہ' ''را'' کے نیچے کسرہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ وہ زمین جو اپنی جڑوں کے ذریعے سے پانی کھینچ کر خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے۔ زمین میں کیونکہ نمی ہوتی ہے اور پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے' اس لیے وہ زمین بغیر سیراب کیے' بغیر نالیوں کا تکلف کیے پانی حاصل کر لیتی ہے [اَلْعُشْرُ] مبتدا مؤخر ہے۔ ''عین'' پر ضمہ اور ''شین'' ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لیے جائیں تو اس کا ایک جز عشر کہلائے گا۔ [وَفِيمَا سُقِيَ] صیغۂ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے۔ [بِالنَّضْحِ] نضح کے ''نون'' پر فتحہ اور ''ضاد'' ساکن ہے۔ اصل میں اس کے معنی ہیں: پانی کا چھڑکاؤ کرنا اور پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعے سے پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح بیل اور گدھے بھی مراد ہیں جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ [بَعْلًا] یعنی عَثَرِيًّا کے بدلے بَعْلًا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بَعْل کی ''با'' پر فتحہ اور ''عین'' ساکن ہے۔ اس سے مراد وہ زمین ہے جو سیراب کیے بغیر زمین کی نمی ورطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعے سے سیراب ہوتی ہو۔ اس کے معنی بھی قریب قریب وہی ہیں جو عثري (نمی والی زمین) کے ہیں' یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ [بِالسَّوَانِي أَوِ النَّضْحِ] سَوَانِي' سَانِيَةٌ کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضا کرتا ہے کہ سَانِيَة اور نَضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر

٤٩٥ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، حديث: ١٤٨٣، وأبوداود، الزكاة، حديث: ١٥٩٦.

عموماً علماء نے انھیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے لیکن قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیہ جانوروں کے ذریعے سے پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور نضح عام ہے۔ اس میں جانوروں کے ساتھ ساتھ سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔ اور خلاصۂ کلام یہی ہے کہ جس زمین کا سیراب کرنا مشقت طلب اور باعث تھکاوٹ ہو۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع سے سیراب کرنے کی صورت میں زکاۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے، مثلاً: جو زمین مشقت طلب ذریعے سے سیراب ہو، جیسے اونٹ، بیل یا آدمی پانی نکال کر یا لا کر سیراب کرتے ہوں تو اس زمین کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے۔ اسی طرح اگر زمین کنوئیں اور ٹیوب ویل کے پانی سے یا پانی خرید کر سیراب کی جاتی ہو تب بھی نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے۔ آج کل آبیانہ دے کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یہ آبیانہ مشقت و محنت کے قائم مقام ہے، لہٰذا موجودہ نظام کے تحت نہری پانی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار میں بھی بیسواں حصہ ہے۔

(٤٩٦) وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ وَمُعَاذٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: لَا تَأْخُذَا فِي الصَّدَقَةِ إِلَّا مِنْ هٰذِهِ الْأَصْنَافِ الْأَرْبَعَةِ: اَلشَّعِيرِ، وَالْحِنْطَةِ، وَالزَّبِيبِ، وَالتَّمْرِ. رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ وَالْحَاكِمُ.

[496] حضرت ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے، نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ”جو، گندم، منقیٰ (کشمش) اور کھجور ان چار اصناف کے علاوہ کسی غلے پر زکاۃ وصول نہ کرنا۔“ (اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔)

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ: فَأَمَّا الْقِثَّاءُ وَالْبِطِّيخُ وَالرُّمَّانُ وَالْقَصَبُ، فَقَدْ عَفَا عَنْهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ. وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

اور دارقطنی میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھیرا (ککڑی)، تربوز، انار اور گنے میں زکاۃ معاف فرمائی ہے۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلزَّبِيبِ] خشک انگور (کشمش)۔ [اَلْقِثَّاءُ] ”قاف“ کے نیچے کسرہ، ”ثا“ مثلثہ پر تشدید اور آخر میں الف ممدودہ ہے، کھیرا۔ [اَلْبِطِّيخُ] ”با“ کے نیچے کسرہ اور ”طا“ پر تشدید ہے، تربوز۔ [اَلرُّمَّانُ] ”را“ پر ضمہ اور ”میم“ پر تشدید ہے، انار۔ [اَلْقَصَبُ] ”قاف“ اور ”صاد“ دونوں پر فتحہ ہے۔ گنا اور ہر وہ زمینی پیداوار جس کے تنے میں پوریاں اور گرہیں ہوں جیسے بانس اور سرکنڈا وغیرہ۔ یہ حدیث زکاۃ کی فرضیت کو غلے اور پھلوں میں سے انھی چار اصناف پر منحصر کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو، یعنی جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکاۃ واجب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی

٤٩٦ـ [إسناده ضعيف] قال المؤلف "أخرجه الطبراني" ولم أجده، والحاكم: ١/ ٤٠١، سفيان الثوري مدلس وعنعن، وحديث معاذ في القثاء أخرجه الدارقطني: ٢/ ٩٧، وفي سنده إسحاق بن يحيى بن طلحة متروك الحديث.

نہیں بلکہ حصر اضافی ہے یعنی یمن میں دستیاب اس دور کی اجناس کے لحاظ سے آپ نے ان کا تذکرہ کیا' یا ان سبزیوں کو خارج کرنے کے لیے یہ حکم صادر فرمایا جن میں زکاۃ فرض ہی نہیں' چنانچہ چاول اور مکئی وغیرہ جیسی اجناس جنھیں اکثر علاقوں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں' ان میں زکاۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل اعتبار ہے۔

فائدہ: حضرت ابوموسیٰ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کی روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (إرواء الغليل: ۳/ ۲۷۸) علاوہ ازیں بعض علماء کے نزدیک یہ مرسل ہے' اس لیے اکثر ائمہ اس بات کے قائل ہیں کہ مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ اور بھی جو چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں ان سب میں عشر یا نصف عشر ہے' جیسے باجرہ' مکئی' چنے' چاول' سرسوں' توریا اور گنا وغیرہ۔ ان کی دلیل قرآنی آیت: ﴿ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ (البقرة ۲: ۲۶۷) اور حدیث [فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ] کا عموم ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں کے الفاظ عام ہیں کہ زمین کی ہر پیداوار میں زکاۃ ہے۔ اس عموم کا تقاضا ہے کہ سب میں سے عشر یا نصف عشر نکالا جائے۔ اس عموم سے وہی چیز خارج ہوگی جس کا استثناء حدیث سے ثابت ہوگا' جیسے سبزیوں کا استثناء حدیث سے ثابت ہے' اس لیے ان میں عشر یا نصف عشر نہیں ہوگا۔ تاہم سبزیوں کے استثناء سے بالواسطہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمین کی پیداوار جو بھی زیادہ عرصے تک محفوظ رکھی جا سکتی ہے' اس میں عشر یا نصف عشر ادا کیا جائے گا۔ اسی بنا پر مذکورہ عموم کے قائل ائمہ' زمین کی پیداوار کے لیے دو شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ماپی تولی جانے والی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ بطور خوراک ذخیرہ کی جاتی ہو۔ اس موقف کی تائید صحیح مسلم کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا: ''کسی دانے (غلے) اور کھجور میں اس وقت تک زکاۃ نہیں جب تک وہ پانچ وسق تک نہ پہنچ جائے۔'' (صحيح مسلم' الزكاة' باب: ليس فيما دون خمسة أوسق صدقة' حديث: ۹۷۹) اس حدیث میں حب (دانے اور غلے) کا لفظ عام ہے جو ہر قسم کے غلے کو شامل ہے' اس لیے اس میں تمام اجناس آ جاتی ہیں جو کھائی اور ذخیرہ کی جاتی ہیں۔ اسی طرح جو پھل وغیرہ ہیں' ان میں سے آئندہ فصل تک رہنے والے پھل بھی اسی اصول اور قاعدے کے تحت اس پیداوار ہی سے سمجھے جائیں گے جن میں سے زکاۃ نکالی جاتی ہے کیونکہ ان میں بھی خوراک ذخیرہ کرنے کی علت موجود ہے' تاہم جو پھل زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے' وہ سبزی کے حکم میں ہوں گے' یعنی ان میں زکاۃ نہیں ہوگی۔ یہی موقف راجح اور درست ہے۔ شیخ صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے' نیز محققین علماء کے نزدیک بھی یہ رائے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ والله أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فقه السنة، الزكاة) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو سنن دارقطنی کے حوالے سے ہے' ضعیف ہے۔ اس میں ضعف کی وجہ ایک ضعیف راوی ہے اور اس کی سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التلخیص میں وضاحت کی ہے' نیز ہمارے فاضل محقق نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے' دیکھیے: تحقیق وتخریج حدیث هذا.

(٤٩٧) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ [497] حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

٤٩٧۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في الخرص، حديث: ١٦٠٥، والترمذي، الزكاة، حديث: ٦٤٣، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٤٩٣، وأحمد: ٣/ ٤٤٨، ٤/ ٢، ٣، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١١٩، حديث: ٣٢٦٩، والحاكم: ١/ ٤٠٢.

تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوا، وَدَعُوا الثُّلُثَ، فَإِنْ لَمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ، فَدَعُوا الرُّبُعَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا: ''جب تم (درختوں پر پھلوں کا) تخمینہ اور اندازہ لگاؤ تو (تم ان کا پھل اتار سکتے ہو پھر) تخمینے کے مطابق زکاۃ وصول کر لو اور (اندازہ کیے ہوئے پھل میں سے) تیسرا حصہ چھوڑ دیا کرو۔ اگر تیسرا حصہ نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھا حصہ چھوڑ دیا کرو۔'' (اسے ابن ماجہ کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِذَا خَرَصْتُمْ] یہ خطاب زکاۃ وصول کرنے والے عاملین اور سرکاری نمائندوں کو ہے۔ خرص اندازہ اور تخمینہ لگانے کو کہتے ہیں۔ یہاں خرص سے مراد انگور اور تر کھجور کا درختوں پر اندازہ لگانا ہے۔ ان دونوں کا اندازہ لگانے کی صورت یہ ہے کہ جب انگور اور کھجور میں مٹھاس پیدا ہو جائے تو اندازہ لگانے والا درخت کے گرد چکر لگائے' سارے پھلوں پر سرسری نظر دوڑا کر اندازہ لگائے کہ جب یہ انگور خشک ہو کر کشمش کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت ان کی مقدار اور وزن اتنا رہ جائے گا اور یہ کھجور جب خشک ہوگی تو اتنی مقدار میں باقی رہ جائے گی اور اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس کے اندازے کے مطابق زکاۃ لی جائے گی۔ اس تخمینہ اور اندازہ لگانے کے لیے ایک ہی آدمی کافی ہے بشرطیکہ وہ منصف مزاج اور عادل ہو اور اس کام میں مہارت رکھتا ہو۔ [فَخُذُوا] پس تخمینے کے مطابق تم زکاۃ وصول کر لو۔ خُذُوا امر کا صیغہ ہے اور أخذ سے ماخوذ ہے۔ [وَدَعُوا الثُّلُثَ ......الخ] مال کے مالکوں کے لیے تخمینہ لگائی گئی مقدار میں سے ایک تہائی حصہ چھوڑ دو۔ ایک قول یہ ہے کہ تیسرا یا چوتھا حصہ مالکوں کے لیے اس لیے چھوڑا جاتا ہے کہ مالک خود اپنے اعزہ واقرباء' ہمسایوں اور مانگنے والے فقراء و مساکین پر صدقہ و خیرات کر سکے اور اس سلسلے میں' یعنی واجب مقدار سے زائد صدقہ کرنے میں اسے تنگی اور حرج میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ تہائی یا چوتھائی حصہ عشر نکالنے سے پہلے ہی اصل مال سے الگ رکھا جائے گا تاکہ مالک پر وسعت و سہولت ہو۔ وہ خود بھی اس میں سے کھا سکے' پکے ہوئے پھل کو بیچ سکے اور اہل و عیال' پڑوسی اور مہمانوں کو ترجیح دیتے ہوئے ان پر خرچ کر سکے۔ یہ مقدار جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے' ان سبزیوں کے قائم مقام ہوگی جن پر زکاۃ نہیں۔ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کی خوبیوں اور محاسن میں سے ہے۔ صاحب سبل السلام نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ جب پھل پک جاتا ہے تو پھل کا مالک خود اور اس کے اہل و عیال اس میں سے کھاتے ہیں اور کبھی دوسرے لوگوں کو بھی کھلاتے ہیں' لہٰذا یہ مقدار ذخیرہ نہیں ہو سکتی۔ اور عرف عام میں' خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کو ان سبزیوں کی جگہ تصور کیا جاتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی نہیں جا سکتیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ] سہل کے ''سین'' پر فتحہ اور ''ہا'' ساکن ہے۔ ان کا نام عبداللہ یا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاری خزرجی مدنی ہے۔ صغار صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۳ ہجری میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور حضرت مصعب بن زبیر کے عہد میں مدینہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٩٨) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أَسِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُّخْرَصَ الْعِنَبُ، كَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، وَتُؤْخَذُ زَكَاتُهُ زَبِيبًا. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

[498] حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا: ''انگوروں (کے کچے پھل) کا اندازہ بھی اسی طرح لگایا جائے جس طرح کھجوروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اور ان کی زکاۃ کشمش کی صورت میں وصول کی جائے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں انقطاع ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی بنا پر صحیح قرار دیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت شواہد کی بنا پر قابل حجت اور قابل عمل بن جاتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ٣/ ٢٨٠-٢٨٣، حديث: ٨٠٥) علاوہ ازیں امام نووی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔ واللّٰہ أعلم.

راویٔ حدیث: [حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ] عتاب میں ''عین'' پر فتحہ اور ''تا'' پر تشدید ہے۔ اَسید کے ''ہمزہ'' پر فتحہ اور ''سین'' کے نیچے کسرہ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: عتاب بن اَسید بن ابوعیص بن امیہ بن عبدشمس اموی مکی۔ مشہور صحابی ہیں۔ نبی ﷺ جب فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو انھیں مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(٤٩٩) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امْرَأَةً أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَهَا ابْنَةٌ لَّهَا، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسَكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: «أَتُعْطِينَ زَكَاةَ هٰذَا»؟ قَالَتْ: لَا، قَالَ: «أَيَسُرُّكِ أَنْ يُّسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ»؟ فَأَلْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ.

[499] حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (شعیب) سے اور وہ (شعیب) اپنے دادا (عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی۔ اور بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپ نے اس خاتون سے پوچھا: ''کیا تو اس کی زکاۃ دیتی ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے روز تجھے اللہ ان کے بدلے میں آگ کے دو کنگن پہنائے؟''

٤٩٨۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في خرص العنب، حديث: ١٦٠٣، والترمذي، الزكاة، حديث: ٦٤٤، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٦١٩، وابن ماجه، الزكاة، حديث: ١٨١٩، وأحمد: ولم أجده، وقال المنذري: "انقطاعه ظاهر لأن مولد سعيد في خلافة عمر ومات عتاب يوم مات أبوبكر".

٤٩٩۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب الكنز ما هو؟، حديث: ١٥٦٣، والترمذي، الزكاة، حديث: ٦٣٧، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٤٨١، وحديث عائشة أخرجه الحاكم: ١/ ٣٩٠.

یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے' اور اسے حاکم نے حضرت عائشہ ؓ سے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَنَّ امْرَأَةً] اس خاتون کا نام اسماء بنت یزید بن سکن ہے۔ [مَسَكَتَانِ] کے ''میم' سین اور کاف'' تینوں پر فتحہ ہے اور یہ مسكة کا تثنیہ ہے' یعنی وہ زیور جو ہاتھوں میں پہنا جاتا ہے جسے فارسی میں دست برنجن اور کنگن کہا جاتا ہے۔ مسكة پازیب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پازیب وہ زیور ہے جو پاؤں میں اس طرح پہنا جاتا ہے جس طرح کنگن ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ [أَيَسُرُّكِ] اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے اور سرور سے ماخوذ فعل مضارع ہے اور ''کاف خطاب'' مؤنث کے لیے (مکسور) ہے۔ معنی ہیں: کیا تجھے یہ پسند ہے' اچھا لگتا ہے۔ [أَنْ يُسَوِّرَكِ] تسویر سے ماخوذ ہے' کنگن پہنانے کو کہتے ہیں۔ [بِهِمَا] ان دونوں کی جگہ' ان دونوں کے بدلے میں' یا یہ معنی ہیں کہ ان دونوں کے سبب' یعنی ان دونوں کی زکاۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں۔ [فَأَلْقَتْهُمَا] تو اس خاتون نے وہ دونوں کنگن پھینک مارے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زیورات میں زکاۃ ہے لیکن اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ زیور میں زکاۃ واجب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیور میں زکاۃ فرض نہیں۔ امام مالک' احمد ؒ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی ؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکاۃ اسے ضرورت مند کو عاریتاً دینا ہے' الگ زکاۃ نہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زیورات میں صرف ایک ہی بار زکاۃ دینا فرض ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ زیورات میں زکاۃ فرض ہے اور یہ صحیح حدیث اس کی واضح دلیل ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض آثار کی بنا پر جو کہا گیا ہے کہ زیورات میں زکاۃ نہیں وہ قابل التفات نہیں۔ (سبل السلام)

(٥٠٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ تَلْبَسُ أَوْضَاحًا مِّنْ ذَهَبٍ، فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! أَكَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ: «إِذَا أَدَّيْتِ زَكَاتَهُ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[500] حضرت ام سلمہ ؓ سے مروی ہے کہ وہ سونے کے پازیب پہنا کرتی تھیں۔ انھوں نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! کیا یہ کنز ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جب تو نے اس کی زکاۃ ادا کر دی تو پھر یہ کنز نہیں۔'' (اسے ابوداود اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوْضَاحًا] ''ضاد'' معجمہ اور ''حا'' مہملہ کے ساتھ' وضح کی جمع ہے۔ وضح کے معنی ہیں پازیب' یعنی پاؤں کا زیور۔ [أَكَنْزٌ هُوَ؟] اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے' یعنی دریافت کیا کہ آیا یہ کنز کی تعریف میں آتا ہے جس

٥٠٠ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب الكنز ما هو؟، حديث: ١٥٦٤، والدارقطني: ٢/ ١٠٥، والحاكم: ١/ ٣٩٠. * عطاء بن أبي رباح لم يسمع من أم سلمة كما قال أحمد وغيره، وللمرفوع شواهد.

کے بارے میں قرآن مجید میں سخت وعید وارد ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ○ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ○﴾ (التوبة9:34،35)''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے گا' پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں' ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جسے تم اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھتے تھے' لہٰذا اب اس کا مزا چکھو جو تم جمع کرتے رہے تھے۔''

[إِذَا أَدَّيْتِ زَكَاتَهُ] اس سے زیور میں زکاۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ اور سنن ابوداود میں ہے کہ جب مال' نصاب زکاۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکاۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکاۃ سے کم مالیت کا زیور ہوگا تو اس میں زکاۃ واجب نہیں۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اور اس کی مفصل بحث سے یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت شواہد کی بنا پر قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (السلسلة الصحيحة للألباني' رقم:559' وصحيح سنن أبي داود' (مفصل) رقم: 1397) بنابریں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استعمال کے زیور میں بھی زکاۃ ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے۔ اس کی تائید میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے جسے فاضل محقق نے بھی سنداً صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھوں میں چاندی کی (موٹی موٹی) انگوٹھیاں دیکھیں تو آپ نے پوچھا: ''عائشہ! یہ کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: میں نے انھیں آپ کی خاطر زینت کے لیے پہنا ہے۔ آپ نے پوچھا: ''کیا تم اس کی زکاۃ دیتی ہو؟'' میں نے کہا: نہیں' یا اس طرح کی کوئی بات کی۔ تو آپ نے فرمایا: ''تجھے جہنم میں لے جانے کے لیے یہی کافی ہے۔'' (سنن أبي داود' الزكاة' باب الكنز ماهو؟ وزكاة الحلي' حديث:1565) مذکورہ دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ استعمال ہونے والے زیور میں بھی زکاۃ ہے جبکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے۔ والله أعلم.

(501) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّهُ لِلْبَيْعِ. رَوَاهُ أَبُو

[501] حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سامان تجارت سے زکاۃ نکالنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند

501۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة هل فيها من زكاة؟، حديث: 1562. * في إسناده خبيب وهو مجهول، وجعفر بن سعد ضعفه الجمهور.

کمزور ہے۔)

لغوی تشریح: [نُعِدُّہٗ] ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کے لیے حاضر کرتے تھے۔ نُعِدُّہٗ میں ''نون'' پر ضمہ اور ''عین'' کے نیچے کسرہ ہے۔ إعداد سے ماخوذ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکاۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ [وَإِسْنَادُہٗ لَیِّنٌ] اس کی سند کمزور ہے، مگر امام ابوداود رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، نیز امام منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔ (عون المعبود: ۲/۳/۲، هندي)

فائدہ: مذکورہ روایت کو فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے اور مزید لکھا ہے کہ جامع ترمذی کی حسن درجے کی روایت: [أَدُّوا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ] (حديث : ٦١٦) اس کی مؤید ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (البقرة ٢: ٢٦٧) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے فاضل محقق کے نزدیک بھی مال تجارت میں زکاۃ واجب ہے۔ امام ابوداود اور امام منذری اس حدیث کے حکم کی بابت خاموش ہیں۔ امام ابن عبدالبر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ائمۂ اربعہ اور ساری امت کا (سوائے چند شاذ لوگوں کے) اس بات پر اتفاق ہے کہ سامان تجارت میں زکاۃ واجب ہے۔ (القواعد النورانية الفقهية، ص: ٨٩، ٩٠، طبع مصر) امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ سال گزرنے پر مال تجارت میں زکاۃ ہے۔ حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ فقہائے سبعہ، حسن، جابر بن زید، میمون بن مہران، طاؤس، النخعی، ثوری، اوزاعی، ابوحنیفہ، اسحاق اور ابوعبید رحمہم اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔ الغرض احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ مال تجارت کسی بھی قسم کا ہو اس کی قیمت کا اعتبار کر کے اس کی زکاۃ ادا کر دی جائے۔ واللہ أعلم. اموال تجارت میں زکاۃ کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ سال بہ سال جتنا تجارتی مال دکان یا گودام وغیرہ میں ہو، اس کی قیمت کا اندازہ کر لیا جائے۔ علاوہ ازیں جتنی رقم گردش میں ہو اور جو رقم موجود ہو، اس کو بھی شمار کر لیا جائے۔ نقد رقم، کاروبار میں لگا ہوا سرمایہ اور سامان تجارت کی تخمینی قیمت سب ملا کر جتنی رقم ہو، اس میں سے ڈھائی فیصد کے حساب سے زکاۃ ادا کی جائے، تاہم اگر کوئی تجارتی مال اس طرح کا ہے کہ وہ خریدا لیکن وہ کئی سال تک فروخت نہیں ہوا تو اس مال کی زکاۃ اس کے فروخت ہونے پر صرف ایک سال کی ادا کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی رقم کسی کاروبار میں منجمد ہو گئی ہو جیسا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے اور وہ رقم دو تین سال یا اس سے زیادہ عرصے تک پھنسی رہتی ہے یا کسی ایسی پارٹی کے ساتھ سابقہ پڑ جاتا ہے کہ کئی سال رقم وصول نہیں ہوتی تو ایسی ڈوبی ہوئی رقم کی زکاۃ سال بہ سال دینی ضروری نہیں بلکہ رقم جب وصول ہو جائے، اس وقت سال کی زکاۃ ادا کر دی جائے۔ هذا ما عندنا والله أعلم بالصواب.

(٥٠٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى [502] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول

٥٠٢ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب في الركاز الخمس، حديث: ١٤٩٩، ومسلم، الحدود، باب جرح العجماء والمعدن والبئر جبار، حديث: ١٧١٠.

عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مدفون خزانے میں خمس (پانچواں حصہ) ہے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [وَ فِي الرِّكَازِ] اس میں ''واؤ'' پہلے جملے پر عطف کے لیے ہے اور وہ جملہ ہے: [اَلْعَجْمَاءُ جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ] مصنف نے اختصار کے پیش نظر اتنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ اور [اَلرِّكَازِ] کے ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اس سے مراد جاہلیت کے زمانے کا زمین میں مدفون خزانہ جو بغیر کسی کثیر عمل و مشقت کے حاصل ہو۔ [اَلْخُمُسُ] ''خا'' اور ''میم'' دونوں پر ضمہ ہے۔ کسی چیز کے پانچ برابر حصے کیے جائیں تو ان میں سے ایک پانچواں حصہ (خمس) کہلاتا ہے۔ اور یہ مبتدا مؤخر ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ [فِي الرِّكَازِ] ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رکاز کے مال میں زکاۃ نہیں بلکہ اس کی حیثیت اموال غنیمت کی سی ہے اور اس میں خُمُس واجب ہے جو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور باقی تمام کا مالک وہ شخص ہوگا جسے یہ خزانہ ملا۔

فائدہ: مدفون خزانہ اگر کسی انسان کو مل جائے تو جس وقت ملے اسی وقت اس میں سے خمس، یعنی کل مال کا پانچواں حصہ فی سبیل اللہ تقسیم کر دے۔ اس میں زکاۃ نہیں بلکہ زکاۃ سے کئی گنا زیادہ، یعنی کل مال میں سے بیس فیصد اللہ کی راہ میں بانٹنا ہے۔ رکاز ملنے کی صورت میں، اس میں سے صدقہ خیرات کرنے کی مقدار اس لیے زیادہ ہے کہ یہ مال بغیر محنت کے حاصل ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

(٥٠٣) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي كَنْزٍ وَجَدَهُ رَجُلٌ فِي خَرِبَةٍ: «إِنْ وَجَدْتَّهُ فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ فَعَرِّفْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَّهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ فَفِيهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

[503] حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خزانے کے بارے میں، جو کسی آدمی کو اجاڑ ویران جگہ سے ملے، فرمایا: ''اگر تو نے یہ خزانہ کسی آباد جگہ سے پایا ہے تو اس کی تحقیق کے لیے اعلان کر۔ اور اگر تو نے کسی غیر آباد جگہ سے پایا ہے تو اس میں اور رکاز میں پانچواں حصہ ہے۔'' (اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فِي خَرِبَةٍ] ''خا'' پر فتحہ اور ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ شکستہ، بے آباد مقام جہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ [فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ] جہاں لوگ آباد ہوں، یعنی یہ ویران اور بے آباد جگہ، آبادی والے علاقے میں ہو۔ [فَعَرِّفْهُ] تعریف (تفعیل) سے امر کا صیغہ ہے، تو لوگوں میں اس کا اعلان کرا اور اس کی کیفیت بیان کرحتیٰ کہ اس کا مالک آجائے اور یا پھر اس پر پورا سال گزر جائے۔ ایسی صورت میں تمھارے لیے اس کا کھانا صحیح اور درست ہے، بہر حال اس خزانے کی نوعیت گری پڑی چیز کی سی ہوگی۔ [وَ إِنْ وَجَدْتَّهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ]، یعنی اور اگر تو اسے غیر آباد جگہ میں پائے تو اس

٥٠٣- [حسن] قال المؤلف "أخرجه ابن ماجه" ولم أجده، وأخرجه أبوداود، اللقطة، حديث: ١٧١٠، وصححه الحاكم: ٢/ ٥٦، ووافقه الذهبي.

کا حکم رکاز کے حکم جیسا ہوگا۔ یا یوں کہیے کہ دونوں کے حکم کی نوعیت اموال غنیمت کے حکم جیسی ہوگی۔ [وَ فِي الرِّكَازِ] میں موجود واؤ عطف اس بات کی متقاضی ہے کہ جب خزانہ زمین کے پیٹ سے نہ نکالا جائے تو اسے رکاز نہیں کہتے۔

(٥٠٤) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَخَذَ مِنَ الْمَعَادِنِ الْقَبَلِيَّةِ الصَّدَقَةَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

[504] حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبل جگہ میں واقع کانوں سے زکاۃ وصول کی۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مَعَادِن] معدن کی جمع ہے۔ مَعْدِنٌ میں ''دال'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اسے اردو میں ''کان'' کہتے ہیں' یعنی زیر زمین وہ حصہ جہاں اللہ تعالیٰ نے سونا' چاندی اور جواہرات وغیرہ پیدا فرمائے ہوں۔ [اَلْقَبَلِيَّة] ''قاف'' اور ''با'' پر فتحہ ہے۔ قبل کی طرف نسبت ہے جو فُرع کے نواح میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اور [فُرْع] میں ''فا'' پر ضمہ اور ''را'' ساکن ہے۔ اور ایک قول کے مطابق دونوں پر ضمہ ہے۔ مدینے کے بالائی حصے میں ساحل سمندر کی جانب واقع ہے اور مکہ و مدینہ کے درمیان' مدینہ سے آٹھ برد (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلے پر ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دفینہ) دونوں لغوی اعتبار سے مختلف ہیں اور اسی طرح حکماً اور شرعاً بھی مختلف ہیں۔

فائدہ: مذکورہ روایت کو فاضل محقق نے حسن قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ حضرت بلال بن حارث کو معادن (کانوں) کا دیا جانا ثابت ہے مگر اس میں زکاۃ لینے کا جو ذکر ہے' وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھیے: (إرواء الغليل: ۳/ ۳۱۱' ۳۱۲' حدیث: ۸۳۰) بنابریں اس کی بابت راجح موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کانوں سے نکلنے والی چیزوں میں زکاۃ نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی بابت کچھ ثابت نہیں' البتہ اس کی آمدنی پر بشرطیکہ نصاب کو پہنچ جائے اور سال بھی گزر جائے' تو زکاۃ ہے خمس نہیں۔ والله أعلم.

راویٔ حدیث: [حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ] حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ مزینہ قبیلے سے ہونے کی وجہ سے مزنی کہلائے۔ کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ ہجری میں مزینہ قبیلے کے وفد کے ساتھ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ کے پیچھے سکونت اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انھوں نے مزینہ قبیلے کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۶۰ ہجری میں وفات پائی۔

١ - بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

باب: 1- صدقۂ فطر سے متعلق احکام و مسائل

(٥٠٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[505] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول

٥٠٤ـ [حسن] أخرجه أبوداود، الخراج والإمارة، باب في إقطاع الأرضين، حديث: ٣٠٦١.

٥٠٥ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب فرض صدقة الفطر، حديث: ١٥٠٣، ومسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين ◄◄

عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ، مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجوریں یا ایک صاع جو صدقۂ فطر فرض کیا ہے۔ اور اس کے متعلق حکم دیا ہے کہ اسے نماز (عید) کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری و مسلم)

وَلِابْنِ عَدِيٍّ وَالدَّارَقُطْنِيِّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: «أَغْنُوهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا الْيَوْمِ».

ابن عدی اور دارقطنی میں ضعیف سند سے ہے: ''اس (عید والے) دن ان (غرباء) کو در بدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔''

لغوی تشریح: [بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ] رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ امام قسطلانی رحمہ اللہ کے بقول فطرانے کی فرضیت رمضان المبارک میں عید سے صرف دو روز پہلے ۲ ہجری میں ہوئی۔ [فَرَضَ] اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقۂ فطر (فطرانے) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض، قدّر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ [مِنَ الْمُسْلِمِينَ] یعنی کافروں میں سے نہ ہو، اس لیے کافر غلام کا صدقۂ فطر نہیں نکالا جاتا۔ [أَغْنُوهُمْ] إغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر جمع جو مفعول ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے، فقراء کی طرف راجع ہے، یعنی هم ضمیر سے مراد محتاج اور ضرورت مند لوگ ہیں۔ [عَنِ الطَّوَافِ] دست سوال دراز کرنے کے لیے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں کے سامنے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے تمام افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرے کے ضرورت مند افراد اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ ② رسول اللہ ﷺ نے فطرانے کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ ③ صدقۂ فطر میں نقدی ادا کرنے کا موقف بعض علمائے کرام نے اپنایا ہے لیکن فرامین نبوی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر میں وہ جنس ادا کرنی چاہیے جو اہل خانہ کی عمومی غذا ہو، مثلاً: گندم، چاول اور کھجور وغیرہ۔ ④ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں، البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمے ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ ⑤ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقۂ فطر کے لیے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ ⑥ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے تو فطرانے کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

◀◀ من التمر والشعير، حديث: ٩٨٤، وحديث "أغنوهم عن الطواف..." أخرجه ابن عدي: ٧/ ٢٥١٩، والدارقطني: ٢/ ١٥٣، فيه أبو معشر نجيح السندي وهو ضعيف، وللحديث شواهد ضعيفة.

(٥٠٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ، أَوْ صَاعًا مِّنْ زَبِيبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعًا مِّنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيدٍ: أَمَّا أَنَا فَلَا أَزَالُ أُخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أُخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «لَا أُخْرِجُ أَبَدًا إِلَّا صَاعًا».

[506] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانے میں اناج (گندم)، کھجور، جو یا کشمش (منقیٰ) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے: ''یا پنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نکالا کرتا تھا۔ اور ابوداود کی روایت میں ہے: میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

لغوی تشریح: [كُنَّا نُعْطِيهَا] ہم صدقۂ فطر (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ [صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ] طعام کا لفظ مابعد مذکور چیزوں کے مقابلے میں بولا گیا ہے جو اس بات کا مقتضی ہے کہ طعام اور دوسری اجناس کے مابین فرق و تغایر ہے۔ طعام کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: بعض کے نزدیک اس سے مراد گندم ہے۔ طعام بول کر اہل عرب عموماً اس سے مراد گندم لیتے ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ''طعام'' میں اجمال ہے اور مابعد اس کی تفصیل ہے۔ اور بعض روایات میں اس کی صراحت بھی ہے، اس لیے یہی قول راجح ہے۔ [أَقِطٍ] ''ہمزہ'' پر فتحہ اور ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے، پنیر کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل دودھ ہوتا ہے جو خشک کر کے جمایا جاتا ہے اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ [فَلَا أَزَالُ أُخْرِجُهُ] اور میں ہمیشہ ایک صاع کی مقدار ہی فطرانے میں نکالتا رہوں گا، خواہ کوئی جنس ہو، گندم ہو یا دوسری اجناس۔ اور ایک صاع پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے اور یہ وزن چار مد کے مساوی ہوتا ہے۔ جدید حساب کے مطابق ایک صاع کا وزن تقریباً ڈھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے۔

فائدہ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں گندم کے سوا باقی تمام اجناس میں سے احادیث کی روشنی میں ایک ایک صاع فطرانے کے طور پر دینے پر اتفاق تھا، صرف گندم میں اختلاف تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کے پیش نظر گندم کا آدھا صاع نکالنے کا مشورہ دیا۔ گندم چونکہ مہنگی بھی تھی اور قلیل بھی تو ان کی اس رائے سے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اتفاق کر لیا، دیکھیے: (صحيح البخاري، الزكاة، حديث:١٥٠٨، و صحيح مسلم، الزكاة، حديث:(١٨)-٩٨٥) امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس مذکورہ بالا اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''نبی ﷺ کے صحابہ میں سے بعض اہل علم کا یہ موقف بھی ہے کہ ہر چیز کا ایک صاع دیا جائے سوائے گندم کے کہ اس کا فطرانے میں نصف صاع بھی کفایت کر جاتا ہے۔'' (جامع الترمذي، الزكاة، حديث:٦٧٣) اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہی ہے یا سنت سے اس کی دلیل بھی ملتی ہے؟ ہاں، اس بارے میں مرفوع احادیث بھی آتی ہیں جنھیں کچھ علماء نے ضعیف

٥٠٦ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب صاع من زبيب، حديث:١٥٠٨، ومسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين من التمر والشعير، حديث:٩٨٥، وأبوداود، الزكاة، حديث:١٦١٦ـ١٦١٨.

قرار دیا ہے لیکن راجح بات یہی ہے کہ آدھے صاع گندم کی حدیث کے بہت سے شواہد ہیں جیسا کہ شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((وَلِلْحَدِيثِ شَوَاهِدُ كَثِيرَةٌ)) (الصحيحة: ۳/ ۱۷۱) اور وہ حدیث یہ ہے: [أَدُّوا صَاعًا مِّنْ بُرٍّ أَوْ قَمْحٍ بَيْنَ اثْنَيْنِ ......] ''گندم کا ایک صاع دو افراد کو ادا کرو۔'' اس حدیث سے واضح ہوا کہ نصف صاع ایک فرد کو دیا جا سکتا ہے۔ اس کی تائید جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے صحیح امر سے بھی ہوتی ہے، فرماتے ہیں: ((صَدَقَةُ الْفِطْرِ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ، عَبْدٍ أَوْ حُرٍّ مُدَّانِ مِنْ قَمْحٍ......)) ''فطرانہ ہر مسلمان پر (ضروری) ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، غلام ہو یا آزاد، گندم کے دو مد (آدھا صاع۔'') (سنن الدارقطني: ۲/ ۱۴۶) اس بحث سے معلوم ہوا کہ یہ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کی رائے نہ تھی بلکہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ان کی اس رائے سے متفق تھے اور ان کی اس رائے کی تائید مرفوع صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے، اس لیے اگر کوئی شخص ایک صاع گندم کے بجائے آدھا صاع گندم بھی فطرانے میں دے دیتا ہے تو ان شاء اللہ یہ بھی جائز ہوگا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (سنن أبي داود (مفصل) للألباني: ۵/ ۳۲۴) لیکن افضل اور اولیٰ گندم کا پورا صاع دینا ہی ہے جیسا کہ عمومی احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ واللّٰه أعلم.

(۵۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ، فَمَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِّنَ الصَّدَقَاتِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[507] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر (فطرانہ) روزے دار کو لغویات اور فحش گوئی سے پاک کرنے کے لیے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لیے مقرر کیا ہے۔ جس نے اسے نماز ادا کرنے سے پہلے ادا کر دیا تو وہ مقبول ہے اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ (عام) صدقوں میں سے ایک صدقہ ہے۔ (صدقۂ فطر نہیں۔) (اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [طُهْرَةً] ''طا'' پر ضمہ ہے۔ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، معنی ہیں: روزے دار کے نفس کی طہارت کے لیے۔ [مِنَ اللَّغْوِ] لغو کا تعلق زبان وقول سے ہوتا ہے، دل سے نہیں۔ [وَالرَّفَثِ] فحش کلامی۔ [طُعْمَةً] ''طا'' پر ضمہ ہے، کھانا۔ اس کا عطف طہرۃ کے لفظ پر ہے۔ علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقۂ فطر صرف انھی کا مخصوص استحقاق ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقۂ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکاۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے جیسا کہ زکاۃ کے مسئلے میں بھی واقع ہوا ہے۔ [مَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ] نماز عید سے پہلے ادا کر دیا۔ [صَدَقَةٌ مِّنَ الصَّدَقَاتِ] یعنی پھر یہ عام صدقہ ہوگا۔ صدقۂ فطر نہیں ہوگا اور آدمی فریضے کا تارک ہی رہے گا۔

۵۰۷۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب زكاة الفطر، حديث: ۱۶۰۹، وابن ماجه، الزكاة، حديث: ۱۸۲۷، والحاكم: ۱/ ۴۰۹.

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہیے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہوگا' فطرانۂ عید نہیں ہوگا۔ واللہ أعلم.

٢ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ

باب: 2- نفلی صدقے سے متعلق احکام ومسائل

(٥٠٨) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ**» - فَذَكَرَ الْحَدِيثَ - وَفِيهِ: «**وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[508] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جبکہ اس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔'' پھر مکمل حدیث بیان کی۔ اور اس میں ہے کہ (ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے:) ''جو اس قدر پوشیدہ طور پر صدقہ دے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [سَبْعَةٌ] سات اقسام وانواع کے لوگ۔ [يُظِلُّهُمْ] باب افعال سے ماخوذ ہے' یعنی ان کو سائے میں جگہ دے گا۔ [فِي ظِلِّهِ] اپنے سائے میں' اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ [يَوْمَ لَا ظِلَّ] جس روز کوئی سایہ نہ ہوگا' اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ [فَذَكَرَ الْحَدِيثَ] پھر مکمل حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان سات قسم کے لوگوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں: ① عادل حاکم۔ ② وہ نوجوان جس کی نشوونما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ ③ وہ آدمی جس کا دل مسجد سے معلق ہو۔ ④ ایسے دو آدمی جن کی باہمی محبت اللہ کے لیے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطر اور اگر جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کے لیے ہو۔ ⑤ وہ آدمی جسے حسب ونسب والی حسین وجمیل نوجوان عورت برائی کی دعوت دے اور وہ یہ کہے کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ⑥ وہ آدمی جو تنہائی میں ذکر الٰہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ ⑦ اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے پوشیدہ اور مخفی طریقے سے صدقہ وخیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ [حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ] بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ وگمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقۂ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ ② قیامت کے روز عرش الٰہی کے سائے کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ ③ عرش کیا ہے؟ اس کی صحیح کیفیت ونوعیت اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ ④ اس حدیث میں مرد کی قید اتفاقی ہے' ورنہ انھی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب

٥٠٨ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب الصدقة باليمين، حديث:١٤٢٣، ومسلم، الزكاة، باب فضل إخفاء الصدقة، حديث:١٠٣١.

ملے گا‘ نیز اس حدیث سے صدقہ وخیرات مخفی طریقے سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بعض لوگوں میں جو مشہور ہے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہیے تاکہ لوگوں میں رغبت وشوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ یہ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی ہو اور ریا بھی مقصود نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔ واللہ أعلم.

(٥٠٩) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**كُلُّ امْرِىءٍ فِي ظِلِّ صَدَقَتِهِ حَتّٰى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ**». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[509] حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ہر آدمی اپنے صدقے کے سائے میں کھڑا ہوگا یہاں تک کہ لوگوں کا فیصلہ ہو جائے۔“ (اسے ابن حبان اور حاکم نے بیان کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں صدقے کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقے کے سائے میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی اور تمازت انتہائی درجے کی ہوگی۔ سائے کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ ② سائے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سائے میں کھڑا سکون وطمانیت محسوس کر رہا ہوگا‘ یا دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ ③ نفلی صدقات کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکاۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(٥١٠) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرْيٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيقِ الْمَخْتُومِ**». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ لِينٌ.

[510] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”جو مسلمان کسی برہنہ مسلمان کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی سبز پوشاک پہنائے گا۔ اور جو مسلمان کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں سے کھلائے گا۔ اور جو مسلمان پیاسے مسلمان کو (پانی یا مشروب) پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی خالص مہر بند شراب سے پلائے گا۔“ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے۔)

لغوی تشریح: [كَسَا] کے معنی ہیں: کسی کو لباس پہنانا۔ [عَلٰى عُرْيٍ] عري میں ”عین“ پر ضمہ اور ”را“ ساکن

٥٠٩۔ **[إسناده صحيح]** أخرجه ابن حبان (الموارد)، حديث: ٨١٧، والحاكم: ١/ ٤١٦ وصححه على شرط مسلم، ووافقه الذهبي، وأحمد: ٤/ ١٤٧، ١٤٨.

٥١٠۔ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في فضل سقي الماء، حديث: ١٦٨٢. ✽ أبوخالد الدالاني مدلس وعنعن، وللحديث طريق آخر عند الترمذي، صفة القيامة، حديث: ٢٤٤٩ وسنده ضعيف جدًا باطل.

ہے۔ یہ مصدر ہے' یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہ ہو۔ [مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ] خضر میں ''خا'' پر ضمہ اور ''ضاد'' ساکن ہے۔ یہ أخضر کی جمع ہے۔ جنت کا سبز لباس۔ [عَلٰی جُوعٍ] بھوک کی حالت میں' اور بھوک پیٹ کے خالی ہونے کو کہتے ہیں۔ [عَلٰی ظَمَأٍ] شدید پیاس کی حالت میں۔ "ظا" اور "میم" دونوں پر فتحہ ہے اور آخری حرف ہمزہ ہے' یعنی پیاسا ہونے کی حالت میں۔ [الرَّحِيقِ] خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ [الْمَخْتُومِ] مہر بند جس کے برتن کا منہ مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔ یہ شراب کی نفاست و صفائی سے کنایہ ہے' یعنی اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جسے کستوری کی مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

فائدہ: مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہے جیسا کہ تحقیق و تخریج میں تفصیل موجود ہے' تاہم دیگر احادیث میں پانی پلانے اور کھانا کھلانے کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور ترغیب دی گئی ہے' لہٰذا بھوکے اور پیاسے کو کھلانا پلانا اور ننگے آدمی کو لباس مہیا کرنا عین ثواب اور فضیلت والا عمل ہے۔ والله أعلم. اس مسئلے کی بابت صحیح احادیث بلوغ المرام ہی میں کتاب الجامع اور دیگر کتب احادیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(٥١١) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[511] حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور (صدقے کا) آغاز و ابتدا ان سے کر جن کی تو کفالت اور عیال داری کرتا ہے۔ اور بہتر صدقہ وہ ہے جس کے دینے کے بعد بھی دینے والا غنی رہے۔ جو شخص دست سوال دراز کرنے سے پرہیز کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا۔ اور جو شخص بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بے نیاز کر دیتا ہے۔'' (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [اَلْيَدُ الْعُلْيَا] اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والے کا ہاتھ ہے۔ [اَلْيَدِ السُّفْلٰى] نیچے والے ہاتھ سے مراد لینے والے اور سوال کرنے والے کا ہاتھ ہے۔ [اِبْدَأْ] یعنی صدقہ و خیرات دینے اور خرچ کرنے میں شروع کر' ابتدا و آغاز کر۔ [بِمَنْ تَعُولُ] جن کا نان و نفقہ تیرے ذمے ہو۔ یہ عَالَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ سے ماخوذ ہے' جس کے معنی ہیں: آدمی نے اپنے گھر والوں کی عیال داری اور کفالت کی۔ یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص اپنے اہل و عیال کے ضروری نان و نفقہ اور لباس کا انتظام کرے۔ [مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى] اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور اس مال کا صدقہ کرنے کے بعد وہ مستغنی رہے۔ لفظ

٥١١ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، حديث:١٤٢٧، ومسلم، الزكاة، باب بيان أن أفضل الصدقة صدقة الصحيح الشحيح، حديث:١٠٣٤.

ظھر محض کلام میں وسعت کے لیے استعمال کیا گیا ہے یعنی اس کا استعمال وسیع و اکثر ہے لفظی معنی مراد نہیں ہیں۔ [وَ مَنْ يَّسْتَعْفِفْ] جو سوال کرنے، مانگنے سے بچنا چاہے اور دست سوال دراز کرنے سے پاکدامنی کا ارادہ کرے۔ [يُعِفَّهُ اللّٰهُ] باب افعال سے ماخوذ ہے اسے اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ [وَ مَنْ يَّسْتَغْنِ] یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے، خواہ کم مقدار میں ہو یا زیادہ، اسی پر قناعت کرتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند اور محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھر والوں پر صرف کرے، یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے، یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔'' (صحیح مسلم، الزكاة، باب فضل النفقة على العيال والمملوك.....، حدیث: ۹۹۴) ② اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو شخص مانگنے سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر اسے بچا لیتا ہے۔

(٥١٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «**جُهْدُ الْمُقِلِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ**.» أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[512] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کم مال والے کا محنت مشقت کر کے صدقہ دینا۔ اور صدقے کی ابتدا ان سے کرو جن کی کفالت کے تم ذمہ دار ہو۔'' (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [جُهْدُ الْمُقِلِّ] الجهد کے ''جیم'' پر ضمہ اور ''ہا'' ساکن ہے۔ ہمت، طاقت۔ اگر ''جیم'' پر فتحہ پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے ''میم'' پر ضمہ اور ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے، قلیل مال والا آدمی۔ معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو، پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں: [أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى] ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد بھوک اور فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث (کم مال والے کے صدقے والی) اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبر کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غنی سے نفس و ضمیر کا استغنا مراد ہے۔ اس اعتبار سے ان میں کوئی منافات اور تعارض نہیں رہتا۔

٥١٢۔ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في الرخصة في ذلك، حديث: ١٦٧٧، وأحمد: ٢/ ٣٥٨، ٣/ ٤١٢، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١٤٤، حديث: ٣٣٣٣، والحاكم: ١/ ٤١٤، وابن خزيمة: ٤/ ٩٩، حديث: ٢٤٤٤، ٢٤٥١.

فائدہ: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ امیر و مال دار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں' اس لیے اپنے گھر والوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہوتا ہے۔

(٥١٣) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**تَصَدَّقُوا**»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! عِنْدِي دِينَارٌ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلٰى نَفْسِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلٰى وَلَدِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلٰى زَوْجَتِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلٰى خَادِمِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ**». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[513] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ و خیرات کرو۔'' ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اسے تو اپنی جان پر صدقہ کر۔'' اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور بھی ہے' آپ نے فرمایا: ''اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔'' اس نے پھر کہا: میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔'' اس نے پھر کہا کہ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر۔'' وہ کہنے لگا: میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اس کے خرچ کرنے کی بابت تو بہتر جانتا ہے۔'' (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: تَصَدَّقْ بِهِ عَلٰى نَفْسِكَ تَصَدَّقْ' أَنْفِقْ کے معنی میں استعمال ہوا ہے' یعنی اسے اپنی ذات پر خرچ کر۔ صدقے کا لفظ بول کر انفاق مراد لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقوق والوں پر خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ أَنْتَ أَبْصَرُ' یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کون سا شخص زیادہ مستحق ہے؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر' پھر اولاد پر' پھر بیوی پر

٥١٣ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب في صلة الرحم، حديث: ١٦٩١، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٥٣٦، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١٤١، حديث: ٣٣٢٦، والحاكم: ١/ ٤١٥.

اور پھر خادم پر۔ جو بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھے تا کہ آئندہ کسی کام آئے' لہٰذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تا کہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(٥١٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِزَوْجِهَا أَجْرُهُ بِمَا اكْتَسَبَ، وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذٰلِكَ، لَا يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[514] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے' انھوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت اپنے گھر کے کھانے سے کچھ خیرات کرے بشرطیکہ اس کی نیت گھر بگاڑنے کی نہ ہو تو جو کچھ وہ خیرات کرے گی اس کا اجر وثواب ضرور اسے ملے گا اور اس کے شوہر کو بھی' کمانے کی وجہ سے ثواب ہوگا۔ اور اسی طرح خزانچی کو ثواب ملے گا' نیز کسی کا ثواب دوسرے کے ثواب کو کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [غَيْرَ مُفْسِدَةٍ] یعنی فضول خرچی' اسراف وتبذیر کے بغیر' نیز یہ خرچ کرنا خاوند اور اس کے زیر کفالت افراد کے اخراجات پر اثر انداز نہ ہو۔ بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ شوہر اپنی بیوی کو صریح طور پر اجازت دے دے یا اشارتاً جیسا کہ معاشرے میں یہ چیز معروف ومعلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مؤاخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

فوائد ومسائل: ① عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ وخیرات نہیں کرنا چاہیے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کے لیے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ ② معمولی صدقہ' مثلاً: سائل کو روٹی دے دی یا تھوڑا بہت آٹا دے دیا یا پڑوسی کو تھوڑا بہت نمک مرچ دے دی وغیرہ' اس صدقے میں بیوی کے ساتھ ساتھ اس کا شوہر کما کر لانے کی وجہ سے' خزانچی اس کی حفاظت کرنے کی وجہ سے اور خادم خدمت گاری کی بنا پر اجر وثواب کے مستحق ہیں۔ کسی کے اجر میں سے کمی نہیں کی جائے گی' ہر ایک کو اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔

(٥١٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: جَاءَتْ زَيْنَبُ امْرَأَةُ ابْنِ مَسْعُودٍ، فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّكَ أَمَرْتَ الْيَوْمَ بِالصَّدَقَةِ، وَكَانَ عِنْدِي حُلِيٌّ لِي،

[515] حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی اہلیہ حضرت زینب ؓ آئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے آج صدقہ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ میرے پاس میرا ذاتی زیور ہے' میں چاہتی

٥١٤ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب أجر المرأة إذا تصدقت، حديث: ١٤٤١، ومسلم، الزكاة، باب أجر الخازن الأمين، حديث: ١٠٢٤.

٥١٥ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب الزكاة على الأقارب، حديث: ١٤٦٢.

فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ، فَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ وَوَلَدَهُ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «**صَدَقَ ابْنُ مَسْعُودٍ، زَوْجُكِ وَوَلَدُكِ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ہوں کہ اسے صدقہ کر دوں مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ وہ اور اس کی اولاد زیادہ مستحق ہیں کہ انھی کو صدقہ دوں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے۔ تیرا شوہر اور تیری اولاد تیرے صدقے کے زیادہ مستحق ہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [حُلِيٌّ] ''حا'' پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور ''لام'' کے نیچے کسرہ اور ''یا'' پر تشدید ہے۔ یہ حَلْيٌ کی جمع ہے۔ حلي کی ''حا'' پر فتحہ' ''لام'' ساکن اور ''یا'' مخفف ہے۔ سونے چاندی کے وہ زیورات جو عورت تزیین و آرائش کے لیے پہنتی ہے۔ اسی طرح اس سے موتی اور عمدہ پتھر کے نگینے وغیرہ بھی مراد ہیں۔ یہ حدیث اس بات کے جواز کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کے معاملات و مصالح میں اپنی زکاۃ دے سکتی ہے' بشرطیکہ شوہر محتاج اور عیال دار ہو۔

فائدہ: لفظ ''صدقہ'' نفلی صدقہ' فرض زکاۃ اور صدقۂ فطر (فطرانہ) سب پر مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی زکاۃ کی تقسیم کے مصارف کے موقع پر لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے۔ اگر اس بات کا کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو کہ یہاں عام صدقہ مراد ہے تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ اس سے مراد زکاۃ ہوتی ہے۔ اس مقام پر بھی بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض صدقہ ہے' اس لیے کہ نفلی صدقے کے متعلق پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو اپنی زکاۃ دے سکتی ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو زکاۃ نہیں دے سکتی۔ لیکن ان کا یہ قول اس صریح حدیث کے مخالف ہے۔ اور اس مسئلے پر سب کا اتفاق ہے کہ شوہر اپنی اہلیہ کو زکاۃ نہیں دے سکتا۔ اس حدیث کی روشنی میں جب بیوی فرض زکاۃ دے سکتی ہے تو نفلی صدقہ بدرجۂ اولیٰ دے سکتی ہے۔

راویٔ حدیث: [زینب رضی اللہ عنہا] یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ ہیں۔ بنوثقیف سے ہونے کی وجہ سے ثقفیہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبداللہ بن معاویہ یا ابومعاویہ ہے۔ انھوں نے نبی ﷺ' اپنے شوہر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایات بیان کی ہیں۔ اور ان سے ان کے بیٹے' بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے احادیث روایت کی ہیں۔

(٥١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُضْعَةُ لَحْمٍ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[516] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو آدمی (پیشہ ور گداگر) لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا اور بھیک مانگتا رہتا ہے' وہ قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت تک نہ ہوگا۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [مُزْعَةٌ] اور ایک نسخے میں مُضْغَةٌ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن

٥١٦ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب من سأل الناس تكثرًا، حديث: ١٤٧٤، ومسلم، الزكاة، باب كراهة المسألة للناس، حديث: ١٠٤٠.

ہے' اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور وہ ذلت و خواری اور گھٹیا حالت کے ساتھ آئے گا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں کہ اس کے چہرے کو اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چہرے کا گوشت تک اڑ جائے۔ یا اسے اٹھایا ہی اس حالت میں جائے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی ڈھانچہ ہوگا تاکہ وہ اس کی پہچان کی علامت بنا رہے۔

فائدہ: اس حدیث سے گداگری کے پیشے کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال کرنا اور مانگنا صرف تین قسم کے آدمیوں کے لیے جائز ہے۔ حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے قبیصہ! صرف تین اشخاص کے لیے سوال کرنا جائز ہے: ایک وہ شخص جس نے کوئی ضمانت اٹھائی (کسی شخص کے متعلق وعدہ کر لیا کہ میں اس کا ذمہ دار ہوں' اگر یہ فلاں وقت تک پیسے نہیں دے گا تو میں دے دوں گا' پھر وہ حسب وعدہ نہیں دیتا اور ضامن کو دینے پڑتے ہیں) تو اس ضامن کے لیے اس ادا کی جانے والی رقم کی حد تک سوال کرنا جائز ہے حتی کہ وہ اتنی رقم سوال کر کے حاصل کرے' پھر وہ سوال کرنے سے رک جائے۔ اور دوسرا وہ شخص کہ اسے کوئی آفت پہنچی جس نے اس کا سارا مال تباہ کر دیا' تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے پاس اتنی رقم ہو جائے جس سے وہ اپنی گزران حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اور تیسرا وہ شخص کہ فقر و فاقہ اسے گھیر لے' علاوہ ازیں اس کی قوم میں سے تین عقل مند آدمی اس کے معاملے کو لے کر کھڑے ہوں اور وہ کہیں کہ فلاں شخص فقر و فاقے کی حالت میں مبتلا ہے' تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے پاس اتنی رقم ہو جائے جس سے وہ اپنی گزران حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اے قبیصہ! ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے سوال کرنے کو میں حرام سمجھتا ہوں۔ وہ سوال کر کے جو کچھ حاصل کرے گا' وہ حرام مال کھائے گا۔'' (صحیح مسلم' الزکاۃ' باب من تحل له المسألة للناس' حدیث:۱۰۴۴) بنابریں ہر سوال کرنے والے کو سوچ لینا چاہیے کہ وہ ان تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی ذیل میں آتا ہے؟ اگر آتا ہے تو یقیناً اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے' بصورت دیگر اس کے لیے سوال کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ واللہ أعلم۔

(۵۱۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ يَسْأَلُ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[517] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو آدمی لوگوں سے ان کے مالوں کا سوال کرتا ہے (ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ) اپنا مال بڑھانے کی غرض سے تو وہ اپنے لیے (جہنم کے) انگارے ہی کا سوال کرتا ہے۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انھیں کم کر لے یا زیادہ۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [تَكَثُّرًا] مال کو زیادہ کرنے کی غرض سے' اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہیں۔ [جَمْرًا] آگ کا دہکتا ہوا انگارا۔ [فَلْيَسْتَقِلَّ ..... الخ] یعنی چاہے کم لے یا زیادہ حاصل کرے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ

۵۱۷۔ أخرجه مسلم، الزكاة، باب كراهة المسألة للناس، حديث: ۱۰۴۱.

تھوڑا یا زیادہ حاصل کرے' اس میں تحکم' تہدید اور ڈانٹ ڈپٹ ہے اور اس کام کے خطرناک ہونے کے سلسلے میں زبردست وعید ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے گداگری کا پیشہ ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ ② توانا وقوی الجثہ آدمی کا سوال کرنا معاشرے میں بے عزت ہونے کا موجب ہوتا ہے۔ ③ جن لوگوں نے بلاوجہ مانگنے کو اپنا معمول بنالیا ہو انھیں خیرات دینا محل نظر ہے۔

(٥١٨) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ عَلٰى ظَهْرِهِ، فَيَبِيعَهَا، فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَّسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ.» رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[518] حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی شخص رسی پکڑے' پھر لکڑیوں کا گٹھا (جنگل سے) اپنی پشت پر اٹھا کر لائے اور اسے فروخت کرے' جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت و آبرو محفوظ رکھے' تو یہ اس کے لیے سوال کرنے سے بہتر ہے کہ لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ] حُزمة کی ''حا'' پر ضمہ اور ''زا'' ساکن ہے۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ [فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهُ] یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھتا ہے اور دست سوال دراز کرنے کی رسوائی سے باز رکھتا ہے۔

فائدہ: اس حدیث کی رو سے گداگری اور بھیک مانگنا قابل مذمت فعل ہے۔ کما کر کھانا اور محنت و مشقت کر کے حاصل کرنا بہتر ہے۔ سوالی و گداگر کو اگر کچھ مل بھی جائے تو سوال کرنے کی ذلت کیا کچھ کم ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت و آبرو نہیں رہتی۔ معاشرے میں وقار کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایسے آدمی کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔ مفت خوری کی بدعادت ایسے آدمی کو کاہل وسست بنا کر رکھ دیتی ہے۔ معاشرے کی ترقی متاثر ہو جاتی ہے۔ اور ایسا شخص بسا اوقات چوری اور ہیرا پھیری جیسی بری عادات کا خوگر بن کر رہ جاتا ہے۔

(٥١٩) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «اَلْمَسْأَلَةُ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلَّا أَنْ يَّسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَانًا أَوْ فِي أَمْرٍ لَابُدَّ مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

[519] حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سوال کرنا تو گویا زخم لگانا اور خراشیں ڈالنا ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے' سوائے اس شخص کے جو سربراہ مملکت سے سوال کرے یا مجبوری کی وجہ سے سوال کرے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا

٥١٨ـ أخرجه البخاري، الزكاة، باب الاستعفاف عن المسألة، حديث: ١٤٧١.

٥١٩ـ [صحيح] أخرجه الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في النهي عن المسألة، حديث: ٦٨١.

ہےاور صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [كُدُوحٌ] ''کاف'' اور ''دال'' دونوں پر ضمہ ہے۔ کَدْحٌ کی جمع ہے۔ کدح کے ''کاف'' پرفتحہ اور ''دال'' ساکن ہے' خدش اور خمش کے ہم معنی ہے' خراش اور زخم کو کہتے ہیں' یعنی اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی' یا یہ کہ اس کے چہرے پر ذلت ورسوائی اور اہانت کے نشانات ظاہر ہو رہے ہوں گے۔ ایک نسخے میں كُدُوحٌ کی بجائے كَدٌّ کے الفاظ ہیں لیکن معنی میں کوئی فرق نہیں۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی سے بغیر ضرورت مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہیے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے مانگنا' اپنے حق کے حصول کا سوال ہے' اس میں کسی کے امتنان واحسان کا کوئی تعلق نہیں۔

٣ - بَابُ قَسْمِ الصَّدَقَاتِ

باب:3-صدقات کوتقسیم کرنے کا بیان

(٥٢٠) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلَّا لِخَمْسَةٍ: لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ مِسْكِينٍ تُصُدِّقَ عَلَيْهِ مِنْهَا فَأَهْدٰى مِنْهَا لِغَنِيٍّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأُعِلَّ بِالْإِرْسَالِ.

[520] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچ قسم کے افراد کے علاوہ کسی امیر اور مال دار آدمی کے لیے صدقہ (اور زکاۃ) حلال نہیں ہے۔ ① زکاۃ وصدقات اکٹھا کرنے والا۔ ② وہ (دولت مند) شخص جو صدقے کی چیز اپنے مال کے بدلے خرید لیتا ہے۔ ③ مقروض۔ ④ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا۔ ⑤ مسکین کو صدقہ دیا گیا اور اس نے وہ کسی غنی اور مال دار آدمی کو تحفے کے طور پر دے دیا۔'' (اسے احمد' ابوداود اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور اس میں مرسل ہونے کی علت بیان کی گئی ہے۔)

لغوی تشریح: [لِغَنِيٍّ] غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ ہو یا اتنی مقدار میں کھانا ہو کہ صبح شام اس کے لیے کافی ہو جائے۔ [لِعَامِلٍ عَلَيْهَا] عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقے کی وصولی کے لیے کام کرتا ہے' مثلاً: اسے اکٹھا کرنے والا' حساب رکھنے والا' تحریر کرنے والا۔ اس کے لیے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے' خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ [غَارِمٍ] مقروض' قرض دار۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ باہمی رقابت و

٥٢٠ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب من يجوز له أخذ الصدقة، وهو غني، حديث: ١٦٣٦، وابن ماجه، الزكاة، حديث: ١٨٤١، وأحمد: ٣/ ٣١، ٤٠، ٥٦، ٩٧، والحاكم: ١/ ٤٠٧، ٤٠٨، والعلة مردودة.

دشمنی کی اصلاح کے لیے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے تو اسے اتارنے کے لیے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کے لیے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت واستطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرے میں شامل ہوگا اور اگر طاقت رکھتا ہے تو اسے غنی شمار کیا جائے گا جس کی وجہ سے اس کے لیے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کے لیے زکاۃ لینا جائز نہیں۔ ② غنی کون ہے؟ اس کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابوداود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: غنی کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح شام کی گزر بسر ہو سکے۔'' (سنن أبي داود' الزكاة' باب من يعطى من الصدقة و حد الغنى' حديث:١٦٢٩) اور سنن نسائی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ ہو اس کے باوجود اگر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چمٹ کر یعنی اصرار سے سوال کیا۔''

(٥٢١) وَعَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ، أَنَّ رَجُلَيْنِ حَدَّثَاهُ: أَنَّهُمَا أَتَيَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْأَلَانِهِ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيهِمَا الْبَصَرَ، فَرَآهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: «**إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا، وَلَا حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ، وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ**.» رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

[521] حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے انھیں اپنا واقعہ سنایا کہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (جبکہ آپ صدقہ تقسیم فرما رہے تھے۔) ان دونوں نے آپ سے صدقے کا سوال کیا۔ آپ نے ان دونوں کو ایک نظر اٹھا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا تو دونوں کو طاقتور پایا۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں تمھیں دے دیتا ہوں مگر (حقیقت یہ ہے کہ) اس میں غنی اور طاقتور کما کھا سکنے والے کا کوئی حصہ نہیں۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداود اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَقَلَّبَ فِيهِمَا الْبَصَرَ] آپ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے انھیں دیکھا۔ [جَلْدَيْنِ] ''جیم'' پر فتحہ اور ''لام'' ساکن ہے اور ''لام'' کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی۔ [لَا حَظَّ] کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ [لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ] صیغۂ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا۔ [إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا] یعنی صحت مند اور غنی کے لیے صدقہ لینا ذلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمھیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپ نے ان سے زجر و توبیخ کے طور پر فرمائی۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کے لیے صدقہ و زکاۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہیے کہ سائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں' بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی

٥٢١ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى، حديث: ١٦٣٣، وأحمد: ٤/ ٢٢٤، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٥٩٩.

تلقین کرے اور اسے برے انجام سے خبردار کردے۔

راویٔ حدیث: [عبیداللہ بن عدی بن خیار قرشی نوفلی رحمہ اللہ] خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول کے مطابق ان کی پیدائش رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہوئی۔ ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت کی ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے' چنانچہ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فقہاء و علماء میں ہوتا ہے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور کے آخری ایام میں وفات پائی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۹۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ خیار میں ''خا'' مکسور ہے۔

(٥٢٢) وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهِلَالِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ: رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتّٰى يَقُولَ ثَلَاثَةٌ مِّنْ ذَوِي الْحِجٰى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَاقَبِيصَةُ! سُحْتٌ، يَأْكُلُهُ صَاحِبُهُ سُحْتًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[522] حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سوال کرنا صرف تین آدمیوں کے لیے جائز ہے: ایک وہ شخص جس نے کوئی ضمانت اٹھا لی تو اس (ضامن) کے لیے سوال کرنا جائز ہے حتی کہ وہ (سوال کر کے) اتنی رقم حاصل کر لے' پھر وہ سوال کرنے سے رک جائے۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے کوئی ناگہانی مصیبت پہنچی جس نے اس کا مال تباہ و برباد کر دیا تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے پاس اتنی رقم ہو جائے جس سے وہ اپنی گزران حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اور تیسرا وہ شخص جسے فقر و فاقہ گھیر لے' اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی فلاں شخص فقر و فاقے کی حالت میں مبتلا ہے' تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے پاس اتنی رقم ہو جائے جس سے وہ اپنی گزران حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے اے قبیصہ! سوال کرنا اور مانگنا حرام ہے۔ مانگنے والا سوال کر کے جو کچھ حاصل کرے گا' وہ حرام مال کھائے گا۔'' (اسے مسلم' ابوداود' ابن خزیمہ' اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [ثَلَاثَةٍ] اس پر تنوین ہے۔ [رَجُلٍ] ثلاثہ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے' یا پھر مرفوع ہے۔ اس

٥٢٢ـ أخرجه مسلم، الزكاة، باب من تحل له الصدقة، حديث: ١٠٤٤، وأبوداود، الزكاة، حديث: ١٦٤٠، وابن خزيمة: ٤/ ٦٥، حديث: ٢٣٦٠، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١٦٨، حديث: ٣٣٨٧.

صورت میں أَحَدُهُم مبتدا محذوف ہوگا۔ [تَحَمَّلَ] ذمہ اٹھایا' کفالت کی۔ [حَمَالَةً] ''حا'' پر فتحہ اور ''میم'' مخفف ہے' وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے' مثلاً: دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کے لیے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکاۃ لے سکتا ہے۔ [ثُمَّ يُمْسِكُ] إمساك سے ماخوذ ہے۔ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ [جائِحَةٌ] آسمانی یا زمینی آفت' مثلاً: نہایت ٹھنڈی ہوا چلنے سے' آگ لگنے سے یا سیلاب کی وجہ سے فصل تباہ ہو جائے۔ [اِجْتَاحَتْ] ہلاک کردے۔ [قِوَامًا] ''قاف'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی وہ چیز جس سے کوئی شخص اپنی حاجت وضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ [اَلْحِجی] ''حا'' کے نیچے کسرہ ہے اور آخر میں الف مقصورہ ہے' یعنی عقل۔ [سُحْتٌ] ''سین'' پر ضمہ اور ''حا'' ساکن ہے۔ حرام۔ يَسْحَتُ الْبَرَكَةَ کے معنی ہیں: جو برکت کو لے اڑے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں سوال کرنے والے کی حالت معلوم کرنے کے لیے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل ودانش آدمی اس کی حالت' کسمپرسی اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کے لیے سوال کرنا جائز ہے اور اس میں سائلین کی حالت کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت ومزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت قبیصہ بن مخارق الہلالی ﷜] ابوبشر کنیت ہے۔ قبیصہ میں ''قاف'' پر فتحہ اور ''با'' کے نیچے کسرہ ہے۔ اور مُخارق میں ''میم'' پر ضمہ ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: قبيصة بن مُخارق بن عبدالله بن شداد العامري الهلالي. شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے' اور نبی ﷺ کے پاس وفد کے ساتھ آئے اور آپ سے احادیث سنیں۔ چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(٥٢٣) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَنْبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ». وَفِي رِوَايَةٍ: «وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[523] حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث ﷜ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ صدقہ آل محمد (ﷺ) کے لیے مناسب نہیں۔ یہ تو لوگوں (کے اموال) کا میل کچیل ہے'' اور ایک دوسری روایت میں ہے: ''صدقہ حضرت محمد (ﷺ) اور آل محمد (ﷺ) کے لیے حلال نہیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَوْسَاخُ النَّاسِ] وسخ کی جمع ہے۔ میل کچیل۔ آل محمد (ﷺ) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا

٥٢٣_ أخرجه مسلم، الزكاة، باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة، حديث: ١٠٧٢.

ہے اس کا ذکر کتاب الزکاۃ کی ایک ابتدائی حدیث: ۴۸۸ میں گزر چکا ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث ﷜] ان کا سلسلہ نسب یوں ہے: ابن عبدالمطب بن ہاشم القریشی، مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ۶۲ ہجری میں وہیں وفات پائی۔

(٥٢٤) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَشَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَارَسُولَ اللهِ! أَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَّاحِدٌ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[524] حضرت جبیر بن مطعم ﷜ سے مروی ہے کہ میں اور حضرت عثمان بن عفان ﷜ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بنو مطلب کو خیبر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا اور ہمیں نظر انداز کر دیا، حالانکہ آپ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے ہم اور وہ برابر ہیں۔ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بنو مطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ] خمس میں ''خا'' اور ''میم'' دونوں پر ضمہ ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ [وَنَحْنُ وَهُمْ] هُمْ سے یہاں بنو المطلب مراد ہیں۔ [بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ] آپ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لیے کہ حضرت عثمان ﷜ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبد مناف سے تھا، اس طرح دونوں ہاشم بن عبد مناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس، نوفل اور مطلب، ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ [إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَّاحِدٌ] بنو مطلب اور بنو ہاشم ایک ہی چیز ہیں، اس لیے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی موالاۃ ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا تعلق نہیں ہے۔ یہ لوگ قرابت داروں کو دیے جانے والے حصے میں شریک ہیں، بخلاف دوسروں کے کہ وہ شامل نہیں، اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں اس لیے بیان کیا ہے کہ بنو مطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکاۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں، یعنی دونوں کے لیے زکاۃ لینا حرام ہے۔

فائدہ: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان ﷠ کا ''ہم اور بنو مطلب برابر ہیں'' کہنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ جیسی وفاداری اور اطاعت گزاری بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرماں برداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم میں اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں، جتنا کچھ استحقاق قرابت

٥٢٤ـ أخرجه البخاري، فرض الخمس، باب ومن الدليل على أن الخمس للإمام، حديث: ٣١٤٠.

انھیں آپ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنوعبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ ہاشم' مطلب' نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے بیٹے تھے' اس طرح حضرت جبیر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہی درجے کا ہے۔ حضرت جبیر و عثمان رضی اللہ عنہما کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے نسب میں بنوعبد شمس اور بنونوفل' بنومطلب کے برابر ہیں لیکن بنومطلب کی بنو ہاشم کے ساتھ باہمی موالاۃ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں بھی رہی ہے' بنوعبد شمس اور بنونوفل کے برعکس کہ ان کے بنو ہاشم سے جاہلیت میں ایسے تعلقات نہیں رہے۔ اس لحاظ سے بنومطلب میرے (بنو ہاشم کے) زیادہ قریب ہیں۔ اس قربت کی بنا پر انھیں خمس میں سے دیا گیا ہے اور ان پر زکاۃ حرام ہے۔ اور بنوعبد شمس اور بنونوفل کو خمس میں سے نہیں دیا گیا اور نہ ان پر زکاۃ حرام ہے۔

(٥٢٥) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلاً عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِي مَخْزُومٍ، فَقَالَ لِأَبِي رَافِعٍ: اِصْحَبْنِي، فَإِنَّكَ تُصِيبُ مِنْهَا، فَقَالَ: لَا، حَتّٰى آتِيَ النَّبِيَّ ﷺ فَأَسْأَلَهُ، فَأَتَاهُ فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «**مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[525] حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنومخزوم کے ایک آدمی کو صدقات و زکاۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابورافع رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو' تمھیں بھی اس میں سے کچھ حصہ ملے گا۔ اس نے کہا: میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت کر لوں' چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں آیا اور آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''قوم کا مولیٰ (آزاد شدہ غلام) بھی انھیں میں ہوتا ہے اور ہمارے لیے صدقات و زکاۃ حلال نہیں ہے۔'' (اسے احمد' تینوں (ابوداود' نسائی' ترمذی)' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَعَثَ رَجُلًا] آپ نے ایک آدمی کو بھیجا' اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں۔ [تُصِيبُ مِنْهَا] اس حاصل شدہ صدقے میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکاۃ حرام ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کے لیے خود زکاۃ لینا حرام ہے' اسی طرح اس کے غلام پر بھی حرام ہے۔ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے' اس لیے ان کے لیے بھی زکاۃ لینا حرام تھا۔

٥٢٥ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الزكاة، باب الصدقة على بني هاشم، حديث: ١٦٥٠، والترمذي، الزكاة، حديث: ٦٥٧، والنسائي، الزكاة، حديث: ٢٦١٣، وأحمد: ٣/ ٤٤٨، ٤/ ٣٢٠، وابن خزيمة: ٤/ ٥٧، حديث: ٢٣٤٤، وابن حبان(الإحسان): ٥/ ١٢٤، حديث: ٣٢٨٢.

راویٔ حدیث: [حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ] ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں‘ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ہرمز یا ثابت یا ابراہیم۔ قبطی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انھوں نے انھیں نبی ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ انھوں نے غزوۂ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے‘ احد اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابورافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ۳۶ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(٥٢٦) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ، فَيَقُولُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ مِنِّي، فَيَقُولُ: «خُذْهُ، فَتَمَوَّلْهُ، أَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ، وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمَا لَا، فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[526] حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ اپنے والد (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز دیتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرتے: جو لوگ مجھ سے زیادہ غریب ہیں انھیں دے دیجیے۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے: ”اسے لے لو‘ پھر اسے اپنا مال بنا لو یا صدقہ وخیرات کر دو اور جو مال بغیر لالچ اور مانگنے کے تمھارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔“ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْعَطَاءَ] کام کرنے کا معاوضہ‘ اجرت یا عطیہ۔ [أَفْقَرَ] أفعل التفضيل کا صیغہ ہے‘ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ [فَتَمَوَّلْهُ] امر کا صیغہ ہے‘ یعنی اسے اپنا مال بنا لے۔ [مُشْرِفٍ] اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص ولالچی ہونا۔ [فَلَا تُتْبِعْهُ] إتباع سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ سبل السلام میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہوا ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہیے‘ واپس نہیں کرنی چاہیے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کے لیے ہے‘ یعنی ایسا کرنا مندوب ہے‘ فرض و واجب نہیں۔ اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے۔ اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لے لینا چاہیے‘ لہٰذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہیے کیونکہ اس حدیث میں عطاء سے یہی مراد ہے۔ علاوہ ازیں صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصولیٔ زکاۃ کی اجرت کے بارے میں فرمائی تھی۔ (صحيح مسلم‘ الزكاة‘ باب جواز الأخذ بغير سؤال ولا تطلع‘ حديث:١٠٤٥) یہ امر استحباب ہے‘ وجوب کے لیے نہیں‘ اور اس سے ہر قسم کا عطیہ اور تحفہ بھی مراد

٥٢٦۔ أخرجه مسلم، الزكاة، باب جواز الأخذ بغير سؤال ولا تطلع، حديث: ١٠٤٥.

ہوسکتا ہے۔ بنابریں جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص وطمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔



٥ - كِتَابُ الصِّيَامِ

روزوں سے متعلق احکام و مسائل

(٥٢٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَقَدَّمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلَا يَوْمَيْنِ، إِلَّا رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْماً فَلْيَصُمْهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[527]۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رمضان (شروع ہونے) سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھو، سوائے اس شخص کے جو پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو تو وہ اس دن کا بھی روزہ رکھ لے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [كِتَابُ الصِّيَامِ] اَلصِّيَامِ کے لغوی معنی ہیں: اَلْإِمْسَاك، یعنی رک جانا۔ شرعی طور پر اس کے معنی ہیں: طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور جماع کرنے سے شرعی طریقے کے مطابق رک جانا، نیز لغویات، بے ہودہ گوئی اور مکروہ و حرام کلام سے رک جانا بھی اس میں شامل ہے۔ روزہ 2 ہجری میں فرض ہوا تھا۔ [لَا تَقَدَّمُوا] یہ اصل میں لَا تَتَقَدَّمُوا تھا، یعنی رمضان کے استقبال کے لیے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو۔ [كَانَ يَصُومُ صَوْمًا] یعنی معمول کے مطابق کچھ مخصوص دنوں میں وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو گئے، مثلاً: ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتے میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آ گیا تو اس شخص کے لیے اس دن روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا

٥٢٧ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب لا يتقدم رمضان بصوم يوم ولا يومين، حديث: ١٩١٤، ومسلم، الصيام، باب لا تقدموا رمضان بصوم يوم ولا يومين، حديث: ١٠٨٢.

ہے۔ [فَلْيَصُمْهُ] اس میں لام امر' بیان جواز کے لیے ہے' یعنی وہ شخص معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

فائدہ: مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ استقبال رمضان کے پیش نظر رمضان سے پہلے روزے رکھنا جائز نہیں ہے' سوائے اس شخص کے جس کا معمول' سنت کے مطابق' سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنا ہو' اور سوموار یا جمعرات کا دن 29 یا 30 شعبان کو آ جائے' یا کوئی قضا وغیرہ کے روزے رکھتا آ رہا ہے جو 29 یا 30 شعبان کو ختم ہو رہے ہیں' ان صورتوں میں یا ایسی ہی کسی اور اتفاقی صورت میں روزے رکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ أعلم.

(٥٢٨) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ، فَقَدْ عَصٰى أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ. ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيقًا، وَوَصَلَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[528] حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے شک کے دن کا روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (اسے بخاری نے تعلیقاً اور پانچوں نے موصولاً ذکر کیا ہے' نیز ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ] يُشَكُّ صیغۂ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں دن ہے جب کہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے شواہد کی بنا پر صحیح کہا ہے۔ علاوہ ازیں امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسے تعلیقاً بیان کیا ہے' نیز دیگر دلائل سے بھی شک کے دن کا روزہ رکھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ بنابریں مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد اور متابعات کی بنا پر قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ واللہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل: ۴/۱۲۵-۱۲۷' رقم: ۹۶۱) ② شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو صبح روزہ رکھنا' مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء گو کسی حد تک درست ہو سکتی ہیں لیکن انھیں لازمی اور حتمی نہیں کہا جا سکتا۔

(٥٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[529] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے

٥٢٨ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصوم، باب كراهية صوم يوم الشك، حديث: ٢٣٣٤، والبخاري تعليقا، الصوم، حديث: ١٩٠٦، والترمذي، الصوم، حديث: ٦٨٦، وقال: حسن صحيح، والنسائي، الصيام، حديث: ٢١٩٠، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٤٥، وابن خزيمة: ٣/ ٢٠٥، حديث: ١٩١٤، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ٢٣٩، حديث: ٣٥٧٧، أبوإسحاق مدلس وعنعن.

٥٢٩ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ إذا رأيتم الهلال فصوموا، حديث: ١٩٠٦، ومسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان، حديث: ١٠٨٠، وحديث أبي هريرة أخرجه البخاري، الصوم، حديث: ١٩٠٩، ومسلم، الصيام، حديث: ١٠٨١.

عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ: «فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلَاثِينَ». وَلِلْبُخَارِيِّ: «فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ». وَلَهُ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ».

رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جب تم (رمضان کا) چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (شوال کا) چاند دیکھ لو تو رکھنا موقوف کر دو۔ اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کے لیے اندازہ لگا لو۔'' (بخاری و مسلم) اور مسلم میں یہ بھی ہے: ''اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لیے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو۔'' اور بخاری میں ہے: ''پھر تیس روز کی گنتی اور تعداد پوری کرو۔'' اور بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [إِذَا رَأَيْتُمُوهُ] جب تم اسے دیکھ لو۔ اس سے مراد چاند ہے، یعنی جب چاند تمھیں نظر آ جائے۔ [فَإِنْ غُمَّ] غُمَّ میں ''غین'' پر ضمہ اور ''میم'' پر تشدید ہے۔ صیغۂ مجہول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے، مخفی اور پوشیدہ رہ جائے، ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے دیکھا نہ جا سکے۔ [فَاقْدُرُوا لَهُ] قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فَاقْدُرُوا لَهُ میں ''دال'' پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ تیسواں روزہ بھی رکھ کر مکمل مہینے کی گنتی اور تعداد پوری کر لو۔

(٥٣٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ، فَأَخْبَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

[530] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، اور میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے، چنانچہ آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ] لوگ چاند دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے خبر واحد، یعنی صرف ایک آدمی کی شہادت بھی مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

فوائد و مسائل: ① ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزے کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہیں۔ چاند نظر آ جائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھنا بند کیا جائے۔ ② اگر انتیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کیے جائیں اور اسی طرح اگر انتیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے

٥٣٠ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصوم، باب شهادة رجلين على رؤية هلال شوال، حديث: ٢٣٤٢، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١٨٨، حديث: ٣٤٣٨، والحاكم: ١/ ٤٢٣.

کیے جائیں۔ ③ اگر گردو غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آ جائے تو روزہ سارے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ ④ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رؤیت قابل قبول نہ ہوگی جیسا کہ جمہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں بھی بعض لوگ روزے، عیدین اور دیگر عبادات جو چاند سے متعلق ہیں سعودی عرب کی رؤیت ہلال کے مطابق ادا کرتے ہیں اور اسی رؤیت کو اپنے لیے قابل عمل قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلے کی بابت سعودی علماء اور مفتیان سے بھی استفسار کیا گیا، چنانچہ سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں: ''یہ مسئلہ سعودی عرب کے کبار علماء کی مجلس میں بھی پیش کیا گیا تو ان علماء کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلے میں راجح بات یہ ہے کہ اس میں کافی گنجائش ہے۔ اپنے ملک کے علماء کی رائے کے مطابق عمل کر لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ ایک معتدل رائے ہے اور اس سے اہل علم کے مختلف اقوال و دلائل میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ آگے چل کر انھوں نے علماء کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اہل علم پر واجب ہے کہ ماہ کے آغاز و اختتام کے موقع پر اس مسئلے کی طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور ایک بات پر متفق ہو جائیں جو ان کے اجتہاد کے مطابق حق کے زیادہ قریب ہو، پھر اسی کے مطابق عمل کریں اور لوگوں تک بھی اپنی بات پہنچا دیں۔ ان کے حکمرانوں اور عام مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اس سلسلے میں اپنے علماء کی پیروی کریں اور اس مسئلے میں اختلاف نہ کریں کیونکہ اس سے لوگ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور کثرت سے قیل و قال ہونے لگے گی۔'' دیکھیے: (فتاویٰ اسلامیہ (اُردو)، ۲/ ۱۵۸، ۱۵۹، مطبوعہ دارالسلام) ⑤ سعودی مفتیان کے فتاویٰ اور دیگر دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ ہر ملک اپنی رؤیت اور اپنے علماء کے متفقہ فیصلے کے مطابق ہی روزے، عیدیں اور دیگر عبادات بجالائے، ان شاءاللہ اسی میں خیر ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔ ⑥ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کے لیے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کے لیے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، سب متفق ہیں۔

(٥٣١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ أَعْرَابِيًّا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الْهِلَالَ، فَقَالَ: «أَتَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ»؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَابِلَالُ! أَنْ يَّصُومُوا غَدًا». رَوَاهُ

[531] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں؟'' اس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟'' اس نے کہا: ہاں۔ آپ نے

٥٣١ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أبوداود، الصوم، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، حديث: ٢٣٤٠، والترمذي، الصوم، حديث: ٦٩١، والنسائي، الصيام، حديث: ٢١١٤، وقال: مرسل، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٥٢، وابن خزيمة: ٣/ ٢٠٨، حديث: ١٩٢٣، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ١٨٧، حديث: ٣٤٣٧، وأحمد: لم أجده. * سلسلة سماك عن عكرمة ضعيفة عند التحقيق.

الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ إِرْسَالَهُ.

فرمایا: ''بلال! اٹھو اور لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے جبکہ نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔)

لغوی تشریح: [فَأَذِّنْ] تَأْذِين سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کے لیے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے۔ اور یہی بات صحیح ہے۔

فائدہ: مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہے جیسا کہ فاضل محقق نے اس طرف اشارہ کیا ہے' تاہم گزشتہ حدیث جو کہ سنن ابی داود میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' اسے محققین نے صحیح قرار دیا ہے۔ وہ حدیث یوں ہے' ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ لوگ چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مجھے چاند نظر آ گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے (اس خبر کے مطابق) خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (سنن أبي داود' الصيام' باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان' حديث: ٢٣٤٢) لہٰذا معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی گواہی ہی رمضان شروع ہونے کا یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔ واللّٰه أعلم.

(٥٣٢) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَمَالَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ، وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعًا ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[532] ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے رات کو صبح صادق سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ: «لَا صِيَامَ لِمَنْ لَّمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ».

اور دارقطنی کی روایت میں ہے: ''جس نے رات کو اسے اپنے آپ پر واجب نہ کیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔''

لغوی تشریح: [مَنْ لَّمْ يُبَيِّتْ ......الخ] يُبَيِّتْ، تَبْيِيت سے ماخوذ ہے' یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا۔ [لَمْ يَفْرِضْهُ] باب ضَرَبَ يَضْرِبُ سے ہے' یعنی اسے اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس نے روزے کی نیت نہ کی۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح کہا

٥٣٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصوم، باب النية في الصيام، حديث: ٢٤٥٤، والترمذي، الصوم، حديث: ٧٣٠، والنسائي، الصيام، حديث: ٢٣٣٣، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٧٠٠، وأحمد: ٦/ ٢٨٧، وابن خزيمة: ٣/ ٢١٢، حديث: ١٩٣٣، وابن حبان: لم أجده، والدارقطني: ٢/ ١٧٢، الزهري عنعن.

ہے۔علاوہ ازیں فاضل محقق نے سنن ابن ماجہ کی تحقیق میں اس روایت کی بابت لکھا ہے کہ یہ مذکورہ روایت سنن نسائی میں بھی حضرت حفصہ ؓ سے مروی ہے' وہ روایت موقوفاً صحیح ہے۔ دیکھیے: تحقیق وتخریج سنن ابن ماجہ' رقم: ١٧٠٠) شیخ البانی ؒ نے ارواء الغلیل میں اس پر کافی بحث کی ہے جس سے تصحیح حدیث والی رائے ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغلیل: ۴/ ۲۵'۳۰' رقم: ۹۱۴) بنابریں فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے کر لینا ضروری ہے۔ گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جا سکتی ہے۔ ② نفلی روزے کی نیت دن میں بھی کی جا سکتی ہے۔ ③ نیت اس لیے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کے لیے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے روزے کے لیے الگ الگ نیت شرط ہے' البتہ روزے کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت ہیں کیونکہ نیت دل کا عمل ہے' زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ نبی اکرم ﷺ یا صحابۂ کرام ؓ ہی سے ثابت ہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب ؓ] پہلے یہ خنیس بن حذافہ سہمی ؓ کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے بعد وہ وفات پا گئے تو رسول اللہ ﷺ نے 3 ہجری میں انھیں اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں شعبان 45 ہجری میں فوت ہوئیں۔

(٥٣٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ، فَقَالَ: «**هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ**»؟ قُلْنَا: لَا، قَالَ: «**فَإِنِّي إِذًا صَائِمٌ**» ثُمَّ أَتَانَا يَوْمًا آخَرَ، فَقُلْنَا: أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: «**أَرِينِيهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِمًا**» فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[533] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا: ''کیا تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟'' ہم نے عرض کیا: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''اچھا' تو میں روزے سے ہوں۔'' اس کے بعد پھر ایک روز آپ تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا: حَیس کا تحفہ ہمیں (کہیں سے) دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''ذرا مجھے تو دکھاؤ' صبح سے میں روزے سے تھا۔'' (یہ فرما کر) آپ نے حَیس تناول فرما لیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [فَإِنِّي إِذًا صَائِمٌ] إِذًا پر تنوین ہے۔ اس حدیث سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ نفلی روزے کی نیت طلوع آفتاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت حفصہ ؓ کی سابقہ روایت میں نیت کا لزوم فرضی روزے کے لیے ہے' نفلی روزے کے لیے نہیں۔ [حَيْسٌ] ''حا'' پر فتحہ اور ''یا'' ساکن ہے۔ جسے کھجور' گھی اور پنیر ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ [أَرِينِيهِ] إِرَاءَةٌ سے امر کا صیغہ واحد مؤنث مخاطب ہے اور اس میں نون وقایہ کا ہے اور بعد کی ''یا'' یائے متکلم ہے جو فعل کا پہلا مفعول واقع ہو رہی ہے اور دوسرا مفعول ضمیر غائب ہے۔ [فَأَكَلَ] پھر آپ نے اسے

٥٣٣ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب جواز النافلة بنية من النهار قبل الزوال، حديث: ١١٥٤.

تناول فرما لیا۔ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نفلی روزے دار بغیر کسی عذر کے روزہ افطار کر (توڑ) سکتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نفلی روزے کی نیت طلوع فجر سے پہلے لازمی نہیں بلکہ طلوع آفتاب کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ امام شافعی، امام احمد اور امام مالک رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ فرض روزے کے لیے رات کو نیت کرنا ضروری ہے جبکہ نفلی روزے کی نیت زوال سے پہلے تک کی جا سکتی ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نفلی روزہ بغیر کسی عذر کے توڑا جا سکتا ہے۔ امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بلا عذر روزہ توڑنا جائز نہیں، اسے پورا کرنا ان کے نزدیک واجب ہے۔ ان کے نزدیک اگر افطار کر لیا تو اس کی قضا توڑنے والے پر واجب ہے۔ لیکن راجح اور صحیح موقف جمہور علماء کا ہے کہ نفلی روزہ توڑنے کا کفارہ نہیں اگرچہ قصداً ہی توڑا جائے۔

(٥٣٤) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[534] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ اس وقت تک بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔'' (بخاری و مسلم)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ، أَعْجَلُهُمْ فِطْرًا».

ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے مروی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میرے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔''

لغوی تشریح: مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ | عَجَّلُوا تعجیل سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے، یعنی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو فوراً روزہ افطار کر دینا چاہیے۔ افطار میں جلدی کرنا اہل اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرماں برداری کا بھی یہی تقاضا ہے، اس لیے شعار اسلام کا اہتمام کرنا، شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیر و برکت کا باعث ہے اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

فوائد و مسائل: ① جامع ترمذی کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے، البتہ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس مسئلے کی بابت یوں مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔ روزہ جلدی کھولا کرو

٥٣٤ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب تعجيل الإفطار، حديث:١٩٥٧، ومسلم، الصيام، باب فضل السحور وتأكيد استحبابه...، حديث:١٠٩٨. وحديث أبي هريرة أخرجه الترمذي، الصوم، حديث:٧٠٠، وسنده ضعيف، الزهري مدلس وعنعن.

کیونکہ یہودی دیر کرتے ہیں۔'' (سنن ابن ماجه' الصيام' حديث:١٦٩٨) بنابریں مطلع صاف ہو' گردوغبار اور ابر نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ ② تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود ونصاریٰ کا طریقہ ہے۔ اور شرح مصابیح میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے' لہٰذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہیے۔

(٥٣٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[535] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں بڑی برکت ہے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: اَلسَّحُور ''سین'' پر فتحہ کی صورت میں وہ کھانا مراد ہے جو طلوع فجر سے پہلے کھایا جائے اور اگر اس پر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہوگا اور اس سے مراد کھانے کا عمل ہوگا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے۔ ② یہود ونصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے تھے' اس لیے ان کی مخالفت کی گئی ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔'' برکت کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھانے کا ثواب ملتا ہے کیونکہ یہ ایک مسنون عمل ہے اور اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی رہتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کھائے جانے والے کھانے میں واقعتاً ایک خاص برکت ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق سنت نبوی سے ہے۔

(٥٣٦) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى تَمْرٍ، فَإِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

[536] حضرت سلمان بن عامر ضبی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے خشک کھجور سے افطار کرنا چاہیے۔ اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر لے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو روزہ کھجور سے افطار کرنا چاہیے کیونکہ کھجور مقوی معدہ' مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار

٥٣٥ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب بركة السحور من غير إيجاب، حديث:١٩٢٢، ١٩٢٣، ومسلم، الصيام، باب فضل السحور وتأكيد استحبابه.....، حديث:١٠٩٥.

٥٣٦ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصوم، باب ما يفطر عليه، حديث:٢٣٥٥، والترمذي، الزكاة، حديث:٦٥٨، وابن ماجه، الصيام، حديث:١٦٩٩، والنسائي في الكبرى:٢/٢٥٤، حديث:٣٣١٩ وغيره، وأحمد:٤/٢١٣، ٢١٤، وابن خزيمة:٣/٢٧٨، حديث:٢٠٦٧، وابن حبان (الإحسان):٥/٢١٠، حديث:٣٥٠٥، والحاكم:١/٤٣٢.

بہتر ہے۔ ② نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔ (جامع الترمذي' الصوم' باب ماجاء مایستحب علیه الإفطار' حدیث:٦٩٦) ③ امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کھجور یا پانی سے روزہ افطار کرنے میں رسول اکرم ﷺ کی اپنی امت کے ساتھ کمال شفقت اور خیر خواہی کا اظہار ہے کیونکہ خالی معدے کی حالت میں میٹھی چیز کھانا معدے کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے ساتھ باقی اعضا بھی قوت پکڑتے ہیں۔ خصوصاً قوت بینائی کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ اس طرح پانی کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کے ساتھ جگر میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اگر اسے پانی کے ساتھ رطوبت پہنچ جائے تو وہ بعد میں کھائی جانے والی غذا سے بہت فائدہ حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کھجور اور پانی کی خاصیات کو امراض دل کے ماہرین ہی بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ دل کی درستی میں ان کا کس قدر عمل دخل ہے۔ (زاد المعاد: ١٦٠/١)

راویٔ حدیث: [حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ] ان کا سلسلۂ نسب یوں ہے: سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث الضبي۔ مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش پذیر رہے۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول کے مطابق ان کے سوا کوئی بھی صحابی ضبی نہیں۔

(٥٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ: فَإِنَّكَ تُوَاصِلُ يَارَسُولَ اللّٰهِ!؟ قَالَ: «وَأَيُّكُمْ مِثْلِي؟ إِنِّي أَبِيتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الْوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْمًا، ثُمَّ يَوْمًا، ثُمَّ رَأَوُا الْهِلَالَ، فَقَالَ: «لَوْ تَأَخَّرَ الْهِلَالُ لَزِدْتُكُمْ»، كَالْمُنَكِّلِ لَهُمْ حِينَ أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[537] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے وصال (کھائے پیے بغیر مسلسل دو یا تین روزے رکھنے) سے منع فرمایا۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے کہا: اللہ کے رسول! آپ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔" چنانچہ جب لوگ وصال سے باز نہ آئے تو آپ نے انھیں ایک دن' پھر دوسرے دن وصال کرایا۔ پھر انھوں نے چاند دیکھ لیا تو آپ نے فرمایا: "اگر آج چاند نظر نہ آتا تو میں تمھیں زیادہ دن وصال کراتا۔" گویا آپ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [اَلْوِصَالُ] اس کا مطلب ہے کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ

٥٣٧ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب التنكيل لمن أكثر الوصال، حديث:١٩٦٥، ومسلم، الصيام، باب النهي عن الوصال في الصوم، حديث:١١٠٣.

رکھے۔ رات کو بھی کچھ نہ کھائے پیے۔ سحری کے وقت اگر اتفاقاً ایسے ہو جائے، یعنی کسی عذر کی بنا پر آدمی کچھ کھا پی نہ سکے تو وہ وصال شمار نہیں ہوگا۔ [وَ اَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟] یہ استفہام انکاری ہے، یعنی تم میں سے کوئی میری طرح کا نہیں ہے۔ آپ کا یہ قول اس کا متقاضی ہے کہ وصال آپ کی خصوصیت تھی اور آپ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ [یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَ یَسْقِیْنِیْ] میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ پچھلے کلام میں آپ نے اس بات کی نفی کی تھی کہ کوئی آپ کی طرح کا ہو۔ اس کی وضاحت کے لیے آپ نے یہ فرمایا: ''مجھے میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔'' گویا یہ پچھلے کلام کا بیان ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے معارف کی غذا کھلاتا ہے اور آپ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے۔ محبت الٰہی کی نعمت سے آپ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپ کو اللہ کی جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد: ۱۵۴/۱۵۵) [کَالْمُنَکِّلِ لَهُمْ] اَلْمُنَكِّل، تَنْكِيل سے ماخوذ اسم فاعل ہے، یعنی زجر و توبیخ، ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں وصال کرایا اور ان کے ساتھ مل کر خود بھی مسلسل روزہ رکھنے لگے۔ یہ جواز کے لیے نہیں تھا بلکہ زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے تھا اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود تھا، چنانچہ جب انھوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی ممانعت کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے (ممانعت وصال کو) قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ ② اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پیے بغیر روزہ رکھنا انسانی اعضاء و قوتوں کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ ③ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی غذا کی قوت مل جاتی تھی، اس لیے آپ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نیکی کے جذبے سے اور آپ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپ نے انھیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپ نے سبق سکھانے کے لیے مسلسل روزے رکھنا شروع کیے تو اتنے میں چاند نظر آ گیا۔ آپ نے زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا: کرو وصال۔ کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں صوم وصال کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمھیں سبق ملتا۔ ④ بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وصال نہ کرو۔ ہاں، اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔'' (صحیح البخاري، الصوم، باب الوصال إلی السحر، حدیث: ۱۹٦۷) جس سے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ ⑤ سحری کا کھانا شعائر اسلام میں سے ہے، اس لیے سحری کو کھانا چاہیے اور رات دن کا وصال نبی ﷺ کی خصوصیت ہے۔

(٥٣٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالْعَمَلَ بِهِ، وَالْجَهْلَ،

[538] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جھوٹ اور بے ہودہ بولنا اور اس

٥٣٨ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور، حديث: ١٩٠٣، وأبوداود، الصيام، حديث: ٢٣٦٢.

فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُودَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

پر عمل کرنا نہ چھوڑے اور حماقت و بیوقوفی کو ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' (اسے بخاری اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداود کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [لَمْ يَدَعْ] نہ چھوڑا' ترک نہ کیا۔ يَدَعْ' وَدَعَ سے ماخوذ ہے۔ [اَلزُّوْر] ''زا'' پر ضمہ اور ''واؤ'' ساکن ہے' یعنی جھوٹ اور بے ہودہ بولنا۔ [اَلْجَهْلَ] حماقت و بیوقوفی اور سختی۔ [فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ] تو اللہ کو اس کی طرف التفات وتوجہ کی حاجت وضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ' غلط بیانی اور جہالت و نادانی کے کام ترک کر دینے چاہییں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی' اس لیے روزے کی حالت میں روزے دار کا ان کاموں سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ② روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ' دغا' فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہ مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(٥٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقَبِّلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلٰكِنَّهُ كَانَ أَمْلَكَكُمْ لِأَرَبِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: فِي رَمَضَانَ.

[539] حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کو بوسہ دیتے تھے اور معانقہ وغیرہ بھی کر لیتے تھے لیکن آپ تمھاری نسبت اپنے جذبات پر خوب ضبط رکھنے والے تھے۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ (آپ یہ دونوں فعل) رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: [يُقَبِّلُ] تقبيل سے ماخوذ ہے۔ بوسہ دینا۔ [يُبَاشِرُ] میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا' بغل گیر ہونا۔ اس سے جماع مراد نہیں ہے۔ [لِأَرَبِهِ] ''ہمزہ'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے' یعنی حاجت' خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق۔) اور ایک قراءت کے مطابق ''ہمزہ'' کے نیچے کسرہ اور ''را'' ساکن ہے۔ اس صورت میں دو احتمال ہیں: اس سے مراد حاجت ہے یا عضو مخصوص' یعنی اپنے جذبات پر یا اپنی شرم گاہ پر تمھاری نسبت خوب ضبط رکھنے والے تھے۔ اس حدیث کی رو سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کے لیے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو۔ یہ رعایت ایسے آدمی کے لیے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلے میں تمام اقوال وآراء سے زیادہ مناسب اور مبنی برعدل ہے۔

٥٣٩۔ أخرجه البخاري، الصوم، باب القبلة للصائم، حديث: ١٩٢٨، ومسلم، الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم ليست محرمة، حديث: ١١٠٦.

(٥٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِحْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[540] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حالت احرام میں پچھنے لگوائے۔ اور آپ نے روزے کی حالت میں بھی پچھنے لگوائے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

(٥٤١) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتٰى عَلٰى رَجُلٍ بِالْبَقِيعِ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «**أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ**». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

[541] حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بقیع میں ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لائے جو رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا۔ (اسے دیکھ کر) آپ نے فرمایا: ''سینگی (پچھنے) لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' (اسے ترمذی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور احمد' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

راویٔ حدیث: [**حضرت شداد بن اوس** رضی اللہ عنہ] ابویعلی نجاری' انصاری مدنی۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری مدنی کہلائے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھتیجے تھے۔ علم و حلم کے مالک تھے۔ ۵۸ ہجری میں ۷۵ برس کی عمر پا کر شام میں وفات پائی۔

(٥٤٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَوَّلُ مَا كُرِهَتِ الْحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، أَنَّ جَعْفَرَ بْنَ أَبِي طَالِبٍ احْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: «**أَفْطَرَ هٰذَانِ**»، ثُمَّ رَخَّصَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ فِي الْحِجَامَةِ لِلصَّائِمِ، وَكَانَ أَنَسٌ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَوَّاهُ.

[542] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے پہل روزے دار کے لیے سینگی لگوانا اس طرح مکروہ ہوا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی' نبی ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: ''ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔'' اس کے بعد نبی ﷺ نے روزے دار کے لیے سینگی لگوانے کی رخصت دے دی۔ اور انس رضی اللہ عنہ روزے کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور قوی کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَعْدُ] دال پر ضمہ ہے۔ یہ مبني على الضم ہے' مضاف الیہ نیت میں ہے اور لفظوں سے اسے حذف

٥٤٠ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب الحجامة والقيء للصائم، حديث: ١٩٣٨.

٥٤١ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، الصوم، باب في الصائم يحتجم، حديث: ٢٣٦٩، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٨١، والنسائي في الكبرٰى، حديث: ٣١٤١، وأحمد: ٤/ ١٢٤، وابن خزيمة: ٣/ ٢٢٦، ٢٢٧، حديث: ١٩٦٣، وابن حبان(الإحسان): ٥/ ٢١٩، حديث: ٣٥٢٦.

٥٤٢ـ [إسناده حسن] أخرجه الدارقطني: ٢/ ١٨٢، وقال: "رجاله كلهم ثقات ولا أعلم له علة".

کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں بَعْدَ ذٰلِكَ تھا۔ سینگی یا پچھنے لگانا ایک طریق علاج ہے جس میں ایک خاص طریقے سے جسم سے خون نکالا جاتا ہے۔ مریض کے جسم پر کسی تیز دھار آلے سے زخم لگا کر ایک دوسری چیز کے ذریعے سے خون چوسا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر کسی کو سینگی لگائے' یا کوئی روزہ دار سینگی لگوائے تو کیا ان کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا قائم رہے گا؟ اس بارے میں علمائے کرام میں دو مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ روزہ ٹوٹنے کے قائل ہیں' ان کی دلیل یہی حدیث ہے جو حضرت ثوبان' حضرت شداد بن اوس' حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عائشہ اور خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھ کر سینگی لگوائی۔ اور ان کے نزدیک سینگی لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: کیا آپ لوگ (عہد نبوی میں) روزے دار کے لیے سینگی لگوانا ناپسند کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ''نہیں' صرف کمزوری کی وجہ سے مکروہ سمجھا جاتا تھا۔'' (صحیح البخاري' الصوم' باب الحجامة والقيء للصائم' حدیث:۱۹۴۰) حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم بھی روزے کی حالت میں سینگی لگوا لیا کرتے تھے۔ (الموطأ للإمام مالك' الصيام' باب ماجاء في حجامة الصائم' حدیث:۲۵'۲۶'۲۷) امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ''روزے دار کو سینگی لگوانا صرف اس لیے مکروہ ہے کہ کمزوری کا اندیشہ ہوتا ہے۔'' (الموطأ للإمام مالك' حواله مذکورہ بالا) شیخ عبدالقادر ارناؤوط جامع الاصول کے حاشیے میں لکھتے ہیں: ''سینگی سے روزہ ٹوٹنے کا حکم منسوخ ہے۔'' (جامع الأصول:۶/۲۹۵' حدیث: ۴۴۱۶'۴۴۱۷) امام ابن حزم اور شیخ البانی رحمہما اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ (فتح الباري:۴/۱۵۵' ومختصر صحيح البخاري للألباني:۱/۴۵۵) امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر بحث کر کے آخر میں فرمایا: ''حدیثوں میں تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ سینگی لگوانا اس شخص کے لیے مکروہ ہے جسے کمزوری لاحق ہوتی ہو۔ اور اگر کمزوری اس حد تک پہنچتی ہو کہ اس کی وجہ سے افطار کرنا پڑے تو اس صورت میں سینگی لگوانا زیادہ مکروہ ہے۔ اور جس شخص کو کمزوری نہیں ہوتی' اس کے حق میں (سینگی لگوانا) مکروہ نہیں' لہٰذا [أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ] ''سینگی لگانے اور لگوانے والے نے روزہ کھول دیا۔'' کو مجازی معنی میں لینا پڑے گا کیونکہ مذکورہ بالا دلائل اسے حقیقی معنی پر محمول کرنے سے مانع ہیں۔'' (نیل الأوطار' أبواب مایبطل الصوم' ومایکرہ' وما یستحب' باب ماجاء في الحجامة:۴/۲۲۸) ان دلائل سے اور ان کے علاوہ دلائل سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس قسم کے مسائل میں احتیاط کرنا مناسب ہے' جیسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کی بابت فرماتے ہیں: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روزے کی حالت میں سینگی لگوا لیا کرتے تھے پھر انھوں نے یہ عمل ترک کر دیا' چنانچہ وہ رات کو سینگی لگواتے تھے۔ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے رات کو سینگی لگوائی۔'' (صحیح البخاري' الصوم' باب الحجامة، والقيء للصائم' قبل الحدیث:۱۹۳۸)

(٥٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا ، [543] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

٥٤٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه ابن ماجه، الصيام، باب ما جاء في السواك والكحل للصائم، حديث: ١٦٧٨ . * سعيد بن عبدالجبار الزبيدي ضعيف. كان جرير يكذبه (تقريب).

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِكْتَحَلَ فِي رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: لَا يَصِحُّ فِيهِ شَيْءٌ.

نے رمضان میں روزے کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند سے بیان کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔)

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح کہا ہے۔ ② روزے کی حالت میں سرمہ ڈالنے کی بابت حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عمل سنن ابی داود میں مروی ہے کہ وہ روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن موقوف قرار دیا ہے' اسی طرح سنن ابی داود ہی میں ہے' جناب اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اہل علم دوستوں (فقہاء و محدثین) میں سے کسی کو نہیں پایا کہ روزے دار کے لیے سرمے کو مکروہ سمجھتے ہوں۔ اور ابراہیم نخعی اجازت دیتے تھے کہ روزے دار ایلوا کو بطور سرمہ استعمال کرے۔ ہمارے فاضل محقق نے اسے سنداً حسن قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (سنن أبي داود' الصیام' حدیث: ۲۳۷۸' ۲۳۷۹) ③ ان دلائل کی روشنی میں روزے کی حالت میں آنکھوں میں سرمہ ڈالنے سے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' لہٰذا روزے کی حالت میں آنکھوں میں سرمہ اور دوائی وغیرہ ڈالنا جائز ہے۔ تاہم بہتر اور افضل یہ ہے کہ سرمہ رات کو استعمال کرے جیسا کہ شیخ ابن باز اور شیخ ابن عثیمین کا فتویٰ بھی یہی ہے۔

(٥٤٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللّٰهُ، وَسَقَاهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[544] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرلے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اسے کھلایا پلایا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

وَلِلْحَاكِمِ: «مَنْ أَفْطَرَ فِي رَمَضَانَ نَاسِيًا فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلَا كَفَّارَةَ». وَهُوَ صَحِيحٌ.

اور مستدرک حاکم میں یوں مروی ہے: ''اگر کوئی شخص بھول کر رمضان میں روزہ افطار کرلے تو اس پر قضا اور کفارہ نہیں۔'' (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

(٥٤٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ

[545] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جسے خود بخود قے آجائے (اس پر قے

٥٤٤ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب الصائم إذا أكل أو شرب ناسيًا، حديث: ١٩٣٣، ومسلم، الصيام، باب أكل الناسي وشربه وجماعه لا يفطر، حديث: ١١٥٥، والحاكم: ١/ ٤٣٠.

٥٤٥ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصوم، باب الصائم يستقيء عمدًا، حديث: ٢٣٨٠، والترمذي، الصوم، حديث: ٧٢٠، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٧٦، وأحمد: ٢/ ٤٩٨، والنسائي في الكبرٰى: ٢/ ٢١٥، حديث: ٣١٣٠، والدارقطني: ٢/ ١٨٤، وقال: "رواته ثقات كلهم". * هشام بن حسان مدلس وعنعن، وأخرج البيهقي: ٤/ ٢١٩ بإسناد صحيح عن ابن عمر قال: "من ذرعه القيء فلا قضاء عليه ومن استقاء فعليه القضاء".

فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَأَعَلَّهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

غالب آ جائے) تو اس پر (روزے کی) قضا نہیں اور جو جان بوجھ کر قے کرے اس پر قضا ہے۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام احمد نے اسے معلول کہا ہے اور دارقطنی نے قوی کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [ذَرَعَهُ الْقَيْءُ] قے غالب آ جائے، یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے۔ [اِسْتَقَاءَ] جو قصداً اور ارادتاً خود قے کرے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے فاضل محقق نے سنن ابی داود کی تحقیق میں لکھا ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مصنف ابن ابی شیبہ (۳/ ۳۸، حدیث: ۹۱۸۸) میں صحیح سند سے مروی ہے، لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف اور معناً صحیح ہے۔ دیکھیے: (سنن ابوداود (اردو) طبع دارالسلام، حدیث: ۲۳۸۰ کی تحقیق و تخریج) مزید سندی اور تحقیقی بحث کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ۱۶/ ۲۸۴، والإرواء، رقم: ۹۲۳) ② اگر روزے دار کو از خود قے آ جائے تو اس پر قضا نہیں اور اگر وہ جان بوجھ کر قے کرے تو اس پر قضا ہے۔ امام شافعی، امام سفیان ثوری، امام احمد اور امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ دیکھیے: (جامع الترمذي، بعد حديث: ۷۲۰)

(٥٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ إِلٰى مَكَّةَ فِي رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتّٰى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتّٰى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَقِيلَ لَهُ بَعْدَ ذٰلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ، أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ».

[546] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپ نے روزہ رکھا، یہاں تک کہ آپ کُرَاعِ الغَمِيم (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ پھر آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اسے اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا، پھر آپ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے اب بھی روزہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''یہی لوگ نافرمان ہیں، یہی لوگ نافرمان ہیں۔''

وَفِي لَفْظٍ: فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ شَقَّ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ، وَإِنَّمَا يَنْتَظِرُونَ فِيمَا فَعَلْتَ، فَدَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَشَرِبَ. رَوَاهُ

اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں: آپ سے کہا گیا کہ یقیناً روزے نے لوگوں کو مشقت میں ڈال دیا ہے اور وہ صرف آپ کے عمل کا انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے عصر کے

٥٤٦ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان، حديث: ١١١٤.

مُسْلِمٌ.

بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ] نبی اکرم ﷺ ہجرت کے بعد آٹھویں سال ۱۰ رمضان المبارک کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ [كُرَاعَ الْغَمِيمِ] كُرَاعَ کے ''کاف'' پر ضمہ ہے اور ''را'' مخفف ہے اور اَلْغَمِيمِ میں ''غین'' پر فتحہ اور ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے۔ عسفان سے آگے ایک وادی کا نام ہے۔ [دَعَابِقَدَحٍ] پیالہ طلب کیا۔ [فَرَفَعَهُ ......الخ] اسے ہاتھ پر رکھ کر بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں اور روزہ افطار کر لینے کا انھیں علم ہو جائے۔ [أُولٰئِكَ الْعُصَاةُ] عُصَاة، عَاصٍ کی جمع ہے، یعنی نافرمان۔ انھیں نافرمان اس لیے کہا گیا کہ انھوں نے اپنے آپ پر سختی کی اور روزہ افطار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ یمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر کو روزہ رکھنے اور چھوڑنے میں اختیار ہے اور ضرورت لاحق ہونے پر مسافر روزہ افطار بھی کر سکتا ہے، خواہ دن کا اکثر حصہ روزے کی حالت میں گزر چکا ہو۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سفر کے دوران میں مشقت کی صورت میں روزہ افطار کرنا افضل ہے۔

(٥٤٧) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَجِدُ بِي قُوَّةً عَلَى الصِّيَامِ فِي السَّفَرِ، فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّصُومَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو سَأَلَ.

[547] حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں، (اگر میں روزہ رکھ لوں) تو کیا مجھ پر کوئی حرج ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے، جو اسے لے لے تو بہتر ہے اور جو کوئی روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری و مسلم میں یوں مروی ہے کہ حضرت حمزہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سوال کیا۔)

فائدہ: مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کے لیے سفر میں رمضان کا روزہ نہ رکھنا جائز ہے، تاہم دوران سفر میں اس کے لیے روزہ نہ رکھنا افضل اور بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ثابت ہے: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول کیا جائے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے اس کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کیا جائے۔'' (مسند أحمد: ۲/۱۰۸)

راویٔ حدیث: [حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ] حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت ابوصالح یا ابومحمد

٥٤٧ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب التخيير في الصوم والفطر في السفر، حديث: ١١٢١، وأصله في البخاري، الصوم، حديث: ١٩٤٣، ومسلم، الصيام، حديث: ١١٢١ من حديث عائشة رضي الله عنها.

ہے۔ ان سے ان کے فرزند محمد اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ ۶۱ ہجری میں فوت ہوئے' اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس تھی۔

(٥٤٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: رُخِّصَ لِلشَّيْخِ الْكَبِيرِ أَنْ يُفْطِرَ وَيُطْعِمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مِسْكِينًا، وَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ.

[548] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بڑی عمر والے بوڑھے کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے (روزے نہ رکھے) اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [رُخِّصَ] یہ تَرْخِيص سے مجہول کا صیغہ ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو۔ اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ ﷺ نے کی ہو۔ [وَ يُطْعِمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مِسْكِينًا] کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص' جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو' اور اسی طرح علاج سے مایوس مریض یومیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں' نیز یہی حکم حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کا ہے کہ اگر ان کے روزہ رکھنے سے ان کے اپنے بارے میں یا ان کے رحم میں زیر پرورش یا دودھ پیتے بچے کی بابت نقصان کا اندیشہ ہو تو ان کے لیے روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے۔ ② زیادہ بوڑھے مرد وعورت کو ان کی اپنی ذاتی کمزوری کی بنا پر رخصت دی گئی ہے۔ اور حاملہ اور مرضعہ کو رخصت بچوں کے نقصان کے اندیشے کے پیش نظر دی گئی ہے۔ ③ حاملہ اور مرضعہ بعد میں قضا دیں یا نہ دیں اس کی بابت اختلاف ہے۔ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ وہ مریض کے حکم میں ہیں' وہ روزہ چھوڑ دیں' انھیں فدیہ دینے کی ضرورت نہیں' وہ بعد میں قضا دیں' نیز سعودی علماء کی بھی یہی رائے ہے۔ بعض دوسرے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا حکم مایوس مریض کا ہے کہ وہ صرف فدیہ دیں گی' قضا ادا نہیں کریں گی۔ واللّٰه أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (صفة صوم النبي' فتاویٰ اسلامیہ' اردو' طبع دارالسلام: ۲/ ۲۰۳-۲۰۵)

(٥٤٩) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ:

[549] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: اے اللہ

٥٤٨ـ [حسن] أخرجه الدارقطني: ٢/ ٢٠٥، وقال: "هذا إسناد صحيح"، والحاكم: ١/ ٤٤٠ وصححه على شرط البخاري، ووافقه الذهبي.

٥٤٩ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب إذا جامع في رمضان.....، حديث: ١٩٣٦، ومسلم، الصيام، باب تغليظ تحريم الجماع في نهار رمضان على الصائم، حديث: ١١١١، وأبوداود، الصيام، حديث: ٢٣٩٠ ـ ٢٣٩٣، والترمذي، الصوم، حديث: ٧٢٤، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٧١، والنسائي في الكبرٰى: ٢/ ٢١٢، حديث: ٣١١٧، وأحمد: ٢/ ٢٠٨، ٢٤١، ٢٧٣، ٢٨١، ٥١٦.

هَلَكْتُ يَارَسُولَ اللهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَكَ»؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً»؟ قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ»؟ قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّينَ مِسْكِينًا»؟ قَالَ: لَا، ثُمَّ جَلَسَ، فَأُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيهِ تَمْرٌ، فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهٰذَا»، فَقَالَ: أَعَلَى أَفْقَرَ مِنَّا؟ فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَهْلُ بَيْتٍ أَحْوَجُ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «اِذْهَبْ فَأَطْعِمْهُ أَهْلَكَ». رَوَاهُ السَّبْعَةُ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

کے رسول! میں ہلاک ہوگیا۔ آپ نے فرمایا: ''کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟'' اس نے کہا کہ میں رمضان میں (روزے کی حالت میں) اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: ''کیا تجھ میں اتنی استطاعت ہے کہ تو ایک گردن کو آزاد کردے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ (اتنی دیر میں) نبی ﷺ کے پاس ایک بڑا ٹوکرا لایا گیا۔ اس میں کھجوریں تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''انھیں صدقہ کردے۔'' اس نے کہا: کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں؟) کیونکہ دو سیاہ پتھروں والے میدانوں کے مابین (مدینے میں) کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔'' (اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [جَاءَ رَجُلٌ] ایک آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ بن صخر بیاضی تھا۔ [وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي] میں اپنی بیوی پر واقع ہوگیا، یعنی جماع کرلیا۔ حضرت عائشہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ اس آدمی نے کہا: میں نے اس سے وطی کی ہے۔ اور اس کا یہ کہنا کہ هَلَكْتُ ''میں ہلاک ہوگیا'' اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزے کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عمداً یہ حرکت کی، اس لیے اس حدیث سے اس شخص کے متعلق استنباط نہیں کیا جاسکتا جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ [رَقَبَةً] غلام یا لونڈی۔ یہ [مَاتُعْتِقُ] میں مَا کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ [فَأُتِيَ] صیغۂ مجہول ہے۔ نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ [بِعَرَقٍ] ''عین'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ ہے۔ بڑا ٹوکرا۔ [فِيهِ تَمْرٌ] جس میں پندرہ صاع، یعنی ساٹھ مد کھجوریں تھیں۔ [أَعَلٰى أَفْقَرَ] أَعَلٰى میں ہمزہ استفہام ہے اور عَلٰى حرف جر ہے، یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے گھر والوں سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ [فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا] میں لَابَتَيْهَا، لَابَة کا تثنیہ ہے اور ''با'' پر فتحہ ہے، یعنی وہ زمین جس میں سیاہ بوسیدہ پتھر ہوں، یوں محسوس ہو کہ جیسے اسے آگ نے جلایا ہو۔ اور ''ھا'' کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف راجع ہے۔ اور لَابَتَان سے دو مشہور

ومعروف حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غربی جانب ہیں۔ایک کا نام حَرَّةُ الْوَاقِم اور دوسرے کا حَرَّةُ الْوَبْرَہ ہے۔اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقع ہے' لہٰذا لَابَتَین سے مراد مدینہ منورہ ہے' یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔[أَنْيَابُهُ] یہ نَابٌ کی جمع ہے۔اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو رباعی کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔اور رباعی، ثنایا کے ساتھ والے دانتوں کو کہتے ہیں۔اور ثنایا کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سامنے والے دو دو دانتوں پر ہوتا ہے۔[أَطْعِمْهُ أَهْلَكَ] یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے امام اوزاعی رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ تنگ دست پر کفارہ نہیں۔مگر امام مالک' امام شافعی' امام ابوحنیفہ' امام ثوری اور امام ابوثور رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال درست نہیں' کفارہ جب میسر ہو بہرنوع ادا کیا جائے گا۔ نبی ﷺ نے اس سے کفارے کا ذکر کیا۔تنگ دستی کی بنا پر کھجوریں اسے بطور صدقہ کے دیں' کفارہ کے طور پر نہیں۔اس حدیث میں قطعاً ذکر نہیں کہ نبی ﷺ نے اس سے کفارے کو ساقط قرار دیا ہے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو کفارے کے سقوط کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ ② اس حدیث میں گو روزے کی قضا ادا کرنے کا حکم نہیں مگر دوسری احادیث میں قضا کا حکم موجود ہے جیسا کہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں ہے: [وَصُمْ يَوْمًا مَكَانَهُ] ''اس کی جگہ ایک روزہ رکھ لینا۔'' شیخ البانی رحمہ اللہ اس جملے کی بابت لکھتے ہیں کہ اس روایت کے تمام طرق سامنے رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔ دیکھیے: (إرواء الغليل: ۴/۸۸-۹۳' رقم:۹۳۹) اس بنا پر ائمۂ اربعہ اور جمہور علماء ایسی صورت میں مرد وزن دونوں کے لیے روزہ رکھنے کے قائل ہیں۔اور احتیاط اور تقویٰ اسی میں ہے کہ جو روزہ توڑا گیا ہے اس کے بدلے میں روزہ رکھ کر مہینے کی تعداد پوری کی جائے' تاہم اگر عورت روزہ دار نہ ہو تو اس پر قضا نہیں۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے اور اس سے ایک ہزار فوائد ومسائل کا استنباط کیا ہے۔

(۵۵۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصْبِحُ جُنُبًا مِنْ جِمَاعٍ ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ : وَلَا يَقْضِي .

[550] حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جماع کی وجہ سے جنابت کی حالت میں صبح کرتے' پھر آپ غسل کرتے اور روزہ رکھتے۔(بخاری ومسلم) اور مسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ زائد الفاظ نقل کیے ہیں: قضا نہیں دیتے تھے۔

فائدہ: مذکورہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنبی آدمی پر غسل سے پہلے صبح ہو جائے تو روزہ درست ہے۔جمہور اسی کے قائل ہیں بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معارض مسند امام احمد وغیرہ میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کسی پر حالت جنابت میں صبح ہو جائے تو روزہ نہ رکھے' اس کے بارے میں جمہور نے کہا

۵۵۰۔ أخرجه البخاري، الصوم، باب الصائم يصبح جنبًا، حديث: ۱۹۲۵، ۱۹۲۶، ومسلم، الصيام، باب صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب، حديث: ۱۱۰۹.

ہے کہ وہ منسوخ ہے اور خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (جو ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنے کے قائل تھے) نے جب یہ حدیث سنی تو انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (سبل السلام وغیرہ)

(٥٥١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَّاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[551] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزہ لازم ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [وَ عَلَيْهِ صِيَامٌ] یعنی اس کے ذمے لازم و واجب روزہ ہو۔ کیونکہ عَلٰی کا لفظ وجوب کے لیے ہے۔ [صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ] اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی، یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہیے اور روزے میں نیابت جائز ہے۔ اور جن حضرات نے کہا ہے کہ روزے میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ راجح یہی ہے کہ روزے میں نیابت ہے۔

فائدہ: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزے میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزے میں بھی نیابت جائز ہے اور یہی بات راجح ہے، نیز یہ بھی لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے، کوئی دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے جیسے کہ حج میں ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل السلام)

١ - بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ، وَمَا نُهِيَ عَنْ صَوْمِهِ

باب: 1- نفلی روزوں اور ان دنوں کا بیان جن میں روزہ رکھنا منع کیا گیا ہے

(٥٥٢) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ، فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ، فَقَالَ: «ذٰلِكَ يَوْمٌ وُلِدْتُّ

[552] حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرفہ (۹ ذوالحج) کے دن کا روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''(یہ روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔'' اور آپ سے عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔''

٥٥١ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب من مات وعليه صوم، حديث: ١٩٥٢، ومسلم، الصيام، باب قضاء الصيام عن الميت، حديث: ١١٤٧.

٥٥٢ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب استحباب صيام ثلاثة أيام من كل شهر، حديث: ١١٦٢.

فِيهِ، وَبُعِثْتُ فِيهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور آپ سے سوموار کا روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''میں اسی دن میں پیدا ہوا' اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَوْمِ عَرَفَةَ] عرفہ کا دن' ذوالحجہ کا نواں دن ہوتا ہے۔ جو شخص میدان عرفات میں نہ ہو اس کے لیے اس دن کا روزہ رکھنا مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمۂ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کے لیے روزہ غیر مستحب یا مکروہ ہے۔ [يُكَفِّرُ] یہ تکفیر سے ہے' یعنی اس کی برکت سے گزشتہ اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ ان گناہوں سے صرف صغیرہ گناہ مراد ہیں یا صغیرہ اور کبیرہ تمام گناہ؟ اس مسئلے کی بابت اہل علم کا اختلاف معروف ہے اور فریقین اپنے اپنے موقف کے دلائل بھی رکھتے ہیں' تاہم اس حدیث شریف سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر قسم کے گناہ' خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ معاف فرما دیتا ہے۔ واللّٰه أعلم. [يَوْمِ عَاشُورَاءَ] عاشورہ کا دن محرم الحرام کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ یہود اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمن سے نجات پانے کی وجہ سے روزہ رکھتے تھے۔ آپ نے بھی اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی اور اس کے ساتھ ایک اور روزہ ملا لینے کا حکم فرمایا۔ اس کے لیے دن کی تعیین کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث: ''یہود کی مخالفت کرو' ان سے ایک دن پہلے یا بعد روزہ رکھو'' تو ضعیف ہے' تاہم حضرت ابن عباس ہی سے موقوفاً مروی ہے: ''یہود کی مخالفت کرو' نو اور دس کا روزہ رکھو'' علمائے محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے' لہٰذا بہتر اور راجح موقف یہی ہے کہ دس کے ساتھ نو کا روزہ رکھا جائے' تاہم اگر نو کا روزہ نہ رکھ سکے تو مخالفت یہود کے پیش نظر دس کے ساتھ گیارہ کا روزہ بھی ان شاء اللہ مقبول ہوگا۔ واللّٰه أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ۴/ ۵۲) اور سوموار کا روزہ رکھنے کے بارے میں آپ نے جو فرمایا ہے' وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو' بطور تشکر وتقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور اس میں قرب الٰہی کے حصول والے کام کیے جاسکتے ہیں۔ سوموار کا روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے' آپ نے فرمایا: ''اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کیے جاتے ہیں' اس لیے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش کیے جائیں۔'' (جامع الترمذي' الصوم' باب ماجاء في صوم يوم الاثنين والخميس' حديث: ۷۴۷)

(۵۵۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ، كَانَ

[553] حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص رمضان کے روزے رکھے' پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو یہ (عمل)

۵۵۳ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال، حديث: ۱۱۶۴.

كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

سارے سال کے روزے رکھنے کی مانند ہوگا۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [ثُمَّ أَتْبَعَهُ] یعنی رمضان کے بعد روزے رکھے۔ [سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ] شوال کے چھ روزے' خواہ یہ شوال کے آغاز میں رکھے یا درمیان میں یا آخر میں اور خواہ متواتر رکھے یا متفرق۔ [كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ] گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔ یہ اس لیے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے' چنانچہ رمضان کے تیس روزے دس ماہ کے برابر اور شوال کے چھ روزے دو ماہ کے برابر ہو گئے۔

(٥٥٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللهِ إِلَّا بَاعَدَ اللّٰهُ بِذٰلِكَ الْيَوْمِ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ سَبْعِينَ خَرِيفًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[554] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے' اللہ تعالیٰ اس کے چہرے سے ستر سال کے لیے جہنم کی آگ کو دور کر دیتا ہے۔'' (بخاری و مسلم - یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [فِي سَبِيلِ اللّٰهِ] اللہ کی راہ میں' جب یہ لفظ مطلقاً بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے' یعنی جہاد کے دوران میں جو مجاہد ایک دن روزہ رکھتا ہے' اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی۔ لیکن یہ تب ہے کہ روزہ رکھنے سے کمزوری نہ آئے جو جہاد پر اثر انداز ہو' اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آ جائے اور جہاد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ خریفًا سے مراد ایک سال ہے۔

(٥٥٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ حَتّٰى نَقُولَ لَا يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتّٰى نَقُولَ لَا يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ اِسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلَّا رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِي شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[555] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپ کبھی افطار نہیں کریں گے۔ اور آپ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے: اب آپ روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے رمضان کے سوا کبھی کسی دوسرے مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں۔ اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم- یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

٥٥٤_ أخرجه البخاري، الجهاد، باب فضل الصوم في سبيل الله، حديث: ٢٨٤٠، ومسلم، الصيام، باب الصيام في سبيل الله لمن يطيقه، حديث: ١١٥٣.

٥٥٥_ أخرجه البخاري، الصوم، باب صوم شعبان، حديث: ١٩٦٩، ومسلم، الصيام، باب صيام النبي ﷺ في غير رمضان، حديث: ١١٥٦.

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم وبیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مصروفیات اور مشاغل کی بنا پر کئی دن روزہ نہ رکھتے' البتہ آپ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے شعبان میں رکھتے تھے۔

(٥٥٦) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ: ثَلَاثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[556] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ہر ماہ تیرہ' چودہ اور پندرہ (تاریخ) کو تین دن کے روزے رکھیں۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔)

(٥٥٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلَّا بِإِذْنِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «**غَيْرَ رَمَضَانَ**».

[557] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ (نفلی) روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو' الا یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔'' (بخاری ومسلم- یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔) ابوداود نے ''سوائے رمضان'' کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزے سے مقدم ہے۔ ② نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے' البتہ فرضی روزے کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ فرض کی ادائیگی بہرنوع مقدم ہے۔

(٥٥٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[558] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا: عیدالفطر کے دن کا اور قربانی کے دن کا۔ (بخاری ومسلم)

(٥٥٩) وَعَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ

[559] حضرت نُبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول

٥٥٦ـ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، الصوم، باب ما جاء في صوم ثلاثة أيام من كل شهر، حديث: ٧٦١، وقال: حديث حسن، والنسائي، الصيام، حديث: ٢٤٢٤، وابن حبان (الإحسان): ٥/ ٢٦٤، حديث: ٣٦٤٨.

٥٥٧ـ أخرجه البخاري، النكاح، باب صوم المرأة بإذن زوجها تطوعًا، حديث: ٥١٩٢، ومسلم، الزكاة، باب ما أنفق العبد من مال مولاه، حديث: ١٠٢٦، وأبوداود، الصيام، حديث: ٢٤٥٨.

٥٥٨ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب صوم يوم النحر، حديث: ١٩٩٥، ومسلم، الصيام، باب النهي عن صوم يوم الفطر ويوم الأضحى، حديث: ٨٢٧- (٢٦٧٣).

٥٥٩ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب تحريم صوم أيام التشريق.....، حديث: ١١٤١.

تعالٰى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أيام التشريق أيام أكل وشرب وذكر الله عزوجل». رواه مسلم.

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تشریق کے دن کھانے، پینے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دن ہیں۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَيَّامُ التَّشْرِيقِ] تشریق کے دن۔ یوم النحر کے بعد یہ تین دن ہوتے ہیں۔ اور یوم النحر دس ذوالحجہ کو کہتے ہیں، یعنی جس دن قربانی کی جاتی ہے۔ [أَيَّامُ أَكْلٍ وَّشُرْبٍ] کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت نبیشہ ؓ] تصغیر کے ساتھ ہے۔ نام ونسب یوں ہے: نبيشة بن عبدالله بن عمرو بن عتاب الهذلي. هذلي کی ''ہا'' پر ضمہ اور ''ذال'' پر فتحہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انھیں نُبَيْشَةُ الْخَيْر کہا جاتا تھا۔

(٥٦٠) وعن عائشة وابن عمر رضي الله تعالٰى عنهم قالا: لم يرخص في أيام التشريق أن يصمن إلا لمن لم يجد الهدي. رواه البخاري.

[560] حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر ؓ فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَمْ يُرَخَّصْ] یہ صیغۂ مجہول ہے۔ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا: ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہ اور ابن عمر ؓ) نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو جس میں ہے: ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ (البقرة ۲:۱۹۶) ''پھر جو شخص قربانی نہ پائے تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھے۔'' [أَنْ يُّصَمْنَ] یہ بھی صیغۂ مجہول ہے۔ [إِلَّا لِمَنْ لَّمْ يَجِدِ الْهَدْيَ] سوائے اس شخص کے جو ہدی نہ پائے۔ هدي کی ''ہا'' پر فتحہ اور ''دال'' ساکن ہے۔ یہ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

فائدہ: جو شخص حج تمتع یا حج قران کرنے والا ہو یا محصر ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کے لیے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں، یہ قول سلف وخلف کی اکثریت کا ہے۔ ان کی دلیل یہی حدیث اور اس کی مؤید دوسری روایات ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا بالکل حرام ہے۔ اس کی حرمت مطلقاً ہے کیونکہ یہ حدیث صریحی طور پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں صراحت کے ساتھ مرفوع روایات آئی ہیں وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

(٥٦١) وعن أبي هريرة رضي الله تعالٰى

[561] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ

٥٦٠ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب صيام أيام التشريق، حديث: ١٩٩٧.

٥٦١ـ أخرجه مسلم، الصيام، باب كراهة صيام يوم الجمعة منفردًا، حديث: ١١٤٤.

عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِّنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلَا تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِّنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ، إِلَّا أَنْ يَّكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نے فرمایا: ''دوسری راتوں میں سے جمعے کی رات کو قیام کرنے کے لیے مخصوص نہ کرو اور نہ دوسرے دنوں ہی میں سے جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مختص کرو' سوائے اس کے کہ جمعہ ایسے دن میں آ جائے کہ جس دن کا روزہ تم میں سے کوئی شخص رکھتا چلا آ رہا ہو۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① [لَا تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ] یعنی صرف جمعے کے دن کو روزے کے لیے مختص نہ کرو' اس لیے کہ جمعے کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حسن سند والی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہت کم جمعے کا روزہ چھوڑتے تھے۔ (جامع الترمذي' الصوم' باب ماجاء في صوم يوم الجمعة' حديث:٧٤٢) مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ ② یاد رہے کہ نبی ﷺ نے بلاریب جمعے کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعے میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا بالکل ناجائز ہے' کسی طرح بھی جائز نہیں حتی کہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد والے دن میں روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں ہوتا کیونکہ آپ نے عید کے دن روزہ رکھنے سے مطلقاً منع فرمایا ہے جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ ﷺ نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کے بعد والی حدیث میں آ رہا ہے۔

(٥٦٢) وَعَنْهُ أَيْضًا رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا أَنْ يَّصُومَ يَوْمًا قَبْلَهُ، أَوْ يَوْمًا بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[562] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی جمعے کے دن روزہ نہ رکھے' الا یہ کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھے۔'' (بخاری و مسلم)

(٥٦٣) وَعَنْهُ أَيْضًا رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُومُوا». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَحْمَدُ.

[563] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب شعبان آدھا گزر جائے تو روزہ نہ رکھو۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے منکر کہا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ ممانعت اس لیے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو

٥٦٢ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب صوم يوم الجمعة، حديث: ١٩٨٥، ومسلم، الصيام، باب كراهة صيام يوم الجمعة منفردًا، حديث: ١١٤٤.

٥٦٣ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، الصوم، باب في كراهية ذلك، حديث: ٢٣٣٧، والترمذي، الصوم، حديث: ٧٣٨، وأحمد: ٢/ ٤٤٢، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٦٥١، والنسائي في الكبرٰى: ٢/ ١٧٢، حديث: ٢٩١١.

جائے اور رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے لیے قوت بحال رہے۔ یہ نہی تنزیہی ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ ② امام احمد رحمہ اللہ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبدالرحمٰن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ ③ اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عادتاً رکھے جاتے ہیں، مثلاً: جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو اس کے لیے نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں میں روزہ رکھنا جائز ہے۔ مزید تفصیل کے لیے فتح الباری وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔

(٥٦٤) وَعَنِ الصَّمَّاءِ بِنْتِ بُسْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَصُومُوا يَوْمَ السَّبْتِ إِلَّا فِيمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ لَّمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلَّا لِحَاءَ عِنَبٍ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ، فَلْيَمْضُغْهَا». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ، وَقَدْ أَنْكَرَهُ مَالِكٌ. وَقَالَ أَبُودَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ.

[564] حضرت صماء بنت بسر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہفتے کے دن کا روزہ نہ رکھو، سوائے اس روزے کے جو تم پر فرض کیا گیا ہو۔ چنانچہ ہفتے کے دن اگر تمھیں انگور کا چھلکا یا کسی درخت کی لکڑی میسر آئے تو اسے ہی چبا لو۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں اضطراب ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے۔ اور ابوداود نے کہا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔)

لغوی تشریح: [لِحَاءَ عِنَبٍ] لحاء کے ''لام'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور آخر میں مد ہے۔ اس کے معنی ہیں: چھلکا۔ اور العنب کی ''عین'' کے نیچے زیر اور ''نون'' پر فتحہ ہے۔ مشہور پھل انگور کو عنب کہتے ہیں۔ [فَلْيَمْضُغْهَا] یہ باب نَصَرَ اور فَتَحَ دونوں سے آتا ہے، یعنی اسے کھا لے اور اس سے روزہ توڑ لے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہفتے کے دن روزے کی یہ ممانعت اس لیے ہے کہ یہود ہفتے کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت صماء بنت بسر رضی اللہ عنہا] صماء میں ''صاد'' پر زبر اور ''میم'' مشدد ہے۔ ان کا نام بُهَيَّه تھا اور بہیہ کی ''با'' پر پیش، ''ہا'' مفتوح اور ''یا'' مشدد ہے۔ اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بُهَيْمَه (میم کے اضافے کے ساتھ) تھا۔ بسر کی ''با'' پر پیش اور ''را'' ساکن ہے۔ قبیلۂ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبداللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(٥٦٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[565] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول

٥٦٤۔ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصوم، باب النهي أن يخص يوم السبت بصوم، حديث: ٢٤٢١، والترمذي، الصوم، حديث: ٧٤٤، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٧٢٦، وأحمد: ٤/ ١٨٩، ٦/ ٣٦٨، والنسائي في الكبرٰى: ٢/ ١٤٣، حديث: ٢٧٦٠.

٥٦٥۔ [إسناده حسن] أخرجه النسائي في الكبرٰى، حديث: ٢٧٧٥، وابن خزيمة: ٣/ ٣١٨، حديث: ٢١٦٧، وابن حبان ◄◄

عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَكْثَرَ مَا كَانَ يَصُومُ مِنَ الْأَيَّامِ، يَوْمُ السَّبْتِ، وَيَوْمُ الْأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَهُمْ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ.

اللہ ﷺ ہفتے اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔'' (اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں۔)

فائدہ: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتے کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناسخ یہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتے اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لیے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے کیونکہ یہود ہفتے کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں کیونکہ عید کے دن روزہ رکھنا منع ہوتا ہے۔

(٥٦٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ الْعُقَيْلِيُّ.

[566] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عرفات میں عرفے کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے جبکہ امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے۔)

فوائد و مسائل: ① اسے امام عقیلی رحمہ اللہ نے منکر اس لیے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مہدی بن حرب ہجری سے روایت کی ہے۔ عقیلی نے کہا ہے کہ حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ اور اس سے بیان کرنے والا راوی بھی مختلف فیہ ہے۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثین رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ بھی تقریب التہذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے' البتہ مہدی ہجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرك میں ان کی تائید کی ہے۔ اور اسے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''مقبول'' کہا ہے۔ اور اس سے بیان کرنے والا راوی حوشب بن عبدل ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں ثقہ کہا ہے۔ ② یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی' وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر

◄◄ (الموارد): ٩٤١، والحاكم: ١/ ٤٣٦.

٥٦٦ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، الصوم، باب في صوم يوم عرفة بعرفة، حديث: ٢٤٤٠، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٣٠٠٧، وابن ماجه، الصيام، حديث: ١٧٣٢، وأحمد: ٢/ ٣٠٤، والحاكم: ١/ ٤٣٤، وابن خزيمة: ٣/ ٢٩٢، حديث: ٢١٠١.

ﷺ کی حدیث سے ہوتی ہے: ''یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے۔'' یعنی اہل عرفہ کے لیے یہ دن عید کا ہے۔ (سنن النسائي، الحج، باب النهي عن صوم يوم عرفة، حديث:٣٠٠٧) اس لیے انھیں اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت ہے، البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ ③ نبی ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(٥٦٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ بِلَفْظِ: «لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ».

[567] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس نے روزہ نہیں رکھا۔'' (بخاری ومسلم) اور مسلم میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں: ''اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا۔''

لغوی تشریح: [لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ] اس سے ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے۔ اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ یہ طریقہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔ [لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ] یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے۔ اور ''نہ افطار کیا'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا اور روزے میں جن چیزوں سے رکا جاتا ہے، اس نے ان چیزوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو روزے دار سمجھتا رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا ناجائز اور حرام ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

٢ - بَابُ الْاِعْتِكَافِ وَقِيَامِ رَمَضَانَ

باب:2-اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان

(٥٦٨) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[568] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [بَابُ الْاِعْتِكَافِ] اعتکاف کے لغوی معنی روکنے، بند کرنے، ٹھہرنے اور لازم رہنے کے ہیں۔ اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا۔ اور قیام رمضان سے مراد رات کو نماز یا قرآن

٥٦٧ـ أخرجه البخاري، الصوم، باب حق الأهل في الصوم، حديث:١٩٧٧، ومسلم، الصيام، باب النهي عن صوم الدهر لمن تضرر به، حديث:١١٥٩، وحديث أبي قتادة أخرجه مسلم، الصيام، حديث:١١٦٢.

٥٦٨ـ أخرجه البخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، حديث:٢٠٠٨، ومسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان، حديث:٧٥٩.

پاک کی تلاوت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہنا ہے۔ اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ [إِیْمَانًا] مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کے وعدے پر یقین رکھتے ہوئے۔ اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اپنے ایمان کی وجہ سے قیام کرتا ہے، یعنی اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریا و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ [اِحْتِسَابًا] یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے قیام کرتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کس قدر عظیم اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ② نبی ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپ نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (قیام اللیل للمروزي' کتاب قیام رمضان' ص:١٥٥' طبع المکتبة الأثریة' سانگلہ ھل) اس لیے سنت نبوی تو بہر نوع گیارہ رکعت ہی ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر : ۱/۳۳۴)

(٥٦٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ، - أَيِ الْعَشْرُ الْأَخِيرَةُ مِنْ رَمَضَانَ - شَدَّ مِئْزَرَهُ، وَأَحْيَا لَيْلَهُ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[569] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے، رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [شَدَّ مِئْزَرَهُ] مِئْزَر کی ''میم'' کے نیچے کسرہ اور ''ہمزہ'' ساکن ہے، یعنی اپنی چادر مضبوطی سے باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپ عبادت کے لیے کمربستہ ہو جاتے، اس کے لیے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبادت کی وجہ سے اپنی ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ [وَأَحْيَا لَيْلَهُ] یعنی نماز وغیرہ میں ساری رات بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ [وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ] اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کے لیے نیند سے اٹھاتے۔

(٥٧٠) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[570] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ وفات پانے تک رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کرتے رہے، پھر آپ کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔ (بخاری و مسلم)

٥٦٩ـ أخرجه البخاري، فضل ليلة القدر، باب العمل في العشر الأواخر من رمضان، حديث: ٢٠٢٤، ومسلم، الاعتكاف، باب الاجتهاد في العشر الأواخر من شهر رمضان، حديث: ١١٧٤.

٥٧٠ـ أخرجه البخاري، الاعتكاف، باب اعتكاف النساء، حديث: ٢٠٣٣، ومسلم، الاعتكاف، باب متى يدخل من أراد◄◄

فائدہ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ نبی ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل السلام)

(٥٧١) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّعْتَكِفَ، صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[571] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے اور پھر اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [صَلَّى الْفَجْرَ] صبح کی نماز پڑھتے' اکیس رمضان کی نماز فجر مراد ہے۔ [ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ] اسم ظرف کا صیغہ ہے' یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ۔ نماز فجر کے بعد آپ اس جگہ میں سب سے منقطع ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتے' یہ مطلب نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کی ابتدا کا ہے بلکہ اعتکاف کے لیے تو آپ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے' جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ امام نووی ؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لیے ضروری ہے کہ اس حدیث اور بعد والی احادیث میں تطبیق دی جا سکے جس میں یہ وضاحت ہے کہ آپ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(٥٧٢) وَعَنْهَا رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: إِنْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَيُدْخِلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، - وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ - فَأُرَجِّلُهُ، وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةٍ، إِذَا كَانَ مُعْتَكِفًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[572] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بحالت اعتکاف مسجد سے اپنا سر مبارک میرے آگے کر دیتے' میں آپ کو کنگھی کر دیتی تھی۔ اور جب آپ اعتکاف میں ہوتے تو گھر میں بلا ضرورت تشریف نہ لاتے۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [إِنْ كَانَ] إِنْ حرف تاکید ہے اور یہ إِنَّ ثقیلہ سے خفیفہ ہوا ہے جسے اَلْمُخَفَّفَه مِنَ الْمُثَقَّلَه کہتے ہیں۔ اصل کلام إِنَّهُ كَانَ تھا۔ [لَيُدْخِلُ] إِدْخَال سے ہے' یعنی داخل کرتے۔ [عَلَيَّ] "یا" مشددہ ہے' یعنی میری جانب۔ [فَأُرَجِّلُهُ] آپ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی' تیل لگاتی۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے' اس سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔ اور آدمی اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ [إِلَّا لِحَاجَةٍ] مگر ضروری حاجت کے لیے۔ اس سے بول و براز' غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ

◀◀ الاعتكاف في معتكفه، حديث: ١١٧٣.

٥٧١ـ أخرجه البخاري، الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الأواخر، حديث: ٢٠٢٦، ومسلم، الاعتكاف، باب اعتكاف العشر الأواخر من رمضان، حديث: ١١٧٢.

٥٧٢ـ أخرجه البخاري، الاعتكاف، باب لا يدخل البيت إلا لحاجة، حديث: ٢٠٢٩، ومسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله، حديث: ٢٩٧.

مراد ہے جو مسجد میں نہیں کیے جا سکتے۔

(٥٧٣) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ أَنْ لَّا يَعُودَ مَرِيضًا، وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً، وَلَا يَمَسَّ امْرَأَةً، وَلَا يُبَاشِرَهَا، وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ إِلَّا لِمَا لَابُدَّ لَهُ مِنْهُ، وَلَا اعْتِكَافَ إِلَّا بِصَوْمٍ. وَلَا اعْتِكَافَ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَلَا بَأْسَ بِرِجَالِهِ، إِلَّا أَنَّ الرَّاجِحَ وَقْفُ آخِرِهِ.

[573] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی بیمار پرسی کرے نہ جنازے میں شرکت کرے‘ عورت کو ہاتھ لگائے نہ اس سے مباشرت کرے اور انتہائی ضروری کام کے بغیر مسجد میں سے نہ نکلے‘ نیز روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہے اور جامع مسجد کے علاوہ کہیں اعتکاف نہیں۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں کوئی خلل نہیں لیکن راجح یہ ہے کہ اس کے آخری الفاظ موقوف ہیں۔)

لغوی تشریح: [أَنْ لَّا يَعُودَ] یہ عیادت سے ماخوذ ہے‘ یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کے لیے نہ نکلے‘ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ [وَلَا يَمَسَّ امْرَأَةً] یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگائے۔ [وَلَا يُبَاشِرَهَا] اور نہ اس سے جماع کرے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''مس'' سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ۔ [وَلَا اِعْتِكَافَ إِلَّا بِصَوْمٍ] اور روزے کے بغیر اعتکاف نہ کرے۔ [مَسْجِدٍ جَامِعٍ] وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ [إِلَّا أَنَّ الرَّاجِحَ وَقْفُ آخِرِهِ] یعنی آخری جملہ وَلَا اِعْتِكَافَ إِلَّا بِصَوْمٍ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا: مرفوع حدیث صرف لَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے۔ (فتح الباري) اور یہاں فرمایا ہے کہ آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ (سبل السلام) امام ابوداود رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عبدالرحمن بن اسحاق کے علاوہ کوئی بھی اَلسُّنَّةُ کے الفاظ بیان نہیں کرتا‘ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ سنت ہے۔ اور انھوں نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول قرار دیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہے جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے متابعات کی بنا پر حسن قرار دیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ دیکھیے: (إرواء الغليل، رقم: ٩٦٦‘ وصحيح سنن أبي داود (مفصل) للألباني‘ رقم: ٢١٣٥) اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے۔ واللّٰه أعلم. ② اعتکاف بہر نوع مسجد میں ہونا چاہیے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کے لیے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہیے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ ③ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ جو علماء مذکورہ روایت کے الفاظ [لَا اِعْتِكَافَ.....] کو مدرج اور موقوف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اعتکاف کے لیے روزہ شرط نہیں ہے‘ البتہ جو علماء اسے مرفوعاً حسن قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک روزہ شرط ہے اور یہی

٥٧٣ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، الصوم، باب المعتكف يعود المريض، حديث: ٢٤٧٣. * الزهري مدلس وعنعن.

رائے راجح معلوم ہوتی ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٥٧٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلَّا أَنْ يَجْعَلَهُ عَلٰى نَفْسِهِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضًا.

[574] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الا یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔'' (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کا بھی موقوف ہونا ہی راجح ہے۔)

فائدہ: مذکورہ روایت میں ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لیے روزہ رکھنا شرط نہیں' اس سے مراد نذر کا اعتکاف ہے جو رمضان کے علاوہ ہو کیونکہ رمضان میں تو روزہ ویسے ہی فرض ہے' لہٰذا رمضان میں اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٥٧٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رِجَالًا مِّنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ، فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**أَرٰى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[575] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کے کچھ صحابہ کو آخری سات راتوں میں شب قدر دکھائی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری رائے یہ ہے کہ تمھارے خواب اس پر موافق ہیں کہ وہ آخری سات راتوں میں ہے۔ پس اگر کوئی شخص اسے تلاش کرنا چاہے تو وہ اسے آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أُرُوا] إِرَاءَةٌ سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے۔ [فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ] اس سے آخری سات دن مراد ہیں جن کی ابتدا تیئیس کی رات سے ہوتی ہے۔ [أُرٰى] یہ صیغۂ مجہول ہے جو أُظُنُّ کے معنی میں ہے اور أَظُنُّ صیغۂ معلوم ہے۔ اس کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ [تَوَاطَأَتْ] کے معنی موافقت کے ہیں۔ [مُتَحَرِّيهَا] جو اس کا طالب ہو۔ یہ اَلتَّحَرِّي سے ماخوذ ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہیں۔

(٥٧٦) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ

[576] حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب قدر کے بارے میں فرمایا: ''یہ

٥٧٤_ [ضعيف] أخرجه الدارقطني: ٢/ ١٩٩، والحاكم: ١/ ٤٣٩ وهو شاذ، انظر السنن الكبرٰى للبيهقي: ٤/ ٣١٩، والموقوف هو الصحيح.

٥٧٥_ أخرجه البخاري، فضل ليلة القدر، باب التماس ليلة القدر في السبع الأواخر، حديث: ٢٠١٥، ومسلم، الصيام، باب فضل ليلة القدر .....، حديث: ١١٦٥.

٥٧٦_ [حسن] أخرجه أبوداود، الصلاة، باب من قال سبع وعشرون، حديث: ١٣٨٦.

الْقَدْرِ: «لَيْلَةُ سَبْعٍ وَّعِشْرِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

ستائیس کی رات ہے۔" (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ راجح ہے۔)

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِي تَعْيِينِهَا عَلَى أَرْبَعِينَ قَوْلًا، أَوْرَدْتُّهَا فِي فَتْحِ الْبَارِي.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے اور اس بارے میں چالیس اقوال ہیں جنھیں میں نے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: [وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ] یعنی راجح یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں' البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ [وَقَدِ اخْتُلِفَ فِي تَعْيِينِهَا ...... الخ] اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چالیس اقوال نقل کیے ہیں مگر ان میں راجح اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس' کبھی تئیس' کبھی پچیس' کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو آتی ہے۔ اور جن روایات میں بڑے جزم اور پختگی سے تعین کا ذکر ہے' جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تئیس کا ذکر ہے تو یہ اس لیے کہ جس سال آپ نے یہ حدیث سنائی اس سال اسی رات شب قدر تھی' یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(٥٧٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ، مَا أَقُولُ فِيهَا؟ قَالَ: «**قُولِي: اَللّٰهُمَّ! إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّي**». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ أَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

[577] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے بتلائیں کہ اگر میں جان لوں کہ شب قدر کون سی ہے تو میں اس میں کیا دعا کروں؟ آپ نے فرمایا: "یوں کہنا: [اَللّٰهُمَّ! إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ الْعَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّي] "اے اللہ! بے شک تو بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے' تو معاف کرنا پسند کرتا ہے' لہٰذا مجھے معاف فرما دے۔" (اسے ابوداود کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَرَأَيْتَ] آپ مجھے بتلائیں۔ یہ أَخْبِرْنِي کے معنی میں ہے۔ [أَيُّ لَيْلَةٍ] مفعول ہونے کے اعتبار سے أَيَّ پر نصب اور مبتدا ہونے کی بنا پر ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہوگی اور یہ پورا جملہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہوگا۔ [عَفُوٌّ] "عین" پر زبر اور "واو" مشدد ہے' یعنی بہت درگزر کرنے والا' بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

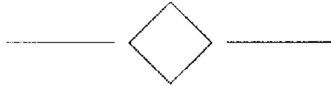
٥٧٧۔ [صحيح] أخرجه الترمذي، الدعوات، باب ٨٥، حديث: ٣٥١٣ وقال: "حسن صحيح"، وابن ماجه، الدعاء، حديث: ٣٨٥٠، وأحمد: ٦/ ١٧١، والحاكم: ١/ ٥٣٠، والنسائي في الكبرى، حديث: ٨٧٢ وغيره.

(٥٧٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هٰذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[578] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین مسجدوں کے سوا کسی اور کی طرف رخت سفر نہ باندھا جائے: مسجد حرام' میری یہ مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ] مجہول کا صیغہ ہے اور اس میں احتمال ہے کہ یہ فعل نفی ہو یا فعل نہی۔ اَلرِّحَال رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں' جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے۔ اور کجاوے باندھنا استعمال کر کے سفر سے کنایہ کیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر سفر کے لیے ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ حصول برکت وفضیلت کی نیت سے سفر نہ کیا جائے۔ اور ایک روایت میں لَا تَشُدُّوا یعنی نہی کا صیغہ جمع مذکر ہے۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر نیک اور صالح لوگوں کی زیارت کرنا' خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ ② تبرک کی تخصیص اس لیے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے' اس لیے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مختص ہے' البتہ دوسرے اغراض ومقاصد کے لیے سفر کرنا جائز ہے بلکہ بسا اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ مطول کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ③ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف وفضل پر دلالت کرتی ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے' وہاں عبادت اور ذکر وتلاوت کی مقدور بھر کوشش کی جائے۔



٥٧٨ـ أخرجه البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، باب مسجد بيت المقدس، حديث: ١١٩٧، ومسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: ٨٢٧ - (٣٢٦١).

٦ - كِتَابُ الْحَجِّ

حج سے متعلق احکام ومسائل

١ - بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانِ مَنْ فُرِضَ عَلَيْهِ

باب:1- حج کی فضیلت وفرضیت کا بیان

(٥٧٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[579] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کے مابین گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [كِتَابُ الْحَجِّ] ''حا'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں، جس کے لغوی معنی ہیں: قصد کرنا۔ لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف کثرت سے قصد کرنا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے۔ حج بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی جبکہ بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ [اَلْعُمْرَةُ] لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد وارادہ کے کیے ہیں۔ اور اصطلاح

٥٧٩ـ أخرجه البخاري، العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها، حديث: ١٧٧٣. ومسلم، الحج، باب في فضل الحج والعمرة ويوم عرفة، حديث: ١٣٤٩.

شریعت میں اس سے مراد احرام، طواف، سعی صفا و مروہ، سر منڈوانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھی مذکورہ اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ (سبل السلام) [اَلْحَجُّ الْمَبْرُورُ] اس سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے۔ اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کیے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

(٥٨٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «**نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَاقِتَالَ فِيهِ؛ اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ.

[580] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، ان پر ایسا جہاد ہے جس میں لڑائی وغیرہ نہیں ہوتی۔ وہ حج اور عمرہ ہے۔'' (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: [عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ] کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام محذوف ہے اور حج وعمرہ پر جہاد کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے بڑے حکیمانہ اسلوب میں جواب دیا۔ [وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ] اس کی اصل صحیح میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے۔ یہ حدیث عمرے کے وجوب کی دلیل ہے۔

(٥٨١) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْعُمْرَةِ، أَوَاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «**لَا، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

[581] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! مجھے عمرے کے بارے میں بتائیں کہ کیا وہ واجب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں، اور تو عمرہ کرے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے۔'' (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کا موقوف ہونا راجح ہے۔)

وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ

امام ابن عدی نے ایک اور ضعیف سند سے حضرت

٥٨٠ـ **[صحيح]** أخرجه ابن ماجه، المناسك، باب الحج جهاد النساء، حديث: ٢٩٠١، وأحمد: ٦/ ١٦٥، وأصل الحديث عند البخاري، الحج، حديث: ١٥٢٠.

٥٨١ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه الترمذي، الحج، باب ما جاء في العمرة أواجبة هي أم لا، حديث: ٩٣١، وقال: "حسن صحيح"، وأحمد: ٣/ ٣١٦. * حجاج بن أرطاة ضعيف مدلس، وحديث جابر أخرجه ابن عدي في الكامل: ٤/ ١٤٦٨ وسنده ضعيف، ابن لهيعة عنعن.

عَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعًا : «اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ فَرِيضَتَانِ» .

جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: ''حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں۔''

لغوی تشریح: [وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ] راجح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ انھی سے ایک بدو نے سوال کیا اور انھوں نے اسے یہ جواب دیا۔ اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ (سبل السلام) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی سند بھی ضعیف اور نا قابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی (ج ۲: ص ۱۱۳) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ] ایک اور ضعیف سند سے مروی ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن لہیعہ عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے' اور ابن لہیعہ اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم المکی ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید رضی اللہ عنہ سے سماع بھی نہیں ہے۔ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ (سبل السلام) عمرے کے متعلق دلائل کے اختلاف کی وجہ سے اس کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عمر' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم' امام شافعی' امام احمد اور امام بخاری رحمہم اللہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(٥٨٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ! مَا السَّبِيلُ؟ قَالَ: «اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِرْسَالُهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضًا، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

[582] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! ''سبیل'' سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ''راستے کا خرچ اور سواری۔'' (اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے مگر اس کا مرسل ہونا راجح ہے۔ اور اسے ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: [مَا السَّبِيلُ] سبیل کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو وجوب حج کے لیے سبیل کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۂ آل عمران میں یوں ہے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران ۳:۹۷) [اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ] راحلہ سے مراد سواری ہے' خواہ وہ جانور ہو' موٹر کار ہو' بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز۔ اور الزاد سے روانگی سے لے کر واپسی تک اہل وعیال کے ضروری خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(٥٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[583] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی

٥٨٢۔ **[ضعيف]** أخرجه الدارقطني: ٢/ ٢١٦، والحاكم: ١/ ٤٤٢. * قتادة مدلس وقد عنعن. وللحديث شواهد ضعيفة، وحديث ابن عمر أخرجه الترمذي، الحج، حديث: ٨١٣، وسنده ضعيف جدًا، إبراهيم الخوزي متروك الحديث.

٥٨٣۔ أخرجه مسلم، الحج، باب صحة حج الصبي وأجر من حج به، حديث: ١٣٣٦.

عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْبًا بِالرَّوْحَاءِ، فَقَالَ: «مَنِ الْقَوْمُ»؟ قَالُوا: اَلْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «رَسُولُ اللهِ»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِيًّا، فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ﷺ مقام روحاء پر کچھ سواروں سے ملے تو آپ نے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' انھوں نے عرض کیا کہ ہم مسلمان ہیں' پھر انھوں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کا رسول ہوں۔'' پھر ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر آپ کی خدمت میں لائی اور پوچھا کہ کیا اس پر حج ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں' اور اس کا ثواب تجھے ملے گا۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رَكْبًا] ''را'' پر زبر اور ''کاف'' ساکن ہے۔ راکب کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ [بِالرَّوْحَاءِ] رَوحاء کے ''را'' پر فتحہ اور آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ [فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟] تو انھوں نے کہا کہ آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انھیں رات کے وقت ملے ہوں گے اور وہ آپ کو پہچان نہ سکے ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انھوں نے آپ کو نہ دیکھا ہو۔ (سبل السلام) [وَلَكِ أَجْرٌ] اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت اجر وثواب تمھیں ملے گا۔

فائدہ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ فرض حج سے کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آگے حدیث میں آ رہا ہے۔

(٥٨٤) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الْفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ مِّنْ خَثْعَمَ، فَجَعَلَ الْفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الْفَضْلِ إِلَى الشِّقِّ الْآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ فَرِيضَةَ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الْحَجِّ أَدْرَكَتْ أَبِي شَيْخًا كَبِيرًا، لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأَحُجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذٰلِكَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

[584] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے' انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے کہ قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی تو حضرت فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی' چنانچہ نبی ﷺ نے فضل رضی اللہ عنہ کا منہ دوسری جانب کر دیا۔ اس عورت نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! بے شک حج جو بندوں پر اللہ کا فریضہ ہے اس نے میرے بوڑھے باپ کو پا لیا ہے مگر وہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' اور یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہے۔ (بخاری ومسلم- یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [رَدِيف] ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو ردیف کہتے ہیں۔ [خَثْعَمَ] ''خا'' پر زبر'

٥٨٤ـ أخرجه البخاري، الحج، باب وجوب الحج وفضله، حديث: ١٥١٣، ومسلم، الحج، باب الحج عن العاجز، حديث: ١٣٣٤.

''ثا'' ساکن اور ''عین'' پر زبر ہے۔ یمن کے مشہور قبیلے کا نام ہے۔ اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ [الشِّقِّ] یعنی جانب۔ آپ نے حضرت فضل بن عباس ؓ کا چہرہ اس لیے پھیر دیا کہ کہیں شیطان انھیں فتنے میں مبتلا نہ کر دے۔ [حَجَّةِ الْوَدَاعِ] یہ وہ حج ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپ وفات پا گئے۔ الوداع کے ''واؤ'' پر زبر ہے اور یہ وَدَّعَ تودیعا کا مصدر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''واؤ'' کے نیچے کسرہ ہے۔ یوں یہ وَادَعَ موادعة کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجۃ الوداع اس لیے رکھا گیا کہ آپ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت اور الوداع کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری (جس کے دور ہو جانے کا امکان ہو) میں نیابت درست نہیں۔ یہ شرط فرض حج کے لیے ہے، نفلی حج کے لیے اس میں بلاشرط نیابت جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد ؒ کا یہی موقف ہے۔ اور حج بدل کے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کا قریبی ہی نائب بنے۔

وضاحت: [حضرت **فضل بن عباس** ؓ] یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام أم الفضل لبابة الكبرى بنت الحارث الهلالية تھا۔ نہایت حسین وجمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ ﷺ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس ؓ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کے لیے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال اردن کے قریب ۱۸ ہجری میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ یرموک کے دن شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی جبکہ ان کے جسم پر نبی ﷺ کی چادر تھی۔

(٥٨٥) وَعَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً مِّنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: **«نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْكَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اِقْضُوا اللّٰهَ، فَاللّٰهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»**. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[585] حضرت ابن عباس ؓ ہی سے مروی ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ بے شک میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی اور فوت ہو گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! اس کی طرف سے حج کر، اگر تیری ماں کے ذمے قرض ہوتا تو کیا تو وہ قرض اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔'' (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [جُهَيْنَة] ''جیم'' پر پیش اور ''ہا'' پر زبر ہے۔ (تصغیر کے ساتھ) ایک مشہور قبیلے کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے کہ یہ قحطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔

٥٨٥ـ أخرجه البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب من شبه أصلاً معلوما ......، حديث: ٧٣١٥.

[حُجّي] امر مخاطب کا صیغۂ واحد مؤنث ہے۔ اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ [دَین] ''دال'' پر زبر ہے' یعنی قرض۔ اسے آپ نے مثال کے انداز میں اس لیے بیان فرمایا کہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے اور دل میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔

(٥٨٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الْحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرٰى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرٰى». رَوَاهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلَّا أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي رَفْعِهِ، وَالْمَحْفُوظُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ.

[586] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بچہ حج کرے' پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے۔ اور جو غلام حج کرے' پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔'' (اسے ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اور محفوظ یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔)

لغوی تشریح: [بَلَغَ الْحِنْثَ] ''حا'' کے نیچے کسرہ اور ''نون'' ساکن ہے۔ اس کے معنی گناہ کے ہیں' یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ اس کے نامۂ اعمال میں جرم کی بنا پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بچپن میں کیا ہوا جرم اللہ کے ہاں قابل مؤاخذہ نہیں۔ بلوغت کی عام علامت احتلام کا ہونا ہے جس سے وہ مرد بن جاتا ہے۔

(٥٨٧) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً، وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

[587] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبے میں یہ فرماتے ہوئے سنا: ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہرگز علیحدگی اختیار نہ کرے' الا یہ کہ اس عورت کے ساتھ محرم ہو۔ اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! بے شک میری بیوی حج کے لیے روانہ ہوگئی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوے میں شامل ہونے کے لیے لکھا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جاؤ اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔'' (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [لَا يَخْلُوَنَّ] یہ نون تاکید کے ساتھ خلوة سے نہی کا صیغہ ہے۔ [ذُو مَحْرَمٍ] ''میم'' اور ''را'' پر زبر اور ان کے مابین ''حا'' ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے جیسے باپ' بیٹا'

٥٨٦ـ [شاذ] أخرجه البيهقي: ٤/ ٣٢٥، ٥/ ١٧٩ وأشار إلى علته.

٥٨٧ـ أخرجه البخاري، الجهاد، باب من اكتتب في جيش فخرجت امرأته حاجة، حديث: ٣٠٠٦، ومسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: ١٣٤١.

بھائی وغیرہ۔ [اُكْتُتِبْتُ] باب افتعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے، یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے اور مجھے فلاں غزوے کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت اپنے خاوند یا محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کے لیے یہ بھی فی الجملہ (مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) کے حکم میں شامل ہے۔ یہ عورت کے لیے زائد شرط ہے، اگر یہ پوری ہوگی تو اس پر حج واجب ہے ورنہ اس پر حج کا فریضہ عائد ہی نہ ہوگا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کے لیے تنہائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے، بلکہ ایک حدیث میں ہے، جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کے لیے محرم کے بغیر تنہا سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض ادلہ کی بنا پر بوڑھی، قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس بات کی نفی کرتے ہیں۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں، البتہ نفلی حج ہو تو عورت کو بہر نوع اجازت لے کر جانا چاہیے۔

(٥٨٨) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ؟» قَالَ: أَخٌ لِي، أَوْ قَرِيبٌ لِي، قَالَ: «حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ»؟ قَالَ: لَا، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالرَّاجِحُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَقْفُهُ.

[588] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو یوں کہتے ہوئے سنا: شبرمہ کی طرف سے لَبَّيْك. آپ نے فرمایا: ”شبرمہ کون ہے؟“ اس نے کہا کہ میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ آپ نے فرمایا: ”تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟“ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ”پہلے اپنی طرف سے حج کر، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔“ (اسے ابوداود اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ اور امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا راجح ہے۔)

لغوی تشریح: [شُبْرُمَة] ”شین“ اور ”را“ پر پیش اور ان کے مابین ”با“ ساکن ہے۔ [أَوْ قَرِيبٌ لِي] یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کہا یا یہ کہا کہ وہ میرا قریبی ہے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی بابت سیر حاصل بحث کی ہے۔ محققین کی اس تفصیلی گفتگو سے تصحیح حدیث والی رائے ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے۔ واللہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (إرواء الغليل للألباني، رقم: ٩٩٤، وصحيح ابن حبان (موارد الظمآن) بتحقيق حسين سليم أسد داراني، حديث: ٩٦٢، وسنن ابن ماجه بتحقيق الدكتور بشار عواد، رقم: ٢٩٠٣) ② حج بدل جائز ہے۔ ③ حج بدل کے لیے یہ شرط ہے کہ حج کرنے والا پہلے اپنا حج کر چکا ہو۔

٥٨٨۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، حديث: ١٨١١، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٢٩٠٣، وابن حبان (الموارد): ٩٦٢، قتادة مدلس وعنعن، وللحديث شواهد ضعيفة.

③ حج بدل کرنے والا جس کی طرف سے حج کر رہا ہے احرام باندھتے وقت اسی کی طرف سے نیت کرے اور لبیک پکارتے وقت نام بھی اسی کا لے۔ ④ عمرے کا بھی یہی حکم ہے۔

(٥٨٩) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ»، فَقَامَ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِي كُلِّ عَامٍ يَارَسُولَ اللهِ!؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُهَا لَوَجَبَتْ. اَلْحَجُّ مَرَّةً، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ.

[589] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔'' چنانچہ حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے عرض کیا: کیا ہر سال' اے اللہ کے رسول! (کیا ہر سال حج فرض ہے؟) آپ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار (فرض) ہے۔ اور جو اس سے زائد ہے وہ نفل ہے۔'' (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔)

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے' اس سے زائد نفل ہے۔ ② اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا' اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر نبی ﷺ بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اس قول کو درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ ③ نبی ﷺ کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول وعقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔

وضاحت: [حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ] یہ قبیلۂ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد بنو تمیم کا جو وفد نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا' اس میں شامل تھے۔ مؤلفۃ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

٢ - بَابُ الْمَوَاقِيتِ

باب:2-(احرام کے) میقات کا بیان

(٥٩٠) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى

[590] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

٥٨٩ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب فرض الحج، حديث: ١٧٢١، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٢٦٢١، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٢٨٨٦، وأحمد: ١/ ٣٧١، وأصله في مسلم، الحج، حديث: ١٣٣٧ من حديث أبي هريرة.

٥٩٠ـ أخرجه البخاري، الحج، باب مهل أهل مكة للحج والعمرة، حديث: ١٥٢٤، ومسلم، الحج، باب مواقيت الحج ◀◀

عَنْهُمَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَاالْحُلَيْفَةِ ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ ، هُنَّ لَهُنَّ ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ ، وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ ، حَتّٰى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ .

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

کہ نبی ﷺ نے مدینے والوں کے لیے ذوالحلیفہ‘ شام والوں کے لیے جحفہ‘ نجد والوں کے لیے قرن منازل اور یمن والوں کے لیے یلملم کو احرام باندھنے کی جگہیں مقرر کیا ہے۔ اور یہ میقات ان (جگہوں والے لوگوں) کے لیے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو دوسرے شہروں سے آئیں اور ان کے پاس سے حج یا عمرے کے ارادے سے گزریں۔ اور جو لوگ ان میقات کے اندر کی جانب ہیں وہ جہاں سے چلیں وہیں سے احرام باندھیں یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [بَابُ الْمَوَاقِيت] مواقیت‘ میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد عبادت کے لیے وقت یا جگہ متعین کرنا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنھیں شارع ﷺ نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ [وَقَّتَ] یعنی احرام کے لیے میقات مقرر کیا۔ اور یہ تَوْقِيت سے ماخوذ ہے جس کے معنی تحدید و تعیین کے ہیں۔ [ذُو الْحُلَيْفَةِ] ”حا“ پر ضمہ ہے۔ (تصغیر ہے۔) مدینہ منورہ اور اس سے ملحقہ علاقوں کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے جو کہ مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر اور مکہ مکرمہ سے تقریباً ساڑھے چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آج کل بِئْرِ عَلِي کے نام سے مشہور ہے۔ [اَلْجُحْفَة] ”جیم“ پر پیش اور ”حا“ ساکن ہے۔ شام‘ ترکی اور مصر کی جانب سے آنے والوں کا میقات ہے جو کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل اور مدینہ طیبہ سے پانچ اور دو تہائی‘ یعنی تقریباً پونے چھ مراحل پر واقع ہے‘ یعنی مکہ سے شمال مغرب میں ۱۸۷ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا نام مہیعہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہا لے گیا جس کی بنا پر اسے جحفہ کہا جانے لگا کیونکہ اجتحاف کہتے ہیں جڑ سے اکھیڑ دینے کو۔ اور اس سیلاب نے بھی یہی حشر کیا تھا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے‘ اسی لیے آج کل اس سے کچھ پہلے رابغ مقام سے احرام باندھتے ہیں کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ [قَرْنَ الْمَنَازِلِ] اسے قَرْنَ الثَّعَالِبِ بھی کہا گیا ہے‘ یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمک دار‘ گولائی والا اور چکنا پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب ۹۴ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ اہل نجد اور عرفات کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے۔ [يَلَمْلَم] ”یا“ اور ”لام“ دونوں پر فتحہ اور درمیانی میم ساکن ہے۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً ۹۲ کلومیٹر کی مسافت ہے۔ یہ یمن‘ چین‘ بنگلہ دیش‘ افغانستان‘ بھارت اور پاکستان کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے۔ [هُنَّ] یعنی یہ میقات اور مقامات۔ [لَهُنَّ] ان مذکورہ اہل بلدان (شہر والوں) کے لیے ہیں۔ [مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ] جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس

◂◂ والعمرة، حديث: ١١٨١ .

بات کی دلیل ہے کہ جو شخص حج اور عمرے کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ [وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ] اور جو اس (احرام والی جگہ) کے اندر ہو' یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان رہتا ہو تو وہ اسی جگہ سے احرام باندھے۔ [مِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ] جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے' یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی ہی سے احرام باندھے۔ [حَتّٰى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ] یہاں تک کہ اہل مکہ' مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرے کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں۔

(٥٩١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ، إِلَّا أَنَّ رَاوِيَهُ شَكَّ فِي رَفْعِهِ.

[591] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اہل عراق کے لیے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ (اسے ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے۔)

وَفِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ هُوَ الَّذِي وَقَّتَ ذَاتَ عِرْقٍ.

اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جنھوں نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيقَ.

اور احمد' ابوداود اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے مشرق والوں کے لیے عقیق کو میقات مقرر فرمایا تھا۔

لغوی تشریح: [ذَاتَ عِرْقٍ] عرق کی ''عین'' کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ مکہ مکرمہ سے شمال مشرق میں ۹۴ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ اور یہ قرن منازل کے برابر اس کے شمال میں واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ [وَفِي الْبُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ هُوَ الَّذِي وَقَّتَ ذَاتَ عِرْقٍ] اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میقات مقرر کیا تھا۔ بظاہر تو یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے مقرر کیا جبکہ بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کیا۔ اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو گی' چنانچہ انھوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ [الْعَقِيق] یہ ذات عرق سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ''ذات عرق'' کی حدود میں داخل ہے۔ ہر وہ وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں جو عسق سے ماخوذ ہے

٥٩١ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب في المواقيت، حديث: ١٧٣٩، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٢٦٥٧، وأصله من حديث جابر عند مسلم، الحج، حديث: ١١٨٣، وأثر عمر أخرجه البخاري، الحج، حديث: ١٥٣١، وحديث ابن عباس أخرجه أبوداود، المناسك، حديث: ١٧٤٠، والترمذي، الحج، حديث: ٨٣٢، وأحمد: ١/ ٣٤٤، تفرد به يزيد بن أبي زياد وهو ضعيف مدلس مختلط.

اور اس کے معنی ہیں پھاڑنا۔ اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ ''ذات عرق'' میقات واجب ہے اور ''عقیق'' میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

فوائد و مسائل: ① یاد رہے کہ وادیٔ مر الظہران جو آج کل وادیٔ فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے' وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور مغرب میں جدہ کے قریب اس کی جنوبی سمت بحر احمر پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے مشرق میں دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو قرن المنازل کہتے ہیں' اہل طائف اور اہل نجد جب مکہ کا قصد کرتے ہیں تو وہ یہیں سے گزرتے ہیں۔ اور دوسرا شمالی کنارہ ضریبہ کے قریب ہے جسے ذات عرق کہتے ہیں' جہاں سے اہل عراق اور اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور دونوں کی یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا' جب وہ نبی ﷺ کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ ② یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ جو شخص ایسے راستے پر چلے جہاں ان پانچوں میقات میں سے کوئی ایک بھی واقع نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ جونسے میقات کے برابر سے گزرے وہاں سے احرام باندھ لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ ہی سے ذات عرق کو اہل عراق کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور تمام علماء اس اصول و ضابطے پر متفق ہیں۔ محاذات اور برابری کا مفہوم یہ ہے کہ میقات آدمی کے دائیں یا بائیں جانب واقع ہو رہا ہو اس حالت میں کہ وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھیے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے سے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا' لہٰذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہوگا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے محاذ اور برابر کا خط ہے' اس لیے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا' اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا' اس لیے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا' پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور انھیں ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے' لہٰذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تبھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستے پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور بھارت سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز حج کرنے کے لیے جاتے ہیں' ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات سے گزرے ہیں اور نہ کسی میقات کے برابر ہی سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں حدود میقات سے تقریباً ایک سو میل کی مسافت پر ہوتا ہے تو احرام باندھ لیتے ہیں' یہ لازمی نہیں ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے ینبع کی طرف ذوالحلیفہ کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے سے جا رہا ہو تو بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات سے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز

پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات سے پیچھے ہوگا' اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پہنچ کر اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے' وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

٣ - بَابُ وُجُوهِ الْإِحْرَامِ وَصِفَتِهِ

باب :3- احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(٥٩٢) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، وَأَهَلَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالْحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُومِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[592] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے' ہم میں سے بعض وہ تھے جنھوں نے عمرے کے لیے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنھوں نے حج اور عمرے دونوں کے لیے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنھوں نے حج کے لیے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا' چنانچہ جنھوں نے عمرے کے لیے لبیک کہا تھا وہ (طواف کے بعد) حلال ہو گئے' یعنی احرام کھول دیا۔ اور جنھوں نے حج کے لیے لبیک کہا یا حج اور عمرے کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [بَابُ وُجُوهِ الْإِحْرَامِ وَصِفَتِهِ] الوجوہ' وجه کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام مراد ہیں۔ اور وہ تین ہیں' یعنی صرف حج یا محض عمرہ یا دونوں کا احرام باندھنا۔ صفته سے مراد مُحرِم کی وہ کیفیت ہے جسے وہ حالت احرام میں اختیار کرتا ہے۔ [خَرَجْنَا] ہم نکلے۔ حج کے لیے نبیٔ اکرم ﷺ کی معیت میں یہ نکلنا ہفتے کے روز نماز ظہر کے بعد تھا جبکہ ذی القعدہ کے پانچ دن ابھی باقی تھے۔ [عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ] حجۃ الوداع' دس ہجری میں ہوا۔ نبی ﷺ نے ہجرت کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا۔ اور اسے حجۃ الوداع اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں آپ نے لوگوں کو الوداع کہا تھا۔ [أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ] یعنی صرف عمرے کا احرام باندھا' ایسے شخص کو متمتع کہتے ہیں۔ [أَهَلَّ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ] حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ ایسے شخص کو قارن کہتے ہیں۔ اور جس نے صرف حج کے لیے احرام باندھا ہوا سے مُفْرِدْ کہتے ہیں۔ اور اَلْإِهْلَال' آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مراد احرام باندھنے کے وقت بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے۔ [فَحَلَّ] یعنی وہ حلال ہو گیا۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں یا کٹوائے جاتے ہیں اور احرام کھول دیا جاتا ہے۔ [يَوْمُ النَّحْرِ] نحر' یعنی قربانی کا دن اور وہ دس ذوالحجہ ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے تنہا حج کا احرام باندھا تھا' یعنی حج مفرد کیا

٥٩٢ـ أخرجه البخاري، الحيض، باب كيف تهل الحائض بالحج والعمرة، حديث: ٣١٩، ومسلم، الحج، باب بيان وجوه الإحرام.....، حديث: ١٢١١.

تھا۔ لیکن دوسرے بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ قارن تھے اور حج وعمرے کا اکٹھا احرام باندھا تھا۔ اور یہی بات صحیح ہے تاہم اقسام حج میں سے کون سی قسم افضل ہے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اور جو شخص ''مفرد'' ہوتا ہے وہ صرف قربانی کے دن ہی حلال ہوتا ہے' پھر یہ حدیث صحیح بخاری ومسلم کی ان روایات کے بھی مخالف ہے جن میں ہے کہ آپ نے ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم' جن کے پاس ہدی' یعنی قربانی نہ تھی' انھیں فرمایا تھا کہ تم حج کو عمرہ بنالو۔ عمرے کو مکمل کر کے حج کا احرام مکہ سے باندھ لو' اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دراصل صرف ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ہے جن کے پاس قربانی تھی۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کی تین قسمیں ہیں: حج قران' حج تمتع اور حج افراد۔ ان تینوں میں سے افضل کون سا حج ہے؟ اس کی بابت اختلاف ہے' بعض حج قران کو افضل قرار دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہی حج پسند کیا۔ اس میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر نفیس بحث کی ہے۔ بعض حج تمتع کو افضل کہتے ہیں کہ اس میں سہولت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرحلے پر اس کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ اور بعض حضرات حج افراد کو افضل قرار دیتے ہیں مگر دلائل کے اعتبار سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حج تمتع ہی افضل ہے۔ واللّٰہ أعلم.

٤ - بَابُ الْإِحْرَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ

باب: 4- احرام اوراس سے متعلقہ امور کا بیان

(٥٩٣) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا أَهَلَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِلَّا مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[593] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد (ذوالحلیفہ) کے پاس سے تلبیہ شروع کیا۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [بَابُ الْإِحْرَامِ] احرام حج یا عمرے میں داخل ہونے کا نام ہے۔ اسے احرام' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ [إِلَّا مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ] مگر صرف مسجد کے پاس سے۔ مسجد سے مسجد ذوالحلیفہ مراد ہے۔ جس وقت آپ کی اونٹنی آپ کو لے کر سیدھی کھڑی ہوئی تھی اس وقت آپ نے تلبیہ کہا۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداء کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپ نے اس وقت لبیک پکارا تھا جب آپ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں' یعنی آپ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپ نے لبیک کہا۔ اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپ ''بیداء'' کی چوٹی پر چڑھے تو آپ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض

٥٩٣- أخرجه البخاري، الحج، باب الإهلال عند مسجد ذي الحليفة، حديث: ١٥٤١، ومسلم، الحج، باب أمر أهل المدينة بالإحرام، حديث: ١١٨٦.

ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنھوں نے وہاں آپ کے احرام کا مشاہدہ کیا انھوں نے اسی کا ذکر کیا' اور جب آپ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آواز بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ آپ نے احرام ابھی ابھی باندھا ہے' پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انھوں نے سمجھا کہ آپ نے یہاں سے احرام باندھا ہے۔ گویا ہر فریق نے اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق خبر دی' اس لیے ان روایات میں کوئی تناقض نہیں۔

(٥٩٤) وَعَنْ خَلَّادِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَمَرَنِي أَنْ آمُرَ أَصْحَابِي، أَنْ يَّرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالْإِهْلَالِ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

[594] حضرت خلاد بن سائب رحمہ اللہ اپنے باپ (سائب بن خلاد بن سوید رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہ کو حکم دوں کہ وہ تلبیہ بلند آواز سے پکاریں۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی اور امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔)

فائدہ: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے تلبیہ کہنا چاہیے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علمائے کرام رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہیے۔ (سبل السلام)

راویٔ حدیث: [حضرت خَلَّاد رحمہ اللہ] خلاد کی ''خا'' پر زبر اور ''لام'' مشدد ہے۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سوید انصاری خزرجی ہیں۔ تیسرے طبقے کے ثقہ تابعی ہیں جنھوں نے انھیں صحابی کہا انھیں وہم ہوا ہے۔

[أَبِيه] ان کے والد سائب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابوسلمہ ہے۔ بدر میں حاضر تھے۔ عہد معاویہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں یمن کا عامل مقرر کیا۔ اور ۷۱ ھجری میں فوت ہوئے۔

(٥٩٥) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِإِهْلَالِهِ، وَاغْتَسَلَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

[595] حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے احرام باندھنے کے وقت کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔)

(٥٩٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[596] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول

٥٩٤ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب كيف التلبية، حديث: ١٨١٤، والترمذي، الحج، حديث: ٨٢٩، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٢٧٥٤، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٢٩٢٢، ٢٩٢٣، وأحمد: ٤/ ٥٥، وابن حبان (الإحسان): ٦/ ٤٢.

٥٩٥ـ [إسناده حسن] أخرجه الترمذي، الحج، باب ما جاء في الاغتسال عند الإحرام، حديث: ٨٣٠.

٥٩٦ـ أخرجه البخاري، الحج، باب ما لا يلبس المحرم من الثياب، حديث: ١٥٤٢، ومسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم◄◄

عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «لَا يَلْبَسُ الْقَمِيصَ، وَلَا الْعَمَائِمَ، وَلَا السَّرَاوِيلَاتِ، وَلَا الْبَرَانِسَ، وَلَا الْخِفَافَ، إِلَّا أَحَدٌ لَا يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ، وَلَا تَلْبَسُوا شَيْئًا مَّنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الزَّعْفَرَانُ، وَلَا الْوَرْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: احرام باندھنے والا کون سا لباس پہنے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ قمیص، پگڑی، شلوار، برانڈی (ٹوپی والا اوورکوٹ) اور موزے نہ پہنے۔ لیکن اگر کسی کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے پہن لے اور اسے چاہیے کہ دونوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے۔ اور ایسا کوئی کپڑا نہ پہنو جسے زعفران اور ورس لگا ہوا ہو۔'' (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

لغوی تشریح: [الْعَمَائِم] یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے۔ [السَّرَاوِيل] شلوار۔ [الْبَرَانِس] یہ برنس کی جمع ہے۔ برنس کی ''با'' اور ''نون'' پر ضمہ اور دونوں کے درمیان ''را'' ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو، خواہ کوئی زرہ یا جبہ یا اوورکوٹ وغیرہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ [الْخِفَاف] ''خا'' کے نیچے زیر ہے۔ خف کی جمع ہے، یعنی موزے۔ [فَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ] انھیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران میں ٹخنے ننگے رہیں۔ اور کعب سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ [الْوَرْس] ''واؤ'' پر زبر اور ''را'' ساکن ہے۔ زرد رنگ کی خوشبودار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لیے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احرام کے وقت قمیص، پاجامہ، شلوار، ٹوپی، برانڈی اور موزے پہننا درست نہیں۔ ② جوتے اگر میسر نہ ہوں، صرف موزے ہوں تو اس حدیث کی رو سے انھیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لینا چاہیے، تاہم فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ موزے پہننے کو جائز قرار دیتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موزوں کو کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابتدائے احرام کے وقت تھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں کاٹنے کا حکم نہیں اور یہ حکم آپ نے عرفات میں بیان فرمایا تھا، اس لیے کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ اور یہی رائے راجح اور درست معلوم ہوتی ہے، نیز شیخ البانی رحمہ اللہ اور سعودی علمائے کرام کی بھی یہی رائے ہے۔ واللّٰہ أعلم۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتاویٰ اسلامیہ: (أردو) ۲/۳۳۱، طبع دارالسلام) ③ امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر شوافع چادر نہ ہونے کی صورت میں مطلقاً شلوار پہننے کے قائل ہیں اور ان کا استدلال بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ اس کے قطعاً

◀◀ بحج أو عمرة لبسه، حديث: ١١٧٧.

قائل نہیں' البتہ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض شوافع کا کہنا ہے کہ اگر چادر میسر نہ ہو تو شلوار کو پھاڑ کر چادر نما بنا کر پہننا جائز ہے' مگر ان کا یہ قول محض قیاس پر مبنی ہے جس پر کوئی نص نہیں' اس لیے شلوار کے بارے میں صحیح موقف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہی کا معلوم ہوتا ہے کہ چادر نہ ہونے کی بنا پر احرام میں شلوار پہننا جائز ہے۔ ④ زعفران اور ورس سے رنگا ہوا لباس بھی احرام میں جائز نہیں۔ یہ ممانعت رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشبو کی وجہ سے ہے کیونکہ احرام کے بعد خوشبو لگانا بالاتفاق حرام ہے' البتہ اگر اسے دھو کر اس کی خوشبو زائل کر دی جائے تب جائز ہے۔

(٥٩٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَ لِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[597] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو احرام باندھنے سے پہلے اور طواف (زیارت) سے پہلے احرام کھولتے وقت خوشبو لگاتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [أُطَيِّبُ] یہ تطییب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے۔ میں خوشبو لگاتی تھی۔ [لِإِحْرَامِهِ] یعنی احرام باندھنے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کا آغاز ہوتے ہی خوشبو لگانا حرام ہے۔ [قَبْلَ أَنْ يَّطُوفَ بِالْبَيْتِ] بیت اللہ کے طواف سے پہلے۔ اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار' قربانی اور حلق (سر منڈوانے) کے بعد کیا جاتا ہے۔

(٥٩٨) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلَا يُنْكِحُ، وَلَا يَخْطُبُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[598] حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''احرام والا خود اپنا نکاح کرے نہ کسی دوسرے کا اور نہ شادی کا پیغام ہی دے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ] یعنی خود نکاح نہ کرے۔ [وَلَا يُنْكِحُ] یہ إنکاح سے ماخوذ ہے۔ نہ کسی دوسرے کا نکاح کرے۔ [وَلَا يَخْطُبُ] یہ خِطْبَة (''خا'' مکسور) سے مشتق ہے' یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کے لیے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا' کسی کا نکاح کرنا' کسی کو اپنے لیے یا کسی اور کے لیے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ اور اس وہم کی بنیاد غالبًا یہ ہے کہ یہ کام احرام سے فارغ ہوتے ہی ہو گیا تھا۔

٥٩٧۔ أخرجه البخاري، الحج، باب الطيب عند الإحرام، حديث: ١٥٣٩، ومسلم، الحج، باب الطيب للمحرم عند الإحرام، حديث: ١١٨٩.

٥٩٨۔ أخرجه مسلم، النكاح، باب تحريم نكاح المحرم، حديث: ١٤٠٩.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ویسے بھی اس وقت چھوٹے بچے تھے' اس لیے انھوں نے سمجھا کہ یہ نکاح حالت احرام میں ہو گیا تھا' نیز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا خود بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے مقام سرف میں نکاح کیا تھا اور ہم دونوں حلال تھے۔ دیکھیے: (صحیح مسلم' النکاح' حدیث:۱۴۱۱) حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(٥٩٩) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ- فِي قِصَّةِ صَيْدِهِ الْحِمَارَ الْوَحْشِيَّ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ-قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ -: «**هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ بِشَيْءٍ**»؟ قَالُوا: لَا، قَالَ: «**فَكُلُوا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[599] حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے...... ان کے جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انھوں نے احرام نہیں باندھا تھا...... مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے' جو احرام والے تھے' فرمایا: ''کیا تم میں سے کسی نے اسے حکم دیا تھا یا اس کی طرف کسی قسم کا اشارہ کیا تھا؟'' انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اس کے گوشت سے جو بچ گیا ہے اسے کھا لو۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [فِي قِصَّةِ صَيْدِهِ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ] جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں۔

 **فوائد ومسائل:** ① اس قصے کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر کے لیے نکلے' مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے احرام نہیں باندھا تھا' البتہ ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ جب انھوں نے وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظر انداز کر دیا۔ جب ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاٹھی پکڑاؤ' انھوں نے اس سے انکار کر دیا' پھر ابوقتادہ رضی اللہ عنہ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہو گئے۔ بالآخر جب وہ نبی ﷺ سے جا ملے تو آپ سے یہ سارا ماجرا عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ ② یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کی ہو اور نہ اس بارے میں کوئی اشارہ ہی کیا ہو تو محرم بھی اس میں سے کھا سکتا ہے مگر اس بارے میں مزید تفصیل ہے جو آئندہ حدیث کے تحت آ رہی ہے۔

(٦٠٠) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ أَهْدٰى لِرَسُولِ اللهِ ﷺ حِمَارًا وَحْشِيًّا، وَهُوَ بِالْأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَّانَ،

[600] حضرت صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک وحشی گدھا بطور تحفہ بھیجا جبکہ آپ ''ابواء'' یا ''ودان'' مقام پر تھے۔ آپ نے وہ

٥٩٩۔ أخرجه البخاري، جزاء الصيد، باب لا يشير المحرم إلى الصيد، حديث: ١٨٢٤، ومسلم، الحج، باب تحريم الصيد للمحرم، حديث: ١١٩٦.

٦٠٠۔ أخرجه البخاري، جزاء الصيد، باب إذا أهدى للمحرم حمارًا وحشيًا، حديث: ١٨٢٥، ومسلم، الحج، باب تحريم الصيد للمحرم، حديث: ١١٩٣.

فَرَدَّهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلَّا أَنَّا حُرُمٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

انھیں واپس کر دیا اور فرمایا: ''ہم نے یہ صرف اس لیے واپس کیا ہے کہ ہم احرام والے ہیں۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [حِمَارًا وَحْشِيًّا] اس سے مراد وحشی گدھے کا ایک ٹکڑا ہے کیونکہ صحیح مسلم میں ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''وحشی گدھے کا گوشت'' اور دوسری میں ہے: ''وحشی گدھے کا سرین۔'' اور تیسری روایت میں ہے: ''شکار کے گوشت میں سے ایک ٹکڑا۔'' ملاحظہ ہو: صحيح مسلم، باب تحريم الصيد للمحرم. [بِالْأَبْوَاءِ] ''ہمزہ'' پر زبر اور ''با'' ساکن ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ایک بستی آباد ہے اور وہ بستی بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ نبی ﷺ کی والدہ کا انتقال اسی جگہ پر ہوا۔ اس کے اور جحفہ کے مابین بیس یا تیس میل کی مسافت ہے۔ [وَدَّان] ''واؤ'' پر زبر اور ''دال'' مشدد ہے۔ یہ ابواء کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ [حُرُمٌ] ''حا'' اور ''را'' دونوں پر پیش ہے، یعنی ہم محرم ہیں۔

فائدہ: یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لیے شکار کا گوشت مطلق طور پر حرام ہے، خواہ اس کی اجازت یا اشارے وغیرہ سے شکار نہ بھی کیا گیا ہو جبکہ پہلی حدیث میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ دی گئی ہے کہ شکار جب محرم کے لیے کیا گیا ہو، یعنی محرم کو شکار کا گوشت کھلانے کی نیت سے شکار کیا گیا ہو تو اس کا کھانا بھی محرم کے لیے حرام ہے گو اس نے اس کا اشارہ وغیرہ بھی نہ کیا ہو کیونکہ سنن ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث میں مروی ہے کہ جب میں نے آپ سے عرض کیا کہ جناب یہ شکار میں نے آپ کے لیے کیا ہے تو آپ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ (سنن ابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠٩٣) اسی طرح ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''حالت احرام میں زمین کا شکار تمھارے لیے حلال ہے بشرطیکہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمھارے لیے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔'' (جامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في أكل الصيد للمحرم، حديث: ٨٤٦) جس سے معلوم ہوا کہ شکار جب محرم کے حکم سے یا اس کے اشارے وغیرہ سے کیا گیا ہو یا شکار محرم کی ضیافت کے لیے کیا گیا ہو تو اس کے لیے اس کا کھانا ناجائز ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت صعب رضی اللہ عنہ] ''صاد'' پر زبر اور ''عین'' ساکن ہے۔ والد کا نام جثامہ (''جیم'' پر زبر اور ''ثا'' مشدد) ہے۔ لیث قبیلے سے تھے۔ ودان اور ابواء میں رہتے تھے۔ ان کی حدیث حجازیوں میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔ بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمان رضی اللہ عنہ تک زندہ رہے۔

(٦٠١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: خَمْسٌ مِّنَ

[601] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچ جانور ایسے موذی ہیں کہ انھیں حرم

٦٠١ـ أخرجه البخاري، جزاء الصيد، باب ما يقتل المحرم من الدواب، حديث: ١٨٢٩، ومسلم، الحج، باب ما يندب للمحرم وغيره قتله، حديث: ١١٩٨.

الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: اَلْعَقْرَبُ، وَالْحِدَأَةُ، وَالْغُرَابُ، وَالْفَأْرَةُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کے اندر اور حرم سے باہر (ہر جگہ) قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہیں: بچھو، چیل، کوا، چوہا اور کاٹ کھانے والا کتا۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [الدَّوَابّ] ''با'' پر تشدید ہے۔ یہ دابة کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر رینگتا ہے، یعنی چلتا ہے، پھر عموماً اس کا استعمال چار ٹانگوں والے جانوروں پر ہونے لگا۔ [فَوَاسِق] فاسقة کی جمع ہے اور ان کا فسق اور شر ان کی خباثت، کثرت نقصان اور موذی ہونے کی بنا پر ہے۔ [الْحِدَأَة] ''حا'' کے کسرہ کے ساتھ۔ عِنَبَة کے وزن پر ہے۔ جسے چیل کہتے ہیں۔ اتنا خبیث پرندہ ہے کہ انسان کے ہاتھ سے گوشت چھین کر لے جاتا ہے۔ [الْعَقْرَب] بچھو۔ اس کے مفہوم میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ [وَالْكَلْبُ الْعَقُور] العقور ''عین'' پر زبر کے ساتھ ہے، عقر سے مشتق ہے، جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں۔ اور اس سے ہر چیر نے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے، جیسے شیر، چیتا، تیندوا، ریچھ اور بھیڑیا وغیرہ۔

(٦٠٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[602] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے احرام کی حالت میں سینگی لگوائی۔ (بخاری ومسلم)

(٦٠٣) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَالْقَمْلُ يَتَنَاثَرُ عَلٰى وَجْهِي، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أُرَى الْوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرٰى، أَتَجِدُ شَاةً»؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَصُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَوْ أَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِينَ، لِكُلِّ مِسْكِينٍ نِصْفُ صَاعٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[603] حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اس حال میں کہ جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''میرا یہ خیال نہ تھا کہ بیماری نے تمھیں اس حالت تک پہنچا دیا ہوگا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تیرے پاس بکری ہے؟'' میں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تین دن کے روزے رکھ یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا۔ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع دے۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [حُمِلْتُ] صیغۂ مجہول ہے، یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ [الْقَمْلُ] ''قاف'' پر زبر اور ''میم'' ساکن ہے۔ چھوٹے چھوٹے حشرات جنھیں جوئیں کہتے ہیں۔ [يَتَنَاثَرُ] یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں اور

٦٠٢- أخرجه البخاري، جزاء الصيد، باب الحجامة للمحرم، حديث: ١٨٣٥، ومسلم، الحج، باب جواز الحجامة للمحرم، حديث: ١٢٠٢.

٦٠٣- أخرجه البخاري، المحصر، باب الإطعام في الفدية نصف صاع، حديث: ١٨١٦، ومسلم، الحج، باب جواز حلق الرأس للمحرم، حديث: ١٢٠١.

حضرت کعب رضی اللہ عنہ انھیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ [مَا كُنْتُ أُرٰى] أُرٰی کے ''ہمزہ'' پر پیش ہے۔ صیغہ مجہول ہے، یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ [الْوَجَعَ] تکلیف۔ [مَاأَرٰى] ''ہمزہ'' پر زبر۔ رؤیت بصری سے مشتق ہے، یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ [أَتَجِدُ شَاةً] یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپ نے انھیں سر منڈوانے کا حکم دیا اور اس کے کفارے کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کے روزے رکھنے کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔ ان تینوں میں سے کوئی کام بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ آپ نے انھیں اختیار دیا تھا۔

راویٔ حدیث: [حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ] عجرہ میں ''عین'' پر پیش اور ''جیم'' ساکن ہے۔ یہ جلیل القدر صحابی قبیلۂ بلی سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے۔ بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ ہجری میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(٦٠٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللّٰهَ، وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ، وَ إِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَ إِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ، وَ إِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا، وَلَا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا، وَلَا يَحِلُّ سَاقِطَتُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ»، فَقَالَ الْعَبَّاسُ: إِلَّا الْإِذْخِرَ، يَارَسُولَ اللهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلَّا الْإِذْخِرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[604] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ پر فتح عطا کی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے، پھر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا۔ اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی کے لیے حلال نہ تھا۔ میرے لیے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوگا، لہٰذا نہ اس کا شکار بھگایا جائے، نہ اس کا کوئی کانٹا کاٹا جائے اور اعلان کرنے والے کے سوا اس کی گری ہوئی چیز کو اٹھانا حلال نہیں ہے۔ اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے اسے دو میں سے ایک بہتر بات کا اختیار ہے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اذخر (ایک قسم کی گھاس، یعنی اس کے کاٹنے) کی اجازت دیجیے کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''سوائے اذخر کے۔'' (اسے کاٹنے کی اجازت ہے۔) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [حَبَسَ] یعنی روکا اور منع کیا۔ [الْفِيلَ] ہاتھی جسے ابرہہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کے لیے لے کر

٦٠٤ـ أخرجه البخاري، العلم، باب كتابة العلم، حديث: ١١٢، ومسلم، الحج، باب تحريم مكة وصيدها، حديث: ١٣٥٥.

آیا تھا' جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ [وَ سَلَّطَ] یہ تسلیط سے ماخوذ ہے۔ غلبہ کے معنی میں ہے۔ [سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ] دن کی ایک گھڑی۔ اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ [لَا يُنَفَّرُ] تنفیر سے صیغۂ مجہول ہے' یعنی بھگایا نہ جائے۔ [وَلَا يُخْتَلٰی] یہ بھی صیغۂ مجہول ہے' یعنی نہ کاٹا جائے۔ [سَاقِطَتُهَا] یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ [إِلَّا لِمُنْشِدٍ] یہ إنشاد سے ماخوذ ہے' یعنی وہاں گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے' البتہ اسے اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے یہاں تک کہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ [قَتِيل] یعنی مقتول۔ [فَهُوَ] یعنی مقتول کا ولی۔ [بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ] یعنی ولی کو دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے' چاہے تو قصاص لے اور چاہے تو دیت وصول کرے۔ [إِلَّا الْإِذْخِرَ] یعنی آپ یہ فرمائیں: [إِلَّا الْإِذْخِرَ] "اِذخر کے سوا" کہ اسے کاٹنے کی اجازت ہے۔ اذخر کے "ہمزہ" اور "خا" کے نیچے زیر اور دونوں کے درمیان میں ذال ساکن ہے۔ یہ چوڑے پتوں والی خوشبودار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اور قبر کے اوپر رکھے جانے والے پتھروں یا کچی اینٹوں کے سوراخ اس سے بند کیے جاتے تھے۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ مکہ میں رہنے والوں سے لڑائی کرنا حرام ہے۔ جو اس میں داخل ہو گیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹیاں کاٹنی حرام ہیں' نیز اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کے لیے اٹھانا حرام ہے۔

(٦٠٥) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ، وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[605] حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو حرم قرار دیا اور اس کے بسنے والوں کے لیے دعا کی۔ اور یقیناً میں مدینے کو حرم قرار دیتا ہوں' جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو حرم قرار دیا۔ اور میں نے مدینے کے صاع اور مد میں برکت کی دعا کی ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکے میں بسنے والوں کے لیے کی تھی۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [حَرَّمَ مَكَّةَ] یہ تحریم سے ہے' یعنی اسے حرم بنایا۔ اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں شکار کرنا' اس کے درخت کاٹنا اور وہاں بدعات کا ارتکاب کرنا حرام ہے۔ (سبل السلام)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا" کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی دعا کی وجہ سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے: [إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ] یعنی اللہ نے مکہ کو حرم قرار دیا ہے۔ (صحيح البخاري' العلم' حديث:١٠٤)

٦٠٥ـ أخرجه البخاري، البيوع، باب بركة صاع النبي ﷺ ومده، حديث: ٢١٢٩، ومسلم، الحج، باب فضل المدينة، حديث: ١٣٦٠.

(٦٠٦) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**اَلْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلٰى ثَوْرٍ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[606] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ عیر پہاڑ سے ثور پہاڑ تک حرم ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [عَیر] ''عین'' کے اوپر زبر اور ''یا'' ساکن ہے۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں ایک مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے اور قباء کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ [ثَور] ''ثا'' پر زبر اور ''واؤ'' ساکن ہے۔ یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے: [مَابَیْنَ عَیْرٍ إِلٰی أُحُدٍ] عیر اور احد کے درمیان والی جگہ حرم ہے، گویا کہ جبل ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ ایک جبل ثور مکہ مکرمہ میں بھی ہے جس میں ہجرت کے موقع پر آپ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے: ﴿إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ (التوبة ٩:٤٠) لیکن اس حدیث میں یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے شمالاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے، شرقاً غرباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے: [مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حَرَامٌ] (صحیح مسلم، الحج، حدیث:١٣٧١) ''دو حرّوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ حرم ہے۔'' اور اس سے مراد ایک ''حرۂ وَبرہ'' ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا ''حرۂ واقم'' جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے۔ یوں چاروں سمت سے حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

٥ - بَابُ صِفَةِ الْحَجِّ وَدُخُولِ مَكَّةَ

باب:5- حج کا طریقہ اور مکہ میں داخل ہونے کا بیان

(٦٠٧) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتّٰى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الْحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «**اِغْتَسِلِي، وَاسْتَثْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي**»، وَصَلّٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ الْقَصْوَاءَ، حَتّٰى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى الْبَيْدَاءِ، أَهَلَّ بِالتَّوْحِيدِ: «**لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ! لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا**

[607] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچے کو جنم دیا۔ آپ نے فرمایا: ''غسل کر کے ایک لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔'' رسول اللہ ﷺ نے (ذوالحلیفہ کی) مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (اونٹنی) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپ بیداء کے برابر آئے تو آپ نے توحید کا تلبیہ پکارا [لَبَّيْكَ، اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ......لَاشَرِيكَ لَكَ]

٦٠٦ـ أخرجه مسلم، الحج، باب فضل المدينة، حديث: ١٣٧٠.

٦٠٧ـ أخرجه مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: ١٢١٨.

شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ»، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا الْبَيْتَ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلَاثًا، وَمَشَى أَرْبَعًا، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى الرُّكْنِ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْبَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ»، فَرَقِيَ الصَّفَا حَتَّى رَأَى الْبَيْتَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللّٰهَ، وَكَبَّرَهُ، وَقَالَ: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ، قَالَ: مِثْلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى الْمَرْوَةِ، حَتَّى إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِي بَطْنِ الْوَادِي سَعٰى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَشٰى إِلَى الْمَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلٰى مِنًى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيلًا حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ، فَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ، فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي، فَخَطَبَ النَّاسَ، ثُمَّ أَذَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى

''حاضر ہوں' اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ بلاشبہ سب تعریفیں اور نعمتیں تیری ہیں۔ اور بادشاہت بھی تیری ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔'' یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے رکن (حجر اسود) کو بوسہ دیا' تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکروں میں معمول کے مطابق چلے' پھر آپ مقام ابراہیم پر آئے اور نماز پڑھی' پھر رکن (حجر اسود) کی طرف واپس آئے اور اسے بوسہ دیا' پھر (مسجد حرام کے) دروازے سے صفا کی طرف نکلے۔ جب صفا کے نزدیک پہنچے تو یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ ۲:۱۵۸) ''بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' (پھر فرمایا:) ''میں (سعی کو) اس مقام سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ نے شروع کیا ہے۔'' (میں اسی سے شروع کرتا ہوں جس کا نام اللہ نے پہلے لیا ہے۔) پھر آپ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ آپ نے بیت اللہ کو دیکھا' پھر قبلہ رخ ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا: [لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، لَاشَرِيكَ لَهُ... وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ] ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ یکتا ہے' کوئی اس کا شریک نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کی جماعتوں کو اسی اکیلے نے شکست دی۔'' پھر ان (الفاظ کو پہلی بار اور دوسری بار پڑھنے) کے درمیان دعا مانگی۔ تین بار ایسا کیا' پھر صفا سے اتر کر مروہ کی طرف چلے حتی کہ جب آپ کے قدم وادی کے نشیب میں پڑے تو آپ دوڑنے لگے یہاں تک کہ آپ بلند جگہ پہنچے تو مروہ کی طرف پیدل چلنے لگے' پھر مروہ پر وہی کچھ کیا

أَتَى الْمَوْقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ إِلَى الصَّخَرَاتِ، وَجَعَلَ حَبْلَ الْمُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلًا، حَتَّى إِذَا غَابَ الْقُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَنَقَ لِلْقَصْوَاءِ الزِّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيبُ مَوْرِكَ رَحْلِهِ، وَيَقُولُ بِيَدِهِ الْيُمْنَى: «**يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اَلسَّكِينَةَ، اَلسَّكِينَةَ**»، وَكُلَّمَا أَتَى حَبْلًا مِّنَ الْحِبَالِ أَرْخَى لَهَا قَلِيلًا حَتَّى تَصْعَدَ حَتَّى أَتَى الْمُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئًا، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَشْعَرَ الْحَرَامَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسِّرٍ، فَحَرَّكَ قَلِيلًا، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيقَ الْوُسْطَى الَّتِي تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِي عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِّنْهَا، مِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ، رَمَى مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ، فَصَلَّى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُطَوَّلًا.

جو صفا پر کیا تھا' پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذوالحجہ) ہوا تو لوگ منیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار ہوئے (اور منیٰ پہنچے)۔ آپ نے وہاں ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور صبح کی نمازیں پڑھیں' پھر تھوڑی دیر ٹھہرے رہے یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو وہاں سے روانہ ہوئے اور (مزدلفہ سے گزرتے ہوئے) عرفات میں پہنچے تو وہاں ایک خیمہ لگا ہوا پایا جو آپ کے لیے نمرہ میں لگایا گیا تھا' آپ وہاں تشریف فرما ہوئے' پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپ سوار ہو کر وادی کے نشیب میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا' پھر اذان دلوائی' پھر اقامت کہلوا کر نماز ظہر ادا کی' پھر اقامت کہلوا کر عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی' پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور پیدل چلنے والوں کے راستے کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلے کی جانب کر لیا' پھر آپ ٹھہرے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی۔ جب سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا تو آپ (اسی حالت میں) واپس ہوئے۔ آپ نے قصواء کی مہار اتنی کھینچ رکھی تھی کہ اس کا سر آپ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے تھے: ''لوگو! آرام سے چلو' آرام سے چلو۔'' اور جب بھی آپ کسی ٹیلے پر آتے تو مہار تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے حتی کہ وہ (اونٹنی) اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نفل نماز نہیں پڑھی' پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ صبح

ہوگئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی' پھر سوار ہوکر مشعر حرام پر آئے' چنانچہ آپ قبلہ رو ہوئے' دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ خوب روشنی ہونے تک آپ وہاں ٹھہرے رہے' پھر سورج نکلنے سے پہلے واپس ہوکر وادی محسر کے نشیب میں آئے تو سواری کو کچھ تیز کر دیا' پھر درمیانی راستے پر چلے جو جمرۂ کبریٰ (بڑے شیطان) پر پہنچتا ہے' پھر آپ اس جمرے پر آئے جو درخت کے پاس ہے اور اسے سات کنکریاں وادی کے نشیب سے ماریں۔ ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے۔ ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیا اور چنے وغیرہ کے دانے) کے برابر تھی' پھر آپ قربان گاہ کی طرف گئے اور وہاں قربانی کی' پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے' پھر مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ] یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ [وَاسْتَثْفِرِي] یہ استثفار سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: لنگوٹ کو مضبوطی سے کسنا۔ اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز (رسی یا ازار وغیرہ) باندھ لیتی ہے' پھر ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ [وَأَحْرِمِي] احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ [اَلْقَصْوَاءِ] ''قاف'' پر زبر اور ''صاد'' ساکن ہے اور آخر میں ''الف ممدودہ'' ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں: کان کٹی ہوئی۔ مگر یہاں یہ نبی ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے۔ اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ [اَلْبَيْدَاءِ] دراصل اس بیابان جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ [أَهَلَّ] إهلال سے ماضی کا صیغہ ہے' یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ [بِالتَّوْحِيدِ] یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کیا' جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں شرکیہ کلمات بھی کہتے تھے۔ [لَبَّيْكَ] لَبّٰى کا مصدر ہے۔ جب لبیك کہے گا تو یہ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا۔ اور اس کا عامل وجوباً محذوف ہوگا اور لبیك کو تثنیہ ذکر کرنے سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں تیرے دربار میں بار بار حاضر ہوں' یعنی تیری اطاعت پر بار بار قائم رہنے کا اظہار کرتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے تیری دعوت کو بار بار قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پکار کا جواب ہے جو انھوں نے حج کے لیے لگائی تھی۔ [إِنَّ

اَلْحَمْدَ] ''ہمزہ'' کے نیچے زیر ہے' جملہ مستانفہ کی بنا پر۔ اور جملہ معللہ بنانے کی صورت میں اس پر زبر آئے گی۔ [اِسْتَلَمَ الرُّكْنَ] رکن' یعنی حجر اسود پر ہاتھ رکھا اور اسے بوسہ دیا۔ [فَرَمَلَ] یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ [ثَلَاثًا] یعنی سات میں سے تین چکر اس طرح دوڑ کر پورے کیے۔ [وَمَشٰى أَرْبَعًا] اور باقی چار حسب عادت عام معمول کے مطابق چل کر پورے کیے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں' نیز اسے طواف دخول اور طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ [مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ] وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خود بخود اوپر ہو جاتا تھا۔ [فَصَلّٰى] پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ﴿ قُلْ يَآاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور دوسری میں ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھی۔ [مِنَ الْبَابِ] باب صفا کے نام سے معروف ہے۔ [دَنَا] قریب ہوئے۔ [شَعَائِر] یہ شعيرة کی جمع ہے' یعنی علامت۔ یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک اور حج کے طریقے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انھی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ [أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ] یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے اور مروہ کا بعد میں۔ [فَرَقِيَ] سبل السلام میں ہے کہ ''قاف'' پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی' یعنی اوپر چڑھے۔ [أَنْجَزَ وَعْدَهُ] یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ [نَصَرَ عَبْدَهُ] اپنے بندے کی مدد کی۔ بندے سے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ [وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ] یہ حزب کی جمع ہے' اس کے معنی جماعت اور لشکر کے ہیں' یعنی ان کے لشکر کا زور توڑ کر انھیں مغلوب کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ [ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ] یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ [ثَلَاثَ مَرَّاتٍ] تین مرتبہ۔ اس سے لازم آتا ہے کہ آپ نے یہ ذکر بھی تین بار کیا۔ [حَتّٰى إِذَا انْصَبَّتْ] یہ انصباب سے ماخوذ ہے' یعنی وادی میں نیچے اترے۔ [حَتّٰى إِذَا صَعِدَ] یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ [فَذَكَرَ الْحَدِيثَ] یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی۔ مگر مصنف رحمہ اللہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ [يَوْمُ التَّرْوِيَةِ] ''تا'' پر زبر' ''را'' ساکن' ''واؤ'' کے نیچے زیر اور ''یا'' مخفف ہے۔ یہ مصدر ہے۔ جو إرواء (سیراب کرنے' پانی پلانے) کے معنی میں ہے۔ اور يَوْمُ التَّرْوِيَة ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لیے کہتے ہیں کہ اسی دن حُجاج میدان عرفات کی ضرورت کے لیے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ [تَوَجَّهُوا] یعنی انھوں نے قصد کیا اور روانہ ہو گئے۔ [فَصَلّٰى بِهَا] یعنی منیٰ میں پہنچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا۔ [ثُمَّ مَكَثَ قَلِيلًا] یعنی نو ذوالحجہ کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ [فَأَجَازَ] یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے۔ [حَتّٰى أَتٰى عَرَفَةَ] یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ [اَلْقُبَّةَ] ''قاف'' پر پیش اور ''با'' پر تشدید ہے۔ چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ [بِنَمِرَةَ] ''نون'' پر زبر' ''میم'' کے نیچے زیر اور ''را'' پر زبر ہے۔ میدان عرفات سے کچھ پہلے ایک معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں ہے۔ [فَرُحِّلَتْ] یہ ترحیل سے ماخوذ صیغۂ مجہول ہے' یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ [فَأَتٰى

بَطْنَ الْوَادِي | اس وادی سے مراد وادیٔ عرنہ ہے جس کی ''عین'' پر پیش ''را'' پر زبر اور اس کے بعد نون ہے۔ وادیٔ عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور تمام علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ [اَلْمَوْقِفَ] ''قاف'' کے نیچے زیر' یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ [إِلَى الصَّخَرَاتِ] پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر ہیں جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ [حَبْلَ الْمُشَاةِ] حبل ''حا'' مہملہ کے اوپر زبر اور ''با'' ساکن۔ اور مشاۃ کی ''میم'' پر پیش ہے اور یہ ماشٍ کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں: پیدل چلنے والوں کا راستہ۔ ریت کے لمبے اور ضخیم ٹیلے کو بھی حبل کہتے ہیں جس طرح پتھروں کے پہاڑ ہوتے ہیں اسی طرح ریت کے ٹیلے ہوتے ہیں۔ اور حبل مشاۃ پیدل چلنے والوں کے جمع ہونے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ جبل (جیم معجمہ اور با مفتوحہ کے ساتھ) بھی آیا ہے۔ اس جگہ حبل مشاۃ سے مراد پیدل چلنے والوں کا راستہ اور پگڈنڈی ہے۔ [وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلًا] یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہوگئی۔ جس سے اس کے غروب ہونے کا یقین ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے کا یقین ہونے تک ٹھہرا جائے' پھر اس کے بعد مزدلفہ کا رخ کیا جائے۔ میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی فجر صادق طلوع ہونے تک ہے۔ جو شخص اس وقت کے اندر اندر کسی بھی حصے میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا وقوف صحیح ہے اور جو اس دوران میں یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہوگیا۔ (نووی)

[حَتَّى إِذَا غَابَ الْقُرْصُ] یعنی جب سورج اچھی طرح غروب ہوگیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ یہاں سورج کی ٹکیا مراد ہے۔ اور ان الفاظ کا مقصد یہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے۔ [دَفَعَ] یہ إذا کا جواب ہے' یعنی آپ عرفات سے روانہ ہوئے۔ [وَقَدْ شَنَقَ] واؤ حالیہ ہے اور شَنَقَ کے ''نون'' پر زبر ہے' یعنی ملا لیا اور کھینچنے کے ساتھ تنگ کر دیا۔ [اَلزِّمَام] ''زا'' کے نیچے زیر ہے' اونٹنی کی مہار۔ مہار کو اس لیے کھینچا اور تنگ کیا کہ وہ بھاگے نہ۔ [لَيُصِيبُ] لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے' یعنی چھوتا تھا' پہنچ جاتا تھا۔ [مَوْرِكَ] ''میم'' پر زبر' ''واؤ'' ساکن اور ''را'' کے نیچے زیر ہے۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ [اَلسَّكِينَةَ] اس کی نصبی حالت منصوب علی الإغراء ہونے کی وجہ سے ہے اور اِلْزَمُوا محذوف ہے' یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ [كُلَّمَا أَتَى حَبْلًا] حبلًا' ''حا'' کے ساتھ ہے' یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے۔ [أَرْخَى لَهَا] تو اس کی مہار ڈھیلی اور لمبی کر دیتے۔ [لَمْ يُسَبِّحْ] یہ تسبیح سے ماخوذ ہے' یعنی نفل نہیں پڑھے۔ [اِضْطَجَعَ] اپنے پہلو کو زمین پر رکھا' یعنی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ [تَبَيَّنَ] یعنی ظاہر ہوا۔ [اَلْمَشْعَرَ الْحَرَامَ] یہ مزدلفہ میں ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ قزح کے ''قاف'' پر پیش اور ''زا'' پر زبر ہے۔ [وَهَلَّلَ] یہ تهليل سے ماخوذ ہے' یعنی لا إله إلا الله پڑھا۔ [أَسْفَرَ] یعنی جب خوب روشنی ہوگئی۔ [بَطْنَ مُحَسِّرٍ] مُحَسِّر کی ''میم'' پر پیش ''حا'' پر زبر اور ''سین'' مشدد کے نیچے زیر ہے۔ مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ مزدلفہ کا' بلکہ دونوں کے درمیان میں حد ہے۔ اس کا نام وادیٔ محسر' اس لیے رکھا گیا کہ اس کے معنی ہیں روکنا۔ کیونکہ ابرہہ کے ہاتھی

یہاں روک لیے گئے تھے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آ گئے تھے۔ [فَحَرَّكَ] یہ تحریک سے ماخوذ ہے' یعنی آپ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تاکہ وہ تیز چلے' اس لیے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے' جیسے آپ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی بستی سے جلدی جلدی گزر گئے تھے۔ [ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيقَ الْوُسْطَى] دونوں راستوں کے درمیان والے راستے پر چلے۔ اور یہ اس راستے کے علاوہ تھا جسے آپ نے عرفات کی طرف جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ [الَّتِي تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرَى] اسے جمرۂ عقبہ بھی کہتے ہیں۔ جمرۃ کنکریوں کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔ [حَتّٰى أَتٰى] یعنی یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچے۔ [الْجَمْرَةَ الَّتِي عِنْدَ الشَّجَرَةِ] یعنی جمرۂ عقبہ۔ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد ہے' منی کا حصہ نہیں۔ آپ کے زمانے میں وہاں درخت تھا' تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ [الْخَذْف] ''خا'' پر زبر اور ''ذال'' ساکن ہے۔ انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لوبیا اور چنے وغیرہ کے دانے کے برابر ہو۔ [رَمٰى مِنْ بَطْنِ الْوَادِي] یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں' بایں طور کہ منیٰ' عرفہ اور مزدلفہ آپ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ [الْمَنْحَرِ] یعنی قربان گاہ جو کہ منیٰ میں ہے۔ [نَحَرَ] اونٹ کا ذبح کرنا نحر کہلاتا ہے جو سینے کے اوپر والے گڑھے میں ہوتا ہے' جیسے کہ دوسرے جانوروں کے لیے ذبح کا لفظ ہے جو کہ حلق میں ہوتا ہے۔ [أَفَاضَ] یعنی آپ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ [إِلَى الْبَيْتِ] یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کے لیے گئے۔ اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد میں ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑتا ہے۔

(٦٠٨) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ سَأَلَ اللّٰهَ رِضْوَانَهُ وَالْجَنَّةَ، وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

[608] حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب حج یا عمرے میں تلبیہ' یعنی لبیک کہنے سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضامندی اور جنت طلب کرتے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ سے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ] اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ رضی اللہ عنہ] انصار کے قبیلۂ اوس کی خطمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابوعمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن خطمی قبیلے کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے اور اسی موقع پر شہید ہوئے۔

٦٠٨ـ [إسناده ضعيف جدًا] أخرجه الشافعي في الأم: ٢/ ١٥٧ عن إبراهيم بن محمد الأسلمي عن صالح بن محمد بن زائدة عن عمارة بن خزيمة عن أبيه به. * إبراهيم متروك وشيخه منكر الحديث كما قال البخاري رحمه الله.

(٦٠٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هٰهُنَا، وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ، وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[609] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے قربانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قربان گاہ ہے' لہٰذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قربانی کرو۔ اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام ہے۔ اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے قیام ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ] جمع میں ''جیم'' پر فتحہ اور ''میم'' ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے۔ اور ایک قول کی رو سے اسے جمع اس لیے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو جنت سے زمین پر اپنے اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے کی بنا پر اسے جمع کہتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے جمع کہا گیا ہے۔

(٦١٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلٰى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[610] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب (حج کے لیے) مکہ میں داخل ہوئے تو مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور اس کے زیریں حصے سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کے مکہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کا راستہ بیان ہوا ہے کہ آپ ثنیہ علیا کے راستے سے داخل ہوئے اور ثنیہ سفلیٰ سے واپس ہوئے۔ ② بعض کے نزدیک حج کے لیے مکہ میں داخل ہونا انھی راستوں سے مسنون ہے' اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔ ③ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخل ہونے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلے کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(٦١١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ لَا يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلَّا بَاتَ بِذِي

[611] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو ذی طویٰ میں صبح تک شب بسر کرتے اور

٦٠٩ـ أخرجه مسلم، الحج، باب ما جاء أن عرفة كلها موقف، حديث: ١٤٩ (١٢١٨).

٦١٠ـ أخرجه البخاري، الحج، باب من أين يخرج من مكة، حديث: ١٥٧٨، ومسلم، الحج، باب استحباب دخول مكة من الثنية العليا، حديث: ١٢٥٨.

٦١١ـ أخرجه البخاري، الحج، باب الاغتسال عند دخول مكة، حديث: ١٥٧٣، ومسلم، الحج، باب استحباب المبيت بذي طوى، حديث: ١٢٥٩.

طُوًى، حَتّٰى يُصْبِحَ، وَيَغْتَسِلَ، وَيَذْكُرُ ذٰلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: بَاتَ رات گزارتے۔ بِذِي طُوًى طوی کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تنوین ہے۔ مکہ کے قریب ایک مقام وجگہ کا نام ہے۔ (جو آج کل ایک پرانے کنویں کی وجہ سے بئر طوی کے نام سے مشہور ہے۔)

(٦١٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْحَاكِمُ مَرْفُوعًا، وَالْبَيْهَقِيُّ مَوْقُوفًا.

[612] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس پر سجدہ کرتے۔ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ ② سجدہ کرنے سے مراد اس جگہ پیشانی رکھنا ہے۔ امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور اسے جائز سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں وہم اور اضطراب ہے مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے۔ اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا شذوذ ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ج:۵، ص:۴۴) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

(٦١٣) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا ثَلَاثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعًا، مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[613] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ تین چکروں میں ہلکا ہلکا دوڑ کر چلیں اور چار چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں اور دونوں رکنوں کے مابین پیدل چلیں۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: أَمَرَهُمْ هُمْ سے مراد آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم فرمایا تھا۔ أَنْ يَرْمُلُوا "میم" پر ضمہ ہے۔ دوڑتے ہوئے۔ أَشْوَاطٍ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: چکر لگانا۔

(٦١٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالْبَيْتِ الطَّوَافَ الْأَوَّلَ

[614] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی بیت اللہ کا طواف قدوم (پہلا طواف) کرتے تو اس

٦١٢ـ [صحيح] أخرجه الحاكم: ١/ ٤٥٥ وصححه، ووافقه الذهبي، والدارقطني: ٢/ ٢٨٩، والمرفوع والموقوف صحيحان كلاهما.

٦١٣ـ أخرجه البخاري، الحج، باب كيف كان بدء الرمل، حديث: ١٦٠٢، ومسلم، الحج، باب استحباب الرمل في الطواف والعمرة، حديث: ١٢٦٤.

٦١٤ـ أخرجه البخاري، الحج، باب استلام الحجر الأسود، حديث: ١٦٠٣، ومسلم، الحج، باب استحباب الرمل في الطواف والعمرة، حديث: ١٢٦١.

خَبَّ ثَلَاثًا وَمَشٰى أَرْبَعًا. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ أَوِ الْعُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعٰى ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ بِالْبَيْتِ وَيَمْشِي أَرْبَعَةً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کے پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی سی چال چلتے اور (باقی) چار میں آہستہ چلتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:) میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ حج یا عمرے کے لیے جب بھی طواف قدوم کرتے تو اس کے پہلے تین چکر دوڑ کر لگاتے اور باقی چار میں آہستہ چال چلتے۔ (بخاری و مسلم)

(٦١٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمْ أَرَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَّيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[615] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں یمانی رکنوں کے سوا بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: يَسْتَلِمُ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے۔ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ نون کے بعد والی "یا" مخفف ہے اور اسے کبھی کبھی تشدید سے بھی پڑھا گیا ہے۔ یمن کی جانب منسوب ہے۔ چونکہ یمن کی طرف ان کا رخ ہے اس لیے انھیں رکن یمانی کہتے ہیں۔ اور رُكْنُ الْبَيت سے مراد اس کی ایک جانب ہے۔ ان دونوں رکنوں اور کونوں سے مراد حجر اسود والا کونا اور بیت اللہ کا جنوب مغربی کونا ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ اور رکنین شامیین یعنی ملک شام کی جانب والے کونوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(٦١٦) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَّلَ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[616] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا: مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو پتھر ہے۔ تو کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ① اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا بلکہ یہ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ ② حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فرمان سے مشرکین کے اس

٦١٥ـ أخرجه مسلم، الحج، باب استحباب استلام الركنين اليمانيين في الطواف، حديث: ١٢٦٩.

٦١٦ـ أخرجه البخاري، الحج، باب ما ذكر في الحجر الأسود، حديث: ١٥٩٧، ومسلم، الحج، باب استحباب تقبيل الحجر الأسود في الطواف، حديث: ١٢٧٠.

باطل نظریے کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(٦١٧) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ، وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[617] حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے۔ آپ چھڑی سے' جو آپ کے پاس تھی' حجر اسود کو چھوتے اور پھر اس چھڑی کو بوسہ دیتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: **بِمِحْجَنٍ** ''میم'' کے نیچے کسرہ ہے۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا' خم دار چھڑی۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ہجوم زیادہ ہو اور حجر اسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ ② مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجر اسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے' اس لیے اگر تمھیں فارغ وقت میسر آ جائے تو ہاتھ سے چھو لیا کرو' بصورت دیگر حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ ہی کہہ لیا کرو۔'' (مسند أحمد: ١/ ٢٨) ③ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں۔ ④ اگر حجر اسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارے سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہیے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو اس لیے بوسہ دیا جاتا ہے کہ وہ حجر اسود کے ساتھ لگ چکے ہوتے ہیں۔

راویٔ حدیث: **حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ** ان کا نام عامر بن واثلہ لیثی کنانی رضی اللہ عنہ ہے۔ نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ ہجری میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ ہجری میں وفات پائی۔ اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۱۰ ہجری کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(٦١٨) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مُضْطَبِعًا بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

[618] حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سبز چادر میں طواف کیا جس کو آپ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

٦١٧۔ أخرجه مسلم، الحج، باب جواز الطواف على بعير وغيره، حديث: ١٢٧٥.

٦١٨۔ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، المناسك، باب الاضطباع في الطواف، حديث: ١٨٨٣، والترمذي، الحج، حديث: ٨٥٩، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٢٩٥٤، وأحمد: ٤/ ٢٢٤، ابن جريج والثوري مدلسان وعنعنا.

لغوی تشریح: [مُضْطَبِعًا] اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصے کو اپنی دائیں بغل کے نیچے کر کے اس کے دونوں کنارے (پلو) بائیں کندھے پر ڈال لینا۔ اس طرح دایاں کندھا ننگا رہتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے' نیز سنن ابن ماجہ کی تحقیق میں اسے سنداً ضعیف قرار دینے کے بعد لکھا ہے کہ سنن بیہقی کی روایت اس سے کفایت کرتی ہے۔ جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح' حسن اور قوی قرار دیا ہے' لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد اور متابعات کی بنا پر قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ واللہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد:۲۹/۴۷۳' ۴۷۴' وصحیح سنن ابن ماجه للألباني' رقم:۲۴۰۹) ② اضطباع پہلے پہل عمرۃ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کے لیے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کے لیے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں' البتہ یہ اضطباع صرف طواف قدوم میں مسنون ہے۔ طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعتیں پڑھتے وقت دونوں کندھے ڈھانک لینے چاہییں۔ ③ رمل اور اضطباع صرف مردوں کے لیے مشروع ہے عورتوں کے لیے نہیں۔ ④ احرام کے لیے ضروری نہیں کہ چادر سفید ہی ہو' دوسرے رنگ کے کپڑے میں بھی جائز ہے۔ صرف زرد رنگ ناپسندیدہ ہے جبکہ سفید افضل اور مستحب ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوصفوان تمیمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابیٔ رسول ہیں۔ فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا۔ حنین' طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی جانب سے عامل مقرر کیے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک حیات رہے۔

(٦١٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: كَانَ يُهِلُّ مِنَّا الْمُهِلُّ فَلَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ فَلَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[619] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ تلبیہ کہتے تھے' انھیں بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے، انھیں بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس حدیث میں منیٰ سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تلبیہ کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(٦٢٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[620] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' انھوں

٦١٩ـ أخرجه البخاري، الحج، باب التلبية والتكبير إذا غدا من منى إلى عرفة، حديث: ١٦٥٩، ومسلم، الحج، باب التلبية والتكبير في الذهاب من منى إلى عرفات في يوم عرفة، حديث: ١٢٨٥.

٦٢٠ـ أخرجه البخاري، الحج، باب من قدم ضعفة أهله بليل ....، حديث: ١٦٧٧، ومسلم، الحج، باب استحباب ◄◄

عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي الثَّقَلِ، أَوْ قَالَ: فِي الضَّعَفَةِ، مِنْ جَمْعٍ، بِلَيْلٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

نے کہا کہ مجھے نبی ﷺ نے مسافروں کے سامان کے ساتھ' یا کہا کہ کمزوروں کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے (منیٰ کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [فِي الثَّقَلِ] اَلثَّقَلِ کی ''ثا'' اور ''قاف'' دونوں پر فتحہ ہے۔ سامان مسافر۔ [اَلضَّعَفَةِ] ''ضاد' عین اور فا'' تینوں پر فتحہ ہے۔ ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین' بچے اور خادم وغیرہ ہیں۔ [مِنْ جَمْعٍ] مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جانے کے لیے۔ [بِلَيْلٍ] رات کے وقت۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کے لیے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منیٰ کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور باقی لوگوں کے لیے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔ ② طیبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور وضعیف حضرات کو ہجوم کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔

(٦٢١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: اِسْتَأْذَنَتْ سَوْدَةُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ أَنْ تَدْفَعَ قَبْلَهُ، وَكَانَتْ ثَبِطَةً، يَعْنِي ثَقِيلَةً، فَأَذِنَ لَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[621] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضرت سودہ ؓ نے مزدلفہ کی رات رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ آپ سے پہلے واپس آ جائے اور (یہ اجازت انھوں نے اس لیے طلب کی کہ) وہ بھاری جسم والی تھیں۔ آپ نے انھیں اجازت دے دی۔ (بخاری ومسلم)

فائدہ: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری بھرکم جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منیٰ کی طرف جانے کی رخصت واجازت ہے۔

وضاحت: [حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ ؓ] امہات المومنین میں سے ہیں۔ مکہ مکرمہ ہی میں ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور اپنے خاوند کے ساتھ دوسری ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ ان کا خاوند وہاں فوت ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا اور حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد اور حضرت عائشہ ؓ کے نکاح سے پہلے مکہ میں ان کے ساتھ وظیفۂ زوجیت ادا کیا۔ اور ۵۵ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔

(٦٢٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى

[622] حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے' رسول

◀◀ تقديم دفع الضعفة من النساء وغيرهن من مزدلفة إلى منى . . . ، حديث: ١٢٩٣.

٦٢١ـ أخرجه البخاري، الحج، باب من قدم ضعفة أهله بليل . . . ، حديث: ١٦٨١، ومسلم، الحج، باب استحباب تقديم دفع الضعفة من النساء وغيرهن من مزدلفة إلى منى . . . ، حديث: ١٢٩٠.

٦٢٢ـ [إسناده ضعيف] أخرجه أبوداود، المناسك، باب التعجيل من جمع، حديث: ١٩٤٠، والترمذي، الحج، حديث: ٨٩٣، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠٢٥، وأحمد: ١/ ٢٣٤، ٢٧٧ "الحسن العرني أرسل عن ابن عباس" كما في التقريب (١٢٥٢)، وللحديث شواهد ضعيفة.

عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَرْمُوا الْجَمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا: ''طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مارو۔'' (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔اس کی سند میں انقطاع ہے)

فوائد و مسائل: ① مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیا ہے جبکہ دیگر محققین نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس پر تفصیلی بحث کی ہے جس سے تصحیح حدیث والی رائے ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد اور متابعات کی بنا پر قابل عمل ہے۔ واللّٰہ أعلم. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: ۵۰۴/۳، ۵۰۵، والإرواء للألباني: ۲۷۶/۴) ② دس ذوالحجہ کو سورج طلوع ہونے کے بعد کنکریاں مارنا مسنون ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے دس ذوالحجہ کو فجر کی نماز مزدلفہ میں ادا کی، اس کے بعد خوب روشنی ہو جانے تک ذکر و اذکار میں مشغول رہے، پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہوئے اور سورج طلوع ہونے کے بعد بڑے جمرے پر کنکریاں ماریں۔ (صحيح مسلم، الحج، حديث: ۱۲۱۸، وسنن ابن ماجه، المناسك، باب حجة رسول الله ﷺ، حديث: ۳۰۷۴) ③ جن روایات میں سورج طلوع ہونے سے قبل کنکریاں مارنے کا ذکر ہے تو یہ صرف عورتوں، بچوں اور غلاموں کے لیے ہے جو ان کی خدمت کے لیے ہوں۔ ان کے علاوہ دس ذوالحجہ کو کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ طلوع فجر سے پہلے کنکریاں مارے جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٦٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَرْسَلَ النَّبِيُّ ﷺ بِأُمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ، فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ، ثُمَّ مَضَتْ، فَأَفَاضَتْ. رَوَاهُ أَبُودَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ.

[623] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو قربانی والی رات پہلے بھیج دیا تھا، چنانچہ انھوں نے طلوع فجر سے پہلے کنکریاں ماریں، پھر جا کر طواف افاضہ کیا۔ (اسے ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل: ① فجر سے پہلے رمی کی یہ رعایت صرف عورتوں کے لیے اور ان کمزوروں کے لیے ہے جو ان کے ہمراہ جائیں۔ ② مذکورہ حدیث سے یہ دلیل پکڑنا صحیح نہیں کہ اس وقت ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی کنکریاں مارنا جائز ہے۔ ③ یہ حدیث پہلی حدیث سے سند کے اعتبار سے راجح ہے، اس لیے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(٦٢٤) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ مُضَرِّسٍ رَضِيَ اللهُ

[624] حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

٦٢٣ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، المناسك، باب التعجيل من جمع، حديث: ١٩٤٢.

٦٢٤ـ [صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب من لم يدرك عرفة، حديث: ١٩٥٠، والترمذي، الحج، حديث: ٨٩١، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٣٠٤٢، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠١٦، وأحمد: ٤/ ٢٦١، وابن خزيمة: ٤/ ◄◄

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا هٰذِهِ، - يَعْنِي بِالْمُزْدَلِفَةِ - فَوَقَفَ مَعَنَا حَتَّى نَدْفَعَ، وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذٰلِكَ لَيْلًا أَوْ نَهَارًا، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، وَقَضَى تَفَثَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جوشخص ہمارے ساتھ اس نماز' یعنی مزدلفہ میں (فجر کی نماز میں) شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے پہلے وہ رات کو یا دن کو عرفہ میں وقوف (عرفات میں قیام) کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس نے اپنا میل کچیل دور کر لیا۔'' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: | مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا هٰذِهِ | جس نماز (فجر) کے لیے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ | لَيْلًا أَوْ نَهَارًا | اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذوالحجہ کی صبح تک جو عرفات میں کسی بھی لمحے قیام پذیر رہا اس نے حج پا لیا جیسا کہ امام خطابی نے کہا ہے۔ | فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ | اس نے حج کو پورا کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے جس کے بغیر حج نامکمل رہتا ہے۔ | وَقَضَى تَفَثَهُ | اس نے اپنا میل کچیل دور کر لیا' یعنی اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لیے۔ تفث ان کاموں کو کہتے ہیں جنھیں محرم سر کے بال منڈوانے یا کٹوانے کے بعد حلال ہونے کے موقع پر کرتا ہے۔ اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج کی ادائیگی بھی شامل ہے کیونکہ تفث تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں تفث میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپ نماز کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ''طے'' کے دو پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو (دوڑا دوڑا کر) تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے کوئی ٹیلا (یا پہاڑ) ایسا نہیں چھوڑا کہ جس پر وقوف نہ کیا ہو۔ (سب ٹیلوں پر وقوف کیا ہے۔) تو کیا میرا حج ہو گیا؟ پھر مذکورہ بالا ساری حدیث ذکر کی۔

فوائد و مسائل: ① ''اس نے اپنا میل کچیل دور کر لیا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مناسک حج پورے کر لیے' اب وہ مابعد کے دیگر اعمال حج' یعنی طواف وغیرہ کر کے احرام کھول سکتا ہے اور حجامت بنوا کر نہا دھو کر کپڑے پہن سکتا ہے۔ ② حج کی ادائیگی کے لیے مقررہ وقت میں عرفات کی حاضری ضروری ہے۔ اسے ہی وقوف عرفہ کہا جاتا ہے۔

راویٔ حدیث: | حضرت عروہ بن مُضَرِّس رضی اللہ عنہ | ''میم'' پر ضمہ ''ضاد'' پر فتحہ اور ''را'' مشدد کے نیچے زیر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے: عروہ بن مضرس بن اوس بن حارثہ بن لام طائی۔ مشہور صحابی ہیں۔ حجۃ الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

◀◀ ٢٥٦، وابن حبان (الإحسان): ٦/ ٦١، حديث: ٣٨٣٩، ٣٨٤٠، والحاكم: ١/ ٤٦٣ وصححه، ووافقه الذهبي.

(٦٢٥) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا لَايُفِيضُونَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَيَقُولُونَ: أَشْرِقْ ثَبِيرُ! وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَفَاضَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[625] حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین (مزدلفہ سے) طلوع آفتاب کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے: اے ثبیر (پہاڑ!) روشن ہو جا۔ لیکن نبی ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے وہاں سے کوچ کیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [لَا يُفِيضُونَ] واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ [أَشْرِقْ] إشراق سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو یعنی چاہیے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ [ثبیر] ''ثا'' پر فتحہ اور ''با'' کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ ندا، محذوف کا منادیٰ ہونے کی وجہ سے مبنی علی الضم ہے۔ منیٰ کی طرف جانے والے کے بائیں جانب آنے والے ایک مشہور ومعروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلۂ ہذیل کے ثبیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اس پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: [كيما نغير] اس کے معنی ہیں: تاکہ ہم چل سکیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ (سنن ابن ماجه' المناسك' باب الوقف لجمع' حديث: ٣٠٢٢)

فائدہ: اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزدلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہیے اور جو طلوع آفتاب تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہو گیا۔

(٦٢٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ، قَالَا: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتّٰى رَمٰى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[626] حضرت ابن عباس اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم دونوں سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جمرۂ عقبہ کو کنکری مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [حتّٰى رمى جمرة العقبة] جمرۂ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے جو دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جونہی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

راویٔ حدیث: [حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما] ان کی کنیت ابومحمد یا ابوزید تھی۔ اسامہ کے ''ہمزہ'' پر ضمہ ہے: نسب نامہ اس طرح ہے: اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے محبوب' آزاد کردہ غلام اور آزاد کردہ غلام کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ تھی۔ آپ نے اپنی وفات سے

٦٢٥۔ أخرجه البخاري، الحج، باب متى يدفع من جمع، حديث: ١٦٨٤.

٦٢٦۔ أخرجه البخاري، الحج، باب التلبية والتكبير غداة النحر، حديث: ١٦٨٥.

چند دن قبل انھیں اپنے لشکر کا سر براہ مقرر فرمایا جس میں اکابر صحابۂ کرام ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر لوگ بھی شامل تھے۔ اس وقت اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ یہ لشکر نبی ﷺ کی وفات کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وفات پائی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی وفات ۵۴ ہجری میں ہوئی۔

(٦٢٧) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنًى عَنْ يَمِينِهِ، وَرَمَى الْجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، وَقَالَ: هٰذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[627] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے بیت اللہ کو اپنی بائیں جانب اور منیٰ کو اپنی دائیں جانب رکھا اور جمرے کو سات کنکریاں ماریں اور فرمایا کہ یہ اس ہستی کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے جس پر سورۂ بقرہ کا نزول ہوا تھا۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [رَمَى الْجَمْرَةَ] اس جمرہ سے جمرۃ العقبہ مراد ہے۔ [أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ] سورۂ بقرہ کا بالخصوص ذکر اس لیے کیا کہ حج کے اکثر احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس سے اس پر متنبہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ حج کے اعمال توقیفی ہیں۔ ان میں ردوبدل اور ترمیم و تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں۔

(٦٢٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: رَمَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[628] حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمرہ کو قربانی کے روز چاشت کے وقت کنکریاں ماریں اور اس روز کے بعد آفتاب ڈھلنے کے بعد (کنکریاں مارتے رہے۔) (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ ② اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(٦٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَرْمِي الْجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ عَلٰى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ،

[629] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ (مسجد خیف کے) سب سے قریبی جمرے کو سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے' پھر آگے تشریف لے جاتے اور نرم جگہ (میدان میں) آ کر کھڑے ہو جاتے اور

٦٢٧ـ أخرجه البخاري، الحج، باب رمي الجمار بسبع حصيات، حديث: ١٧٤٨، ومسلم، الحج، باب رمي جمرة العقبة من بطن الوادي، حديث: ١٢٩٦.

٦٢٨ـ أخرجه مسلم، الحج، باب بيان وقت استحباب الرمي، حديث: ١٢٩٩.

٦٢٩ـ أخرجه البخاري، الحج، باب إذا رمى الجمرتين يقوم مستقبل القبلة ويسهل، حديث: ١٧٥١.

فَيَقُومُ طَوِيلًا، وَيَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَرْمِي الْوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ، ثُمَّ يَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُومُ طَوِيلًا، ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ، مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْعَلُهُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

قبلہ رخ ہو کر طویل قیام فرماتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے، پھر جمرۂ وسطیٰ (درمیانی جمرے) کو کنکریاں مارتے، پھر بائیں جانب ہو جاتے اور نرم جگہ (میدان) میں آ کر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے، پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور دعا کرتے ہوئے طویل قیام فرماتے۔ اس کے بعد جمرۂ عقبہ کو کنکریاں وادی کی نچلی جگہ سے مارتے مگر وہاں قیام نہ فرماتے، پھر واپس تشریف لے آتے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [اَلْجَمْرَةَ الدُّنْيَا] اَلدُّنْيَا کے "دال" پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ یہ مسجد خیف کے قریب ہے۔ اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ [ثُمَّ يُسْهِلُ] يُسْهِلُ کی "یا" پر ضمہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: سہل کی طرف جانا۔ اور وہ زمین کے نشیبی حصے کو کہتے ہیں۔ [يَرْمِي الْوُسْطَى] وسطیٰ سے مراد جمرۂ ثانیہ (دوسرا جمرہ) ہے جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمروں کو کنکریاں مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آ کھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے، لہٰذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہیے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آ کر ہاتھ اٹھا کر طویل دعا کرنی چاہیے۔ اس طرح حاجی ہجوم کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(٦٣٠) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ! ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ»، قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِينَ، يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمُقَصِّرِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[630] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الٰہی! سر منڈانے والے (حاجیوں) پر رحم فرما۔" صحابۂ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بال کتروانے والوں پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا: "بال کتروانے والوں پر بھی (رحم فرما)۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: [اَلْمُحَلِّقِينَ] تحلیق سے ماخوذ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرے سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈاتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینے کو کہتے ہیں۔ [وَالْمُقَصِّرِينَ] یہ عطف تلقین ہے، یعنی آپ یہ بھی کہیں: وَالْمُقَصِّرِينَ۔ اور تقصیر بال کتروانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف

٦٣٠ـ أخرجه البخاري، الحج، باب الحلق والتقصير عند الإحلال، حديث: ١٧٢٨، ومسلم، الحج، باب تفضيل الحلق على التقصير.....، حديث: ١٣٠١.

نہیں کیے جاتے۔ یہ حدیث بال منڈوانے کی افضلیت پر دلالت کر رہی ہے۔

(٦٣١) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ. فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْعُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ. قَالَ: «اِذْبَحْ وَلَا حَرَجَ»، وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ، فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ، قَالَ: «اِرْمِ وَلَا حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ يَوْمَئِذٍ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ: «اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[631] حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہوگئے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے سوالات کرنے شروع کیے۔ کسی نے کہا: مجھے علم نہیں تھا تو میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوا لی۔ آپ نے اس سے فرمایا: ''اب قربانی کرلو کوئی حرج نہیں۔'' اور ایک آدمی نے عرض کیا کہ مجھے معلوم نہیں تھا تو میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کرلی۔ آپ نے اس سے فرمایا: ''اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔'' اس روز آپ سے جس عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق بھی استفسار کیا گیا' آپ نے یہی فرمایا: ''اب کرلو کوئی حرج نہیں۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ دسویں ذی الحجہ کو زوال آفتاب کے بعد آپ اپنی سواری پر جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ لَمْ أَشْعُرْ اشعر میں ''عین'' پر ضمہ ہے یعنی مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ یہ دونوں باب تفعیل سے مجہول کے صیغے ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمے چار کام بالترتیب انجام دینے ہوتے ہیں: پہلا کام جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنا' دوسرا قربانی کرنا' تیسرا سر منڈانا یا بال کٹوانا اور چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر تو اتفاق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے۔ اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(٦٣٢) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَحْلِقَ، وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ بِذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[632] حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود حجامت کرانے سے پہلے قربانی کی اور اپنے صحابہ کو بھی اس کا حکم دیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

٦٣١ـ أخرجه البخاري، الحج، باب الفتيا على الدابة عند الجمرة، حديث: ١٧٣٨، ومسلم، الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي ...، حديث: ١٣٠٦.

٦٣٢ـ أخرجه البخاري، المحصر، باب النحر قبل الحلق في الحصر، حديث: ١٨١١.

راویٔ حدیث: [حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ] مسور کے ''میم'' کے نیچے کسرہ ''سین'' ساکن اور ''واؤ'' پر فتحہ ہے۔ مخرمہ میں ''میم'' پر فتحہ ''خا'' ساکن اور ''را'' پر فتحہ ہے۔ زہری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہو گئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۴ ہجری کے آغاز میں مکے کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے انھیں منجنیق کا پتھر آ کر لگا اور وہ وفات پا گئے۔

(٦٣٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «**إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلَّا النِّسَاءَ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

[633] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کنکریاں مار لو اور سر کے بال منڈوا لو تو تمھارے لیے بیویوں کے علاوہ خوشبو اور دیگر تمام چیزیں حلال ہو گئیں۔'' (اسے احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: إِلَّا النِّسَاء یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے۔ وَ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ اس لیے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔ تاہم دیگر صحیح احادیث سے مسئلہ اسی طرح ثابت ہے کہ دسویں تاریخ کو رمی کے بعد حاجی کے لیے بیوی کے علاوہ دیگر ممنوعات حلال ہو جاتی ہیں۔

(٦٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا يُقَصِّرْنَ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

[634] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کے لیے سر منڈوانا نہیں بلکہ ان کے لیے صرف بال کتروانا ہے۔'' (اسے ابوداود نے حسن سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانے نہیں بلکہ صرف کترانے چاہییں اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے لیے بال کترانا ہی مشروع ہے۔

(٦٣٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اسْتَأْذَنَ

[635] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے منیٰ والی

٦٣٣ـ **[إسناده ضعيف]** أخرجه أحمد: ٦/ ١٤٣، وأبوداود، المناسك، حديث: ١٩٧٨، وابن خزيمة، حديث: ٢٩٣٧، حجاج بن أرطاة ضعيف مدلس، وللحديث شواهد ضعيفة.

٦٣٤ـ **[إسناده حسن]** أخرجه أبوداود، المناسك، باب الحلق والتقصير، حديث: ١٩٨٥.

٦٣٥ـ أخرجه البخاري، الحج، باب سقاية الحاج، حديث: ١٦٣٤، ومسلم، الحج، باب وجوب المبيت بمنى ليالي أيام التشريق، حديث: ١٣١٥.

رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ يَبِيتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى، مِنْ أَجْلِ سِقَايَتِهِ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

راتیں مکہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی تاکہ وہ آب زمزم پلا سکیں' چنانچہ آپ نے انھیں اجازت دے دی۔ (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: لَيَالِيَ مِنًى منیٰ کی راتوں سے مراد ذوالحجہ کی گیارھویں' بارھویں اور تیرھویں راتیں ہیں۔ یہ اجازت انھوں نے اس مقصد اور غرض کے لیے طلب کی کہ وہ اوران کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ لوگوں کو پلاتے تھے۔ فَأَذِنَ لَهُ یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کے لیے منیٰ ہی میں یہ راتیں گزارنا واجب ہے اور جنھیں کوئی عذر پیش آ جائے' مثلاً: منیٰ میں خیمے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن ومشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور اسی طرح تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منیٰ میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(٦٣٦) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ لِرُعَاةِ الْإِبِلِ فِي الْبَيْتُوتَةِ عَنْ مِنًى، يَرْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَرْمُونَ الْغَدَ وَمِنْ بَعْدِ الْغَدِ لِيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَرْمُونَ يَوْمَ النَّفْرِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

[636] حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کے چرواہوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت دے دی کہ قربانی کے دن کنکریاں ماریں' پھر کل اور پرسوں دو روز کی (اکٹھی ایک دن) کنکریاں ماریں' پھر کوچ کے روز کنکریاں ماریں۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: أَرْخَصَ اور ایک نسخے میں رَخَّصَ ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں' یعنی رخصت واجازت دے دی۔ رُعَاةٍ ''را'' پر ضمہ کے ساتھ' رَاعٍ کی جمع ہے۔ چرواہے۔ فِي الْبَيْتُوتَةِ البيتوتة، بَاتَ کا مصدر ہے۔ رات گزارنا۔ رات گزارنے سے مراد منیٰ میں راتوں کو گزارنا ہے جس کی تفصیل گزشتہ حدیث کی شرح میں گزر چکی ہے۔ عَنْ مِنًى عَن یہاں بعد اور دوری کے لیے ہے اور غائبین محذوف کے متعلق ہوگا' یعنی منیٰ سے باہر' اس سے دور رہتے ہوئے' یعنی نبی اکرم ﷺ نے انھیں اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال کے لیے منیٰ سے دوران کی حفاظت وحراست کے لیے منیٰ میں رات نہ گزارنے کی اجازت دے دی۔ ثُمَّ يَرْمُونَ الْغَدَ وَ مِنْ بَعْدِ الْغَدِ لِيَوْمَيْنِ وہ یوم نحر سے اگلے دن' یعنی گیارہ اور بارہ کی کنکریاں بارہ ذوالحجہ کو مارتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو جمع کرتے تھے۔ ثُمَّ يَرْمُونَ يَوْمَ النَّفْرِ النفر سے مراد منیٰ سے واپسی کا دن' یعنی تیرہویں تاریخ ہے جسے یوم النفر الثاني بھی کہتے ہیں۔

٦٣٦- [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب في رمي الجمار، حديث: ١٩٧٥، والترمذي، الحج، حديث: ٩٥٥، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٣٠٧١، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠٣٧، وأحمد: ٥/ ٤٥٠، وابن حبان (الموارد): ١٠١٥.

فائدہ: یہ حدیث دلیل ہے کہ عام حاجیوں کے لیے منیٰ میں رات بسر کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رخصت و اجازت واجب ہی کی صورت میں کسی کو دی جاتی ہے ورنہ اگر واجب نہ ہو تو اجازت کی ضرورت ہی نہیں۔

راویٔ حدیث: [حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ] ان کی کنیت ابوعبداللہ یا ابوعمرو ہے۔ بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ بنو عبید کا تعلق انصار کے قبیلے بنو عمرو بن عوف سے تھا۔ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں حاضر رہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بدر کے روز یہ قبائل عالیہ پر امیر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کے لیے حصہ مقرر فرمایا۔ ۴۵ ہجری میں فوت ہوئے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جنگ یمامہ کے روز شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(٦٣٧) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، اَلْحَدِيثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[637] حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قربانی کے روز خطبہ دیا۔ اور ساری حدیث ذکر کی۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: حج کے دوران میں نبی اکرم ﷺ سے کئی خطبے ثابت ہیں۔ مالکیہ اور احناف کے نزدیک ایک خطاب ساتویں ذی الحجہ کو اور دوسرا عرفہ میں ۹ تاریخ کو اور تیسرا گیارھویں ذی الحجہ کو ہوگا۔ دسویں ذی الحجہ یعنی قربانی کے دن کے خطاب کو مالکیہ اور حنفیہ خطبہ نہیں کہتے بلکہ صرف چند نصیحتیں کہتے ہیں۔ یہ عید کا خطبہ نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے نماز عید تو ادا ہی نہیں فرمائی تھی۔ بعض اسے بھی خطبہ ہی کہتے ہیں۔ اس طرح چار خطبے مسنون ہو جاتے ہیں۔

(٦٣٨) وَعَنْ سَرَّاءَ بِنْتِ نَبْهَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الرُّءُوسِ فَقَالَ: **«أَلَيْسَ هٰذَا أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ»؟** اَلْحَدِيثَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

[638] حضرت سراء بنت نبہان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سروں والے دن خطبہ دیا اور فرمایا: ''کیا یہ دن ایام تشریق کا درمیانی دن نہیں ہے؟'' اور ساری حدیث ذکر کی۔ (اسے ابوداود نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [يَوْمَ الرُّءُوسِ] اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یوم الرؤوس سے ذوالحجہ کی گیارہ تاریخ مراد ہے۔ اس کا نام یوم الرؤوس اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس روز کثرت سے قربانی کے جانوروں کے سر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ [أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ] سبل السلام میں ہے کہ اوسط کے لفظ میں دو احتمال ہیں: ہوسکتا ہے کہ أوسط بمعنی افضل ہو اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ یہ چونکہ طرفین (دس ذوالحجہ اور بارہ ذوالحجہ) کے درمیان میں واقع ہے' اس لیے یہ اوسط ہے۔ اور اس قول کے مطابق یوم النحر ایام تشریق میں شامل ہے مگر تقریباً تمام علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو

٦٣٧۔ أخرجه البخاري، الحج، باب الخطبة أيام منى، حديث: ١٧٤١، ومسلم، القسامة، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال، حديث: ١٦٧٩.

٦٣٨۔ [حسن] أخرجه أبوداود، المناسك، باب أي يوم يخطب بمنى، حديث: ١٩٥٣.

چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھتے تھے اور گوشت خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھنے کو عربی زبان میں ''تشریق'' کہتے ہیں' اس لیے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوئ حدیث: [حضرت سراء بنت نبہان ﷝] سراء کے ''سین'' پر فتحہ ''را'' پر فتحہ وتشدید اور آخر میں الف ممدودہ ہے۔ نبہان کے ''نون'' پر فتحہ اور ''با'' ساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے ان سے روایت بیان کی ہے۔

(٦٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «طَوَافُكِ بِالْبَيْتِ، وَسَعْيُكِ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، يَكْفِيكِ لِحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[639] حضرت عائشہ ﷞ سے مروی ہے' نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا اور صفا اور مروہ کے مابین سعی کر لینا تیرے حج اور تیرے عمرے (دونوں) کے لیے کافی ہے۔'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① معلوم رہے کہ حضرت عائشہ ﷞ نے تلبیہ عمرے کا کہا تھا مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہو گئیں تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''عمرے کو چھوڑ دو۔'' اور انھیں حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا۔ ② بعض روایات میں ہے' آپ نے فرمایا: [اُرْفُضِي عُمْرَتَكِ] الرفض کے معنی ہیں: ترک کرنا' یعنی عمرے کے اعمال وافعال کو نظر انداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال حج اور عمرے میں صحیح نہیں بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انھوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارنہ بن گئیں۔ ③ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قارن کے لیے حج اور عمرہ دونوں کی طرف سے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(٦٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَرْمُلْ فِي السَّبْعِ الَّذِي أَفَاضَ فِيهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

[640] حضرت ابن عباس ﷠ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے طواف افاضہ کے سات چکروں میں رمل نہیں کیا۔ (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ اور طواف وداع میں رمل نہیں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ ② طواف قدوم اس پہلے طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں داخل ہوتے ہی کیا جاتا ہے۔ ③ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کے لیے ہے خواتین کے لیے نہیں' ہاں اگر کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ

٦٣٩ـ أخرجه مسلم، الحج، باب بيان وجوه الإحرام .....، حديث: ١٣٢، ١٣٣ - (١٢١١).

٦٤٠ـ [إسناده حسن] أخرجه أبوداود، المناسك، باب الإفاضة في الحج، حديث: ٢٠٠١، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠٦٠، وأحمد: لم أجده، والنسائي في الكبرى: ٢/ ٤٦١، حديث: ٤١٧٠، والحاكم: ١/ ٤٧٥ وصححه على شرط الشيخين، ووافقه الذهبي.

گیا ہو تو اس کی تلافی ضروری نہیں۔

(٦٤١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمُحَصَّبِ، ثُمَّ رَكِبَ إِلَى الْبَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[641] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے محصب میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں پڑھیں' پھر (وہاں) تھوڑا سا سو گئے۔ پھر (بعدازاں) سوار ہو کر بیت اللہ کی جانب تشریف لے گئے اور اس کا طواف کیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [رَقَدَ رَقْدَةً] یعنی تھوڑا سا سو گئے۔ [بِالْمُحَصَّبِ] یہ اس جگہ کا بیان ہے جہاں آپ نے نمازیں ادا فرمائیں اور استراحت بھی فرمائی اور یہ کوچ کا آخری دن تھا' یعنی ایام تشریق کا تیسرا دن۔ محصب بروزن محمد ہے۔ جگہ کا نام ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بہ نسبت مکہ کے منیٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اسے ابطح اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ [فَطَافَ بِهِ] اس سے طواف وداع مراد ہے اور یہ حج کا سب سے آخری طواف ہوتا ہے۔

(٦٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ تَفْعَلُ ذٰلِكَ - أَيِ النُّزُولَ بِالْأَبْطَحِ - وَتَقُولُ: إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِأَنَّهُ كَانَ مَنْزِلًا أَسْمَحَ لِخُرُوجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

[642] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ ابطح (محصب) میں قیام نہیں کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر اس لیے قیام فرمایا تھا کہ یہاں سے واپسی میں آسانی و سہولت زیادہ تھی۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بِالْأَبْطَحِ] أبطح سے وادی محصب ہی مراد ہے۔ [أَسْمَحَ] زیادہ سہل و آسان۔ [لِخُرُوجِهِ] مکہ سے مدینہ کو جانے کے لیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محصب میں قیام کرنا ان مناسک حج میں سے نہیں ہے جو مستحب ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ اس مقام پر اس لیے اترے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم سے نبوت کے ساتویں سال میں قطع تعلق کا عہد و پیمان کیا اور وہاں بیٹھ کر اس بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا تھا۔ نبی ﷺ یہاں اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اترے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول کو غلبہ عطا فرمایا' اس لیے ان کا قول ہے کہ حاجیوں کو یہاں فروکش ہونا چاہیے۔ مگر بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٦٤٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ

[643] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان کا سب سے آخری عمل

٦٤١- أخرجه البخاري، الحج، باب من صلى العصر يوم النفر بالأبطح، حديث: ١٧٦٣.

٦٤٢- أخرجه مسلم، الحج، باب استحباب النزول بالمحصب، حديث: ٣٤٠-(١٣١١).

٦٤٣- أخرجه البخاري، الحج، باب طواف الوداع، حديث: ١٧٥٥، ومسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، حديث: ١٣٢٨.

بِالْبَيْتِ، إِلَّا أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

بیت اللہ کا طواف ہو مگر حائضہ عورتوں کے لیے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: یہ طواف وداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمہ اللہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا (جانور ذبح کرنا) پڑتا ہے مگر حائضہ عورتوں کو رخصت ہے۔

(٦٤٤) وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ، إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةٍ فِي مَسْجِدِي هٰذَا بِمِائَةِ صَلَاةٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

[644] حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ ہے سوائے مسجد حرام کے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں سو نماز پڑھنے سے افضل ہے۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔)

فوائد و مسائل: اس حدیث میں مسجد نبوی اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ هذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے ظاہری طور پر تو یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد عہد نبوی میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر صحیح بات یہی ہے کہ اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبوی کے ساتھ ملحق ہے، اس لیے وہ بھی مسجد نبوی کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ واللہ أعلم.

راویٔ حدیث: [حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما] ان کی کنیت ابوبکر اور نام عبداللہ بن زبیر بن عوام ہے۔ قریش کے قبیلۂ اسد سے ہیں، اس لیے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ قباء پہنچتے ہی ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوگئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ اہل اسلام کا پہلا بچہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بکثرت روزے رکھتے اور بکثرت نفلی نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسیم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ درد کو بانٹنے والے تھے۔ ۶۴ ہجری میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز، عراق، یمن، مصر اور اکثر علاقۂ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور انھیں جمادی الثانیہ ۷۳ ہجری میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

٦٤٤ـ [إسناده صحيح] أخرجه أحمد: ٤/ ٥، وابن حبان (موارد)، حديث: ١٠٢٧.

٦ - بَابُ الْفَوَاتِ وَالْإِحْصَارِ

باب:6- حج سے رہ جانے اور حج سے روکے جانے کا بیان

(٦٤٥) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: قَدْ أُحْصِرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتّٰى اعْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

[645] حضرت ابن عباس ﷠ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو (حدیبیہ پر) روک دیا گیا تو آپ نے اپنا سر منڈوایا' اپنی ازواج سے تعلق زوجیت قائم کیا اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا' پھر آپ نے آئندہ سال عمرہ کیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: [بَابُ الْفَوَاتِ وَالْإِحْصَارِ] فوات کی ''فا'' پر فتحہ ہے' یعنی اس شخص کا بیان جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے' جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے۔ اور إحصار کے معنی روکنے کے ہیں' جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اس کے لیے بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بنے۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ [أُحْصِرَ] صیغۂ مجہول' یعنی آپ کو عمرہ کرنے سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ٦ ہجری میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کرے۔ [حَتّٰى اعْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا] حتی کہ آئندہ سال عمرہ کیا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرے کی قضا واجب ہے۔ اس میں تو زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپ نے عمرہ کیا اور یہ وجوب کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آپ کا یہ عمرہ پہلے عمرے کی قضا تھی بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرۃ القضا یا عمرۃ القضیہ تو صرف اس لیے رکھا گیا کہ ''قضا'' کے معنی ہیں: فیصلہ' اور حدیبیہ کے موقع پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آئیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ٦ ہجری میں رسول اللہ ﷺ احرام باندھ کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپ نے وہیں احرام کھول دیا' قربانی کی اور سر کے بال منڈوائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے' وہیں نحر و ذبح کر دیے۔ ② احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں؟ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجالانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ ③ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی' خواہ وہ جگہ حِل ہو یا حرم' اور یہی قول راجح ہے۔ احناف کے نزدیک قربانی ہر

٦٤٥ـ أخرجه البخاري، المحصر، باب إذا أحصر المعتمر، حديث: ١٨٠٩.

صورت میں حرم میں ذبح ونحر ہونی چاہیے اور اسے کسی کے ذریعے سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ④ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ممکن نہ ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ ⑤ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ نبی ﷺ کے تمام اصحاب کے پاس ہدی (قربانی) تو نہیں تھی' اگر واجب ہوتی تو پھر سب کے لیے اس کا وجوب ہوتا' حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے۔

(٦٤٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا، فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «**حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

[646] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار ہوں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''حج کر اور یہ شرط کر لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں اے اللہ! تو نے مجھے روکا۔'' (بخاری ومسلم)

لغوی تشریح: [شَاكِيَةٌ] بیمار۔ [مَحِلِّي] ''میم'' پر فتحہ اور ''حا'' کے نیچے کسرہ ہے' یعنی حج سے خروج کا مکان اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ مقصود اس سے وقت اور مقام دونوں کا بیان ہے۔ اور یہ ظرف زمان اور ظرف مکان دونوں کے معنی دے رہا ہے۔ [حَبَسْتَنِي] صیغۂ مخاطب' یعنی ''اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

وضاحت: [حضرت ضباعہ بنت زبیر رضی اللہ عنہا] ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ''ضاد'' پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔

(٦٤٧) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرَجَ فَقَدْ حَلَّ، وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ**»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ

[647] حضرت عکرمہ حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کی ہڈی توڑی جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو وہ حلال ہو گیا (احرام سے نکل گیا۔) اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی ہے۔''

٦٤٦ـ أخرجه البخاري، النكاح، باب الأكفاء في الدين، حديث: ٥٠٨٩، ومسلم، الحج، باب جواز اشتراط المحرم التحلل بعذر المرض، حديث: ١٢٠٧.

٦٤٧ـ [إسناده صحيح] أخرجه أبوداود، المناسك، باب الإحصار، حديث: ١٨٦٢، والترمذي، الحج، حديث: ٩٤٠، والنسائي، مناسك الحج، حديث: ٢٨٦٤، وابن ماجه، المناسك، حديث: ٣٠٧٧، وأحمد: ٣/ ٤٥٠.

ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَاهُرَيْرَةَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَا: صَدَقَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حضرت حجاج بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: [کُسِرَ] صیغۂ مجہول۔ [أَوْعَرَجَ] ''عین'' اور ''را'' دونوں پر فتحہ ہے۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو پیدائشی نہ ہو۔ جب پیدائشی چوٹ ہو تو اس صورت میں عَرِجَ، یعنی را کے کسرہ سے پڑھا جاتا ہے۔ [فَقَدْ حَلَّ] یعنی اس کے لیے احرام ترک کر دینا جائز ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ [وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ] آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرض حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ یمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ محرم' احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے: ① احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی بھی مانع کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ ② اس نے شرط کر لی ہو۔ ③ کسی حادثے کی وجہ سے کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا وہ لنگڑا ہو گیا ہو۔ رہا وہ شخص جس کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو۔ اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرے کے لیے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ عمرے کے لیے تلبیہ کہے گا اور از سر نو دوبارہ احرام باندھے گا' پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کے لیے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے کہ دم دینا' قربانی کرنا واجب نہیں ہے۔

راویٔ حدیث: [حضرت عکرمہ رحمہ اللہ] عکرمہ میں ''عین'' کے نیچے کسرہ' ''کاف'' ساکن اور ''را'' کے نیچے کسرہ ہے۔ ابو عبداللہ کنیت ہے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام تھے۔ بربر قبیلے سے تھے۔ بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہائے مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے طبقے میں شامل ہیں۔ ۱۰۷ ہجری میں اسی سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

وضاحت: [حضرت حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ] ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے۔

قَالَ مُصَنِّفُهُ - حَافِظُ الْعَصْرِ، قَاضِي الْقُضَاةِ أَبُوالْفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حَجَرٍ الْكِنَانِيُّ الْعَسْقَلَانِيُّ الْمِصْرِيُّ، أَبْقَاهُ اللّٰهُ فِي خَيْرٍ- : آخِرُ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ هٰذَا الْكِتَابِ الْمُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ الْفَرَاغُ مِنْهُ فِي ثَانِيَ عَشَرَ شَهْرِ رَبِيعِ الْأَوَّلِ سَنَةَ سَبْعٍ وَّعِشْرِينَ وَثَمَانِمِائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ الْعِبَادَاتِ، يَتْلُوهُ فِي الْجُزْءِ الثَّانِي كِتَابُ الْبُيُوعِ.

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا دَائِمًا أَبَدًا . غَفَرَ اللّٰهُ لِكَاتِبِهِ وَلِوَالِدَيْهِ وَلِكُلِّ الْمُسْلِمِينَ ، وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ .

بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر' قاضی القضاۃ (چیف جسٹس)' ابوالفضل احمد بن علی بن حجر الکنانی العسقلانی مصری' - اللہ تعالیٰ انھیں بھلائیوں میں ہمیشہ زندہ رکھے- نے کہا ہے کہ یہ مقام جز اول کا آخری حصہ ہے۔ اور وہ جز اول اس مبارک کتاب کا نصف ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ ہجری ماہ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو اس سے فارغ ہوا۔ اور یہ عبادات کے چوتھائی حصے کا آخر ہے۔ اب اس کے بعد دوسرے نصف میں کتاب البیوع کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سید محمد ﷺ' ان کی آل اور اصحاب پر ہمیشہ ہمیشہ بے شمار رحمتیں اور سلامتی نازل کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ اس (تصنیف) کے کاتب' اس کے والدین اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے۔ اور اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

وضاحت: مذکورہ عبارت ۱۲۹۹ ہجری کے مطبوعہ نسخے میں مطبعہ صدیقیہ (جو بھوپال کا ایک سرکاری پریس ہے) میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کے زمانے کا پریس ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخے سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اس نسخے کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخے کو ان کے بڑے بڑے شاگردوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے پڑھا تھا' انھوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا' مثلاً: امام یوسف (جو مصنف کی اولاد میں سے ہیں)' شیخ عبدالباسط بن احمد ہیثمی ازہری' شیخ محمد بن عبداللطیف ملیجی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخے کی طباعت نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ والیٔ بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی۔ اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی۔ اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی (مؤلف روح المعانی کے پوتے) کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ ہجری میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اس عظیم فائدے کو دیکھا جو اس عبارت میں ہے اور ان خصوصیات کا ذکر کیا تو ہم نے انھیں اس کتاب میں بیان کر دیا۔



"بلوغ المرام" ابو الفضل شہاب الدین
احمد ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ کی بے مثال
کتاب ہے۔ ضخامت میں مختصر ہے لیکن جامعیت
اور افادیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ مسائل و احکام کا
یہ نہایت اہم اور گرانقدر مجموعہ علماء اور طلباء کے لیے یکساں مفید ہے۔ اپنی زبردست
اہمیت اور افادیت کی وجہ سے یہ کتاب دنیا بھر کے مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب
ہے۔ اس نامور کتاب کا اردو میں نہایت خوبصورت ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں
ہے۔ کم و بیش ہر حدیث کے نیچے پہلے لغوی تشریح اور پھر حاصل کلام کے عنوان سے
شرح بھی لکھ دی گئی ہے تاکہ ہر حدیث کی وضاحت ہوجائے اور جو احکام اس
حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی تشریح و تفہیم آسان ہو جائے۔ زیر نظر جدید
ایڈیشن میں احادیث کے فوائد میں مزید اضافے، تخریج و تحقیق
اور راویوں کے مختصر حالات زندگی بھی درج کیے گئے ہیں۔
جس سے اس کتاب کی افادیت واہمیت میں
بے حد اضافہ ہوگیا ہے۔



ISBN 969574205-X
